U5403 . 3-12-91

Title – Tazkira Hazaar Dastaan Maroof Ba Khamkhana Javed

Author – Lala Sreeram

Publisher – Kay Gulab Singh Press (Lahore).

Date – 1911

Pages – 8+16+604

Subject – Urdu Shayari Tanqeed; Tazkira Shora.

تذکرہ ہزار داستان

خمخانہ جاوید

مؤلفہ

جناب لالہ سری رام صاحب ایم۔اے

سابق منصف دہلی۔ خلف الصدق

عالیجناب آنریبل راے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب بیرسٹر

F.W.R. Co.
LAHORE

مرتب کا دیباچہ

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید کی وہ شخصیت تھی کہ ان کو بہت سے یاد کرتے ہیں۔ اور گاہ گاہ نہیں اکثر یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ غیر معمولی اوصاف کے مالک تھے۔ خاندان کو دیکھیے تو ان کا سلسلہ اکبر اعظم کے نورتن کے ممتاز فرد راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ لالہ سری رام کے ایک بزرگ لالہ جیون لال محمد شاہ کے دربار کے ایک نامی گرامی منصبدار تھے۔ ان کے والد آنریبل رائے مدن گوپال بہادر ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا دہلی اور لاہور میں بہترین قانوندان سمجھے جاتے تھے۔ ان کے تایا رائے بہادر ماسٹر پیارے لال دہلی میں نئے طرز کی لٹریری سوسائٹی کے بانی اور پنجاب میں اردو کی تدوین اور اشاعت کرنے والوں میں سے تھے۔ لالہ سری رام کا قدیم خاندانی مکان وہاں تھا جہاں اب چاندنی چوک میں بیپٹسٹ گرجا (Baptist Chapel) بنا ہوا ہے۔ ایسے باغ میں جو ہونہار بروا پیدا ہو اُس کے پات چکنے کیوں نہ ہوتے۔

لالہ سری رام ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور میں ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ایم۔ اے کی ڈگری انگریزی میں حاصل کرکے جلد ہی آپ منصف کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ مگر ۱۹۰۴ء میں ادبی مصروفیتوں کی وجہ سے سرکاری ملازمت چھوڑ دی۔ اور اُردو ادب و شاعری کی خدمت کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے وہ خود شاعر نہ تھے لیکن بے نظیر سخن فہم و سخن شناس اور شاعر نواز تھے۔ اساتذہ کے سلسلوں یعنی مشہور شاعروں کے ادبی تعلقات اور اُن کے حلقۂ تلامذہ کے بارے میں

جو تحقیق اور واقفیت ان کی تھی اس کی نظیر میرے دیکھنے میں نہیں آئی یہی کمال اُن کو شاہی خاندانوں اور اہلِ ریاست کے گھرانوں کی تاریخی معلومات میں حاصل تھا۔

لالہ سری رام کا مطالعہ نہایت وسیع اور متنوع تھا۔ شعر میں مضمون کی چوری اس پھرتی سے پکڑتے کہ پُرانے استاد دنگ رہ جاتے کوئی دیوان یا مجموعۂ کلام غرض اُردو نظم کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو اُن کے کتب خانے میں موجود نہ ہو اور ان کی نظر سے نہ گزری ہو ابھی ذکر آیا ہے کہ انھوں نے شعر کبھی نہیں کہا۔ لیکن زمانہ اور مخزن کے ابتدائی دور میں متعدد مضامین ان نامی رسالوں میں لکھے جو ٹکسالی فصاحت اور تحقیق کے اعتبار سے نہایت قابلِ قدر تھے۔ اور تذکرہ خمخانۂ جاوید کی جلدوں میں تو ان کے سحر نگار قلم نے وہ گلکاریاں کیں جو اہلِ مذاق کے دماغ کو ہمیشہ تفریح اور تازگی بخشتی رہیں گی۔

ادب کی خدمت کا مختصر حال یہ ہے کہ انور مرحوم کا دیوان طالب علمی کے ہی زمانہ میں حاصل کر کے شایع کر دیا تھا۔ اگر یہ نہ کرتے تو انور جیسے نغز گفتار شاعر کا کلام چند اشعار کے سوا جو لوگوں کو یاد تھے اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا معقول رقم دے کر جناب داغ کا حقِ تصنیف خریدا اور اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا۔ یادگار داغ کے بعد فصیح الملک کا اور کلام جو فرد فرد تھا فراہم کر کے ضمیمہ یادگار داغ کے نام سے چھپوا کر شایع کیا مرزا محمد تقی بیگ مایل کے کلام کا مجموعہ مرتب کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے جو مختصر سا دیوان مایل کا شایع کیا ہے اس کا ماخذ وہی مجموعہ ہے جس کا ابھی ذکر ہوا منشی بہاری لال مشتاق کا کلیات چھپوانے ہی کو تھے کہ آخری بیماری میں مبتلا ہو گئے۔

لالہ سری رام کا کتبخانہ ادب اور آرٹ کا عجائب گھر تھا۔ فارسی۔ عربی۔ اردو اور ہندی کی کتابیں ہزاروں تھیں جن کے موضوعوں کی نوعیت گوناگوں تھی۔ قلمی کتابیں جنھیں اہلِ مخطوطات کہتے ہیں سیکڑوں تھیں۔ ان میں بہت سی بالکل یکتا تھیں چھپی ہوئی کتابوں اور انگریزی کتابوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بڑی تعداد ان کتابوں کی تھی جو کمیاب اور نایاب ہیں یہی کیفیت

قلمی تصویروں کی تھی۔ ایسی تصویریں پانسو سے زیادہ تھیں۔ خطاطی یعنی مختلف رسم الخط کے نمونے قطعوں۔ وصلیوں اور مرقعوں کی شکل میں بہت سے تھے۔ پرانے شاہی فرمان بھی خاصی تعداد میں تھے۔

لالہ سری رام کی ادب نوازی کے کئی طریق تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ لکشمی اور سرستی کے آپس میں حد کا بیر ہے۔ لالہ سری رام پر دونوں کی نظر عنایت تھی۔ اس بارے میں وہ معدودے چند خوش نصیب مستثنیات میں سے تھے۔ وہ یہ کرتے کہ جس نومشق شاعر کو دیکھا کہ اس نے اچھی اور ہونہار طبیعت پائی ہے اس کی دل افزائی کرتے۔ بے روزگاری کی صورت میں اس کے لیے شغل مہیا کرتے۔ شہر اور باہر کے مشاعروں میں اسے ساتھ لے جاتے دنیائے ادب سے اس کا تعارف کرانے۔ ایسا بھی اکثر ہوا ہے کہ ایک شخص نے اپنی تصنیف یا تالیف ان کو دکھائی اور انھیں پسند آگئی تو اس کی طباعت و اشاعت میں امداد فرماتے۔

لالہ سری رام کا ذوق سلیم اُردو ادب اور شاعری سے متعلق مقامی اور ملّی امتیاز سے مبرا تھا۔ ذاتی برتاؤ میں جو رواداری اور سوالات کا جوہر حاوی تھا وہی ادبی معاملات میں بھی موجود تھا۔ دہلی اور لکھنؤ دکن اور پنجاب۔ اہلِ زبان اور نازبان۔ ہندو اور غیر ہندو کے امتیاز اور اختلاف کو نہ اُن کے ادبی شعور اور ذہنیت میں دخل تھا نہ سوشل برتاؤ اور فیض رسانی میں۔ وہ خود اپنے مراسم اور اعتقادات کے شد کے ساتھ پابند اور عامل تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اتنے وسیع المشرب اور فراخدل تھے۔ اس قدر ملنسار اور اخلاق حمیدہ کے مالک تھے کہ ہندو مسلمان ان کی نظر میں ایک تھے۔ ہاں دوستوں کے تعلقات کے بارے میں زود رنج اور ذکی الحس ضرور تھے۔ اس ذیل میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو میری ذات سے متعلق ہے۔ میں روزگار کے پھیر میں برسوں سے دہلی سے باہر تھا ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں منصبی ضرورت سے دہلی آیا۔ کام نہایت اہم اور عجلت کا تھا اس سے

فارغ ہوکر فوراً واپس چلا گیا۔ ان سے ملنے تک کی مہلت نہ ملی۔ ان کو میرے آنے جانے کی خبر مل گئی۔ میں جب دہلی آتا اعزا و اقربا کو چھوڑ کر انھیں کے پاس ٹھیرتا۔ خیر اس کے بعد جو میں آیا تو آپ بولتے نہیں۔ میں ہاتھ بڑھاتا ہوں تو ان کا ہاتھ جیب میں چلا جاتا ہے۔ سامنے ڈٹ جاتا ہوں تو پیٹھ موڑ لیتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ پچھلی دفعہ میرے آنے کی انھیں خبر لگ گئی۔ اسی کا رنج ہے کہ ملا تک نہیں اور چلا گیا۔ میں نے پھر اُن کی طرف رُخ نہ کیا۔ چائے منگوا کر پی اور ملازم سے حقہ لانے کو کہا۔ بس پھر کیا تھا ٹھنڈے ہو گئے پانوں کی ڈبیا میرے آگے سرکا کر پوچھا جب کیسے آئے تھے؟ میں نے جواب دیا آتے گئے کچھ نہیں۔ اُستاد کے قول کا ثبوت آج ملا ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ میں نے کہا استاد ذوق جو فرما گئے تھے کہ:

بے محبت نہیں لے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں لے ذوق محبت کے مزے

ہنس دیے اور لپٹ گئے۔ لوگوں کی بے تمیزی اور دوستوں کی بے رُخی انھیں بہت تکلیف دیتی تھی۔ چونکہ خود بے ریا اور مخلص طبیعت پائی تھی کسی کی عیاری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اپنے زمانے میں وہ سب سے زیادہ کثیر الاحباب شخص تھے۔ شعرا اور ادبی مذاق والوں کا تو ملجا و ماوا تھے ہی عمائد اور سربرآوردہ اصحاب اور والیان ریاست میں بھی وہ اجنبی نہ تھے۔ ان کے دوستوں کے وسیع حلقہ میں مذہب و ملت اور بڑے چھوٹے کی تمیز نہ تھی۔

لالہ سری رام کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ تذکرہ ہزار داستان معروف بہ خمخانۂ جاوید ہے۔ یہ اُردو شاعروں کا بسیط اور جامع تذکرہ ہے۔ اس کی چار جلدیں وہ اپنی زندگی میں شایع کر گئے۔ اور باقی جلدوں کا کم و بیش مسالہ فراہم کر کے اُن کی اشاعت کا انتظام کر گئے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلے اس تذکرہ کی نسبت کچھ سُن لیجئے۔

لالہ سری رام کو ابتدا سے شاعری سے بدرجۂ اتم دلچسپی تھی اور تاریخ چونکہ ان کے مطالعہ کا

خاص موضوع تھا اس لیے اُس وقت تک کے تذکرے بھی نظر سے گزرے لیکن ان میں سے کوئی اس معیار پر پورا نہ اُترا جو اُن کے ذہن میں قایم ہو چکا تھا۔ یہ علتِ غائی تھی اِس جید تذکرہ خمخانۂ جاوید کی تصنیف کی۔ تذکرہ کی پہلی جلد کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

"یہ جنون یہاں تک بڑھا کہ ۔ ۔ اساتذۂ سلف و حال کی خوش کلامی کو مونس اور اُن کے حالات کو اپنا وظیفہ قرار دیا۔ اور دل میں ٹھیرالیا کہ جملہ اساتذہ و دلدادگان سخن کی ایک مجلس منعقد ہو اور ان کے کلام کا لبِ لباب یکجائی صورت میں مہیا کیا جائے۔"

یہ سامان کس طرح مہیا کیا گیا اس کو خود انھیں کے الفاظ میں سُنیے۔ فرمایا ہے:۔

"جس دوست یا بزرگ کی خدمت میں باریابی ہوئی شعرا کے حالات اور کلام کا ذکر میرا مشغلہ ٹھیرا۔ بات کوئی ہوتی مگر میری زبان سے اُس کے جواب میں کسی شاعر کا کلام یا اس کا ذکر نکل جاتا۔"

اِس انتہائے شوق و شغف کا کیا ٹھکانا ستر برس کے تفحص اور انہماک دعرقریزی کے بعد پہلی جلد اس تذکرے کی شایع ہوئی۔ دنیائے ادب نے جس تپاک اور گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا وہ اُن تبصروں سے ظاہر ہے جو ہر جلد کے آخر میں چھپے ہیں۔ اس بارے میں 'یار فروشی' کے الزام سے بچنے کے لیے میں اپنی زبان سے کچھ نہ کہوں گا۔ اور صرف دو تین رایوں سے مجمل انتخاب پیش کروں گا۔ یہ اُن بزرگوں کے نقد و نظر کا ماحصل ہے جو ادب کے بہت ہی محتاط اور سخت نقاد تھے۔ شمس العلما منشی ذکاء اللہ نے فرمایا :۔

"اِس خداداد فہم مستقیم اور مذاقِ سلیم کے سبب سے انھوں (لالہ سری رام) نے ادنیٰ اور متوسط شاعروں کے کلام میں سے ایسے تھوڑے سے اشعار منتخب کیے کہ استادوں کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اعلیٰ شاعروں کے کلام میں سے بہت سے اشعار ایسے منتخب کیے کہ ان سے بہتر اور اشعار اُن کے کلام

میں نہیں پائے جاتے . . . . غرض یہ مصنف کا بڑا احسان اہل زبان پر ہے کہ
اُس نے اُردو لٹریچر پر اپنے اس تذکرے کی تصنیف سے ایسا بے بہا اضافہ کیا
ہے کہ پہلے کبھی نہیں ہوا . . . .''

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی برسوں سے نئی کتابوں پر تنقید و تبصرہ لکھنا چھوڑ چکے تھے
لیکن اس تذکرے کے محاسن نے اُن کے اس معمول میں ایک مستثنیٰ قایم کیا فرماتے ہیں:-

''جس صفائی اور سلاست سے اس میں شعرا کے حالات لکھے گئے ہیں اور جس
سلیقہ سے اُن کا کلام بہم پہنچایا گیا ہے اور جس ادب و احترام کے ساتھ قدما سے
لے کر معاصرین تک سب کا نام لیا گیا ہے ان سب باتوں کو تمام نے تسلیم کیا ہے
اور سب سے بڑھ کر میں صدق دل سے تسلیم کرتا ہوں . یہ تذکرہ جامعیت کے
لحاظ سے بلا مبالغہ شعرائے اُردو کی ایسی سائیکلو پیڈیا ہے کہ جس کی نظیر اُردو
تذکروں میں نایاب سمجھی جائے گی . اور اُردو زبان میں یہ ایک ایسا اضافہ
ہوگا جس کا تمام اہل ملک کو ممنون ہونا چاہیے .''

لکھنؤ کے ادیب اعظم منشی احمد علی شوق قدوائی نے اس تذکرے کو دیکھ کر یہ رائے
قایم کی جو غور کے قابل ہے . فرماتے ہیں :-

''اس تذکرے میں صرف اتنا ہی نہیں کہ شعرا کے نام جمع کر دیئے گئے ہوں بلکہ
مناسب حد تک یا یوں کہو کہ جس قدر مل سکی اس قدر ہر شاعر کی لائف بھی موجود ہے یہ
ایک ایسی بات ہے جس کی قدر شاعری کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ تاریخی حیثیت سے
بھی کی جائے گی . . . ایک بڑا لطف یہ ہے کہ عبارت سلیس فصیح متین اور
سنجیدہ تحریر فرمائی جس نے مذاق نظم کے ساتھ مذاق نثر کو بڑھا کے سونے کو
دوبالا کر دیا .''

لالہ سری رام مرحوم اس عدیم المثال تذکرے کے لیے یعنی اس کی تکمیل کے لیے کیا

انتظام کر گئے اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

انھوں نے مرض لاحقہ کو پیچیدہ دیکھ کر ایک وصیت کی۔ اور امور سے قطع نظر جو وصیت میں درج تھے یہاں دو کا ذکر کیا جائے گا۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی تمام عمر کا علمی اور ادبی اندوختہ یعنی بے نظیر کتبخانہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے معہ تمام قلمی تصویروں وغیرہ کے بنارس یونیورسٹی کو دے گئے۔ کہا گیا کہ وہاں اس کتبخانہ سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جائیگا تو فرمایا کہ اسی لیے تو وہاں جانا چاہیے تاکہ جہاں اردو سے کافی دلچسپی نہیں وہاں دلچسپی پیدا کی جائے۔ چنانچہ لالہ سری رام کی رحلت کے چند سال بعد وہ تمام علمی اور فنی خزانہ بنارس چلا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ تمام کتابیں فہرست میں باقاعدہ درج ہو کر نو تعمیر لائبریری کے ایک کمرے میں رکھی گئی ہیں۔ اپنی مطبوعات کا کاپی رائیٹ اور اسٹاک بھی جو موجود تھا وہ بنارس یونیورسٹی ہی کو دے گئے۔

تذکرے کی تکمیل کا انتظام بھی وصیت میں کیا گیا اور اس کی ترتیب و تکمیل کے لیے راقم کو نامزد کر گئے۔ چنانچہ تذکرہ خمخانۂ جاوید کی پانچویں جلد مطبع میں اختتام کے قریب ہے۔ چند ناگزیر موانع ایسے پیش آگئے کہ اس کام میں اتنا توقف ہوا جن میں بڑا حصہ اُس عذر داری کا ہے جو عدالت میں وصیت کے خلاف دائر کی گئی۔ خود میں بھی خاصی مدت تک مکروہاتِ زندگی میں مبتلا رہا جس کا علم اکثر احباب کو ہے۔

لالہ سری رام اپنے دوستوں کے سچے دوست اور مخلص تھے تو دوسروں کے ساتھ ہمدرد اور فیاض تھے۔ زندگی میں بہت سی بیواؤں اور یتیموں اور نادار طلبہ کی معقول امداد کرتے رہے۔ اور وصیت میں بھی اس کا لحاظ رکھا۔ اچھے شعرا کے بے شمار اشعار نوکِ زبان تھے اور مناسب موقع شعر پر شعر ان کی زبان سے سامعہ نواز ہوتے۔ مرحوم اس تہذیب اور کلچر کا بہترین نمونہ تھے جو ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی شائستگی اور ادب کے اتحاد سے وجود پذیر ہوئی۔ وہ خوش رو۔ خوش پوش اور خوش گفتار تھے۔ اخلاص پر مبنی

اور دوستداری اور ادب نوازی ان کا شیوہ تھا۔ ریاکاری اور تصنع سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جو دل میں ہوتا زبان پر آتا۔ آخر یہ راجہ ٹوڈرمل کی یادگار شعر و سخن کا مربی۔ اور شاعری کے حق میں مسیحائی کرنے والا ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

تذکرے کی جلد پنجم جو اس وقت دنیائے ادب کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن خوبیوں کی حامل ہے جو پہلی چار جلدوں کا مابہ الامتیاز متصور ہے۔ پرانے مسودوں کے مندرجات کو تا حال اور مکمل کرنے میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ اصحاب متعلق سے خط و کتابت شروع ہوئی۔ اکثر کے جواب ہی نہ آئے۔ کئی سفر اس سلسلے میں کیے گئے جن کا نتیجہ پورے طور پر اطمینان بخش نہ ہوا۔ اس اثنا میں ملک کے حالات اور اہلِ وطن کے مذاق میں انقلابِ عظیم وارد ہوگیا تھا۔ ادب دوست احباب نے ترتیب سے متعلق نئی نئی تجویزیں پیش کیں۔ اگر ان سب پر عمل کیا جاتا تو اس جلد کا ڈھانچ ہی اپنی ماسبق جلدوں سے بالکل مختلف ہوتا۔ مناسب یہی سمجھا گیا کہ نوعیت میں فرق نہ پیدا کیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ جو نام اس جلد میں ایزاد کیے گئے ہیں اُن سے متعلق نگارش اور تبصرہ کا طرز سابقہ جلدوں کے مندرجات سے مختلف ہے۔ کیونکہ میرا قلم اس سحر کاری اور معجز نگاری سے محروم ہے جو مرحوم کا حصہ تھا۔

آخر میں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس جلد میں جہاں جہاں **مولف** کا لفظ آیا ہے وہاں لالہ صاحب سے مراد ہے اور جہاں **مرتب** یا **راقم** جیسے الفاظ آئے ہیں وہاں مراد اس خاکسار سے ہے۔

برجموہن دتاتریہ کیفی

نمبر ۱۔ دریا گنج۔ دہلی

لالہ سری رام سی اِس تصنیف کے وقت

فہرست شعرا مندرجہ تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد پنجم

تذکرۂ ہزار داستان

المعروف بہ

خمخانۂ جاوید

جلد پنجم

شعلہ:- منشی سیّد محمّد سلطان صاحب خلف سیّد مرتضےٰ حسین و نبیرہ جلیس الدّولہ بہادر مرحوم لکھنوی مصاحب حضرت واجد علی شاہ۔ آپ کو محشر لکھنوی سے تلمذ ہے۔ ۱۰ جمادی الاوّل ۱۳۱۱ھ کو بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ اب لکھنؤ بنجاری ٹولہ میں سکونت ہے۔ ابتداء میں نوحہ کہنے کا شوق تھا۔ مگر جب حزن و ملال میں تغزّل کی جھلک پائی گئی تو ان کے استاد نے یہ رائے دی کہ غزل کہا کرو۔ شعرگوئی کا شوق خاصا رکھتے ہیں مضامین عاشقانہ سے طبیعت کو مناسبت ہے۔ بے محل تشبیہات فضول استعارول سے پرہیز ہے۔ صاف ستھرا شعر کہتے ہیں۔ انتخاب کلام یہ ہے:

سب سُننے کو بیٹھے ہیں تیرے غم کی کہانی	وہ کون ہے شعلہ کہ جو رو کر نہ اُٹھے گا
ممنون ہوں تیرے ستم جاں گداز کا	مُنہ دیکھنا پڑا نہ مجھے چارہ ساز کا

آتشِ شوق اور اے موسیٰ اگر کچھ بڑھ گئی — جان لینا آج کوہِ طور سارا جل گیا

دستِ جنوں انہیں بھی ٹھکانے لگا دے اب — کام آئینگے یہ چند گریباں کے تار کیا

گئے وہ دن کہ جب نالوں سے کچھ تسکین ہوتی تھی — مداوا اب تو خاموشی ہے اپنے دردِ پنہاں کا

اگر اے چارہ گر دشوار ہے دردِ جگر جانا — تو پھر ہر وقت کی تکلیف سے بہتر ہے مر جانا

شریکِ درد کوئی بھی نہیں اپنے زمانے میں — یقیں کیونکر کریں بالیں پہ سب غمخوار بیٹھے ہیں

لئے چلتے ہیں بزمِ دوست میں آگے مقدر ہے — یہاں تک تیری خاطر اے دلِ ناشاد کرتے ہیں

یہ کہہ کے مر گیا کوئی صبحِ شبِ فراق — اب ان کا انتظار عبث ہے وہ آچکے

ہمراہِ داستانِ وفا ہم بھی ختم ہیں — تھوڑی سی رہ گئی ہے بہت سی سنا چکے

مر گئے ہم تو کھلا بابِ قفس اے صیاد — کیا یونہی قید سے آزاد کیا کرتے ہیں

یہی بہتر ہے نہ آئیں وہ عیادت کیلئے — دیکھکر حالتِ بیمار پریشان ہونگے

کلیم طور پہ دیکھ آئے تھے جسے شعلہ — ازل کے دن سے وہ جلوہ مری نگاہ میں ہے

درد کی ایذا دمِ شدت کبھی ایسی نہ تھی — کیا کہوں جیسی ہے اب حالت کبھی ایسی نہ تھی

حشر تک اب تو اندھیرے میں بسر ہوتی ہے — شمعِ تربت پہ جلائے گا کہاں تک کوئی

مدوا اے ضبط نہ اُف منہ سے نکلنے پائے — ظلم سے باز نہ آئے گا کہاں تک کوئی

دلِ بیتاب ٹھہرنے نہیں دیتا شعلہ — اپنی محفل میں بٹھائے گا کہاں تک کوئی

نہ چھیڑ اے خندۂ صبحِ قیامت — ابھی سوئے ہیں جاگے رات بھر کے

شعلہ: منشی محمد خلیل الرحمن خاں خلف الصدق جناب محمد عوض خانصاحب مرحوم
آپ یکم جنوری ۱۸۹۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکابر خاندان شاہانِ مغلیہ کے عہد
میں اعلیٰ مراتب پر سرفراز تھے۔ آپ کا خاندان مدت دراز سے شہر دہلی میں محلہ بلیماران
کٹرہ بجواڑیاں میں سکونت پذیر ہے۔ آپ نے اینگلو عربک ہائی سکول دہلی میں تعلیم پائی
فی الحال آپ پوسٹل آڈٹ آفس دہلی میں ملازم ہیں۔ آپ نے جناب میر شرافت علی صاحب

کُشتہ سے تلمذ اختیار کیا۔ جناب کشتہ کے انتقال کے بعد آپ نے جناب نوح ناروی سے اصلاح لینی شروع کی۔ اب آپ جناب نوح کے شاگردوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔
جناب شعلہ نہایت خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ دہلی کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے رہتے ہیں۔ آپکے ایک عزیز نے درج تذکرہ ہونے کیلیئے جو کلام روانہ فرمایا ہے اُس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔ آپکے کلام میں حضرت امیر احمد مینائی کا رنگ نمایاں ہے۔ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کا شوق ہے۔ معاملہ بندی کا عنصر آپ کے اشعار میں غالب ہے۔

فرطِ حیا سے بزم میں مجھ سے خموش تھا
بچپن ہی خوب تھا ترے عہدِ شباب سے
میری فغاں سے چونک کے پوچھا عدو نے کون
بعدِ فنا کوئی بھی نہ رہا سرِ مزار
آیا نہ میرے کام کوئی اور پیرہن
بچپن سے رونے آئے نہ ہم زار زار کب
آتے ہی میرے گھر میں انہیں نیند آ گئی
دردِ فراق۔ رشکِ عدو۔ یاس بیکسی
اُن کی بلا سے ہو نہ ہو تربت پہ روشنی
حیا کی۔ ناز کی۔ رفتار کی گفتار کیصورت
تعجب ہے کہ اس صورت پہ ہو انکار کیصورت
ہمیں ہر دم حضوری ہے جدائی کسکو کہتے ہیں
اہلِ جہاں پہ بار نہ اپنا وجود ہو
ہمارے قلبِ وحشت دوست کو تسکین کیا ہوگی
نظر تصویر پہ ہو دھیان اپنا ہو مصوّر پہ

بے پردہ ہو کے اور بھی وہ پردہ پوش تھا
کب تجھکو اس زمانہ میں پردہ کا ہوش تھا
اس نے کہا کوئی نہیں اک دل فروش تھا
اک تھا چراغ گور سو وہ بھی خموش تھا
دو گز کفن ہی بعد فنا پردہ پوش تھا
اِن موتیوں کا پہنا نہ شعلہ نے ہار کب
میرے نصیب جاگیں گے پروردگار کب
چاروں ہوئے نہ ہجر میں مجھ سے دوچار کب
روشن کرینگے شعلہ وہ شمع مزار کب
مصوّر کس طرح کھینچے ادائے یار کیصورت
تمہاری شکل کہتی ہے کہ میں ہوں پیار کیصورت
تصوّر میں یہاں پیشِ نظر ہے یار کیصورت
اس باغ میں رہے تو رہے کوئی بنکے پھول
لباسِ زندگی کی ہم نہ جب تک دھجیاں کرلیں
یہ عینِ حق پرستی ہے جو بُتوں یاد بُتاں کرلیں

ہمیشہ کوہ و صحرا کے بہت تنکے چنے ہم نے
چمن کی چار پتوں کو بھی زیب آشیاں کر لیں

کہاں تک سوز باطن کا فسانہ وہ سنے جائے
زباں بند آپ اپنی شعلۂ آتش بیاں کر لیں

فنا پہ بھی غم بے مائگی نہ مجھکو رہا
بگولے آئے کفن دینے دشت غربت میں

نہ چھوٹے کشمکش رنج و غم سے مر کر بھی
کہ آسمان پہ ہے روح جسم تربت میں

شب غم میں نے منصوبوں میں کاٹیں رنج کی گھڑیاں
اگر یوں ہو تو اچھا ہو۔ اگر دوں ہو تو بہتر ہو

عمر شباب چشم زدن میں گذر گئی
باد نسیم تھی اِدھر آئی۔ اُدھر گئی

لازم ہے بقا کیلئے تعلیم فنا بھی
جینے ہی میں آنے لگے مرنے کا مزا بھی

شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا انکو ذرا بھی
نقشہ تو بہت کھینچا تصور نے کھنچا بھی

سچ ہے یہ مثل ٹوٹی کی بوٹی نہیں ہوتی
بیکار ہے فانی کیلئے آب بقا بھی

مانند نقش پا اِدھر اُبھرا اُدھر مٹا
مارا ہے مجھ کو ہستی بے اعتبار نے

پہنچا دیا ہے بعد فلک پر مرا غبار
پایا یہ رتبہ مر کے ترے خاکسار نے

ہے خیال ہجر میں وصل کا ہر خوشی کا دھیان ملال میں
یہ طلسم عشق تو دیکھئے کہ خزاں میں فصل بہار ہے

وہ جو ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے کہ ہے قبر شعلہ کی کس طرف
انہیں بیکسی نے بتا دیا۔ یہ مزار ہے یہ مزار ہے

شعور:۔ شیخ عبدالرؤف بلگرامی مقیم لکھنؤ۔ حضرت مصحفی کے شاگرد تھے۔ صاحب دیوان تھے کلام سے پختگی ظاہر ہے۔ زبان شستہ اور روزمرہ صاف ہے بہت منجھی ہوئی طبیعت پائی چند شعر جو دستیاب ہو سکے درج ذیل ہیں :-

بادۂ عشرت تہی دستوں کی قسمت میں کہاں
اشک خوں سے بھر گیا آیا جو ساغر ہاتھ میں

یار کی تصویر سے ہے دیدہ و دل کو سرور
رات بھر سینہ پہ ہم رکھتے ہیں دن بھر ہاتھ میں

دیا ہے حسن میں یہ مرتبہ اللہ نے تجھ کو
پری تیرے قدم چومے لگائے حور آنکھوں سے

نہ پہنچیں نرگس و شمشاد ہرگز چشم و قامت کو
وہ ہے رفتار سے مجبور، یہ معذور آنکھوں سے

شفا:۔ سید شریف الدین حسین خلف جناب حکیم سید شاہ کاظم حسین مغفور

سجادہ نشین خانقاہِ داناپور زیورِ علم سے آراستہ ہیں۔ علم طبابت میں اچھا دخل ہے۔ شاہ محمد اکبر صاحب ابوالعلائی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ گلدستہ نالۂ عشاق میں آپ کا کلام نظر سے گذرا۔ چند شعر حاضر ہیں:۔

ہے تصور کبھی خط کا تو کبھی گیسو کا	ہم بھی ہر وقت نیا اِک خفقان رکھتے ہیں
نقش برآب ہے انساں کا وجودِ موہوم	اپنی ہستی صفت وہم وگماں رکھتے ہیں
آگ لگ جائے زمانے میں کریں اُف جو شفا	دل میں ہم وہ شررِ عشق نہاں رکھتے ہیں

شفا۔ حکیم محمد ولایت حسین خاں صاحب۔ آپ لکھنؤ کے قدیم باشندے ہیں۔ میر دوست علی خلیل اور میر وزیر علی صبا کی مجالس مشاعرہ میں شریک رہے ہیں اور ان سے اصلاحیں لی ہیں۔ غدر کے بعد سے آپ نے لکھنؤ کو چھوڑ دیا۔ اور ریاست رامپور میں ملازم ہوگئے۔ جب نواب کلب علی خاں کا انتقال ہوگیا تو آپ حضرتِ داغ کے ہمراہ دہلی چلے آئے۔ مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے اچے گڑھ پہنچے اور وہاں ملازمت اختیار کر لی۔ پھر نواب شمشیر بہادر اخگر سے اصلاح لینے لگے۔ مثنوی عطرِ فتنہ اور فریادِ دین شفائی ان کی تصنیفات سے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

وحشت زدہ دل کا اپنے نہ کچھ حال پوچھئے	آنسو بھی پوچھنے کو تو اب آستیں نہیں
چپلو بگڑو نہ اتنا دل لگی ہیں	کہیں کچھ نہ اب تم سے ہنسی ہیں
پارسا جانتے تھے ہم تو شفا کو از حد	آج دیکھا تو چلے آتے تھے میخانے سے

شفا۔ لالہ سوہن لال صاحب بریلوی شاگرد حضرت ہوش۔ اچھے فکر کے شاعر ہیں۔ کلام یہ ہے:۔

دل کو پروا نہیں سختی وہ اگر کرتے ہیں	اپنے نالے بھی تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
گیسوؤں کا ترے رہتا نہیں کب دل میں خیال	یہ وہ کافر ہیں کہ کعبہ میں بھی گھر کرتے ہیں
بلا ہو۔ قہر ہو۔ کیا جانئے کہ کیا ہو جائے	تمہاری زلف جو برہم کبھی ذرا ہو جائے

نصیب شربت دیدار ہو اگر ان کا	تو پھر شفا کو نہ کیونکر بھلا شفا ہو جائے

شفا

شفا:۔ پادری لے۔آر بیلی بریلوی مذہباً گو عیسائی ہیں۔ مگر ہندستانی زبان اور مشرقی لٹریچر کے سرگرم حامی ہیں۔ عطا بدایونی اور جناب وسیم خیرآبادی سے تلمذ ہے۔ کلام مرسلہ کا انتخاب یہ ہے

ہو گیا ہے مری نظروں سے جو پنہاں کوئی	زندگی کا نظر آتا نہیں ساماں کوئی
اب تو پردہ نہ کرو آ کے دکھا دو دیدار	آنکھ میں دم ہے کوئی دم کا ہے مہماں کوئی
اے جنوں وادیٔ وحشت میں ترے ہاتھوں سے	چاک دامن ہے کوئی چاک گریباں کوئی
کیوں شفا کے لئے کرتے ہیں دوا میری طبیب	دردِ فرقت کا جہاں میں نہیں درماں کوئی

شفاعت:۔ مولوی شفاعت اللہ ولد شیخ سخاوت اللہ حمیدی۔ محلہ قاضی ٹولہ شہر بدایوں میں سکونت تھی۔ جناب نوا سے تلمذ تھا۔ افسوس ہو کہ زیادہ حالات اور کلام نہ ملے کلام شائع نہیں ہوا ۱۲۸۵ھ میں بعمر ۵۰ سال انتقال کیا۔ یہ دو شعر ان کے ہیں

عکس لب سے نتھ کا موتی لعل احمر ہو گیا	ہنس دیا وہ گل تو پھر گوہر کا گوہر ہو گیا
مَیں ترے لئے یار جو رسوا نہیں ہوتا	عالم میں ترے حسن کا شہرا نہیں ہوتا

شفق

شفق:۔ انوار الدولہ سعید الملک نواب محمد سعد الدین خاں صولت جنگ مرحوم رئیس کالپی نواب عماد الملک غازی الدین خاں خلف نظام الملک آصف جاہ کی اولاد میں سے تھے۔ سید امجد علی قلق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شاعر گرامی قدر مصنف چشمۂ فیض اور صاحب دیوان تھے۔ مرزا غالب سے خط و کتابت رہتی تھی۔ اور کسب کمال کا شوق تھا۔ ذہن رسا اور طبیعت خداداد رکھتے تھے طرز بیان مرغوب اور خوش اسلوب ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

آرزوؤں کی نہ لے شوقِ شہادت نکلی	سخت جانی سے مری خنجر قاتل ٹوٹا
مقامِ عشق میں غفلت مری عین ہشیاری	کہ رخنائے زلیخائے نزار خواب ہوا
یاد ہے چشمۂ خنجر کی روانی مجھکو	کہ دیا شرح میں کس لطف سے پانی مجھکو

حوصلے دل میں تڑپنے کے ہیں کیا کیا دیکھئے
ذبح کر کے رقصِ بسمل کا تماشا دیکھئے

گھر سے وحشت میں نکلتے ہی وطن بھول گئے
یہ فضا دشت کی دیکھی کہ چمن بھول گئے

یہ ضعف ہے کہ سانس کا لینا محال ہے
بارِ گراں ہے رُوح تنِ زار کے لئے

شفق:۔ مرزا علی جان لکھنوی ابن مرزا جہاں۔ شاگرد میر امداد علی بحر شاعر دربار واجد علی شاہ اور صاحبِ دیوان تھے۔ مٹیا برج میں رہتے تھے۔ اور اچھا شعر کہتے تھے۔ چند شعر نتائج افکار سے درج کئے جاتے ہیں:۔

سر شوریدہ اپنا وقفِ تیغ جور خوباں ہے
نکالیں حوصلہ جی بھر کے اب اہلِ ستم اپنا

طمع وہ آنسوؤں کی بھی نہ رکھو اہلِ دُنیا سے
شفق جی بھر کے رو لو جلتے جی کر جاؤ غم اپنا

ملو تو صورت آئینہ صاف ہو کے ملو
مزا نہیں ہے دلوں میں اگر غبار رہا

کیوں ٹھنڈی سانس بھرتے ہو غیروں کے واسطے
محفل میں شمع ساں نہ جلاؤ پرائے دل

اُدھر خدا بندگی کا طالب اُدھر ہے نفسِ حریص غالب
بہ رُوح آکر میانِ قالب عجب مصیبت کے درمیاں ہے

جو بات کی انہوں نے خبر ہو گئی ہمیں
حاصل ہوئی ہے عشق سے ہمکو صفائے دل

شفق

شفق:۔ دولت رام گلفروش باشندہ دہلی۔ ساکن قدم شریف اُستاد ذوق کے شاگرد تھے۔ ٹپہ۔ ٹھمری اور غزل کہتے تھے۔ اُمّی محض تھے۔ مگر تعلیم یافتہ لوگوں کے فیض صحبت سے صحیح الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ غدر کے بیس برس بعد تک زندہ رہے۔ پیرانہ سالی میں انتقال کیا۔ کلام یہ ہے:۔

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

دمِ غسل سے مرے پیشتر سبھی ہمدموں نے بھی سوچکر
کہیں جاوے اس کا نہ جی دہل مری لاش پیش سے ہٹا دیا

مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ کہنا اس سے کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشق زار تھا تہ خاک اسکو دبا دیا

میری آنکھ جھپکی تھی ایک پل ہی دل نے چاہا کہ اٹھکے چل
دلِ بیقرار نے آخرش مجھے چٹکی لیکے جگا دیا

اگر اس سے کہتا نہ اتنا تو تو نہ رکتا تجھ سے وہ تند خو
شفق آہ تو نے یہ کیا کیا اُسے عشق اپنا جتا دیا

پسِ مُردن بھی گردش ہے زبس میرے مقدر میں
الٰہی کیا کرے دیوانۂ اُلفت کہاں جائے
خدا کے سامنے آئے تو وہ مغرور قاتل کو
فراقِ یار میں کیا لطف ساقی بادہ نوشی کا

نگوڑے کیطرح رہتی ہے میری خاک چکّر میں
قرار آتا ہے صحرا میں نہ جی لگتا ہے اب گھر میں
قیامت ہم بھی اک برپا کرینگے آج محشر میں
بجائے مے ذرا سا زہر بھردے میرے ساغر میں

دلِ محروم کا مدفن زیارت گاہ بن جائے
شفق چھوٹی سی اک تُربت بنادو کوئے دلبر میں

حکیم شفق

شفق:- جناب مولوی حسن مرتضےٰ صاحب شفق ساکن عماد پور رفیع گنج ضلع گیا خلف مولوی سید حسن رضا مغفور سابق صدر الصدور جونپور و بنارس- آپ اُردو کے کہنہ مشق اور پختہ مغز مشاہیر شعرا میں ہیں- شعر و سخن کا مشغلہ ابتدائے سنِ شعور سے ہے ابتدا میں آپ نے جناب حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی سے اصلاح لی تھی- پھر حضرت امیر احمد مینائی لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا- آپ نے کتب درسیہ عربی فارسیؔ طِب الہ آباد اور عظیم آباد وغیرہ میں پڑھیں- ادب اور زباندانی کا شوق فطری تھا- ہندوستان کے اکثر گلدستوں اور رسالوں میں آپ کی نظمیں چھپتی ہیں- آپ کے کلام کو شرف شہرت و قبولیت حاصل ہو چکا ہے- بیاضِ نعت- حدیقۂ آخرت وغیرہ آپ کے نعتیہ رسالے چھپ چکے ہیں- فنِ عروض میں ایک جامع و مختصر رسالہ مسمّیٰ باسمِ تاریخی مہرِ عروض چھپ گیا ہے- رکن عروض اور تحقیق سخن وغیرہ رسالے بھی آپ کی تصنیف سے ہیں- ریاضِ شفق جس میں آپ کے مختصر حالات اور ہر قسم کے کلام کا انتخاب درج ہے- آپ کے شاگرد ذبیح نے شائع کیا دلِ صد پارہ مختلف عنوان کی سَو رباعیوں کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے- آپ کے تلامذہ میں یہ ہیں- سر برآوردہ بری شمس شہر گھاٹوی- قوسؔ- ذبیحؔ- آپ کا کلام بہت صاف اور فصیح ہوتا ہے- فنِ شعر میں پورا دخل رکھتے ہیں- شوکتِ الفاظ- حسنِ بندش- دلنشیں تخیل- آپ کے کلام

کے امتیازی اوصاف ہیں۔ فرسودہ مضمون جب لکھتے ہیں اپنی جدت طرازی سے اس میں بھی نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ طور و موسیٰ کا معاملہ ہمیشہ سے شعراء کا تختۂ مشق رہا ہے۔ مگر آپ نے کیا دل آویز بات لکھ دی ہے۔ یہ شعر سنئے۔

چمکیگی برقِ طور جمالِ حبیب سے　　کہدو کلیم ہٹ کے کھڑے ہوں قریب سے

اِس مضمون کو شائد کسی شاعر نے اس پہلو سے نہیں ادا کیا۔ یہ خاص جناب شفق کا حصّہ ہے۔ بعض اشعار ایسے ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر دل بے چین ہو جاتا ہے۔

شفق بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا
کہ دِل تھام کر تم ٹہلنے لگے۔

کس قدر اثر میں ڈوبا ہُوا ہے۔ اسی طرح ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ آپ نہایت خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ مظہر سعید آپ کا تاریخی نام ہے۔ ۱۲۸۹ھ انتخاب ملاحظہ ہو:

ہے الگ رشتہ دُوئی سے بندۂ درگاہ کا
ایک ہے کعبہ کلیسا پھیر ہے کچھ راہ کا

سات پردے میں بھی آنکھوں کے ہے جلوہ اس کا
دیکھ ہر پردے میں در پردہ تماشا اس کا

جسکے سو داغ جگر میں ہوں ہزاروں دل میں
اللہ اللہ دِل اُس کا ہے کلیجا اس کا

اس تمنا میں کہ دل کی کوئی حسرت نکلے
آج مُنہ دیکھتی ہے میری تمنّا اُس کا

فنا ہو کر ہم آغوشِ بقا ہوتا تو کیا ہوتا
جو قطرہ تھا وہ دریا آشنا ہوتا تو کیا ہوتا

خودی پر آپکو کیا کیا سمجھتا ہے خدا سمجھے
یہ بندہ بیخودی سے باخدا ہوتا تو کیا ہوتا

قیامت سر نہیں کم انتظارِ وصل کی مدت
خدا جانے کہیں وعدہ وفا ہوتا تو کیا ہوتا

شفق ہے نیستی پر بھی بشر کو دعوئ ہستی
نہ ہونے پر یہ عالم ہے بھلا ہوتا تو کیا ہوتا

مست ہو کر یوں اُبل پڑتا نہ تھا زاہد تجھے
اتنی ہی پھر کیوں نہ پی جتنا تیرا پیمانہ تھا

نہیں ہم ایسے دیوانے کریں منتِ رفوگر کی
کہ اُلٹا اور پردہ فاش ہو چاک گریباں کا

کچھ زمانہ - کچھ مقدر - کچھ فلک بدنام ہے
ڈر کے مارے نام لے کون اس ستم ایجاد کا

بخش دینے کی ذرا ہمت تو دل میں کیجئے
حوصلہ پھر دیکھئے شرمندۂ تقصیر کا

جگر پر ہاتھ - آنکھوں پر ہے دامن درد پہلو میں
شفق معلوم ہوتا ہے تمہارا دل کہیں آیا

فرشتے ملتے ہیں انسان ہی نہیں ملتا
خدا ملے تو ملے آدمی نہیں ملتا

شفق جو دل میں ہے آنکھوں میں ہے نگاہ میں ہے
اسی کو ڈھونڈتے ہیں وہی نہیں ملتا

بیخودی دیکھ کے موسیٰ کی کھلیں یہ آنکھیں
طور نے کام کیا سرمۂ بینائی کا

مے گلرنگ سخن سے یہ ٹپکتا ہے شفق
مست ہوں جام امیر احمد مینائی کا

میں لحد میں بھی نہ تنہا آیا
لیکے ساتھ اس کی تمنا آیا

جب کہا میں نے دل آیا تو کہا
کہنے والے کا کلیجا آیا

جی اٹھے مرتے ہی مرنے والے
موت کیا آئی مسیحا آیا

چھالوں کو جہاں چھیڑتے ہیں دشت میں کانٹے
سب چھوٹ کے رو دیتے ہیں غربت بھی ہے کیا چیز

چھپ چھپ کے شفق تھوڑی سی پی لیتا ہے واعظ
کمبخت نہیں چھوٹتی عادت بھی ہے کیا چیز

ایک نیا خطاب دیں حسن کی ہر ادا کو ہم
پیار کہیں ستم کو ہم لطف کہیں جفا کو ہم

یہ کہہ کہہ کر فرشتے قبر میں شانہ ہلاتے ہیں
کہ غافل عمر بھر سویا تھا اب تجھکو جگاتے ہیں

اشک غمخواریاں جتاتے ہیں
رونے والوں کا منہ دھلاتے ہیں

شفق ہم میکدے والوں سے پوچھے کوئی حال ان کا
جناب شیخ کا کیا پوچھنا اللہ والے ہیں

اتنی ساقی نے دی کہ دی ہی نہیں
اتنی کم ہم نے پی کہ پی ہی نہیں

مر کے جینے کا کیا مزا جانے
جس نے کمبخت جان دی ہی نہیں

دخت رز پا رہی تھی شیشے میں
اڑ گئی یوں کہ جیسے تھی ہی نہیں

ہو فرشتہ شفق یہ بات ہے اور
جو نہ انسان ہو آدمی ہی نہیں

کوستے جاتے ہیں وہ نام شفق کا لے کر
اور کہتے ہیں کہ گمنام ہے مشہور نہیں

ڈھاؤ آغازِ عشق میں نہ ستم　　ابتدا ہی میں انتہا کیوں ہو
جس دوا میں ہو درد کا نہ اثر　　وہ مرے درد کی دوا کیوں ہو
شفق اس کی عطا کو بھول گئے　　اتنے شرمندۂ خطا کیوں ہو

آنسو ہوئے کیوں جاری کیوں دل ہوا گرویدہ　　کیا دیکھ لیا تو نے اے دیدۂ غمدیدہ

اثر کو ساتھ لئے کامیاب ہو کے پھری　　فلک سے میری دعا مستجاب ہو کے پھری
دعائیں دیتی ہے تاثیر کو فغاں میری　　کہ نا امید گئی کامیاب ہو کے پھری
قبول ہو گئی اس در پہ التجا میری　　سوال بن کے گئی تھی جواب ہو کے پھری

فصلِ گل کچھ دن رہی کچھ دن رہا دورِ خزاں　　آشیاں اپنا ہوا آباد بھی برباد بھی
اس نے سیکھا آپ سے اور اس سے سیکھا آپ نے　　آسماں ہے آپ کا شاگرد بھی استاد بھی
ساری دنیا اک طرف گورِ غریباں اک طرف　　کس قدر آباد ہے ملکِ عدم آباد بھی

الگ چمن رکھے دونوں ایک ہو جائیں نہ گھل مل کے　　کہ دل میں تیر کے ٹکڑے ہیں ٹکڑے تیر میں دل کے
بہار آئی تو نغمے ہیں خزاں آئی تو نالے ہیں　　یہ ہیں دو نام گویا ایک ہی شورِ عنادل کے
شفق یہ انتہائے بیکسی ہے دشتِ غربت میں　　کہ کوئی رونے والا تک نہیں ملتا گلے مل کے

کرامت بھرے جام تجھ سے ساقیا　　کہ محفل میں بے پاؤں چلنے لگے

شفق تم اگلے فسانے لوگوں کے جیسے سنتے ہو دوستوں سے　　یونہی زبانوں پہ سب کی آخر تمہاری بھی داستاں رہے گی

چڑھ جاؤ گے نظروں پہ اتر جاؤ گے دل سے　　ہر شخص کی آنکھوں میں سمانا نہیں اچھا

بکھیڑے حسرتوں کے ہیں نہ جھگڑے آرزوؤں کے　　تعلق سے بری ہیں ہم دلِ بے مدعا ہو کر

دریا میں ٹوٹ ٹوٹ کے کہتا ہے سرِ حباب　　جب تک فنا نہ ہو کبھی حاصل بقا نہ ہو

رباعی

سائنس کو مذہب کا پتا ہی نہ ملا　　سب راز کھلے رازِ خدا ہی نہ ملا
الجھے ہوئے ڈورے کا سرا ہی نہ ملا　　عقدہ تو ملا عقدہ کشا ہی نہ ملا

شفق

شفق:- آغا مہدی حسین طبّاع اور ذہین ہیں۔ غزل کے علاوہ مرثیئے، سلام اور نوحے وغیرہ بھی کہے ہیں۔ ڈسٹرکٹ جیل آگرہ میں ملازم تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

دیکھوں کسطرح وہ اغیار کے گھر جاتے ہیں	میں بھی بیٹھا ہوں سرِ راہ گذر آج کی رات
ہر اک موسم میں ضد سے حضرتِ واعظ کی پیتا ہوں	نہیں تو لطفِ مے نوشی فقط آتا ہے ساون میں
دوئی ہو دور گر دل سے تو سارا راز کھل جائے	یہ جنگ مذہبی بے سُود ہے شیخ و برہمن میں

شفق

شفق:- مولوی عبدالقیوم صاحب امروہوی مخاطب بہ رئیس الکلام خلف مولوی حافظ عبدالرحمٰن صدر مدرّس عربیہ امروہہ۔ اگرچہ مرحوم علوم عربیہ میں مہارت وافر رکھتے تھے۔ مگر اُردو شاعری میں انہوں نے بہت قلیل عرصہ میں جو ترقی کی تھی حیرت انگیز ہے۔ مرحوم کی شاعری کا آغاز ۱۹۱۵ء سے ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کثرتِ مشق سے ایک خوشگوار اور سنجیدہ شاعر بن گئے :-

ہندوستان کے مشہور گلدستوں اور رسالوں میں ان کا کلام چھپ کر مقبول ہوتا رہا۔ مرحوم کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ اساتذہ کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ چند غزلوں میں حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانکپوری سے اصلاح لی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ میرا اُستاد صنم خانۂ عشق (دیوان حضرت امیر احمد مینائی) ہے۔ کلام مضامین کی چاشنی کے ساتھ ساتھ اُردو کے روزمرہ کا اچھا نمونہ ہے۔ تاریخ گوئی میں خاصہ ملکہ تھا۔ اور اکثر برجستہ تاریخیں کہی ہیں۔ افسوس ہے کہ عین عالم شباب میں یعنی بعمر ۲۵ سال، پانچ مہینہ کھانسی بخار میں مبتلا رہ کر ۱۹ر جمادی الاوّل ۱۳۴۴ھ کی شب میں انتقال کیا۔ مولوی حبیب اللہ خاں غضنفر اللہ خاں غضنفر امروہوی ان کے شاگردِ رشید اور صحیح یادگار ہیں۔ کلام یہ ہے :-

عزت ترے قدموں سے ملی کون و مکاں کو	روشن ترے جلوے نے کیا بزمِ جہاں کو
وہ جان گئے نالۂ جانکاہ کی تاثیر	وہ مان گئے دردِ بھرے دل کی فغاں کو
زخمی کئے دیتے ہیں ستمگر ترے طعنے	ہم تیغ سے کچھ بڑھ کے سمجھتے ہیں زباں کو

ہم خانۂ کعبہ کی زیارت کو چلے ہیں
سینے سے لگائے ہوئے تصویر بتاں کو

اغیار کٹے جاتے ہیں انداز بیاں سے
جوہر وہ ملے ہیں مری شمشیر زباں کو

زبانِ حال سے رنگِ شفق کہتا ہو گردوں پہ
اُڑے ہیں خون کی چھینٹے زمینِ کوئے قاتل سے

یہی بیتابیِ دل ہے تو کیسا لطف نظارہ
کلیجہ تھام کر اُٹھنا پڑے گا بزمِ قاتل سے

دلِ بسمل سے اب اس کا نکلنا غیر ممکن ہے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی ہیں تیرِ قاتل سے

کس کشمکش میں جان تیرے ناتواں کی ہے
یارائے ضبطِ غم ہے نہ طاقت فغاں کی ہے

خلقت میں دھوم جلوۂ حسنِ بتاں کی ہے
زینت اسی چراغ سے بزمِ جہاں کی ہے

شائد نہیں خبر مرے دردِ نہاں کی ہے
تاکید بار بار جو ضبطِ فغاں کی ہے

او چارہ سازِ خاطرِ مایوس جلد آ
حالت بہت خراب ترے نیم جاں کی ہے

کیونکر نہ آفتابِ قیامت کی دھوم ہو
تصویر ہو بہو مرے داغِ نہاں کی ہے

جو مر گئے فراق میں گویا وہ جی گئے
لذت اجل میں زندگیِ جاوداں کی ہے

عالم سرِ نیاز جھکاتا ہے اس جگہ
کعبہ ہے یا زمین ترے آستاں کی ہے

دل سے نکل کے جانبِ عرشِ بریں چلی
ہمت بہت بلند ہماری فغاں کی ہے

شفق:- منشی کرتار ناتھ صاحب ولد لالہ نند لال صاحب ۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے کئی زبانیں جانتے ہیں۔ ایف۔ اے پاس ہیں۔ فی الحال ڈ'اینا اینڈ کمپنی میں اکونٹنٹ ہیں جناب سیماب اکبرآبادی اور جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ بمقابلہ غزل کے طرزِ جدید کی نظموں کیطرف توجّہ زیادہ ہے۔ کلام میں جدّت زیادہ ہے۔ اگر مشق سخن اور اصلاح جاری رہی تو آیندہ مزید ترقی کی امید ہے۔ جو مختصر کلام موصول ہوا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

نتیجہ یہ ملا اے بے وفا تیری محبت کا
نشاں ملتا نہیں ڈھونڈے سے بھی دل میں مسرت کا

وہ دل ہی کیا جو بلبل کیطرح ہر گل پہ شیدا ہو
شفق تو واقعی انساں نہیں ایسی طبیعت کا

قتل کر دیتے مجھے تیغِ ادا سے غم نہ تھا
کیوں گرفتارِ غمِ اقرارِ فردا کر دیا

پھر بہار آئی ہوا مرغِ قفس پھر نالہ زن
پھر دلِ شوریدہ نے طوفان برپا کر دیا

کس بھروسے پہ زندگی کاٹیں
دو گھڑی ہم بھی چین سے رہتے

تیرا وعدہ کوئی وفا نہ ہوا
یہ بھی اے چرخ بے وفا نہ ہوا

فدا ہوں تیری آنکھوں پر مجھے بھی جام اے ساقی
بہت مدت سے ہیں بھی ہوں تیری امیدواروں میں

تکلف برطرف ساقی ایاغِ بیخودی بھر دے
تمنا ہے مقدر کو نئے سر سے جواں کر لوں

حسینوں کی طبیعت بدگماں معلوم ہوتی ہے
ہماری خامشی ان کو فغاں معلوم ہوتی ہے

شگوفے کیا کھلائے ہیں تیرے نیرنگِ فرقت نے
ہمارا دل حریفِ گلستاں معلوم ہوتی ہے

اٹھائے اسقدر صدمے نہیں احساسِ عشرت بھی
خوشی کی آرزو دل پر گراں معلوم ہوتی ہے

شفق انکی حسیں آنکھیں بھی لبریزِ ناز ہیں
بہت پر درد تیری داستاں معلوم ہوتی ہے

الٰہی ترکِ الفت کا گماں اسکو نہ ہو جائے
نہیں لب آشنا پھر ایک مدت سے فغاں میری

حشر ہی برپا کریگی شوخ جب ہو جائیگی
کر رہی ہے خونِ ناحق آنکھ شرمائی ہوئی

تم جو آ بیٹھو سرِ بالیں تو مرنا سہل ہو
روح پھنستی ہے تنِ بسمل میں گھبرائی ہوئی

گوکل کی چاندنی

سرسبز گلشنوں میں　　موروں کی یہ قطاریں
رنگین مسکنوں میں　　پی پی کی یہ پکاریں

یہ پریت کی بہاریں

اس جانفزا سماں میں　　عشرت کی یہ بہاریں
رنگین گلستاں میں　　یہ نور کی پھواریں

یہ پریم کی [illegible] دھاریں

ساقیٔ وحدت سے خطاب

گھیرے ہوئے نظروں کو ہے جلوہ جانانہ
ہر شاخ پری ہے اور ہر پھول ہی پیمانہ
پھر طور بنا ہر دل پھر شوق ہے دیوانہ
اندر کا اکھاڑہ ہے عشرت کا یہ گُل خانہ

پھر فصلِ بہار آئی
لا پھول پلا ساقی

اے جانِ شفق آکر مسرور ذرا کر دے
اُلفت کے ترانوں سے مسحور ذرا کر دے
پُر کیف نگاہوں سے مخمور ذرا کر دے
ظُلمت کدہ ہستی کو پُر نور ذرا کر دے

خون شُد دلِ سودائی
وقتست کہ باز آئی

شفق :- منشی لالتا پرشاد خلف منشی بیچے لال شاگرد منشی کنور جی مدہوش و شمس فرحت لکھنوی متوطن قدیم لکھنؤ مؤلف فرہنگِ شفق۔ فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ پیشہ کاپی نویسی قوم کایست خوش فکر اور زبر طبع شاعر تھے۔ کچھ زمانہ ہوا کہ تخمیناً ۵۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ چند اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین ہیں :-

چار عنصر یوں سنبھالے ہیں دلِ مُردہ مرا
اِس لئے خاک پہ بیٹھا ہوں میں
کبر کیوں کرتے ہیں یہ دُنیا میں
یہ کس[1] مست کے آنے کی آرزو ہے
سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری
گلستاں میں جاکر ہر ایک گُل کو دیکھا

جس طرح بوجھ ایک کا بعد فنا ہو چار پہ
کہ اُٹھا کر وہ نظر دیکھیں تو
پہلے اصل اپنی بشر دیکھیں تو
کہ ساقی لئے ساغر مشک بُو ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے

[1] مندرجہ غزل کو بعض لوگ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

گریباں کیا چاک وحشت میں ایسا	نہ سینے کے قابل نہ جانے رفو ہے
بندہ ناچیز دبے حقیقت ہے۔	فیض مدہوش۔ شمس و فرحت ہے

شفقت

شفقت:- سید نجف علی۔ شاعر خوش فکر اور عالی خیال ہیں۔ بندش اور مصرع کی ترکیب اچھی ہوتی ہے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہوا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

ازل کے روز سے تیرے ہی نظارہ کا عاشق ہوں	دل حیراں کو آئینہ بنا دے اپنی صورت کا
بہار افزا ہے کیا ہی خال مشکیں چشم گلرو پر	تماشا ہے رکھا ہے سنگ اسود پشت آہو پر
نہ آئے گی مری تدبیر مجکو راس کبھی	مثل ہے اوس سے بجھتی نہیں ہے پیاس کبھی

شفقت

شفقت:- میر محمد حسین متوطن قصبہ گلاوٹھی تلمیذ صہبائی۔ انہوں نے شاہجہان آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کلام میں مضمون آفرینی زیادہ ہے۔ بہت خوب کہتے تھے۔ یہ ان کا کلام ہے جو نذر ناظرین ہے:-

اگر ملے تو میں جان تک بھی دیکرلے لوں صبر	کہ رنج و درد میں سامان ہو توکل کا
چل اب کہ آئے گی کس کام پھر مسیحائی	لبوں پہ دم ہے ترے کشتۂ تغافل کا
شوخی سے جسکو ایک جگہ پر نہو قرار	نقشہ جو کوئی کھینچے تو کیا اس نگار کا
داغ فراق جاتے ہیں سینہ پہ ہم لئے	اب کام کیا رہا ہمیں شمع مزار سے

شفیق:- رائے لچھمی نرائن کھتری تھے۔ ۱۱۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی منسا رام تھا۔ جو نواب نظام الملک آصفجاہ مرحوم کے عہد میں پیشکار صدارت صوبہ دکن تھے۔ رائے منسا رام بھی صاحب تالیف و تصنیفات تھے۔ الغرض شفیق نے ایسے گھرانے میں تربیت پائی۔ جہاں علمی چرچا بکثرت تھا۔ شفیق نے رواج زمانہ کے مطابق فارسی۔ عربی۔ صرف نحو۔ انشا وغیرہ کی تعلیم پائی۔ ابتدائے سن شعور سے شفیق کو شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی اس وقت دکن ہی میں تھے۔ شفیق نے انہیں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اپنے اُستاد

سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ انکی شان میں ایک قصیدہ بہت ہی پُر زور نظم کیا۔ اور بھی اکثر مقامات پر اُستاد کی مدح خوانی کی ہے۔ فارسی اور اُردو کے نامور شاعر تھے۔ بہت کچھ کہا۔ مگر کلام اب کمیاب ہے۔ غضب ہے اپنے تذکرہ چمنستانِ شعرا میں اپنا ایک شعر نہیں دیا۔ شفیق کی چند تصنیفات مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) حقیقت ہائے ہندوستان۔ ہندوستان کی ایک تاریخ ہے۔

(۲) تنمیق شگرف۔ دکن کی تاریخ ہے۔

(۳) مآثرِ آصفی۔ خاندانِ آصف جاہ کی تاریخ۔

(۴) بساط الغنائم۔ مرہٹوں کی تاریخ ہے۔

(۵) حالاتِ حیدر آباد۔ یہ شہر حیدر آباد کی مختصر تاریخ ہے۔

(۶) تذکرہ شام غریباں۔ اُن ایرانی شعرا کا تذکرہ ہے جو ہندوستان میں وارد ہوئے۔

(۷) گُلِ رعنا۔ فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۸) چمنستانِ شعراء۔ ریختہ گو (اردو) شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۹) کلامِ شفیق۔ کلیات کلام اُردو۔

شفیق ایک پُرگو شاعر اور کثیر التصانیف نثّار تھے۔ قریب قریب ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے جس سے قادر الکلامی اور مہارتِ فن کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے صاحب تخلّص کرتے تھے۔ بعد میں شفیق ہوئے۔ بڑی تلاش سے یہ چند اشعار ان کے ہاتھ آئے۔ جو نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ غالبًا یہ ان کا ابتدائی زمانے کا کلام ہے۔ کیونکہ اس میں صاحب تخلّص آیا ہے۔

تیرے بس میں ہیں ہمیں تو چھوڑ دے یا قید رکھ	آپ سے اب دام میں تدبیر کرنا کیا ضرور
بس ٹھٹھولی سے نہ دو یہ بات میاں مت بولو	ہم تمہیں دیکھ لیا اور تمہارا اخلاص
بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ	نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

جیوں جلا آگ کا آتش سینی ہوتا ہے بھلا
شیخ جی آتے ہیں کس دھج سے پکڑ تسبی کو ہاتھ

کیا کریں عرض حال تیرے پاس
کوئی بچارا تجھے کہاں ڈھونڈے

لائے جواب وہ کوئی صاحب کی شعر کا
ہمیں کنج قفس میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے

عشق کے درد کو تحقیق دوا ہیگا عشق
مارے لگے گردن میں ایسا جائے جو منکا ڈھلک

ہم کو دل میں تجھے دماغ نہیں
ایک جا کا تری سراغ نہیں

جس کو کہ ذہن ثاقب و فکر دقیق ہو
خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

شفیق

شفیق:- جونپور کے رہنے والے۔ نام محمد ولی الدین۔ حافظ قرآن فارسی میں بوستان تک واقفیت ہے۔ عربی فی الحال شروع کی ہے۔ مصنف بلبل چمن ہر سہ حصہ وکلام شفیق وغیرہ۔ شفیق حضرت حفیظ جونپوری کے شاگرد اور جناب حافظ حاجی مولوی محمد یعقوب صاحب انیق جونپوری تلمیذ حضرت داغ دہلوی کے خلف اکبر ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:-

شوق میں پہلے بنا بیٹھے نشانہ تیر کا
بے اثر گلشن میں ہے سودائے عالمگیر کا

ظلم کرنیوالا اس پر سے ہیں کوئی اور ہے
مرگئے زنداں میں کیا سر پھوڑ کر تیرے اسیر

اے شفیق آتا ہے بس انکی نزاکت کا خیال
دور شباب چشم زدن میں گذر گیا

تعریف حسن سن کے ہوا تھا فریفتہ
کیا جانئے ہے کیا عدم آباد میں مزا

جینا وہ کیا کہ موت سے بدتر ہو زندگی
کہتے ہیں وہ شفیق کی کچھ خیریت کہو

سرنگوں ہیں دیکھ کر اب زخم دل نخچیر کا
غنچہ غنچہ ہوگیا دانہ مری زنجیر کا

مفت میں ہے نام بدنام آسمان پیر کا
آجکل راتوں کو غل ہوتا نہیں زنجیر کا

ورنہ میں تو کام لوں نالوں سی اپنے تیر کا
جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

انداز اس کے دیکھ کے میں ادھر گیا
پھر کر کبھی نہ آیا وہاں جو بشر گیا

اچھا ہوا کہ آپ کا بیمار مر گیا
وہ خانماں خراب کہاں ہے کدھر گیا

جب کبھی پردے سے باہر روئے جاناں ہو گیا
شرم سے بدلی میں پنہاں مہرِ تاباں ہو گیا

جو کوئی آیا عیادت کو ترے بیمار کی
دیکھ کر اس کی پریشانی پریشاں ہو گیا

پھوٹ کر روئے لہو اسطرح میرے آبلے
ایک اک ٹکڑا بیاباں کا گلستاں ہو گیا

جسطرف دیکھو امید و شوق و ارماں دفن ہیں
خانۂ دل کیا ہوا گنجِ شہیداں ہو گیا

روئے جاناں دیکھ کر گیسوئے جاناں دیکھ کر
کوئی حیراں ہو گیا کوئی پریشاں ہو گیا

زمانہ دے رہا ہے جان اس خلوت نشینی پر
ہر اک آپے سے باہر ہو جو تم پردے سے باہر ہو

محبت کا مزا جب ہے کشش ہو دونوں جانب سے
مرے دل میں ترا گھر ہو ترے دل میں مرا گھر ہو

یہی اب چاہتا ہوں میں یہی میری تمنا ہے
ترا در ہو مرا سر ہو مرا سر ہو ترا در ہو

واعظ ہر ایک شے میں اسی کا ظہور ہے
ایمن کی قید اور نہ تخصیصِ طور ہے

قندیلِ عرش میں بھی مدینے کا نور ہے
ذرّوں میں اس زمیں کے تجلّیِ طور ہے

کیا پوچھتا ہے بادۂ توحید کا مزا
واعظ اسی شراب کی تلچھٹ طہور ہے

اپنے کو جب مٹاؤ تو اس کا نشاں ملے
جتنا ہی وہ قریب اتنا ہی دور ہے

شفیق

شفیق: سید احمد حسین عرف ننھو صاحب لکھنوی ۱۲۸۵ھ میں دری والی گلی محلہ مفتی گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت امام موسیٰ رضا کی اولاد میں ہیں آپ کے والد جناب حاجی سید علی حسین صاحب مرحوم اور دادا سید صادق علی صاحب زبردست عامل سمجھے جاتے تھے مگر پڑھے لکھے نہ تھے۔ باوجود اُمّی محض ہونے کے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ میانہ قد سیاہ رنگ بدن مائل بہ فربہی۔ تقریر میں شوخی اور ظرافت کا انداز ہے۔ اہلِ لکھنؤ کو ان کی فطری اور وہبی شاعری پر ناز ہے۔ مرزا محمد جعفر اوج خلف حضرت دبیر لکھنوی ان کی سخن سرائی پر یہ رائے دیتے ہیں۔ "زبان کی خوبی اور بیان کی خوش اسلوبی دونوں دلکش پیرائے میں ہیں"۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی تحریر فرماتے ہیں۔ کہ نظم کا ذوق

فطری ہوتا ہے۔ شفیق کے کلام میں آمد زیادہ ہے۔ اور آورد کم۔ معاملہ بندی اور جذبات سے کلام خالی نہیں ہوتا۔ مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مرحوم تعجب اور حیرت سے لکھتے ہیں۔ کہ ایک جاہل مطلق ان پڑھ اور ایسا شاعر" اردو زبان کی اصطلاحات کے موز سے واقف ہیں۔ دقیق سے دقیق خیالات کو سلجھے ہوئے الفاظ میں ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ تخیل اور جذبات میں جدت کا ظہور ہے۔ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے علم مجلسی سے خوب واقف ہیں۔ شاعری کیساتھ ہی علم موسیقی میں بھی کافی مہارت رکھتے ہیں۔ اور ایسی خوش الحانی سے غزل پڑھتے ہیں کہ سامعین کی زبان سے بے ساختہ آفرین نکل جاتی ہے۔ آپ کا پہلا شعر یہ بتلایا جاتا ہے۔

پکڑ کر لیچلا صیاد یُوں بلبل کو گلشن سے	دبائے بال و پر مُٹھی میں اور منقار چٹکی میں

اُس زمانہ میں آپ کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ چونکہ بچپن لکھنؤ میں گذرا تھا۔ آپ نے آغا حجو شرف لکھنوی۔ گلشن الدولہ بہادر۔ حضرت مُنیر میر منشی شاہ اودھ کو دیکھا اور ان کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔ شاہ اودھ کے انتقال کے بعد لکھنؤ آئے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ ابو صاحب جلیس نبیرہ میر انیس نے آپ کو نکات شاعری سمجھائے اور بڑی شفقت و دلسوزی سے اصلاح دیتے تھے۔ کچھ زمانے تک جناب پیارے صاحب رشید سے اصلاح لیتے رہے۔ مگر زیادہ تر کلام بغیر اُستاد کے ہے۔ خود لکھ نہیں سکتے۔ بلکہ دوسروں سے اپنے اشعار لکھا لیتے ہیں۔ ۱۳۲۵ھ میں دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

موسیٰ چلے ہیں طور کی جانب اُٹھا کے سر	کچھ بھی نہیں خیال نشیب و فراز کا
عشاق جسکو کہتے ہیں طول شب فراق	وہ بھی نمونہ ہے تری زلف دراز کا
محفل میں جل کے شمع بڑا کام کر گئی	عالم یہاں تمام ہے کیا سوز و گداز کا
جس طرح چاہئے زینت کو ترقی دیجئے	آئینہ اپنا ہے بات اپنی ہے گیسو اپنا

یہ شفیق جگر افگار ہوا ہجر میں کیا
اب تو رونے سے بھی رکتا نہیں آنسو اپنا

نرگس نے مری چشم گہربار کو دیکھا
کس یاس سے بیمار نے بیمار کو دیکھا

نکالا چارہ گردوں نے عجب قیامت کی
کہ ان کے تیر سے رہتا تھا مشغلہ دل کا

ہم وہ عاشق ہیں کہ قبضہ میں ہے ہستی و عدم
روز جینا ہمیں اور روز فنا ہو جانا

میں نے چاہا کہ بحر غم سے میں ہو جاؤں پار
دور مجھ سے منزلوں دامانِ ساحل ہو گیا

عشق عارض مٹ گیا ہوتے ہی عشق زلف یار
شام سے ٹھنڈا چراغ شمع محفل ہو گیا

اے شفیق زار بعد مرگ بس اتنا تو ہو
سب کہیں احباب ایک ایسا بھی جاہل ہو گیا

میں کہاں نظم کہاں جاہل مطلق ہوں میں
اسکی قدرت ہے مرا صاحبِ دیوان ہونا

قیس نے دشت نوردی میں بسر کی اپنی
میری تقدیر میں تھا داخلِ زندان ہونا

وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر دل پہ ہے قابو اپنا
لڑتے ہی آنکھ اثر کرتا ہے جادو اپنا

کہہ لاکھ مگر کوچے سے بستر نہ اٹھے گا
یہ تیرا ستم ہم سے ستمگر نہ اٹھے گا

اے چارہ گرو آبلۂ دل کو نہ چھیڑو
مر جاؤں گا میں صدمۂ نشتر نہ اٹھے گا

یہ سوچ کے ہم کوچہ میں بیٹھے ہیں تمہارے
آجائے قیامت بھی تو بستر نہ اٹھے گا

تم چھپ کے کہیں جاؤ مگر چھپ نہیں سکتے
رفتار سے کیا فتنۂ محشر نہ اٹھے گا

بیمار غم کے مرنے سے کیسا اداس ہے
اب سب مزاج پوچھتے ہیں چارہ ساز کا

بعد مرنے کے مجھے آپ سے خفت یہ ہے
جان تو موت نے لی آپ پہ الزام آیا

ساقی مرے ہر روز کے آنے سے ہے یہ تنگ
اب مجکو اس انداز سے ساغر نہیں ملتا

سمجھ میں کچھ نہیں آتا معاملہ دل کا
حضور آئیں تو ہو جائے فیصلہ دل کا

او نئے یہ شان ہے ترے حسن و جمال کی
ناخن کٹے تو بن گئی صورت ہلال کی

مردہ دلی نے کر دیا رسوا جہان میں
چھپتی نہیں چھپائے سے صورت ملال کی

مرا برباد ہونا عشق میں یوں کام آتا ہے
کسی کے نام کے ہمراہ میرا نام آتا ہے

بنکے سائل اُنکے کوچے میں صدا دینے لگے
جس نے کچھ احساں کیا اُسکو دُعا دینے لگے

مار ڈالا ہے زمیں کی گردشوں نے اے شفیق
ایک دن راحت نہ پائی چرخ کج رفتار سے

اسوقت میں شفیق سے ہے حکم کچھ پڑھو
جب موت اسکی حضرت محشر[۱] قریب ہے

شفیق:- چودھری شفیق الزمان صاحب تعلقہ دار گڑھی بھیلول پور ضلع بارہ بنکی زیادہ تر قیام لکھنؤ میں رہتا ہے۔ رئیسانہ طبیعت پائی ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ باوجود کوشش کے زیادہ کلام نہ مل سکا۔ نمونہ یہ ہے:-

شہید ناز کا ماتم کریں کیا
وہ آئے ہاتھ میں مہندی لگا کے

مجھے ہے رشک اپنے وقت رخصت
حوالے کیا کروں تجھکو خدا کے

چراغ قبر عاشق ہو گیا گل
قیامت کر گئے جھونکے ہوا کے

گرے کیا آنکھ سے اشک ندامت
کہ دریا بہہ گئے لطف خدا کے

شکیب:- منشی عبدالرب صاحب امروہوی۔ علمی استعداد کامل ہے۔ فارسی کے اچھے عالم ہیں۔ اکثر طلبا امتحانات فارسی میں شامل ہونے کے لئے آپ سے رجوع کرتے ہیں۔ سید ابوالحسن ساکت امروہوی کے شاگردوں میں ممتاز ہیں کلام میں بھی اُستاد کے رنگ کا تتبع کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹ء سے قبل کے امروہہ کے مشاعروں میں شریک رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد راجپوتانہ کی کسی ریاست میں ملازم ہو گئے اب عرصہ سے امروہہ میں ہیں۔ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ ایک غزل جناب منظور احمد صاحب صدیقی امروہوی نے معہ حالات روانہ فرمائی تھی۔ اُس کا انتخاب نذر ناظرین ہے:-

ہیں نے کب شکوہ کیا گھر غیر کے جانے لگے
کیوں اُلٹ چٹکی ہوئی کیوں آپ شرمانے لگے

آئے تھے جس بزم سے کل ہو کے رسوا و ذلیل
آج اسی محفل میں پھر خود بخود جانے لگے

[۱] سید کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی۔

ہے غنیمت کون کہتا تھا یہ دن ہونگے نصیب	ہم وہاں جانے لگے اور وہ یہاں آنے لگے
خوب کی مہماں نوازی گھر بلا کر آپ نے	مجکو باتیں ہر کس و ناکس کی سنوانے لگے
کہنے تو دیجے مجھے کچھ سن تو لیجے میرا حال	کیا ضرورت ہے کہ سنکر رحم ہی آنے لگے

شکیب

شکیب :۔ نواب مرزا شکیب دہلی کے رہنے والے حیدر آباد دکن میں وکالت کرتے تھے۔ وہیں انتقال ہوا۔ یہ شعر ان کے ہیں :۔

مزا تو چکھ لے مے لالہ رنگ کا زاہد	ذرا سی پینے میں ظالم عذاب کیا ہوگا
جان لینی ہے تو لے چک ہیں بلا سے چھوٹوں	راستہ دیکھ رہی ہے شب ہجراں کس کا
اے ترک یوں شکیب کو بسمل نہ چھوڑ جا	کر خاتمہ بخیر تو اور اک لگا کے ہاتھ
یہ دل زلف میں پھر پھنسا چاہتا ہے	بلا اپنے سر پر لیا چاہتا ہے
متاعِ دل و جاں جو لینی ہے لے لو	کوئی دم میں یہ سب لٹا چاہتا ہے

شکیبا

شکیبا :۔ میر غلام حسین شاگرد میر تقی میر۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں شاعر خوش اسلوب تھے شعرائے پایہ تخت میں ان کا شمار تھا۔ اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے انکی زبان بہت پاکیزہ معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ انصاف تو یہ ہے کہ دورِ موجودہ کے شعراء کے ہاں بھی ایسے صاف ستھرے شعر کم نکلتے ہیں۔ ذیل کے مطلع میں سات مرتبہ کیا کو لائے ہیں مگر کہیں بھی شعر میں حشو نہیں پایا جاتا۔ اسکو زباندانی اور قادر الکلامی کہہ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ زیادہ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ چند اشعار زیب تذکرہ کئے جاتے ہیں :۔

ہمیں قتل تم نے کیا کیا نہیں کہتے ہم کہ برا کیا	یہ بھلا کیا یہ کہو کہ کیا جو کوئی کہے کہ یہ کیا کیا
نیم بسمل اس نے گر چھوڑا شکیبا غم نہیں	پر یہ غم ہے اعتبار دستِ قاتل اٹھ گیا
اس چشم سرمہ سا کی نظر کیوں نہ تیز ہو	اتری ابھی ہے سان پہ تلوار تیز ہے
نہ پوچھو ماجرا ہجراں کی شب کا سخت آفت ہے	نہ تاباں بھی میرے سر پہ خورشید قیامت ہے
دن نہ گھر میں چین مجکو شب نہ مجکو خواب ہے	تابش مہر قیامت جلوہ مہتاب ہے

تشکیل

تشکیل:- منشی سید محمد صاحب تشکیل لکھنوی اپنے بھائی جناب قمر کے شاگرد ہیں جو بہر قابل موزوں طبع ہیں بہت سمجھکر شعر کہتے ہیں۔ زبان میں شیرینی اور انداز بیان میں دلکشی ہے۔ کلام یہ ہے :-

سب حسیں ہیں جمع واعظ روزِ حشر ۔۔۔ تو ڈراتا تھا اسی دن کے لئے

اور زاہد توبہ کر یہ ابر دیکھ ۔۔۔ تجھ کو سمجھاتے تھے اس دن کیلئے

رندوں سے قسم لیجیے اے حضرت زاہد ۔۔۔ بے آپ کے پینے کی جو نیت ہو کسی کی

فکریں تھے جو مرے دلکے بہلنے کیلئے ۔۔۔ اب دُعا کرتے ہیں وہ جان نکلنے کیلئے

میری آنکھوں میں وہ ہر وقت پھرا کرتے ہیں ۔۔۔ اُسکو ڈھونڈتے ہیں دل سے نکلنے کیلئے

جگر میں داغ لب پر آہ یہ سوز ۔۔۔ یہ تحفہ لائے ہم بزم بتاں سے

تشکر

تشکر:- دانیال سقراط تھیبیل گارڈنر نام۔ ان کے والد مرحوم مسٹر سلیمان شکوہ گارڈنر عرف منا جان قنا کرنل گارڈنر مغفور رئیس کا سگنج کے پوتے تھے کرنل صاحب کی وفات کے بعد پہلا سا تمول و عروج ان کے خاندان کا نہ رہا۔ مگر پھر بھی خوشحالی سے بسر ہوئی۔ یہ انگریزی۔ فارسی۔ اُردو تینوں زبانوں میں مہارت رکھتے اور فنِ سخن میں منشی عباس حسین ہوش لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ ان کا خاندان بسبب اِس تعلق کے جو اُسے اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے خاندان شاہی دہلی وا و دھ سے رہا ہے تاریخ ہند میں قابل ذکر ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

دعائیں ہوئیں کارگر رفتہ رفتہ ۔۔۔ ہوا مدتوں میں اثر رفتہ رفتہ

تڑپتے تڑپتے شب غم کٹی ہے ۔۔۔ ہوئی ہے خوشی کی سحر رفتہ رفتہ

زمیں سے اسکے نہ آسماں سے ۔۔۔ تعالیٰ اللہ کہاں اپنا مکاں ہے

ہوا گردش سے ثابت بعد تحقیق ۔۔۔ زمیں تھمتی نہیں بلکہ آسماں ہے

لحد میں کیوں تھکے لے جانیوالو ۔۔۔ عدم کی راہ میں منزل کہاں ہے

شکوہ

شکوہ:- محمد مرزا جعفر زا قتیل مرحوم کے شاگرد والہ میں تھے۔ اگرچہ شعر کا شوق

کم تھا۔ مگر جو کچھ کہتے تھے اچھا ہوتا تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی سلیم المذاقی آشکار ہے ان میں سے دو شعر اب تک زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں:۔

تجھ کو دلدار میں سمجھتا ہوں
کیا غلط یار میں سمجھتا ہوں

نہ اس کا وصل ہے ممکن نہ تاب ہے دل کو
عجب طرح کا الٰہی عذاب ہے دل کو

مت مل تجھے کہتا تھا میں دل اس سے زیادہ
پائی نہ سزا اور بھی مل اس سے زیادہ

ملے ہے شب و روز وہ شوخ سب سے
مگر ایک ہے عار مجھ جاں بلب سے

شگفتہ

شگفتہ:۔ صاحب عالم میرزا شگفتہ بخت عرف مرزا حاجی خلف الرشید شاہزادہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولی عہد شاہ عالم ثانی صاحب عالم موصوف ناظم خوش تقریر تھے۔ اور بنارس میں سکونت پذیر۔ یہ دو شعر انکے دستیاب ہوئے جو درج ذیل ہیں:۔

ساقی ہے مے ہے۔ باغ ہے۔ ابر بہار ہے
تیرا ہی رشک رنگ فقط اک انتظار ہے

مشکل ہے میری اسکی ہو صحبت برار آہ
ہیں جلد باز ہوں وہ تغافل شعار ہے

شگفتہ

شگفتہ:۔ پنڈت برج بھوکن لال ولد پنڈت درگا پرشاد برہمن ساکن مصرکھ ضلع سیتا پور۔ پیشہ زمینداری۔ سنہ ۱۹۰۱ئہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت جگر صدیقی بسوانی سے تلمذ ہے۔ طبیعت میں عاشقانہ رنگ ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

جو بھڑکائیگی اے صیاد یادِ گلستاں مجھ کو
بہت مشکل ہے وکیلئے قفس کی تیلیاں مجھکو

اٹھا گلشن سی میرا آب و دانہ میں سمجھتا ہوں
نظر کچھ اور آتی ہے نگاہِ باغباں مجھ کو

دم آخر مری بالیں پہ آنے کو تو کہتے ہو
مگر اتنا بتاتے جاؤ ڈھونڈیں کہاں تک کے

ملا دیں سونا کر مٹی میں ٹکڑے مرے دل کے
فا دیسی مجھے ہو جائے حاصل خاک میں مل کے

اٹھے جاتے ہیں کوچہ سے اگر تم حکم دیتے ہو
اجازت ہو تو ٹکڑے ڈھونڈ لیں ٹوٹے ہوئے دل کے

شگفتہ

شگفتہ:۔ میرزا جہاں اختر عرف میرزا شگفتہ سلطان۔ خلف اصغر فہرمان اقلیم سخن رانی میرزا قادر بخش صابر گورگانی۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

بگڑ جائے تری غیروں سے جس دم / ہماری بات اس دم یاد کرنا
اس دل کے لگانے کا اثر دیکھئے کیا ہو / کچھ طور نئے آئے نظر دیکھئے کیا ہو
نزع میں آئے وہ عیادت کو / دو گھڑی اور بھی جیتے ہی بنی

شگفتہ: منشی خیراتی لال کایستھ خلف بڑے طوطا رام تیز فہم، نکتہ جو، جدت پسند تھے مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے تلمیذ و ارادت مند تھے صاحبِ دیوان گذرے ہیں کلام بہت پُر اثر ہے محاورہ بندی نہایت مناسب اور زبان شستہ ہے مضمون آفرینی بھی پسندیدہ ہے کہیں عشق و محبت کا اظہار کہیں شوق و انتظار کی تصویر کہیں اشکِ حسرت کی تراوش ہے اور کہیں خونِ آرزو۔ غرض جس موضوع پر قلم اٹھایا اُس کا نقشہ کھینچ دیا وطن لکھنؤ تھا مگر فیضِ استاد سے کہیں کہیں کلام میں دہلی کا رنگ و بو پایا جاتا ہے ۱۸۹۸ء میں وفات پائی کتابت کے ذریعہ سے بسر اوقات کرتے تھے لکھنؤ چھوڑ کر کانپور کو اپنا وطن بنا رکھا تھا۔ آپ کا دیوان منشی چاند بلی متخلص بہ تکلم نے آپ کی وفات کے بعد شائع کیا مگر افسوس ہے کہ ایک خوش رقم اور مشہور خطاط و خوش نویس کا کلام عمدہ حالت میں اشاعت پذیر نہ ہوا۔ دیوان میں اعلیٰ درجہ کا کاغذ لگایا گیا ہے۔ مگر خط نہایت خراب چھپائی بالکل معمولی پھر طرہ یہ کہ ناگردوں نے کلام کی صحت کا بھی لحاظ نہ کیا۔ خیر یہی کیا کم ہے کہ مرحوم کا کلام تاریکی اور گمنامی سے نکل کر روشنی میں آگیا۔ انتخاب کلام یہ ہے:-

حسرتیں روتی ہیں مل مل کر گلے ہنگامِ قتل / زخم ہنستے ہیں نہ منہ چوم کر شمشیر کا
نظر آتے ہی سب جاتے رہے ہوش و حواس اپنے / لبِ بام آ کے کس نے [illegible] زلف [illegible] کا
ہم نے تمہاری بات پہ دکھلا کے آئینہ / معشوق خوبرو تمہیں ہم سا دکھا دیا
جوشِ الفت نے دکھایا یہ اثر ہنگامِ قتل / خنجرِ قاتل لپٹ کر طوقِ گردن ہو گیا
ایک [illegible] بھی پایا نہ آغوشِ رقیب نے کیا کھولا / اشک جو آنکھوں سے ٹپکا وہ فقط دامن پہ گیا
[illegible] / اُس [illegible] دستِ نگار کا سب اعتبار گیا

بسے تصور جو ترے چہرہ نورانی کا
صورت آئینہ پابند ہوں حیرانی کا

اب کہاں دام مصیبت سے رہائی کی امید
تم کو مشکل ہوا عقدہ مری آسانی کا

گردش پائے تصور نے دکھائے یہ مزے
میرے اس کے منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

روز گھٹ جاتا ہے کچھ ہمت ممسک کی طرح
تنگ کرتا ہے مجھے گوشۂ زنداں کیا کیا

روزہ داران محبت سے حیا کرتی ہے
شام گیسو صفت صبح غریباں کیا کیا

دہشت مشاطہ سے اے یار دم آرائش
بنکے بگڑی ہے تری زلف پریشاں کیا کیا

اسقدر جوش تپ ہجر سے لاغر تن تھا
ذرۂ ریگ پس مرگ مرا مدفن تھا

کیا ندامت تھی دم قتل مجھے قاتل سے
دیدہ تر صفت اشک نہ دامن تھا

یہی جو آتش فرقت کی سرفرازی ہے
تو دود آہ گلوگیر آسماں ہوگا۔

گستاخ ہوئے ہاتھ جنوں جوش پہ آیا
پابوسی دامن کو گریباں اتر آیا

دریائے اشک آنکھ میں آکر سمٹ گیا
کیا ربط یار تھا کہ بڑھا اور گھٹ گیا

اُٹھا نہ گیا کبھی فرش خاک سے ہرگز
مری طرح مرا آنسو بھی ناتواں ٹھہرا

فرط کاہش کا جو مجھ تک دسترس ہو جائیگا
جسم میرا صورت تار نفس ہو جائیگا

حجاب یار کی کیفیتیں ہم کو دکھاتا ہے
رگوں میں منہ چھپا لینا حیا سے نوک نشتر کا

ترے رخ کے سامنے شرما کے او شعلہ مزاج
رکھ لیا ہے منہ پہ دامن شمع نے گلگیر کا

پاؤں باہر خانہ زنداں سے رکھ سکتے نہیں
دیدۂ زنجیر رہتا ہے نگہبان آجکل

فصل گل ہے ہر طرف شیشے ہیں لبریز شراب
زاہد وہ ہے رخصت توبہ کا ساماں آجکل

ڈرتے ڈرتے جب تمہارے سامنے آتے ہیں ہم
ہوش کہتے ہیں خدا حافظ ہے لو جاتے ہیں ہم

جو آئے جی میں وہ ہم پر کرو ظلم
ہم اپنا دل تمہارا کر چکے ہیں

زمین کوئے جاناں سے بڑھا کر صحبتیں اپنی
شگفتہ دیدہ و دانستہ ہم برباد ہوتے ہیں

رائگاں کی مفت ہم نے عمر اپنی کیا کہیں۔
نالہ بے سود میں فریاد بے تاثیر میں

آتشِ غم سے اگر دودِ جگر پیدا کریں
آسماں ایک اور ہم بالائے سر پیدا کریں

بیجا مصیبتوں کی شکایت بجا نہیں
کیا دخل ہے مشیتِ پروردگار میں

رنجِ تنہائی نہ ہوگا شامِ غربت میں مجھے
ساتھ میرے جائیگی مجھ بے وطن کی آرزو

یہ کس گل پیرہن کا اشتیاق آمد آمد ہے
کہ رنگ افزائے گلشن ہوگیا ہے اپنا کاشانہ

بگاڑا دورِ گردوں نے مرے سامانِ راحت کو
صراحی ہے نہ ساغر ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ

نہ شرماؤ آنکھیں اٹھا کر تو دیکھو
ملاقات ہے ہم سے تم سے کبھی کی

نیمجاں ہوں زندگی دودِ چراغِ کشتہ ہے
میری ہستی صورتِ بودِ چراغِ کشتہ ہے

نور ہو چشمِ حقیقت میں تو دیکھے شوق سے
جلوۂ ذاتِ مقدس اختراعِ جلوہ ہے

وہ صبر حق نے دیا ہے کہ ظلم اٹھانے پر
بجائے شکوہ لبوں سے مرے دعا نکلے

شگفتہ

شگفتہ :- مرزا سیف علی بہادر خلف الرشید نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مرحوم صوبہ دار اودھ۔ یہ چند اشعار آپ کے درج کئے جاتے ہیں ؎

بوسہ لیتے ہوئے ہم دیکھو ادب کرتے ہیں
گالیاں دیتے ہیں یہ آپ غضب کرتے ہیں

خرامِ ناز ترا بس مری نظر میں رہا
تمام عمر ہی بیٹھا میں رہگذر میں رہا

آنکھیں چرا کے شب وہ بہانے سے اٹھ گیا
حرفِ مروت آہ زمانے سے اٹھ گیا

شگفتہ

شگفتہ :- منشی سید محمد رضی شاگرد جناب فاخر لکھنوی۔ زبان صاف معاملہ بندی میں مہارت ہے۔ یہ کلام کا نمونہ ہے ؎

مزارِ بیکساں کہتے ہیں مسکن ہیں بلاؤں کے
پریشاں کر کے بالوں کو نہ تم ہرگز ادھر جانا

کسے کے بس کے بلانے کی کوشش وہ بیجا انساں
غضب ہے ایک دل میں لاکھوں ارمانوں کا بسنا

مرے آنے سے تم مضمحل ہیں کیوں اتنا [illegible]
جہاں پر شمع ہوتی ہے وہیں پروانہ ہوتا ہے

بھلا کیسا ہو کہ شہرا ابھی باقی ہے وہی وحشت
کفن کی دھجیاں لیکر تو دیوانہ آتا ہے

شگفتہ

شگفتہ :- [illegible] مرحوم [illegible] والے تھے۔ شاد [illegible] ثانی کا

زمانہ پایا۔ بھورے خاں آشفتہ کے شاگرد تھے۔ ایک شعر دستیاب ہوا۔ جو درج کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سخن گوئی میں مذاق سلیم تھا ؎

ٹوٹے پڑے ہیں ساغر ٹکڑے گلابیاں ہیں	ساقی کے میکدے میں یہ بد شرابیاں ہیں

شمس

شمس:۔ سید صغیر حسن زیدی الواسطی ساکن دہلی مالک یوسفی پریس طرز قدیم کی پابندی میں اچھا کلام ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

رات بھر اک اثر بادۂ سرجوش رہا	سونگھنے ہی ترے بالوں کی کسے ہوش رہا
میرے اعمال اٹھائے لئے پھرتے ہیں ملک	میں گنہ کرکے بھی دنیا میں سبکدوش رہا
چھپتے کیوں ہو ذرا آنکھ ملاؤ تو سہی	میں ہی نورات کو دشمن سے ہم آغوش رہا
ٹکنے کہیں نہ دے گا تلوّن مزاج کا	سوزن کی طرح سینکڑوں ہی گھر بنائینگے
شمس یہ جان لو اُردو کا ستارا چمکا	چند دن اور جو دِلّی میں یہی جوش رہا

شمس

شمس:۔ نواب زادہ سید شمس الحسن خاں بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) فرزند نواب صفی الدولہ حسام الملک شمس العلما سید علی حسن خاں بہادر آپکی ولادت بروز جمعہ نوزدہم صفر ۱۳۲۲ھ ہجری مطابق ششم مئی ۱۹۰۴ء بمقام لکھنؤ ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں بمقام علیگڑھ یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں بمقام لکھنؤ ایل ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ نواب زادہ موصوف نہایت ذہین ہوشمند خوش مزاج اور علم دوست ہیں فضائل اخلاق سے مزین ہیں۔ آپ کے احباب کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ آپ کو ذوق شعر و سخن اور فن لطیف ادب سے ایک خاص طبعی اور فطری مناسبت ہے اور آپ کو جناب علی سکندر جگر صاحب مرادآبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے حضرت شمس کی طبع وقاد اور جناب جگر سے مشورۂ سخن سونے پر سہاگہ۔ تخیل کی بلندی اور زبان کی فصاحت قابل تحسین ہے۔ آپ کا کلام نئے طرز کی عاشقانہ غزل کا ایک بہترین نمونہ۔ قوت تالیف اور ندرت بیان آپ کا

نہ پوچھ جوشِ تحیّر کی جلوہ سامانی | جو حسن نے نہیں دیکھا وہ دیکھتا ہوں میں
سمجھ سکیگا کوئی کیا مری حقیقت کو | خود اپنے وہم و تصوّر سے ماورا ہوں میں
آنکھوں سے راہ رو سی منزل نہاں ہوا اب | ہر ہر قدم پہ دل کا مرے امتحاں ہے اب
یوں شعلہ بار گرمی سوزِ نہاں ہے اب | جو سانس آرہی ہے وہ برقِ تپاں ہے اب
ہائے وہ پہلی ملاقات کی بیگانہ روش | کاش ہوتی رہے ایسی ہی ملاقات نئی
ہر طرف رحمتیں بیتاب نظر آتی ہیں | مل رہی ہے یہ گناہوں کی مکافات نئی
اسکے سو جلووں میں ہر جلوہ ہے محشر بکنار | خوش ہوائے عشق کہ ہر دن ہے نیا رات نئی
شمس کچھ خیر تو ہے رات گذاری کیونکر | آج آنکھوں میں ترے پاتا ہوں اک بات نئی
مرا حال مجھ سے بیاں ہو رہا ہے | عجب طرح سے امتحاں ہو رہا ہے
انہوں نے اٹھا بھی دئے کب کے پردے | میرا عشق ہی درمیاں ہو رہا ہے
جو چبھتا تھا رگ رگ میں نشتر کی صورت | وہی درد آرامِ جاں ہو رہا ہے
ترا جلوہ زمیں سے آسماں تک | تو ہی تو ہے نظر جائے جہاں تک
بڑھی ہے بدحواسی اب یہاں تک | پلٹ آتا ہوں میں جا کر وہاں تک
اٹھا دے پردۂ ہستی اٹھا دے | یہ سب جھگڑے فقط ہیں جسم و جاں تک
ہمیں بھی دیکھنا ہے اے شبِ غم | ستم ڈھاتی ہے تو بڑھکر کہاں تک

شمس ۔ ابو القاسم محمد شمس۔ آپ خان بہادر مولوی عبد الغفور خاں نسّاخ مرحوم صدر الصدور بنگالہ مصنّف تذکرہ سخن شعرا کے خلف الرّشید ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۴ھ میں ہوئی مظہر الحق اسم تاریخی ہے۔ آپ کے خاندان کے بہت سے افراد اعلےٰ اور معزز سرکاری عہدوں پر مامور رہتے آئے ہیں۔ آپ کے چچا آنریبل مولوی عبد اللطیف خاں بنگالہ میں اہل اسلام کے موقر لیڈر سمجھے جاتے تھے۔

حضرت شمس کو صغیر سنی ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ انفراغِ تعلیم کے بعد

کسی سے اصلاح سخن لیے بغیر صرف اپنی ذاتی کوشش سے اس فن شریف میں
کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ پھر کچھ دنوں اپنے قابل باپ کے شاگرد رشید حضرت
انسخ مرحوم سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کے بعد اپنے والد کی تحریک سے فصیح الملک
مرزا داغ سے تلمذ اختیار کیا جنہوں نے فن سخن کے رموز و نکات سے انہیں واقف
کر دیا۔ ان کے ممتاز تلامذہ میں خان بہادر مولوی رضا علی صاحب وحشت کا نام
مشہور ہے۔ اُستاد کے لیے ان کا تلمذ باعث فخر کہا جا سکتا ہے۔ شمس انگریزی
وضع کے دلدادہ آزاد منش اور رند مشرب تھے۔ مگر فقرا اور اہل اللہ کی خدمت
کیا کرتے تھے۔ ان کا مشرب صلح کل تھا۔ انکی طبیعت فطری طور پر شاعری کے
مناسب واقع ہوئی تھی۔ زبان پر اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ مضامین میں شوخی اور
متانت کی گھلاوٹ ہے۔ جرأت کا مذاق شاعری انہیں بہت پسند تھا۔ پرگو اور
زودگو بھی تھے۔ اپنے شباب کے زمانہ میں دہلی بھی آئے اور مدت تک مقیم رہے
تھے۔ داغ۔ مجروح اور رنگین کے مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں بھی پڑھیں۔
غزل پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا۔ مؤلف سے دو تین بار کلکتہ میں ملاقات
ہوئی۔ اس زمانہ میں سب صحبتی زمانہ سے بہت بیدل تھے۔

۱۹۰۵ء میں بنگالہ کا یہ آفتاب سخن غروب ہوا۔ عبدالحکیم صاحب نشتر نے
یہ تاریخ لکھی۔ شمس نامی تھے فخر بنگالہ۔
۱۹

ان کے کلام کا مختصر مجموعہ مولوی بدرالزمان صاحب بدر۔ ایڈیٹر رسالہ شمس
کلکتہ نے اپنے پرچہ میں شائع کیا تھا۔ اس سے انتخاب کر کے نذر ناظرین ہوتا ہے

کہے کوئی جی لگائے کوئی کسی کو دل کا بڑھائے کوئی	سنے کوئی اور سنائے کوئی یہی تو ہے لطف داستاں کا
تو مدتوں کا ہی یار قاصد نہ ایسی باتیں بگھار قاصد	کہیں گے ہم لاکھ بار قاصد وہ منہ نہیں ہے زباں کا
نہیں ہے مطلق ثبات ہستی حباب آسا ہے زیست اپنی	یہاں ہے منزل عدم کی ہر آں نشاں ہے رفتگاں کا

ہوا جو تعلیم کا اثر کچھ کیا نہ جز عشق عمر بھر کچھ
پڑھا لڑکپن میں شمس اگر کچھ تو پانچواں باب گلستاں کا

ہم اور شکوۂ غم ہجراں غلط غلط
افسوس ہے کہ آپکا ایسا خیال ہے

قفس کے لطف گھر میں آ رہے ہیں
گھٹا جاتا ہے دم گھبرا رہے ہیں

مرے ارماں نکلنا چاہتے ہیں
ہجوم یاس سے گھبرا رہے ہیں

نہ ہو کیوں اعتبار عہد و پیماں
عدو کے سر کی قسمیں کھا رہے ہیں

گنہ میں نے کیا مے پی جو واعظ
کھڑے پھر آپ کیوں للچا رہے ہیں۔

سنا ہے وزن در انکو ناپسند ہوا
کبھی کبھی کا مرا دیکھنا بھی بند ہوا

جبیں پر بل ہے غصہ آنکھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
مری بگڑی ہوئی تقدیر گویا بن کے بیٹھے ہیں

مزے کی چھیڑ ہے کہتے ہیں وہ پہلو سے اٹھ جاؤ
اٹھوں کیونکر کہ وہ اوپر مرے دامن کے بیٹھے ہیں

اٹھا سکتا نہیں کوئی بھی صدقے ناتوانی کے
کسی کی بزم میں ہم آج لاکھوں من کے بیٹھے ہیں

نہ چھیڑو تذکرہ وصل عدو کا پھر وہ بگڑ بیٹھینگے
ابھی وہ شمس کن کن منتوں سے من کے بیٹھے ہیں

واعظ کو آج ہم سرِ منبر پلائیں گے
اچھی شراب چاہئے اونچی دکان کی

کوچۂ جاناں میں جانا روز کا اچھا نہیں
شمس سر پیٹو گے جب وہ بدگماں ہو جائیگا

اسکی گلی میں مجکو شمس حزیں ملا تھا
تھی جمع اک خدائی بیچارہ رو رہا تھا

ہجرِ بتاں میں زندگی و موت ایک ہے
جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں

(بند)

ہمدم و مونس و غمخوار نہیں کوئی مرا
غمگسار اور مددگار نہیں کوئی مرا

میں ہوں وہ جنس خریدار نہیں کوئی مرا
مر بھی جاؤں تو عزادار نہیں کوئی مرا

غوث اعظم ہمِن بے سر و ساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

سفرِ کشورِ بغداد کی اب ہے تقریب
لطف فرمائیں اگر آپ تو ہو جائے قریب

آپ کا روضہ ہے امیدگہ شاہ و غریب
ایسی درگاہ کی لے کاش زیارت ہو نصیب

غوثِ اعظم بمنِ بے سر و ساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

شمس

شمس :- مشیر علی خاں۔ والد کا نام باقر علی خاں اور دادا کا نام حبیب شاہ خاں ہے۔ آپ ۱۹۰۲ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ اُردو۔ فارسی کی ضروری تعلیم پائی ہے۔ کتب بینی کا بہت شوق ہے۔ آپ کے اعزا ریاست میں معزز عہدوں پر سرفراز رہے ہیں۔ آپ خود بھی روہیلکھنڈ میں ایک ممتاز زمیندار ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے :-

ناخن وحشت سلامت چاہیئے لے چارہ گر
دیکھنا کیا ہے جو زخمِ عشق اچھا ہو گیا

کچھ نہ دیکھا جلوہ گاہ ناز میں رنگِ جمال
پردہ دارِ حسن خود آنکھوں کا پردہ ہو گیا

پوچھو نہ مجھ سے دل کی تباہی کا ماجرا
برباد ہو کسی کا نہ یوں گھر مرا ہوا

کیا پوچھتے ہو شمس دلِ زار کا پتہ
مدت ہوئی فدائے فریب وفا ہوا

کھنچ گیا آنکھ میں نقشہ تری رعنائی کا
آج کچھ اور ہی عالم ہے تماشائی کا

اور کچھ دیر کا مہماں ہے بیمار فراق
اور باقی ہے فسانہ شبِ تنہائی کا

ہم جانتے ہیں کعبۂ حسنِ ازل جسے
وہ دل حریم جلوۂ ناز بتاں ہے اب

وہ دل کہ جو فریب ستم سے تھا غنی
ممنونِ بے نیازیٔ چشمِ بتاں ہے اب

صحت ہے مجھے کثرت آزار محبت
جاتے نہ الٰہی خلشِ خار محبت

اچھا ہی کہ تکلیف عیادت نہ اٹھائیں
اب لائق پرسش نہیں بیمار محبت

اسی انداز سے بس دیکھ لے او دشمنِ راحت
ابھی احساس کچھ کچھ ہے دلِ آشفتہ ساماں کو

دبا سکتا ہوں ہاں جذبات بیتابی بہر صورت
چھپا سکتا نہیں بے ربطی چاک گریباں کو

تصرف اور ان کا فرنگاہوں کا الٹے توبہ
کوئی دل ڈھونڈتا ہے ورہا ہے کوئی ایماں کو

ترقی کر رہی ہیں دمبدم بیتابیاں دل کی
دعائیں دے رہا ہوں چارہ ساز دردِ پنہاں کا

مبارک شوقِ قتل عاشقاں لیکن یہ سن لیجیے
ابھی دیکھا نہیں ہے آپ نے خونِ شہیداں کو

کبھی ہمراز تھی خوشی دل کی | اب ہے غمخوار بیکسی دل کی
بندہ پرور خطا معاف مری | آپ نے خوب قدر کی دل کی

یہ زخم وہ نہیں ہے کہ مرہم ہو کارگر | یہ درد وہ نہیں کہ مداوا کرے کوئی
قاتل کو وقت ذبح تردد ہے کس لئے | کیا حوصلہ کہ خون کا دعویٰ کرے کوئی
چاہتے ہیں کہ بڑھے شہرت خودداری حسن | اہتمام نگہ شوق ہے پروا کیا ہے
بڑھ رہی ہے خلش درد محبت ای شمس | بیٹھا جاتا ہے دل زار یہ نقشہ کیا ہے
ضبط غم کیجے تو فرماتے ہیں ہم کو کیا خبر | کچھ اگر کہئے تو آئین وفا سے دور ہے
نالہ و فریاد گو عنوان بدنامی سہی | کاش اتنا تو سمجھ لیتے کوئی معذور ہے
ہائے وہ دل جو کبھی تھا مایۂ صبر و سکوں | گوشہ گوشہ اب اسی کا درد سے معمور ہے

دیکھنا ہو جسے نخوت کی مکمل تصویر | آئینہ خانہ میں انداز تمہارا دیکھے
پردہ داری کی یہ صورت کہ نظر بھی نہ اٹھے | خود نمائی کا وہ عالم کہ زمانہ دیکھے

شمس حکیم

شمس :- حکیم خورشید حسن باشندہ سہارنپور۔ کئی رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ تلمذ کا حال معلوم نہیں۔ آپ کے ایک شاگرد محمد یعقوب نے انتخاب کلام بھیجا تھا۔ اشعار ذیل ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں :-

سورج ڈوبا شام ہوئی ہے دنیا نے آرام کیا | شمع جلی پروانے آئے سوز جگر نے کام کیا
زلف پیچاں کے اسیروں کا نہ ذوق دید پوچھ | آنکھ پیدا کر کے چھوڑی حلقۂ زنجیر نے
شمس سے کچھ پوچھئے مت حضرت انساں کا حال | خاک کو رسوا کیا ہے جسم کی تعمیر نے
شہید ناز کی تربت پہ بھی کچھ رنگ جم جائے | چراغ قبر روشن کیجئے جانا شمع محفل سے

شمس

شمس :- مرزا اکبر علی۔ باشندہ لکھنؤ شاگرد حضرت دانش لکھنوی اوسط درجہ کا کلام ہے۔ دو شعر درج کئے جاتے ہیں :-

حرص بھی حد سے سوا سم ہے بشر کے حق میں | زہر ہوتا ہے اگر رزق بھی کھا جائے بہت

نیم جاں کر کے نہ قاتل ہمیں تڑپائے بہت		کشتۂ تیغ نگہ ہوں تو ہو راحت دل کو

شمس

شمس: میر آغا علی شمس لکھنوی خلف میر محمد مہدی ثاقب قاضی محمد صادق خاں اختر ارشد تلامذہ میرزا قتیل مرحوم کے سلسلۂ تلمذ میں داخل تھے۔ دیانت الدولہ بہادر مصاحب حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے رفقا میں ممتاز تھے پری رخان معانی کی تسخیر کے سوا شاہدانِ خوش جمال کو اپنے بس میں کر لیتے۔ معاملہ بندی سے ایسا لگاؤ تھا کہ مرتے دم تک حسن و عشق کی دنیا میں رہے۔ جن مہوشان عشوہ طراز نے خدائی بھر کو اپنا ناز بردار بنایا ان سے اپنی نعش اٹھوا کر چھوڑی۔ آغاز شباب ہی سے بازاری سودا سر میں تھا۔ شعر و سخن کے شوق نے اس جذبہ کو اور بھی مشتعل کر دیا لکھنؤ کی طوائفوں مشتری و زہرہ کا نام چمکانیوالی اور عالمگیر شہرت کا باعث آپکی استادی ہے۔ آغا صاحب کی شاعرانہ اور ادبی کوششوں کا سرمایہ یہ دونوں بہنیں تھیں جنکو آپ نے بڑی محنت سے شاعرہ بنایا تھا۔ اور ان کو ایسا عزیز رکھتے تھے کہ دوسروں کا کلام بھی انکی طرف منسوب کر دیتے تھے چنانچہ بی مشتری کیطرف سے جو فارسی دیوان شائع ہوا ہے۔ اس میں بیشتر حصہ میر غلام علی عشرت بریلوی کے کلام کا ہے۔ دیوان شائع ہونے پر عشرت کے اعزا نے دعویٰ دائر کرنے کا قصد کیا۔ مگر عدالت تک نوبت نہ پہنچی اور فریقین کے باہم فیصلہ ہو گیا۔

جس زمانہ میں برہان قاطع اور قاطع برہان کی بحث کا سلسلہ جاری تھا مرزا غالب کے مخالف لمبے چوڑے رسالے نکال کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے انہیں دنوں میں آپ نے بھی مرزا کے خلاف اخباروں میں زہرہ۔ مشتری کے نام سے مضامین شائع کئے تھے۔ اور مرزا صاحب کی شاعری پر بھی کچھ اعتراضات کئے تھے مگر چاند پر خاک ڈالنے سے کیا ہوتا ہے۔ زہرہ و مشتری کیساتھ بسر اوقات کسنے پر معاصرین ان پر چوٹیں کرتے تھے۔ اور یہ انہیں سنکر خوش ہو جاتے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے کئی قطعے ان کے متعلق کہے ہیں۔ جن میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

شعاعِ شمس زہرہ مشتری ہے	بڑی تو خیر ہے چھوٹی کھری ہے

مشتری اور زہرہ کی بہار زندگی ختم ہو جانے کے بعد آپ کانپور جا رہے تھے ۱۸۹۶ء کے قریب انتقال کیا۔
حضرت شمس عربی فارسی میں صاحب استعداد تھے۔ اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر کرتے تھے۔ چلتی ہوئی طبیعت پائی تھی۔ اگر یہ بازاری کوٹھے چھوڑ کر میدانِ سخن میں اپنا رنگ جماتے تو آج انکے شاگردوں کی تعداد کافی ہوتی۔ اور یہ استاد مانے جاتے۔ مگر افسوس ہے کہ چوک کی اُستادی نے شاعری کے کمالات کو ڈبو دیا۔ اور بزم آرایانِ سخن میں اچھی نگاہ سے نہ دیکھے گئے۔ خدا جانے اپنا مجموعہ کلام کہاں چھپوایا جس قدر اشعار دستیاب ہوئے ہیں درج کئے جاتے ہیں: س

کٹی شب یار کی آرائشوں میں
متاعِ عشق ہاتھوں ہاتھ لوٹی

سحر تک زلف بگڑا کی بنا کی
بندھی مٹھی کھلی قسمت حنا کی

دستِ جاناں میں بڑھی توقیرِ پُشتِ آئینہ
ہنسکے وہ بولے جو بکھرے پیٹھ پر چوٹی کے بال
کیا عجب ہے گر تمہارے دیکھنے کے شوق میں
منہ پہ کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ صفائی دیکھ لی
صاف کھل جاتی ہے طینت یوں دلِ صافی کی شمس

شل پروئے شمس ہے تنویرِ پُشتِ آئینہ
دیکھ کر دیکھی نہ ہو زنجیرِ پُشتِ آئینہ
پھوٹ نکلے اس طرف تصویرِ پُشتِ آئینہ
رُخ کے آگے گرد ہے تنویرِ پُشتِ آئینہ
منہ پہ آئے جس طرح تقریرِ پُشتِ آئینہ

نہ کرو بات ادھر دیکھ تو لو
یہ تو فرمائیے کب آئے گا

نہیں اُلفت تو مروّت ہی سہی
لو خوشی آپ کی رخصت ہی سہی

بشر کا حسن وہ شی ہے طبیعت آ ہی جاتی ہے
دُعاؤں سے نہیں رُکتی یہ آفت آ ہی جاتی ہے

چھپکے ملنے میں حجاب آتا ہے
ہیں تو کہتا ہوں جنوں مجھکو ہوا
نہیں قسمت میں نہ ہو ساغرِ مے

نہیں خلوت ہے تو جلوت ہی سہی
تیرے کہنے سے محبت ہی سہی
پیرِ میخانہ کی خدمت ہی سہی

شمس

شمس منشی ابوالفضل محمد تصدق حسین صاحب خلف منشی امیر خان صاحب سب انسپکٹر پولیس ساکن بیگم گنج لکھنؤ ۱۸۹۶ء سال پیدائش ہے حضرت رعب شاہ آبادی سے فن عروض پڑھا۔ اور نامور شعرا مثل جلال، تسلیم، انجم اور جاوید سے فیض صحبت حاصل کیا۔ پھر حضرت رضا مرحوم شاگرد جناب امیر احمد مینائی سے تلمذ اختیار کیا۔ بقدر ضرورت علم موسیقی سے بھی واقفیت ہے زبان میں لوچ، بیان میں لطف ہے طبیعت مزیدار پائی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی دلکش ہے کچھ عرصہ راجہ اشفاق علی خاں تعلقہ دار کھیری کے پاس رہے پھر رسالہ میزان اور لطیف کے ایڈیٹر رہے انجام کار دلگداز کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہ کلام ان کا ہے:-

ہائے تنہائی لیلیٰ کی خبر لے کوئی　　ساتھ مجنوں کے تو اک عمر بیابانی ہے

توڑ پھولوں کو نہ آغاز نمو میں گلچیں　　رنگ بڑھتی ہوئی کلیوں کا ابھی دھانی ہے

کہوں کہاں سے بیاں اے شمس حال درد دل لکھوں　　نہ اس لائق زباں میری نہ اس قابل قلم میرا

ابھی کم سن ہیں کیا جانیں وہ کیا شے ہے دغا دینا　　جوانی آ کے سکھلائیگی ان کو دل دکھا دینا

اگر پوچھے وہ قاصد تجھ سے میری خانہ بربادی　　ہتھیلی پر اٹھا کر خاک رکھنا اور اڑا دینا

یہاں بجلی گری مجھ پہ وہاں موسیٰ کو غش آیا　　بہت کچھ رنگ لایا شمس ان کا مسکرا دینا

کبھی نازوں کی چھریاں ہیں کبھی غمزوں کے بھالے ہیں　　کسی دل نے دکھانے کیلئے پہلو نکالے ہیں

بتائیں کیا کہ کیوں ہم سینہ پر غم سنبھالے ہیں　　کچھ ابھی آپکے ارماں ہیں کچھ دل کے چھالے ہیں

یہ کہکر ہجر میں دن بھر دل مضطر کو سمجھایا　　نہ گھبراو کہ دیکھو وہ شام آئی۔ اب وہ آنیوالے ہیں

کہاں وہ ولولے دل کے کہاں یہ جوش ناکامی　　محبت کا یہ پھل پایا کہ اب جینے کے لالے ہیں

مزے ناکامی تقدیر کے پوچھو مرے دل سے　　کہ منزل پہ پہنچکر بھی رہا میں دور منزل سے

ستارے جھلملائے بجھ گئیں شمعیں سحر آئی　　اٹھے سب عیش کے سامان تم اٹھے جو محفل سے

سفر کی کلفتیں بھی حسرت افزائے تماشا ہیں　　ہمیں یاد آگیا مٹنا جو اٹھی گرد منزل سے

نہیں معلوم کیا لے قیدی غم ہونیوالا ہے　　کہ دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے آواز سلاسل سے

پرساں ہے کون کشتۂ گیسوئے یار کا
روتا ہے بیکسی پہ اندھیرا مزار کا

آتا ہے گر تو آؤ کہ ہوتی ہے آنکھ بند
بجھتا ہے اب چراغ شب انتظار کا

جہاں کا درد ہے دلمیں زمانے سے تعلق ہے
چلے خنجر کسی پر خون دیتا ہے گلا میرا

کہا ہے جب سے قاتل روز خنجر لیکے آتے ہیں
ذرا سی بات کہکر مول لے لی دشمنی میں نے

جی میں آتا ہے کہ ہاتھوں کی بلائیں لیلوں
اس ادا سے مرے مرنے کی دعا کرتے ہیں

نہ کام آتی ہیں آہیں نہ اب دعا میری
بتوں کے سامنے سنتا نہیں خدا میری

شمس

شمس :- بابو کنھیا لال۔ متوطن فرخ آباد۔ شاگرد جناب شیدا فرخ آبادی کلام اور حالات زیادہ نہ ملے۔ مندرجہ ذیل شعر بطور نمونہ درج ہیں :ـ

تصویر یار آتی ہے ہر دم ہمیں نظر
نقشہ یہ دل کے چوکھٹے میں کون جڑ گیا

مجذوب بھی حیران ہیں سالک بھی پریشان
کیا راز خدا آئے بھلا عقل بشر میں

اس طرح سے کوئی پئے تفریح چلا ہے
ہے تیر و کماں ہاتھ میں خنجر ہے کمر میں

شمس

شمس :- منشی شمس الدین صاحب۔ باشندہ فرخ آباد شاگرد حضرت طاہر فرخ آبادی آپ عرصہ تک مطبع رحیمی قنوج میں کاتب رہے ہے۔ گلدستہ پیام عاشق بھی آپ ہی لکھا کرتے تھے۔ زبان صاف بندشیں چست ہوتی ہیں۔ تلاش اچھی ہے۔ کلام یہ ہے :ـ

تصور نوک مژگاں کا رہا اے جان جاں برسوں
چبھا کیں سینہ و دل پر ہمارے برچھیاں برسوں

جفاؤں کی شکایت پر بگڑ کر مجھ سے فرمایا
جو چاہیگا وہ جھیلیگا ہماری سختیاں برسوں

رخ گلرنگ پر اس کے نہیں سبزے کی نمود
خضر آئے ہیں ہوا کھانے کو گلزاروں میں

روز فرقت جو چمکتا ہے مرا داغ جگر
دھوپ سایہ کیطرح چھپتی ہے دیواروں میں

خیرہ ہوتی ہے نظر دیکھ کے جلوہ اے شمس
روشنی برق کی ہے یار کے رخساروں میں

شمس

شمس :- منشی سید ظہیر الدین صاحب ساکن شیر گھاٹی محلہ شمالی ضلع گیا (صوبۂ بہار) ۱۳۱۱ھ سال ولادت ہے۔ فارسی اردو کے درسیات اپنے مکان پر پڑھنے کے بعد سیاحت

کا شوق دامنگیر ہوا۔ کلکتہ رنگون وغیرہ مختلف مقامات میں رہے۔ شعر و سخن کے علاوہ فن سپاہگری میں خاص مہارت رکھتے ہیں جوان رعنا ذہین و خوش فکر ہیں۔ اردو نثر کی تحریر میں آپکی ڈراما نویسی بھی قابل قدر ہے۔ کئی ڈرامے لکھے ہیں فن نقاشی اور مختلف قسم کے خطوط صنعتی لکھنے میں خاص مہارت ہے۔ اوایل عمری سے شاعری کا مذاق ہے مولانا شفق عماد پوری کو اپنا کلام دکھاتے ہیں اور انکے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے:

یہ پوچھا جب شبِ وعدہ کہ دل بھی دل سے ملتا ہے
وہ بول اُٹھے کہ ملتا ہے مگر مشکل سے ملتا ہے

بڑا ہمدرد نکلا ناوکِ پیکاں ترا قاتل
کہ جب آتا ہے پہلو میں تو آکر دل سے ملتا ہے

شبِ فرقت قضا مہمان ہو جاتی تو اچھا تھا
یہ مشکل مر کے بھی آسان ہو جاتی تو اچھا تھا

مٹانا تھا مٹا کر پھر مجھے برباد کرنا تھا
ستم اچھی طرح لے چرخ بے بنیاد کرنا تھا

کدھر تم چل دئے اے رہروانِ منزلِ ہستی
مسافر ہوں مجھے بھی اس سفر میں یاد کرنا تھا

نہ آئی نیند مجھ کو دیدۂ بیدار کی صورت
بھری آنکھوں میں پتلی بن کے شب بھر یار کی صورت

دیکھ لوں خواب میں اس یوسفِ ثانی کو اگر
نیند سے جاگ اٹھوں بختِ زلیخا ہو کر

تب کلیسا کو گئے خانۂ کعبہ سے گئے
شمس جب کعبہ میں آئے تو کلیسا ہو کر

ہزاروں قافلے بھٹکے ہیں میدانِ محبت میں
جنابِ خضر بھی داخل ہیں یارانِ طریقت میں

فلک پہ جا کے پھر آتی ہے کیوں آہِ رسا میری
لگے ہیں قفل شاید ان دنوں بابِ اجابت میں

عدم کی فکر میں آئے ہیں جانبِ ہستی
سفر کی راہ نکالی ہے ہم نے گھر کیلئے

شمس — چودھری شمس الدین خلف چودھری بشیر الدین رئیس سندیلہ ضلع ہردوئی بملازمت پنشنر ہیں۔ انکے نانا مولوی حکیم الدین صاحب مرحوم خوش فہم اور سخن سنج تھے۔ رسمی تعلیم سے انفراغ کرکے شعر گوئی کی طرف توجہ کی اپنے برادر نسبتی مولوی سید نذیر حسن صاحب فتنہ سندیلوی سے اس فن کی تعلیم حاصل کی اور زندہ طبع دکھلانے لگے۔ کلام سے مشاقی ظاہر ہوتی ہے زبان سلیس جدت نیا ف اور محاورات پاکیزہ لکھتے ہیں مضمون آفرینی کیطرف توجہ کم ہے کلام کا انتخاب یہ ہے:

بُت سمجھ کر ہیں جنہیں ہو گیا کافر یارب	اب وہی ضد سے مُسلمان ہوئے جاتے ہیں
وصل میں پوچھ رہے ہیں مرے دل کی حسرت	جانتے ہیں مگر انجان ہوئے جاتے ہیں
مُردے اُٹھتے ہیں مزاروں سے جو چلّاتا ہوں میں	ہے اثر صورِ قیامت کا مری فریاد میں
ہو گیا باہم یہ پیدا اتحادِ حسن و عشق	رات ہیں انکی یاد میں وہ ہیں ہماری یاد میں
روٹھ کر مجھ سے مری جان کہاں جاتا ہے	جانے والے ترے قربان کہاں جاتا ہے
دیکھ او تیر نگاہ غلط انداز ادھر	منہ اٹھائے ہوئے نادان کہاں جاتا ہے

شمس

شمس:۔ حاجی خواجہ احمد بریلوی شاگرد حضرت ہوش عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا۔ بریلی کے نامی کتب فروشوں میں تھے۔ شاعری سے ذوق تھا۔ کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ یہ کلام کا نمونہ ہے:۔

نالۂ قیس حزیں میں کچھ اگر تاثیر ہو	زلفِ لیلیٰ بڑھ کر اسکے پاؤں کی زنجیر ہو
کیا کہیں جو اس اذیت میں ہیں پنہاں لذتیں	سو گنہ کیجے جو اس کے ہاتھ سے تعزیر ہو

شمس

شمس:۔ منشی محمد علی خاں عرف ننھے صاحب شاگرد دوست علی خلیل کلام پختہ ہوتا تھا۔ زبان صاف تھی۔ یہ انتخاب ہے:۔

ترا جمال جو پیشِ نظر نہیں رکھتے	وہ مثل دیدۂ نرگس بصر نہیں رکھتے
صبا پیام یہ کہنا مری طرف سے اُسے	تم اپنے بیخبروں کی خبر نہیں رکھتے
کیا ہے حسن جوانی نے یہ انھیں بدمست	ہماری کیا کہ وہ اپنی خبر نہیں رکھتے
نظر نہ آئے نہ اپنی صورت کا	وہ آئینہ کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھتے

شمس

شمس:۔ منشی محمد شمس الدّین صاحب خوشنویس لکھنوی شاگرد خواجہ محمد مرتضیٰ خاں بہادر بقا لکھنوی۔ مطبع سرکاری بک ڈپو لاہور میں مدتوں مولف تذکرہ ہذا کے شمس نامدار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب کے ماتحت کام کرتے رہے بہت سے قطعے ان کے ہاتھ کے موجود ہیں۔ بعد کو لکھنؤ جا کر مطبع نولکشور میں ہیڈ خوشنویس

رہے۔ تمام شمالی ہندوستان میں ان کی فنِ خطاطی کی مہارت اور نستعلیق کتابت کی شہرت تھی۔ فنِ سخن میں بھی مشق تھی۔ ذہن کی رسائی مضامین سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اسّی برس سے زائد عمر پاکر انتقال کیا۔ یہ ان کا کلام ہے۔ ؎

عینِ ایماں نام ہے اے جاں اگر اقرار کا	کفر مطلق پھر لقب بے شبہ ہے انکار کا
دانہ ہائے سبحہ سے لیکر امام سبحہ تک	سلسلہ دوڑا ہوا ہے رشتۂ زنار کا
حضرت استاد تو ہیں آسمانِ شاعری	شمس ہیں ہوں کیوں نہ ہو شہرہ مرے استاد کا

شمسی

شمسی :- سید شمس الحق صاحب وکیل عدالتہائے رامپور شاگرد جناب رازؔ و رساؔ۔ بندشیں سلجھی ہوئی۔ زبان میں لذت۔ بیان میں درد ہے۔ کلام یہ ہے

خاک میں مجھکو ملا کر یہ عنایت بھی ہوئی	کہ مری قبر پہ وہ غیر کو لیکر آیا
فصل گل آتے ہی آمد ہوئی ان دونوں کی	جوش دل میں تو مرے پاؤں میں چکر آیا
نہ وہ صورت نہ وہ رنگت نہ وہ حالت نہ وہ ہم	قہر آیا کہ الٰہی دل مضطر آیا
آتشِ تشنگیِ حشر جو بھڑکی شمسی	چھینٹے دینے کے لئے چشمۂ کوثر آیا

شمسی

شمسی :- محمد متین نام۔ موضع کوٹھیا۔ ضلع اعظم گڑھ میں سنہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی سے ماہر ہیں۔ ملّا اور فاضل کی اسناد حاصل کی ہیں۔ انگریزی سے بھی واقف ہیں۔ فی الحال دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول الہ آباد میں ہیڈ مولوی ہیں۔ شعر و شاعری سے طبعی مناسبت ہے۔ کچھ عرصہ سے حضرت نوح ناروی تلمیذ مرزا داغ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کلام یہ ہے۔ ؎

ہمصفیر و گلشن بیداد سے بچتے ہوئے	ہیں تو خوگر ہو گیا بیرحمی صیاد کا
پوچھتے تھی کس عنایت سے وہ غم کی سرگذشت	ہم نہ کچھ بھی کہہ سکے ان سے برا ہو یاد کا
بلا کا سوز ہے بلبل ترے ترانے میں	خموشی آگ نے لگ نے آشیانے میں
کسی کو چین ملا ہوگا اس زمانے میں	یہاں بہار بھی آئی تو قید خانے میں

کسی کا قصر دل آویز ہے تو ہو شمسی
فقیر مست ہیں اپنی غریب خانے میں

کامل ہے کوئی شعبدہ گر اپنے ہنر میں
ہر ظلم کی تردید ہے معصوم نظر میں

جو قطرہ گرا آنکھ سے دامن میں لہو تھا
کیا جانئے کم بخت یہ کیا گذری سفر میں

کھینچ کھینچ کے جان آنکھوں میں آئی شب فراق
پوچھو نہ مجھ سے کشمکش انتظار کو

ہیں جان سے عزیز یہ وعدہ خلافیاں
ہم نے اُلٹ دیا ورقِ اعتبار کو

نہیں اٹھانہ میری لاش اٹھیگی کوچۂ قاتل سے
مقدّر میں یہیں کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

سخت جاں ہوں اور دل نازک بہت قاتل کا ہے
المدد شوقِ شہادت سامنا مشکل کا ہے

کشتۂ بیکس کے پہلو میں پڑی ہے ایک لاش
ہو نہ ہو اے غم یہ چھوٹا سا جنازہ دل کا ہے

مجھ سے ساقی داستانِ شوقِ مے نوشی نہ پوچھ
زندگی کا لطف قصۂ مختصر شیشہ میں ہے

حادثے عشق میں کچھ ایسے نمایاں ہونگے
نہ تو ہم ہونگے نہ دل ہوگا نہ ارمان ہونگے

آگاہ تو ہونے دو ہمیں چاہِ جبیں سے
اقرار سمجھ لیں گے کسی روز نہیں سے

میخانے سے ہے شمسی کو ایک خاص تعلق
بیعت ہے اسے پیرِ خرابات نشیں سے

شمشاد :- جناب مولانا محمد عبدالاحد صاحب شمشاد لکھنوی۔ آپ مولانا قطب الدین سہالویؒ کے خاندان سے تھے جن کی اولاد سے لکھنؤ میں فرنگی محل آباد ہے۔ اور مدّت سے علوم کا مرکز بنا ہوا ہے۔ آپ کے والد ماجد مولوی عبدالرحیم صاحب اپنے وقت کے نامور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ جو غدر کے دنوں میں بحالت نماز مسجد میں شہید ہوئے۔

حضرت شمشاد ۳ صفر ۱۲۶۶ھ کو پیدا ہوئے۔ ۱۴-۱۵ برس کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ آفتاب الدّولہ خواجہ قلق مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کی شاعری۔ تلمیحات مراعات اور استعارات کا مخزن بنی ہوئی تھی برسوں کے فرسودہ مضامین کو نیا کرکے دکھانا کمالات شاعری میں داخل تھا۔ راقم کی رائے

ہیں آپ کے کلام سے تو یہ باتیں نہیں پائی جاتیں تخیل کی شگفتگی مضامین کی تازگی اور اسلوب کی چستی سے آپ کا کلام مالا مال ہے مشاعروں میں خوب داد پائی۔ قلق کے بعد مولانا عبدالعلیم عاصی کو اپنا کلام دکھانے لگے چند ہی روز میں مشق سخن سے کامل الفن ہو گئے۔ آپ کی علمی استعداد عالمانہ درجہ کی تھی۔ تمام عمر درس تدریس میں بسر ہوئی آخری عمر تک مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں معلم رہے۔ شاعری کے اعتبار سے آپکی معلومات نہایت قابل قدر تھیں۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ ۱۵ ۱۹ء میں انتقال کیا۔ آپ کے تین دیوان طبع ہو چکے ہیں۔ جن میں لکھنؤ کی روزمرہ زبان کے نمونے فصیح محاورات۔ ضرب الامثال کا دریا موج زن ہے عربی الفاظ کے بجائے اردو۔ ہندی الفاظ اسقدر ملتے ہیں جو دوسرے زبان داں کے ہاں مشکل سے ملینگے نازک سے نازک مضامین کو نہایت سادہ اور صاف الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ عمر بھر صرف غزل کہی۔ آپ کی غزل میں اخلاقی اور علمی نکات بھی دستیاب ہوتے ہیں صداقت۔ صبر۔ رضا۔ توکل کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ حسن وعشق کے بیان کرنے میں بانکپن کی شان کی بجائے متانت سے کام لیا ہے۔ الفاظ کی تراش خراش اور نازک خیالی اور دماغی کاوشوں میں مبتلا رہتے تھے۔ دورِ حاضرہ میں پرانی وضع کے پابند رہے ہے۔ افسوس ہے کہ آپ نے قدیم دائرے سے قدم باہر نہ نکالا۔ ورنہ اردو شاعری نموا میں خوب اضافہ کرتے۔ کلام کا انتخاب نذر ناظرین کیا جاتا ہے

زمانہ کی طرح وہ شوخ پرفن
کسی کا دوست نہ دشمن کسی کا

آنکھیں لڑنے کی صلح ہوتی ہے
فائدہ کیا ہے اس لڑائی کا

دختر رز کی لالہ گوں صورت
خون کرتی ہے پارسائی کا

غم کلیجہ تک ہمارا کھا گیا
ہم نے غم کھایا تو کیا بیجا کیا

محویت نے رنگ یہ دکھلا دیا تاثیر کا
میری صورت بن گیا عالم تری تصویر کا

کونین ایک عکس ہے جس کے جمال کا
مَیں بھی ہوں ایک نقش اسی کے خیال کا

بے مثل تو ہے تیرے کرشمے ہیں بے نظیر
تیری ثنا میں تنگ ہے عالمِ مثال کا

کب نہ یاد آئی تلخیِ انجام
کب مرا عیش بدمزا نہ ہوا

سات پردوں میں بھی دیکھیگا تمہیں
پڑ گیا لپکا جسے دیدار کا

شام کے وعدہ پر جو تم آتے
مَیں نہ رو رو کے یوں سحر کرتا

اتنا کیا ہے تم نے وہاں حسرتوں کا خون
عاشق کے دل کو گنجِ شہیداں بنا دیا

اے مرے دردِ دل کی بیتابی
رحم بنکر مزاجِ یار میں آ

ہیں رازِ حسن و عشق سمجھتا رہا جسے
تم نے اسی کو رنجشِ پنہاں بنا دیا

تم تو دلبر ہو کیا گلہ تم سے
جب مرا دل ہی بے وفا نکلا

میری شہرت کا دور بھی افسوس
صورتِ عمرِ بے بقا نکلا

دل نہ کعبہ تھا نہ کوہِ طور تھا
تیرے جلووں سے مگر معمور تھا

وہی ہم ہیں وہی جلسے وہی سامانِ عشرت ہیں
فقط اک دل کہ بجھنے سے نہیں وہ رنگ صحبت کا

جن آنکھوں نے دیکھے ہیں تیری حسن کے نیرنگ
ان سے تو کبھی ذوقِ تماشا نہیں جاتا

ان سے الگ تھی جب تک برگشتہ تھی ہر اک شئے
ان کے ہوئے تو اب ہے کون و مکاں ہمارا

جیسے عدم میں تھے ہم ویسے وجود میں ہیں
کیا تھا وہاں ہمارا کیا ہے یہاں ہمارا

مَیں چپ تکتا ہوں سب کا منہ کھلا جاتا ہے رازِ دل
خموشی حال کہتی ہے مرا طرزِ بیاں ہو کر

اٹھلا کے چل کہ ناز سے چل یا سنبھل کے چل
لیکن کسی کا دل نہ کفِ پا سے مل کے چل

ازل کی وہ مستی ابد تک نہ اتری
پلائی جو تو نے شرابِ اوّل اوّل

غیر ممکن ہے کہ ہو اچھے برے کا امتیاز
دل جہاں آیا کسی پر سوجھتا کچھ بھی نہیں

جب کہا یا نہیں گلے میں ڈالکر جانے بھی دو
سب گیا گذرا ہوا غصہ گلہ کچھ بھی نہیں

ساتھ اپنے کیا نہیں لیتا گیا میرا شباب
یا تو لاکھوں حوصلے تھے دل میں یا کچھ بھی نہیں

ہے نفس کی آمد و شد بر بقائے قصرِ تن

ہم صحبتوں کو یاد کرو مجھکو دیکھ کر

تمہاری آنکھ کی گردش سے کون مست نہیں

کروں جو یادِ جوانی تو کہتی ہے پیرانہ

بڑھتی جاتی ہے عداوت آپ کی
ہم بھی عاشق ہیں کچھ غلام نہیں

عجب تاثیر دیکھی ہیں نے یہ عشق مجازی ہیں

کیا ستم ہے کہ نصیحت کرے آکر ناصح

وہ کوسنے کی ادائیں وہ غصہ کی چتوں

خلوتِ دل میں چلے آؤ تکلف نہ کرو

دستِ نگاہ دونوں نہ کیوں بیدھڑک بڑھیں

مصیبت یا کہ راحت جو خدا دے
تم جو آمادہ ہو جفا کے لئے
یاس نے آس اسطرح توڑ دی

ملنے جلنے کا ذرا اس میں نہیں ہوتا دخل

سبز رنگوں کی محبت نے یہ باندھا ہے طلسم

کافر کا کفر بھی نہ کرے گا اسے قبول

حیا خاص ان کی ادا ہو گئی

یہ تو عنوان محبت ہی کہ دنیا سے

من و تو کے مٹانے سے ہوا حاصل تو یہ حاصل

کہاں کا وصل کیسا ہجر غم کس کا خوشی کیسی

جسکی ہستی ہو ہوا پردہ بنا کچھ بھی نہیں

وارفتگانِ قافلہ کا میں غبار ہوں

تم اپنی بزم میں دورِ شراب رہنے دو

کھلی ہے آنکھ تو اب ذکرِ خواب رہنے دو

یہ بھی کیا میری محبت ہو گئی
رشکِ یوسف ہوا کرے کوئی

محبت بڑھتی ہے جتنی جدائی ہوتی جاتی ہے

اس کے ملنے کی تدبیر بتائے کوئی

جو دیکھتا ہوں تو منہ سے دعا نکلتی ہے

ہیں نے ارمانوں کو پہلے ہی نثار رکھا ہے

آنچل ڈھلک گیا ہے وہ سرمستِ خواب ہے

وہی دے جو مرے دلکو مزا دے
دل مرا پھیر دو خدا کے لئے
ہاتھ اٹھتے نہیں دعا کے لئے

دل کے آجانے کا انداز جدا ہوتا ہے

زخم بھرنے نہیں پاتا کہ ہرا ہوتا ہے

زاہد کو جو ملا ہے ریائی نماز سے

بس اب شرم کی انتہا ہو گئی

دل جو اس شوخ پہ آیا تو قضا بھی آئی

تمہارا وصف کرتے ہیں ہم خود نا شکیبے

نہ خلوت تھی نہ جلوت تھی جہاں تم تھے وہاں ہم تھے

رباعی

کھلتا ہی نہیں بھید ذرا کیا ہے یہ
کچھ بھی نہیں پھر بھی اک تماشا ہے یہ
مکھی کی طرح اسمیں الجھتے ہیں حریص
جالا مکڑی کا ہے کہ دنیا ہے یہ

شمشاد۔ منشی شیخ محمد حسین خلف شیخ محمد قاسم نوشاد مرحوم رئیس قدیم بنگلور ملک میسور۔ آپ ۶ ماہ رجب ۱۳۰۰ھ ہجری کو پیدا ہوئے۔ سلسلۂ خاندان شاہ میراں عرف لالجی سے ملتا ہے۔ کتاب معلومات غیب آپکی بہترین تصنیف ہے۔ خواجہ عشرت لکھنوی سے تلمذ ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

موسمِ گل ہیں تو گلشن کی ہوا کھانے دے
آج کل بند قفس میں مجھے صیاد نہ کر

اتنا ہے گن گن کے کروٹیں بدلیں
شب وہ فرقت کی تھی سحر نہ ہوئی
کبھی دورِ فلک میں اے شمشاد
عیش سے زندگی بسر نہ ہوئی

تیری صورت تو پیاری اور بھلی معلوم ہوتی ہے
مگر کچھ شوخ چنچل منچلی معلوم ہوتی ہے
لبوں سے چاٹ کر بنت العنب کو شیخ جی بولے
زباں پر میری مصری کی ڈلی معلوم ہوتی ہے

شمشاد۔ نواب سلطان علی خاں عرف نبن صاحب لکھنوی۔ شاگرد حضرت جلال۔ زبان خوب اور اندازِ بیان دلپذیر ہے۔ دو شعر نذرِ ناظرین ہیں ؎

تمہاری چاہ میں یہ آج کون ڈوب مرا
یہ کیوں ہو تم عرق شرم میں نہائے ہوئے
بتو خدا تمہیں آباد رکھے دنیا میں
ہزاروں گھر گئے ویران بسے بسائے ہوئے

شمشیر جنگ۔ جناب خاص لامرا اعتماد الملک صاحبزادہ محمد خاں صاحب بہادر شمشیر جنگ خلف نواب فیض محمد خاں خلف اکبر وزیر الدولہ مرحوم جاگیردار ٹونک۔ خاصی طبیعت پائی تھی۔ مضمون آفرینی کے ساتھ لطف زبان پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ۶۰ یا ۶۲ برس کی عمر میں ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

ترے عشاق ہیں صورت نہیں سیرت دیکھنے والے
وہی کچھ ہیں حقیقت میں حقیقت دیکھنے والے
الٰہی اجنبی کیسا بنا ہوں بزمِ جاناں میں
تعجب میں کھڑے ہیں میری صورت دیکھنے والے

شمع

شمع۔ مولوی محمود خاں صاحب بدایونی تلمیذ جناب ضیاء۔ خوش فکر شاعر ہیں۔ دو شعر جو دستیاب ہوئے ہیں نذر ناظرین ہیں: ؎

غضب کا سیل مری چشم اشکبار میں ہے	بلا کا شور نفس ہائے پر شرار میں ہے
مری طرف سے کدورت مزاج یار میں ہے	مرے نصیب کا لکھا خط غبار میں ہے

شمیم

شمیم:۔ منشی محمد علی صاحب۔ سر رشتہ دار ریاست نرسنگھ گڈھ ملک مالوہ شوخ طبع شاعر ہیں۔ مولوی سید نذیر حسن صاحب فقۃ سندیلوی کے زمرۂ تلامذہ میں ہیں۔ کلام یہ ہے: ؎

رہتا ہے یار چشم تمنا کے رو برو	آٹھوں پہر ہے عاشق شیدا کے رو برو
اس پیار کی نگاہ سے دیکھا کہ مر گیا	مجنوں جو آ گیا کبھی لیلےٰ کے رو برو
وہ ہمیں بھولے ہوئے ہیں ہم انہیں کرتے ہیں یاد	صدقے انکے ہو گئے قربان اپنی یاد کے
وہ ستم ایجاد کہتا ہے یہی عشاق سے	قمریوں کی گردنوں میں طوق ہوں فولاد کے

شمیم

شمیم:۔ سید خلیل احمد ترمذی خلف و شاگرد حضرت وسیم خیرآبادی۔ عربی و فارسی کی تعلیم عالمانہ ہے۔ انداز بیان دلکش ہے۔ اور کلام میں درد ہے۔ نمونۂ کلام نذر ناظرین ہے۔

آ جائے مجکو لطف خزاں میں بہار کا	تم قبر پہ چڑھاؤ کوئی پھول ہار کا
لو شمع آرزو ہوئی گل صبح ہو گئی	لو چل بسا مریض شب انتظار کا
نکلے تھے پر ابھی کہ اسیر قفس ہوا	آیا نہ مجھ کو راس زمانہ بہار کا
اے رہنے والو باغ کے الوہم تو چل بسے	اب آئے یا نہ آئے زمانہ بہار کا
لائی اُڑا کے گیسوئے مشکیں کی بو شمیم	ممنون کیوں نہ ہوں میں نسیم بہار کا

شمیم

شمیم:۔ منشی سید ولایت احمد صاحب سب انسپکٹر پولیس خلف منشی اکبر علی ساکن خیرآباد شاگرد حضرت امیر مینائی۔ آپ ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے جناب وسیم و حضرت ریاض سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ طبیعت شوخ اور غزل کے مناسب

تھی۔ زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ زندہ دل۔ خوش مزاج اور خلیق انسان تھے۔ محکمہ پولیس میں خوب خدمات انجام دیں۔ قریب ۶۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

پہ ہے خونِ ناحق نہ گھبرا تو اے دل
پکڑ لوں گا محشر میں دامن کسی کا

یہ ڈھٹائی دیکھیے دل لیگئے پہلو سے آپ
اُلٹے مجھ سے پوچھتے ہیں کیا ترا جاتا رہا

کچھ جو تسکین دیکھنے سے انکے دل کو ہو گئی
وہ یہ سمجھے درد دل سب مٹ گیا جاتا رہا

نوٹ مندرجہ بالا آخری شعر کو پڑھ کر مرزا غالب کا یہ شعر فوراً ذہن میں آموجود ہوتا ہے:۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

میری آنکھوں میں سمائی ہے تمہاری صورت
جلوہ طور ہے کیا شعلۂ ایمن کیسا

وہ میری قبر کو ٹھکرا کے بولے
رہو گے خواب غفلت میں کہاں تک

نہالِ آرزو کیوں ہو نہ سرسبز
کہ سینچا ہے اسے خونِ جگر سے

اثر ہے میری چشم تر کا اے دل
کہ وہ دشمن پہ ایسے آج برسے

اے خوش نگاہ گردش چشم سیاہ سے
یُوں میرے دل کو پیں کہ سرما کہیں جسے

ایسے ہی بھولے تو ہیں حضرت دل اے ناصح
تُو نے سمجھایا انھیں اور یہ تری مان گئے

جان پاتے ہیں نئی جی سے گذرنیوالے
عشق میں مر کے بھی مرتے نہیں مرنیوالے

کاکلِ مشکیں گل عارض پہ ہے آئی ہوئی
یا کہ پھولوں پر چمن میں ہے گھٹا چھائی ہوئی

غم وہ شے ہے سامنے دشمن کے بھی میں رو دیا
یا خدا دل کا بُرا ہو کیسی رسوائی ہوئی

کیوں نہ صدقے ہوں تیغِ قاتل کے
اس نے ارمان نکالے ہیں دل کے

کیا چمن سے بہار جاتی ہے
نالے پرورد ہیں عنادل کے

شمیم۔ بابو چھیتر لال بھرتپوری شاگرد شیدا دہلوی۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں تھے۔ بعد کو وطن چلے گئے۔ شاعر خوش فکر ہیں۔ اور زبان شستہ اور سلیس ہے نمونہ کلام یہ ہے

اٹھتی ہے کس مزے کی خلش ہر نفس کے ساتھ
کانٹا تری نظر کا کہیں دل میں رہ گیا

عشق پردہ نشیں کا پاس رہا
راز دل لب سے آشنا نہ ہوا

قالب خاکی میں دل نہ تھا دلمیں تھا وہ جلوہ گر
بت مرا کعبہ میں کعبہ میرا بت خانے میں تھا

پردہ دار راز الفت بن گئی تھی بیخودی
ورنہ یارا ضبط کا کب تیرے دیوانے میں تھا

غنیمت ہے وہی دم زندگی میں
گذر جائے جو حق کی بندگی میں

رخ روشن پہ لہراتی ہے کاکل
یہ ناگن کھیلتی ہے چاندنی میں

مثال آئینہ حیراں ہوگئے کیوں
نظر آیا تمھیں کیا آرسی میں

داغ جگر سے مٹ گئی تاریکی فراق
روشن چراغ آٹھ پہر اپنے گھر میں ہے

چھالے جو کچھ پڑے تھے مرے سوز آہ سے
گردوں پہ آرہے ہیں نظر مہر و ماہ سے

ناکام تیرے در سے پھرا ہے یہ کون آج
حسرت ٹپک رہی ہے یہ کس کی نگاہ سے

شمیم:- جناب صاحبزادہ معظم علی خاں صاحب بہادر نجیب آبادی خلف نواب محمود خاں صاحب تلمیذ حضرت سید احمد علی صاحب رسا۔ طباع اور خوش فکر ہیں۔ زبان بہت صاف اور ستھری ہے۔ اور کلام جاندار ہے۔ یہ کلام ہے۔ ـہ

ہاں جو تکرار ہی منظور ہے تو بات ہو اور
ورنہ کب آپ کا شکوہ مرے لب تک آیا

کوئی بگڑی کا نہ مونس ہے نہ غمخوار نہ دوست
سچ تو یہ ہے کہ یہ اک یار ہے بن آئی کا

حاجت نہیں کہ منت خنجر اٹھاؤں میں
بہتا ہے اب لہو مرے زخم جگر سے آپ

اللہ اللہ نظر آئی خدا کی قدرت
دیکھ کر ایک بت ہوش ربا کی صورت

اللہ اللہ ری تاریکی شبہائے فراق
موت بھی پھر گئی بالیں سے پریشاں ہو کر

خوف ان کی برہمی کا بن گیا مہر دہن
حال دل وہ پوچھتے ہیں ہم بتا سکتے نہیں

وہ نہ آنے پائے اور موت آ گئی
رہ گئی دل ہی میں حسرت کیا کہوں

نمک بھی چھڑکتے ہیں دے دے کے چرکے
محبت میں کیا کیا مزے آرہے ہیں

کب وفا ہوگا وعدۂ فردا
منہ دکھاؤگے کیا قیامت ہیں

کس روز تیرِ غم کا نشانہ نہیں ہوں میں
کس رات دردِ دل سے تڑپتا نہیں ہوں میں

کہتے ہیں کیا کروں وہ مرض میرا دیکھ کر
مر دیکے کہیں جئے ہیں مسیحا نہیں ہوں میں

جانے دو بس نہ منہ مرا کھلواؤ۔ دردِ دل
کیا جانے کیا سبب ہی جو کہتا نہیں ہوں میں

بیٹھا ہوں بزمِ یار میں اللہ ری بیخودی
کچھ بھی خبر نہیں ہی کہ ہوں یا نہیں ہوں میں

ٹھہر تو آج وہ مخمور بھی ہیں اور خلوت بھی
دل بیتاب یہ موقع بڑی مشکل سی ملتا ہے

نہیں دشوار ملنا آدمی کا سہل ہے لیکن
جسے انسان کہتے ہیں بڑی مشکل سی ملتا ہے

اب بے اثری دل کو جلاتی ہی ہمارے
جلتے تھے عدو آہ شرربار سے پہلے

نہیں سرمایۂ طاعت تو کیا ہے
ہمیں فضلِ خدا کا آسرا ہے

نہیں ملتے ہو دشمن سے تو کیا ہے
تمہارا اور اُس کا دل ملا ہے

اٹھائے کوئی کب تک ظلم بیجا
ستم کی بھی کچھ آخر انتہا ہے

ٹھہرے نہ جگر میں بھی مرے دل میں گذر کے
کیا شوخ ہیں یہ تیر تری شوخ نظر کے

شمیم: مولوی محمد عبد الرؤف صاحب۔ ان کا دیوان شائع ہے۔ آدمی خوشگو اور خوش فکر ہیں۔ معاملہ بندی کیطرف توجّہ زیادہ ہے۔ روزمرّہ صاف اور زبان شستہ ہے لیکن جابجا تعقیدیں کلام کو بدمزا کر دیتی ہیں۔ نمونۂ فکرِ رسا نذرِ احباب ہے: ؎

ہے مسیحائی کا دعویٰ بے دلیل
کہئے کس بیمار کو اچھّا کیا

عجب سرا ہی سرائے فانی ثبات اسمیں نہیں کسی کو
کسی کا اس جا مقام دیکھا کسی کا پا در رکاب دیکھا

قتلِ عاشق انھیں منظور ہوا خوب ہوا
دردِ سر روز کا تھا دور ہوا خوب ہوا

قفس مرا ابھی گلشن میں اور رہنے دے
چمن کی دیکھ لوں جی بھر کے میں فضا صیاد

جو اُس نے دیکھا نگاہ بھر کر چبھے ہیں دل میں ہزاروں نشتر
رولا دیا دو پہر برابر جو بات کی ایک مسکرا کر

کرامت اپنی دکھائینگے کیا مرے جنازے پہ آئینگے کیا
بھلا وہ مجکو جلائینگے کیا جنھوں نے مارا جلا جلا کر

زلف کھلتی ہے نقاب رخ روشن ہو کر
مہ نکلا ہے چراغ تہ دامن ہو کر

مشکل ہے رہروان عدم کا پتہ ملے
وہ اس طرح گئے کہ قدم کا نشاں نہیں

اے بت یہ میرے حسن عقیدت کی بات ہے
اللہ بھی خفا ہے جو تو مہرباں نہیں

اس کے رخ صبیح پہ سبزہ عیاں نہیں
زنگ آگیا ہے آئینۂ آفتاب میں

نہیں معلوم گردوں کو ہے مجھ سے دشمنی کیسی
اگر دم بھر ہنساتا ہے تو برسوں ہی رلاتا ہے

چلا تو ہے میخانہ کی سمت زاہد
یہ جبّہ یہ دستار اللہ رکھے

شمیم :- شیخ مراد علی صاحب متوطن اترولی ضلع علی گڑھ۔ اچھا شعر کہتے ہیں مگر کہیں کہیں متروکات کا استعمال کر جاتے ہیں۔ زبان بری نہیں ہوتی۔ مشاق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کلام ہے :-

دست دعا بلند کبھی اپنا گر ہوا
آئی ندا کہ بند اجابت کا در ہوا

رہا ہم پر جنون فتنہ ساماں مہرباں برسوں
اڑائیں دامن صحرا کی ہم نے دھجیاں برسوں

بجز میرے رہا ہے کون صرف امتحاں برسوں
نگاہ ناز کی کس پہ چلی ہیں بجلیاں برسوں

چارۂ درد جگر جب نہ اجل سے بھی ہوا
درد ہی کو دل بیتاب کا درماں سمجھے

آپ کے ساتھ ہی یہ جان بھی رخصت ہوگی
آپ اگر پہلو سے اٹھے تو قیامت ہوگی

شمیم :- جناب عباس مرزا صاحب عرف امراؤ مرزا صاحب لکھنوی تلمیذ میر وزیر علی صبا لکھنوی۔ ان کے والد کا نام امداد علی تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ زبان صاف تھی اور شعر کا انداز دلپذیر۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

گور پر کیا چاہئے اس کی پس مردن چراغ
حسرت و حرماں کے داغوں سے ہو جس کا تن چراغ

وصل کی پھر اس کے کیوں کرتا ہے تو آس اے شمیم
جانتا تو ہے کہ پروانے کا ہے دشمن چراغ

ہر وقت ہجر یار میں ہے یہ صدائے دل
چھوٹے کبھی نہ ہم سے کوئی لگائے دل

تعزیر چاہئے گنہ عشق کے لئے
ہم شوق سے جلائیں ہے سزائے دل

شمیم۔ جناب نواب سیّد محمد مرتضیٰ خاں صاحب نبیرہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم و خلف اکبر ممتاز الدّولہ میر عبدالحیٔ خاں صولت جنگ مرحوم۔ ۱۲۹۹ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام محمود اختر ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد آپ لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اوائل عمر سے شعر و سخن پر فریفتہ اور معانی کے شیفتہ ہیں۔ فارسی اور عربی میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت رکھتے ہیں۔ اُردو میں شمیمؔ اور فارسی میں عشرتیؔ تخلّص کرتے ہیں۔ اُردو میں فصیح الملک حضرت داغ سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ فارسی نظم و نثر میں افتخار الشعراء حافظ خان محمد صاحب شہیر مرحوم تلمیذ حضرت غالب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ خوش وضع امیر زادے اور نازک خیال شاعر ہیں فی البدیہہ اور زُود گوئی میں کمال حاصل ہے۔ فتح پور کے مضافات میں ان کی معقول جائداد ہے۔ اور کانپور میں چند پرانی عمارتیں ان کے اسلاف کی یادگار ہیں۔ نہایت سلیم الطبع اور با اخلاق شخص ہیں۔ زبان صاف کلام چست اور معنی خیز ہوتا ہے۔ اُردو دیوان کے ہزار صفحات ہیں۔ جن میں غزلیات کے علاوہ قصائد۔ مخمسات۔ رباعیات وغیرہ موجود ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو: ؎

منوّر پرتوِ نورِ بتاں سے دل جو رہتا ہے
وفا اس واسطے کرتے ہیں سب اہلِ حرم میرا

نہ ہو نہیں سامنے میرے عدو سے لطف کی باتیں
خیال اتنا تو لازم تھا ستمگر کم سے کم میرا

گر یونہی دورہ رہیگا گردشِ افلاک کا
خاک میں مل جائیگا پُتلا ہماری خاک کا

دل کو چرا لیا یہ ستم تو نے کیا کیا
اے بُت تجھے خدا کی قسم تُو نے کیا کیا

وہ بیقرار ہو کے نکل آئے گھر سے آج
اے اضطرابِ دل یہ ستم تُو نے کیا کیا

اِک ہم کہ ہیں غفلت دل سے نہیں فرصت
اِک وہ کہ نشاں جن کو ملا رازِ نہاں کا

باتوں باتوں میں نہ کاٹو شبِ خلوت دیکھو
بات رہ جائیگی اور وقت گذر جائیگا

ایک دل وہ بھی ہے تیرے بس میں
اور کیا ہے سر و سامان میرا

دل کو وہ چھیڑ کے فرماتے ہیں
عشق کا دل میں نشان باقی رہا

لا مجھے لا پیئے پیکان میرا
جل گئی آگ اور دھواں باقی رہا

کھولا کسی نے بند جو اپنی نقاب کا
منہ پھر گیا ادھر سے اُدھر آفتاب کا

دیکھ سکتا ہے بھلا کون کمر کی صورت
کس کو آتی ہے نظر تار نظر کی صورت

سنگِ درِ جاناں کا پتہ کچھ نہ ملے گا
یہ سر جو رہا ناصیہ فرسا کوئی دن اور

جلوہ نہیں ہے یار کا جامِ شراب میں
اک آفتاب غرق ہے اک آفتاب میں

وہ بگڑے بات بگڑی حال بگڑا اک جہاں بگڑا
تری گردش کا ہیں لے نوبی مقدر پھاں کیوں

شمیم: شیخ ابوالحسن صاحب زمیندار قصبہ بھانی ضلع بارہ بنکی رشتہ دار راجہ نوشاد علی خاں صاحب مرحوم۔ ذہن رسا اور طبیعت عالی ہے۔ یہ نمونہ کلام ہے:

کم نوش ہوں میں شوق ہے بکی شراب کا
ساغر بھی چاہئے مجھے ساقی حباب کا

اس شہسوارِ حسن پہ اٹھتی ہیں انگلیاں
شاید ہلال عید ہے حلقہ رکاب کا

چھڑکا دہانِ زخم پہ سفاک نے نمک
پایا ہے آج ہم نے مزا اضطراب کا

وہ دل میں پیکیاں لینے ہیں آکے
نئے پہلو نکالے ہیں جفا کے

پس مردن زمیں میں گر گیا جلیں
خجل کس نے کیا میت اُٹھا کے

شمیم ناتواں کو سوئے یثرب
اڑا لے جائیں گے جھونکے ہوا کے

شمیم: حکیم محمد تقی صاحب ملازم ریاست ... ضلع ... کلام سے مشتاقی ظاہر ہوتی ہے۔ تلاش مضامین میں اکثر بہت دور نکل جاتے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:

جشنِ نوروز ہے مستانہ بہار آتی ہے
شیشۂ عیش جھلک کے لئے طرفہ پیمانے ہیں

ہاتھ پر قیس کی رو کر یہ کہا لیلیٰ نے
آج دنیا ہوئی خالی مرے دیوانے سے

بخت خوابیدہ وہ رکھتا ہوں کہ شبنم تھی
نیند ... آتی ہے ... افسانے سے

شمیم

شمیم :- منشی شبیر سنگھ صاحب متوطن موضع گوری۔ ڈاکخانہ گورسہائے گنج ضلع فرّخ آباد۔ آپ بیس خاندان کے اعلیٰ ٹھاکر ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ کی عمر ۴۰ برس سے متجاوز تھی۔ آپ کے آباؤ اجداد کا قدیم پیشہ تیغ زنی و نبرد آزمائی تھا۔ اب عرصہ سے ذریعہ معاش زمینداری ہے۔ علاوہ شعرگوئی کے نثر نگاری کا بھی شوق ہے کچھ دنوں جناب عزیز لکھنوی کو کلام دکھلایا ہے۔ مگر اب عرصہ سے اصلاح کسی سے نہیں لیتے۔ تین غزلیں جناب شمیم کے ایک دوست نے بھیجیں۔ ان کا انتخاب نذر ناظرین ہے :-

دلوں کو کرب و اذیت کا میزباں دیکھا	کہیں بھی چین کو ہم نے نہ میہماں دیکھا
قدم جما نہ سکے پھر تو ہجر کے صدمے	خیالِ یار کو جب دل میں میہماں دیکھا
رفتہ رفتہ دل کی بیتابی نے چھیڑا سازِ دل	کھلتے کھلتے کھل گیا آخر ہمارا رازِ دل
چشمِ خونابہ فشاں جب کر رہی ہو انکشاف	ہمنشیں پھر چھپ سکے کیونکر ہمارا رازِ دل
سننے والوں پر نہ بیتابی کا عالم ہو عیاں	عشق کی مضراب نے چھیڑا ہی میرا سازِ دل
مجنوں صفت شمیم جو دیوانے بن گئے	ہندوستاں میں نجد کے ویرانے بن گئے
ساقی کے لطفِ عام سے رندوں کے واسطے	دنیا کے گوشے گوشے میں میخانے بن گئے
ویران رکھئے یا انھیں معمور کیجئے	سب کے دلوں میں آپ کی کاشانے بن گئے
ہمدردیوں کو ان کی بنایا شریک حال	ہشیار اپنے کام میں دیوانے بن گئے

شمیم

شمیم :- مولوی سیّد جوّاد حسین خلف سیّد حیدر حسین یکتا رئیس امروہہ۔ سنہ ۱۲۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ اردو اور فارسی کے عالم تھے اور خطوط نستعلیق و شکستہ کے ماہر۔ جناب سید ابوالحسن صاحب فرقتی امروہوی اور جناب ساکت امروہوی سے فن شعر کو درست کیا۔ کچھ دنوں بعد مولوی ساکت صاحب سے علیحدگی اختیار کرلی۔ حضرت ساکت کا مندرجہ ذیل شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے :-

یہ تو کہاں تھی ہمیں نے بسایا شمیم کو	سب جانتے ہیں اس مرے لطفِ عمیم کو

اپنا اکثر کلام اپنے شاگردوں کو پڑھنے کے لئے دے دیا کرتے تھے۔ گھر کے رئیس تھے۔ مگر جب گھر کی جائداد بے پروائی اور شوقینی کی نذر ہو گئی۔ تو ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ تیس برس حیدر آباد میں اور بیس برس ریاست رامپور میں رہے۔ جناب شمیم کے بڑے صاحبزادے سید برجیس حسن برجیس تخلص کرتے تھے اور مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی میں اچھی ترقی کر گئے تھے۔ عین شباب میں راہی ملک بقا ہوئے۔ جوانا مرگ بیٹے کی وفات نے جناب شمیم کی صحت کو بہت سخت صدمہ پہنچایا۔ اور آخر کار دو برس کے بعد ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں خود بھی بعمر ۷۶ سال انتقال کر گئے۔ امروہہ اور اس کے قرب و جوار میں شاگردوں کی اچھی تعداد چھوڑی۔ آخر عمر میں غزل گوئی ترک کر دی تھی۔ مراثی و سلام وغیرہ بہت کہے مگر مزاج کی بے پروائی نے جمع کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ جناب افسر صدیقی صاحب امروہوی نے یہ شعر روانہ کئے ہیں۔ جو نذر ناظرین ہیں:—

بے کسی کشتہ پہ گریاں دیدہ خونبار صبح	خود شہادت دے رہی ہے سرخیِ رخسار صبح
خطِ ابیض کو بھی سمجھا رشتہ زنار صبح	تیرے شیدا کو نظر آئی خدائی بت پرست
ہم کو آثارِ قیامت بن گئے آثار صبح	وصل کی شب صور کی آواز تھی بانگِ اذان
سورۂ الفجر ہے یا مصحف رخسار صبح	ان کی صورت دیکھ کر حیرت سے کہتے ہیں بشر
جس طرح سے شب کو حق میں شہرت دیدار صبح	آب شمشیر صنم عاشق کے حق میں زہر ہے
یار نکلا ہے بنا ہے یوسف بازار صبح	آفتاب حشر چمکا اور خریدار آگئے
جب شفق دیکھو لٹا ہے پیرہن پر گلنار صبح	یاد روئے گل میں پھرو تخم ان تو ناہوں شمیم

شمیم — رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب رینہ خلف پنڈت اندر نرائن صاحب رینہ ۱۸۵۹ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جالندھر اور لاہور میں پائی۔

۱۸۸۱ء میں قانون کا امتحان پاس کیا۔ اور اس وقت سے ۱۹۰۸ء تک جالندھر ہی میں وکالت کرتے رہے۔ پیشہ وکالت میں پنڈت صاحب موصوف نے ایسا قابلیت کا ثبوت دیا کہ ہائی کورٹ نے آپ کو وکیل سے ایڈووکیٹ کا رتبہ بخشا پنجاب میں سب سے پہلے وکیل ہیں جو ایڈووکیٹ بنائے گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کو رائے بہادری کا خطاب ملا متدرجہ ذیل دو اشعار اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

گو ہم نمک حلالوں میں محسوب ہو گئے	پر اپنے دوستوں میں تو معتوب ہو گئے
جاتی رہی وہ آن وہ نزکی تمام شد	جب سے شمیم رائے سے مخطوب ہو گئے

شمیم صاحب علم ادب سے بھی خاص شوق رکھتے ہیں۔ حال میں آپ پنجاب ہسٹوریکل سوسائٹی کے صدر مقرر ہوئے ہیں۔ آپ بدھ مذہب کے بہت معتقد ہیں۔ فنون لطیفہ کے دلدادہ ہونے کے علاوہ آپ علم موسیقی اور فن شاعری کے ماہرین میں سے ہیں۔ اردو علم ادب میں آپ کو مولانا محمد حسین آزاد کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ علوم و ادب مغربی میں آپ کا مطالع نہایت متنوع اور وسیع ہے۔ حال میں آپ نے اپنا قیمتی کتب خانہ سارناتھ (بنارس) بدھ مست "دھارے" کی نذر کر دیا ہے آپ پنجاب کی مجلس قانونی کے رکن رہ چکے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں کل سلطنت برطانیہ کی یونیورسٹی کانفرنس میں پنجاب یونیورسٹی کی نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور یورپ کے اکثر ملکوں کی سیر کی۔ مطالعہ کی مانند آپ کی سیاحت اور واقفیت عامہ کا میدان بھی نہایت وسیع ہے۔ آپ ایک کہنہ مشق ناشر اور شاعر ہیں۔ ایام شباب میں آپ نے کثرت سے عشقیہ غزلیں لکھیں۔ لیکن اب طبیعت اس طرف راغب نہیں ہے۔ آپ کے کئی ناول شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ آپ کتب ذیل کے مصنف ہیں۔ چاند۔ تاریخی ناول۔ ایم ۔ اے ناول جس میں موجودہ طریقہ تعلیم

مری جان صدقے تری ہر ادا پر
منا پھر رہیں اے خفا کرنے والے

در دوست پر ہم سے لاکھوں کھڑے ہیں
جھکائے سروں کو دعا کرنے والے

شمیم ابتداء عشق کی ہم نے کی ہے
ہمیں اس کی ہیں انتہا کرنے والے

شناور

شناور: منشی صاحب مرزا خلف شاہ میر خاں فیض آبادی۔ شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔ زباندانی میں اچھی مہارت حاصل کی تھی۔ محاورہ بندی میں خوش سلیقہ تھے۔ اور انداز بیان مرغوب تھا۔ مگر کلام شہرت کا محتاج رہا۔ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اور مستند شعراء میں ان کا شمار تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو: ؎

دیر و کعبہ میں نہ جب پایا اسے
دل کو میں سمجھا ٹھکانا یار کا

کس سے شکوہ بے وفائی کا کروں
ہے طرفدار اک زمانہ یار کا

ماہ تاباں کو لگاتا ہے گہن
منہ کو زلفوں میں چھپانا آپ کا

یاد ہیں مجکو بھی عیاری کے دستور بہت
آپ ہیں حور تو بندہ بھی ہے پھر حور بہت

پھر شب عیش و طرب ہے وہی چرچا پھر ہو
وہی ساقی وہی ساغر وہی مینا پھر ہو

پھر اسی چال سے چلتے ہو غضب کرتے ہو
خوف آتا ہے مجھے حشر نہ برپا پھر ہو

گر فنا کی ہو حقیقت سے زمانہ آگاہ
سخت ناداں ہے جو منت کش عیسیٰ پھر ہو

عشق کی کھا کے قسم پھر نہ شناور کر عشق
اعتبار اپنا کھو دیکھ نہ رسوا پھر ہو

اے آئینہ رو ایک مجھی کو نہیں حیرت
بت بن گیا جس کو تری صورت نظر آئی

زلفوں سے صنم شان ہوئی کفر کی ظاہر
رخ سے ترے اللہ کی قدرت نظر آئی

شوخ

شوخ: محمد علی حسین خاں خلف محمد فخر الدین خاں صاحب آنریری مجسٹریٹ رئیس شاہجہانپور۔ آپ کے چار تخلص ہیں۔ شوخ۔ طرار۔ برق۔ بیقرار۔ جو تخلص بہ آسانی موزوں ہو جاتا ہے۔ وہی لکھ دیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر برق

اللہ صبر دے مجھے یا اس کو دے وفا
دو التجائیں ہیں یہ تری بارگاہ میں

لطف سے بڑھ کے ستم میں مجھے ملتا ہے مزا
پیار کرتا ہوں جنہیں میں وہ جفا کرتے ہیں

تیر سے کم نہیں گو اصل میں یہ تیر نہیں
دل کو مجروح ترے ناز و ادا کرتے ہیں

لوگ کہتے ہیں مسیحائے زمانہ جن کو
لیجئے وہ مرے مرنے کی دعا کرتے ہیں

دل کو بھی میں رقیب سمجھتا ہوں عشق میں
جو ان کا دوست ہے وہ مرا آشنا نہیں

موت آتی ہے تری فرقت میں نیند آتی نہیں
جان جاتی ہے مگر دل کی تڑپ جاتی نہیں

نہ رہتے آپ میں سنتے جو یہ تو آتا ہے
ہم آپ سے ترے آنے سے پیشتر جاتے

پیار سے رکھتے ہیں وہ سینے پہ ہاتھ
اب ہمارے دل کی حالت اور ہے

نکالوں کیا دید کی ہوس میں کوئی ظلم و ستم تو دیکھے
کہ پھیر کر منہ میرے گلے پر وہ شوخ خنجر چلا رہا ہے

اٹھاؤ ساغر بھرو صراحی چلو گلستاں میں بادہ خوارو
کہ لطف اب ہوگا میکشی کا وہ ابر گردوں پہ چھا رہا ہے

غم محبت نے اک ستمگر کیا ہے اس گھر کو ایسا ویراں
نہ کوئی حسرت رہی ہے دل میں نہ کوئی اب تک ابھر رہا ہے

میں بھی اور وہ بھی ہیں خوش دونوں ہی جل جانے سے
لاگ ہے شمع سے ان کو مجھے پروانے سے

ہم تو ہیں دیکھ کے زاہد نے بھی دل تھام لیا
ناز سے جھومتے نکلے جو وہ میخانے سے

ترس آہی گیا آخر تڑپ دیکھی جو بسمل کی
گلے سے جھجک کے پھر ملنے لگی تلوار قاتل کی

ادا ہے اب کسی کی شوخ آنکھیں اٹھ نہیں سکتیں
دلوں کا راز کہتی ہیں نگاہیں اہل محفل کی

شوخ

شوخ:- شیخ محمد جان عظیم آبادی سوداگر کتب۔ تلمیذ حضرت داغ۔ اخبار بے مثال پنچ دہلی پنچ وغیرہ میں چٹکیلے پھڑکتے ہوئے ظریفانہ مضامین لکھتے تھے۔ صاف اور سیدھا شعر کہتے۔ زبان صاف ہوتی۔ محاورات درست۔ "شوخ ظریف" کے نام سے جسقدر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سب ان کے زور قلم کا نتیجہ تھے۔ شاعرانہ مباحث و مناظرات سے دلبستگی تھی۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں انتقال کیا۔ فسانہ شوخ اور چند مختصر رسالے ان کی یادگار ہیں۔ کلام یہ ہے:-

وصل اس کو ہے مجھے فرقت نصیب
غیر کی اور میری قسمت دیکھئے

اب بھی ہے انکار وصل غیر سے
آئینہ میں اپنی صورت دیکھئے

پوچھئے مجھ سے نہ حالِ سوزِ دل
آپ پروانہ کی حالت دیکھئے

وہ لٹے جاتی ہے دامن میں صبا
آپ کے گیسو کی نکہت دیکھئے

سی دئیے ہیں ہونٹ رُعبِ حسن نے
مُنہ تر اکتی ہے حسرت دیکھئے

مُنہ چھپا لیتے ہیں مجھ کو دیکھ کر
یہ سزائے جرمِ اُلفت دیکھئے

شوخ وہ کرتے ہیں وعدہ حشر کا
ہو نہ ہو کب ہو قیامت دیکھئے

رباعی

ہر شعر کا دعوےٰ ہے کہ یکتا ہوں میں
مضمون بھی کہتا ہے اچھوتا ہوں میں

قبضہ ہو نہ کیوں ملکِ سخن پر اے شوخ
شاگردِ رئیسِ سخن آرا ہوں میں

شوخ:- منشی بنواری لال ولد منشی کشن نرائن شفیق۔ آپ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ خاندانی شاعر ہیں۔ محلہ نوبستہ شہر لکھنؤ میں قیام ہے۔ آپ کو منشی دوارکا پرشاد صاحب افق مرحوم سے تلمذ تھا۔ ۱۱ر فروری ۱۹۳۲ء کو شاہ افغانستان نے ایک قصیدہ کے صلہ میں ایک طلائی گھڑی مرصع اور ایک عدد قلم پارکر مرحمت فرمایا۔ ۲۰ فروری ۱۹۳۲ء کو مہاراجہ صاحب بنارس کی تاج پوشی کے جلسہ میں آپ نے قصیدہ پڑھا جس کے صلہ میں مہاراجہ صاحب نے دستِ مبارک سے خلعت اور تین سو روپیہ نقد عطا فرمایا۔ آپ کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

مستِ الست ہوں یہ مرا ظرف دیکھئے
چلو لگا لیا وہی پیمانہ ہو گیا

دل کو سکوں ہو کیسے اس ہاں پر اس نہیں پر
کچھ کچھ ہے مسکراہٹ کچھ کچھ شکن جبیں پر

جو گلکدہ ہو وہ ہر گو میخانہ بنا دے
ممکن ہے کہ ہر پھول کو پیمانہ بنا دے

شرط اتنی ہے کہ بڑھ جائے نہ پیمانے سے		شے کے پینے سے نہیں ہوتا ہے کوئی بھی گناہ

شوخ

شوخ: حاجی سید سلطان احمد صاحب لکھنوی شاگرد جلال لکھنوی اچھی طبیعت پائی ہے مضمون اور زبان دونوں باتیں کلام میں ہیں۔ باوجود تلاش کے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ بہم رسیدہ کلام کا انتخاب حاضر ہے:۔

غرض یہ ہے کہ نشاں تک رہے نہ مدفن کا		وہ میرے غم میں پس مرگ خاک اڑاتے ہیں
کہ فرض عین تھا اک بوسہ مینا ہم کو قرآن کا		تمہارا کیا ہوا نقصاں جو چوما مصحف رخ کو
شب فراق کوئی میرا غمگسار نہ تھا		دل اس کا دوست بنتا بھرتی تھی جان دم اس کا
کہ اپنے دل ہی پہ جب اپنا اختیار نہ تھا		کسی کے شکوہ بیجا سے فائدہ ہم کو
بس ایک اس کا غم ہے فقط غمگسار دل		جز یاد دوست کوئی نہیں دوستدار دل
یہ کون لے گیا مرا صبر و قرار دل		جلوہ یہ کس نے حسن کا اپنے دکھا دیا
کب دیکھنے کو آئے ہو جب ہم ہیں دم نہیں		خالی ستم سے لطف تمہارا صنم نہیں
سے نوشوں پر یہ کیا ہی جو اس کرم نہیں؟		کالی گھٹائیں میکدے پر چھائی رہتی ہیں
وہ ہم کو بھول کے بیٹھے ہیں ہم ان کو یاد کرتے ہیں		اگر کچھ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تو یہ کیا ہے
لگا کر جلتے دل میں آگ پھر برباد کرتے ہیں		جلانے کو ہیں وہ بجلی مٹانے کو ہیں وہ آندھی

شوخ: سید افسار علی صاحب قدیم وطن بلگرام ہے۔ مگر ان کے والد ماجد مولوی سید فرزند علی ساڈی ضلع بدایوں میں جا رہے۔ اس وقت سے یہی ان کا وطن ہو گیا۔ حضرت شوخ نے طبیعت بہت چلبلی اور شوخ پائی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے استاد حضرت امیر احمد مینائی نے ان کا تخلص شوخ تجویز فرمایا۔ فارسی و عربی کی تکمیل کے بعد انہوں نے خوش نویسی، شناوری اور فن شہسواری میں بھی کمال پیدا کیا۔ پھر انگریزی میں انٹرنس پاس کر لیا۔ شاعری کا مذاق فطری تھا۔ حضرت امیر مینائی کے فیض اصلاح سے طبیعت میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی۔ مگر

زیادہ دنوں جناب امیر سے استفادہ حاصل نہ کر سکے تھے کہ انہوں نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد سید منصب علی صاحب ہنر مرحوم شاگردِ رشید آفتاب الدولہ قلق لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ اب طبیعت بہت منجھ گئی ہے اور اصلاح کی ضرورت باقی نہیں رہی ہردوئی میں ماسٹر ہیں۔ ہردوئی میں حکام کی طرف سے کوئی جلسہ ہوتا ہے تو یہ نظم پڑھنے کے لئے ضرور یاد کئے جاتے ہیں۔ ہندی شاعری سے بھی ذوق ہے۔ اپنے کلام کو دلکش لہجہ اور انداز سے پڑھتے ہیں۔ پرتاثیر شعر ہوتا ہے۔ زبان کی شستگی اور بیان کی سلاست شوخی اور متانت کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے۔ روزمرہ صاف ہے۔ اب انتخاب کلام نذر ناظرین ہوتا ہے:-

رقیب نے وہ سرِ بزم آج کھائی چوٹ
کہ یاد آ گئی ظالم کو بھی پرائی چوٹ

لطف آ جائے جو ارماں میرے باہم ہو کر
اسکے سینہ میں رہیں عشق کے محرم ہو کر

فتنہ برپا ہوا اک حشر کا عالم ہو کر
انکی پازیب کچھ اس طرح بجی چھم ہو کر

آتشِ ہجر سے جل جل کے ہوئے ہیں یوں سرد
درد و غم ہو کے اٹھے اور گرے شبنم ہو کر

کم سنی ہے وہ ابھی طرزِ جفا کیا جانیں
ناز کہتے ہیں کسے کس کو ادا کیا جانیں

لیجئے کس لئے احسانِ اطبّا سر پر
مرضِ عشق کی یہ لوگ دوا کیا جانیں

شوخ ہے آٹھ پہر دل میں حسینوں کا خیال
بندۂ عشق ہیں ہم یادِ خدا کیا جانیں

خدا کا تو ہے جو یا ہم بتوں کو رام کرتے ہیں
تو اپنا کام کر واعظ ہم اپنا کام کرتے ہیں

ہمیں گر خط لکھے کوئی خدایا ہاتھ ہی ٹوٹیں
جواب نامہ میں شوخی سے وہ ارقام کرتے ہیں

وہ ہو مئے کہ خواب میں بھی نہ مجھے خمار آئے
کوئی ایک جام ساقی کہ نئی بہار آئے

کبھی کچھ کہا جو میں نے تو بگڑ کے مجھ سے بولے
چلو چپ چلے ہیں دیکھے بڑے وضع دار آئے

ہوئی قدر سر فروشی دل زار واہ کیا خوب
سرِ بزم ہنس کے بولے مرے جاں نثار آئے

تری شوخیوں کا شکوہ کبھی شوخ منہ پہ لایا؟
تجھے اعتبار آئے کہ نہ اعتبار آئے

چونک اٹھے فتنۂ محشر کہ یہ آفت کیا ہے
شور قلقل ہے یا شور قیامت کیا ہے

ہے یہ الفت کا مزا میں تو کروں پیار نہیں
وہ کہیں مجھ سے کہ آئی تری شامت کیا ہے

اس طرح سے دل محو تصور ہے کہ ہر دم
آنکھوں میں پھرا کرتی ہے تصویر کسی کی

برق نگہ ناز کسی جا پہ نہ ٹھیری
ہاں ہاں یونہی چل جاتی ہے شمشیر کسی کی

شوخ:- سید علی متقی خاں شوخ خلف سید علی مجتبےٰ خاں مجتبےٰ رئیس امروہہ استعداد عربی و فارسی معقول ہے۔ انگریزی بھی بقدر ضرورت جانتے ہیں۔ نہایت سلجھی ہوئی طبیعت ہے۔ اور بہت سنجیدہ مزاج ہیں۔ جس زمانہ میں مولانا محمد علی مرحوم نے اول مرتبہ ہمدرد جاری کیا تھا آپ بھی عملہ ادارت میں شامل تھے۔ تقریر اور تحریر دونوں باتوں میں اچھا دخل ہے۔ میونسپل کمشنر اور سینیئر وائس چیرمین رہ چکے ہیں۔ خط بہت پاکیزہ ہے۔ فن شعر میں سید محسن حسین صاحب تخی امروہوی سے تلمذ رہا ہے۔ ۴۰ سال کے قریب عمر ہوگی۔ عرصہ سے شغل شعر گوئی ترک ہے۔ ایک غزل جو رسالہ اعجاز امروہہ میں شائع ہوئی تھی۔ جناب منظور حسین صاحب افسر صدیقی نے کراچی سے روانہ فرمائی ہے۔ اس کا انتخاب حاضر خدمت ناظرین ہے:

الم کیا انتہا ہو جس الم کی
ستم کیا کوئی حد ہو جس ستم کی

نہ ہے قسمت مرا قاتل بنا وہ
جہاں میں دھوم تھی جس کے کرم کی

پیام موت ہے حکم رہائی
ہوئی میعاد پوری قید غم کی

دکھائے صورت اس پردہ نشیں کی
تو سمجھوں کچھ حقیقت جام جم کی

ہی نے دل دکھایا خوب اے شوخ
توقع ہم نے کی جس سے کرم کی

شوخی

شوخی:- منشی نادر شاہ خاں رامپوری۔ آپ کے والد محمد خان خاں رامپور کے پٹھان تھے۔ شوخی دہلی میں پیدا ہوئے۔ اوائل شباب میں دہلی میں ملازمت اختیار کی مرزا غالب کا آخری زمانہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دو چار غزلیں ان کو دکھائی تھیں۔ وسط عمر

ہیں بنارس چلے گئے جہاں نائب ناظرِ عدالت کلکٹری اور پیشکاری کی خدمات انجام دینے کے ساتھ مرزا صابر سے مشورہ سخن کرتے رہے کلام کو دیکھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ مرزا غالب کو دو چار غزلیں دکھانے اور مرزا صابر کے تلمذ اور حضرت اسیر اور جناب منیر کے مقابل میں غزلیات پڑھنے کے باوجود آپ کا کلام مشاقی اور رسائی ذہن کا ثبوت پیش نہیں کرتا۔ انتخاب ملاحظہ ہو:

ہوں کسی حالت میں پر غصہ ہے اس دلگیر پر
خود بخود بل آگیا پیشانی تصویر پر

آج پھر پی کر شراب آئے ہیں ان کی بزم میں
کل نکلوائے گئے تھے ہم اسی تقصیر پر

ناتوانی سے نہ پائی جب تری محفل میں راہ
پہنچے ہم چڑھ کر صدائے نالہ دلگیر پر

حسن سوزافزوں ملا اللہ کے گھر سے تجھے
اور کیا تیرے لگیں گے او بت بے پیر پر

بجھائی تشنگی سوز غم فرقت کی کثرت نے
کہ پانی ہو گیا پھرتے ہی خنجر میری گردن پر

ہر سخن پہ جان نہ دینے کا ہے گلا
اک بات آگئی ہے بت خود نما کے ہاتھ

بنا کروں کوئی میخانہ جی میں ہے شوخی
کہ بعد مرگ زمانہ میں یادگار رہے

تلو جا سے ہے داغوں نے جلایا کفن اپنا
کہتے ہیں کہ مردے میں حرارت نہیں ہوتی

کچھ روز جوانی کے مزے لینے دے زاہد
دو چار برس میں تو قیامت نہیں ہوتی

شور

شور: منشی سید اسناد علی مختار عدالت متھرا۔ ۱۸۵۹ئہ میں فتح پور سیکری میں پیدا ہوئے۔ سید عالم عالی ان کے والد آگرہ میں کلکٹری کے دفتر میں ملازم تھے۔ اس وجہ سے ابتدائی مشق سخن میں وہاں کے نامی شعرا مثل مرزا حاتم علی بیگ مہر۔ انکے بھائی مرزا ماہ اور خلیفہ گلزار علی اسیر کی صحبت نصیب ہوئی۔ مرزا خادم حسین رئیس کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہے۔ اچھے شاعر اور قواعد فن عروض سے ماہر تھے اصلاح دینے میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ منشی رادھا موہن عاجز اور منشی گوبند سہائے سنبھال ان کے نامی شاگردوں میں تھے۔ متھرا سے ایک رسالہ مذاق سخن جاری کیا تھا۔ دو دیوان عاشقانہ

ایک دیوان نعتیہ اور مثنوی افسانۂ عبرت ان سے یادگار ہے۔ انداز بیان دلکش اور طبیعت رسا پائی۔ یہ انتخاب کلام ہے:-

محشر میں منع کرتے ہو فریاد کے لئے
یاں بھی نہ فیصلہ ہو کسی دادخواہ کا

ترچھی نگاہیں دل پہ چھری بن کے پھر گئیں
سیکھا ہے ابروؤں نے چلن ذوالفقار کا

عزم ہے تیغ آزمائی کا
اب خدا حافظ اس کلائی کا

نیکی کرتے برائی ملتی ہے
یہ زمانہ نہیں بھلائی کا

کبھی جو خواب میں حوروں سے ہم دوچار رہا
خیال یار سے برسوں میں شرمسار رہا

شراب کیا وہ جسے پی کے ہوشیار رہا
وہ عشق کیا جو طبیعت پہ اختیار رہا

خطائیں داور محشر نے بخش دیں سب کی
گناہگار تمہارا گناہگار رہا

نہ دیر والوں میں عزت نہ کعبہ والوں میں
بتوں کے عشق میں کافر نہ دیندار رہا

نالۂ دل کا شب فرقت عجب انداز تھا
جس کے آگے شور محشر دور کی آواز تھا

خوف رسوائی سے آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں
سات پردوں میں تھے آنسو نہیں تو راز تھا

کیا کر گئی جادو تری شمشیر نظر آج
آپس میں کٹے مرتے ہیں دل اور جگر آج

تنہائی میں اک تو ہی تو ہمدم ہے ہمارا
اٹھ اٹھ کے کہاں جاتا ہے اے درد جگر آج

تاثیر کی پیدا یہ مرے نالۂ دل نے
بوسے لب فریاد کے لیتا ہے اثر آج

مچلے ہوئے بیٹھے ہیں کہ دل لے کے اٹھیں گے
کیونکر انہیں سمجھائیے نادان بہت ہیں

ہنگام نزع مجھکو جو آتی ہیں ہچکیاں
جھوٹے سے آج یاد کسی نے کیا نہ ہو

دل جس کو دے چکے وہی دشمن ہے جان کا
عاشق سا بدنصیب کوئی دوسرا نہ ہو

نکلا جو منہ سے میرے برا ہو رقیب کا
بولے وہ کس ادا سے کہ تیرا برا نہ ہو

شور۔ محمد شفیع الدین خاں برادر خورد جناب جاد و نشان صاحب لبکھاروی شاگرد جلیس۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ چند شعر جو دستیاب ہوئے نذر ناظرین ہیں:-

اے شیخ تو شریک ہو بزم شراب میں / انکار بھی گناہ ہے کار ثواب میں
ہم اے ضبط دل کو سنبھالے ہوئے ہیں / مگر چرخ کے پار نالے ہوئے ہیں
دکھا ان کو تاثیر نالوں کی اے دل / جو کہتے ہیں دل کو سنبھالے ہوئے ہیں
مجھے دیکھ کر وہ رقیبوں سے بولے / مری بزم کے یہ نکالے ہوئے ہیں
مرید مغاں تھے ہم اے شور کل تک / مگر آج اللہ والے ہوئے ہیں

شور

شور۔ مرزا محمود بیگ۔ دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ مرزا منش اور بہت خوش مزاج شخص تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں قدرت اللہ شوق سے دہلی میں ملاقات کی تھی۔ بہت ہی پرگو تھے۔ خیال کی رفعت شوخی اور متانت کے ساتھ دست و گریبان ہوتی ہے۔ یہ نمونۂ کلام ہے۔

پاس خاطر سے نہ چوسر کھیلنے میں کچھ کہا / جیت لی کل ہم سے بازی آپ نے ہاری ہوئی
آہ کھینچوں تو جلے عالم نہ کھینچوں میں جلوں / زندگی اس کشمکش میں اپنی اب بھاری ہوئی
لالہ حمرا زمیں پر آسماں پر ہے شفق / یاں تلک اس چشم تر اپنی سے خونباری ہوئی
تیری خواہش جس نے کی تو اسکے سر چڑھ گئی / کیوں رہی اے بنت العنب تو ایسی مستانی ہوئی

شور

شور۔ جناب رشید احمد صاحب قریشی شاگرد حکیم حنیف علی رعب شاگرد جلال لکھنوی۔ عربی ہائی سکول دہلی میں تعلیم پائی۔ شعر گوئی کی طرف قدرتی میلان ہے کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

تم قابل خطاب تو سمجھے بھلا مجھے / اچھا برا ہوں میں کہے جائے برا مجھے
میں اور تشنہ کام رہوں تیرے دور میں / آنکھوں کا صدقہ جام کوئی ساقیا مجھے
جلنے کو ناز برق اٹھائے مری بلا / کیا کم ہے تیرا خندۂ دنداں نما مجھے
نہ کھلتا تھا کہ یہ دلبستگی کیوں ہے اذیت سی / جو دل چیرا تو نکلے اس میں تیر ناز کے ٹکڑے
آوارگی نہ جائیگی جبتک ہے دم میں دم / وحشت میں ہر نفس ہے سمند ہوا مجھے

شور

شور:- حاجی افتخار الدین مرحوم۔ آپ بدایوں کی عدالت میں وکیل تھے فن سخن میں مولوی احمد حسین وحشت بدایونی سے تلمذ تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ۸۰ برس کی عمر پائی۔ ایک دیوان مطبوعہ ان کی یادگار ہے۔ شعر کا مذاق بہت عمدہ اور قواعد فن سے واقفیت اچھی پائی جاتی ہے۔ معاملہ کے شعر خوب کہتے ہیں۔ کلام بامزا ہوتا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو:-

جلوہ افگن ہے فروغ رخ تاباں کس کا
رات دن تکتا ہے منہ مہر درخشاں کس کا

سجدۂ شوق کا ہر نقش مٹانے کے لئے
خاک پر لوٹ گیا گوشۂ داماں کس کا

چلتا ہوا فقرہ ہے تری تیغ ادا کا
خود کام کرے نام ہو بدنام قضا کا

نظر بازوں میں ہے جلوہ کسی کے روئے روشن کا
فسانہ رہ گیا ہے نام کو اب دشت ایمن کا

اڑا دینا وہ فقروں میں لگا لینا وہ باتوں میں
نکل جانا وہ شوخی سے چھڑا لینا وہ دامن کا

نگاہیں کام کر جاتی ہیں سب پنہاں اشاروں میں
نیا چلتا ہوا جادو یہ دیکھا چشم پر فن کا

خود فروشی جو کرے یوسف دوران اپنا
نذر بیعانہ کرے دل مہ کنعاں اپنا

پھر نہیں جانتے دل لے کے ستمگر دینا
شور دل دیجئے جواں کو تو سمجھ کر دینا

زور و شور آج دکھانا ہے تو لے ابر بہار
سامنا اب دیدۂ گریاں کا برابر دینا

خیال عیش تو اے چرخ کوئی خواب نہ تھا
شب وصال نہ تھی موسم شباب نہ تھا

فتنۂ حشر نیا حشر میں برپا ہوگا
ان کو بے پردہ جو دیکھیں گے تماشا ہوگا

وعدہ وصل کا اقرار نہ پورا ہوگا
آج بھی کل کی طرح وعدۂ فردا ہوگا

گیسوئے جاناں کا سودا ہو گیا
ہم کو بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا

آنکھیں چرا رہے ہیں ملاتے نہیں نظر
ملتا نہیں جواب ہمارے سوال کا

ہیں مرے دم سے جفائیں ساری
یاد کرکے مجھے پچھتائے گا

جل بجھ کے رہ گئی دل سوزاں کی کائنات
کچھ داغ سا ہے سینہ میں دل کا نشاں نہیں

مٹا رہا ہے جہاں مجکو مثلِ حرف غلط
زبان پر بھی نہ آوں وہ داستاں ہوں میں

شریک درد ہوں ہر ایک غم رسیدہ کا
جو کوئی آہ کرے اس کا ہم زبان ہوں میں

وہ اور وعدہ وصل کا اپنی زبان سے
پیغامبر یہ بات بنائی ہوئی سی ہے

وہ آنکھیں دل جو چھینیں دلبری کی اک ادا ٹھہرے
قیامت ہو کہ شوخی بنکے آنکھوں میں حیا ٹھہرے

الٹ دو رخ سے برقع بنکے خود خورشید محشر تم
ابھی مٹنا ہے جھگڑا حشر پر کیوں فیصلہ ٹھہرے

وعدہ کبھی ملنے کا وہ پورا نہیں کرتے
جب کہئے تو کہدیتے ہیں اچھا نہیں کرتے

میری آنکھوں میں آئیے تو سہی
اپنا جلوہ دکھائیے تو سہی

سر یہ حاضر ہے میر البسم اللہ
آپ خنجر اٹھائیے تو سہی

جاں قدموں کیساتھ جائے گی
غیر کے گھر میں جائیے تو سہی

شور

شور: مسٹر جارج پیش شور معروف بہ شور صاحب۔ غدر سے قریب ۸۰ سال قبل ان کے بزرگ نواح دہلی میں آئے تھے۔ اور اسلامی طرز معاشرت اختیار کر لیا تھا گو مذہبًا عیسائی رہے۔ شور صاحب اوائل مشقِ سخن میں مرزا رحیم بیگ ساکن میرٹھ سے مشورہ کرتے رہے پھر قطب الدین مشیر دہلوی اور ان کے بیٹے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لیکر رتبہ استادی حاصل کیا۔ ہر چند پور ضلع میرٹھ اور علی گڑھ میں چند دیہات ان کی ملکیت تھی معاش کی طرف سے بیفکر اور بڑے زندہ دل یار باش خلیق متواضع منش تھے۔ شاعری کا شوق اس درجہ تھا کہ کسی وقت فکر سخن سے فارغ نہ رہتے تھے۔ ہندی زبان کی بھی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی اکثر ٹھمریاں اور ہولیاں مشہور ہیں اردو میں صاحب تصانیف کثیر گذرے ہیں۔ چار یا پانچ اپنی زندگی ہی میں چھپوا کر شائع کر دئے تھے۔ ہر دیوان جناب داغ دہلوی کی ہمطرح غزلوں سے معمور ہے۔ ۱۸۹۴ء میں ۷۰ سال کے قریب عمر پا کر انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ نذر ناظرین ہے۔

اس کی مژگاں کا تصور دل میں ہے
عمر بھر کانٹا سا اک کھٹکا کیا

خاموش رہا تو سوسنا ئیں
بولا تو نہ مجھ سے گفتگو کی

نمک ایسا نہ حسن ایسا زباں ایسی نہ آنکھ ایسی
غنیمت اور اقلیموں سے ہے ہندوستاں پھر بھی

اگرچہ داغ بھی مشہور ہے شیریں کلامی ہیں
مگر تم شور ہو کر شور ہو شیریں زباں پھر بھی

شور:۔ سید عبدالرحیم صاحب بریلوی شاگرد جناب خواہاں۔ صفائی زباں اور سلاست سے ان کی طبیعت کو کم مناسبت ہے۔ نمونۂ کلام مندرج ہے:۔

طوق گردن میں پڑے یا پاؤں میں زنجیر ہو
زلف کے سودے میں کیا کیا دیکھئے تعزیر ہو

بوسۂ زلف معنبر نہیں مانگا ہے ابھی
مشکیں کسواتے ہو کیوں میری خطا سے پہلے

شور

شور:۔ پنڈت برج کشور زتشی۔ آپ بتاریخ ۶ ر اکتوبر ۱۸۶۴ئ بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۱۹ئ میں اسسٹنٹ نائب دیوان مال ریاست کے عہدے سے پنشن پائی۔ اب فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر دہلی قیام ہے۔ اردو و فارسی ہر دو زبان میں شعر خوب کہتے ہیں۔ اردو کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

میں کیا قاصد لکھوں خط میں فراق یار کا مضموں
عبارت طول ہو گی حرف مطلب مختصر ہوگا

پرسش روز جزا پر دادخواہی میں نے کی
کاتب تقدیر نے دفتر کا دفتر رکھ دیا

قدر انساں کی ہوا کرتی ہے مر جانے کے بعد
پھول سے پیدا ثمر ہوتے ہیں مرجھانے کے بعد

آپ کی نیچی نگاہیں کچھ تو کہتی ہیں ضرور
فرق آتا ہے نظر میں دل میں فرق آنے کے بعد

ہمارا دم اکھڑتا ہے وہ دم غیر ونکا بھرتے ہیں
برا ہو ایسے جینے کا نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

لے چلی دل کی خلش جانب صحرا مجھکو
آنکھ دکھلائیگا کیا پاؤں کا چھالا مجھ کو

ساتھ آئے تھے رفاقت کو اسی دن کیلئے
چل دیئے ہوش و خرد چھوڑ کے تنہا مجھ کو

بیقراری مجھے کیوں کرتی ہے رسوا دن کو
رات کیا رونے کو اے دیدۂ گریاں کم ہے

شورش

شورش:۔ میرزا منعم۔ برادرزادہ و تلمیذ میرزا محمد اکبر طپش۔ رائے لچھمی نرائن

اورنگ آبادی اپنے تذکرہ "چمنستان شعرا" میں لکھتے ہیں۔ کہ اگرچہ شورش اپنے چچا یعنی حضرت طپش کے شاگرد تھے۔ مگر ذہانت وطباعی میں اپنے استاد سے بڑھے ہوئے تھے۔ بلکہ آخر میں طپش خود اپنا کلام شورش کو دکھانے لگے تھے۔

حضرت شورش مجردانہ وقلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ علم موسیقی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ ہندی شاعری میں بھی دسترس تھا۔ فارسی واُردو میں بہت کچھ کہا۔ مگر مسودات ضایع ہوگئے۔ ۱۱۷۲ھ میں انتقال ہوا۔ لچھمی نرائن شفیق نے تاریخ کہی۔ ع　مرگیا آہ شورش ہمدم۔ ۱۱۷۲

دو شعر مل سکے جو نذر ناظرین ہیں۔

ہمارے پاس پی آیا نہ آیا　　بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا
جب سنی ہے جامہ پہنے وہ چھلاوہ سبز　　تب سے پایا گلشنوں میں سرو نے ایجاد سبز

شورش

شورش:- جناب غلام احمد صاحب ابن محمد اکبر۔ اصلی وطن کشمیر تھا۔ مگر آپ کا خاندان عرصۂ دراز سے دہلی میں آیا تھا۔ شورش صاحب سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ وحسرتی کو دلی محبت تھی۔ نواب صاحب مرحوم تذکرہ گلشن بےخار میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "باد امی طریق آشنائی می سپرد" فن سخن میں آپ کو حضرت مومن سے تلمذ تھا۔ آپ مہاراجہ بنے سنگھ بہادر والی الور کے ملازم تھے مرض استسقاء میں مبتلا ہوکر ۸۰ سال کی عمر میں اس خاندان کو چھوڑ کر راہ گیر عالم بقا ہوئے ۱۲۱۹ھ میں جناب فصیح نے الور سے جو کلام روانہ فرمایا تھا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

دبیر فصیح الوری

"از ترجیع بند مرثیہ غدر"

عالم میں ایک شور قیامت بپا ہوا　　لو آسمان ٹوٹ پڑا ہائے کیا ہوا
ہر طرف کیوں ہے نالہ واہ ستا بلند　　عشرت کدہ جہان کا کیوں غم سرا ہوا
تھمتی نہیں ہے اشک مسلسل کی کیوں جھڑی　　کیوں چشم خوں فشاں ہے یہ کیا ماجرا ہوا

مرنے کے بعد رونے کی جن سے امید تھی
کیوں قطرہائے اشک نہیں زیبِ آستیں

افسوس ہے انھیں کا ہمیں پیٹنا ہوا
لختِ جگر ہے آنکھ میں شاید رکا ہوا

از غزلیات

کیا جانے عدو خونِ جگر پینے کی لذت
شورش سے مزا پوچھئے تلخ آبِ الم کا

کیا قیامت ہے کہ روزِ حشر ہے سر روزِ ہجر
تھا قیامت کیلئے یا رب مقرر ایک دن

ہمدم شبِ ہجراں میں اجل بھی تو نہیں ہے
حال اپنا کہیں کیا در و دیوار کے آگے

تا خواب میں بھی جلوہ فروز انکے نہو تو
ہم کوچۂ اغیار میں فریاد کریں گے

شورش:۔ میر زین العابدین خاں۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کے دوستوں میں تھے۔ ان کی شاعری کا زمانۂ شباب ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۲ء تک سمجھنا چاہیئے
مہر نے مندرجۂ ذیل غزل کو بہت پسند کیا تھا:۔

ہے قرصِ قمر پر تو انوار کسی کا
کچھ برق میں ہے جلوہ رخسار کسی کا

ہم محوِ رخِ یار ہیں اوروں سے ہمیں کیا
یوسف کو خریدے نہ خریدار کسی کا

کرتے ہیں درستی شکنِ زلف کی یاں آپ
دم ٹوٹ رہا ہے پسِ دیوار کسی کا

بیفائدہ ہے چشمِ وفا یار سے شورش
ممکن ہی نہیں ہووے جو وہ یار کسی کا

شوریدہ:۔ شیخ سلطان دین۔ برہان پور میں وطن تھا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں بھی قیام رہا تھا۔ خط نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ پہلے سلطان تخلص کرتے تھے۔ اس کے بعد تشہیر بعد کو شوریدہ ہو گئے۔ یہ اشعار انکی طبع آزمائی کا نتیجہ ہیں:

یک رنگ میں کئی رنگ بنا تا ہے نگیلا
ہر طرح میں کئی طرح دکھاتا ہے رنگیلا

تجھ زلف کے دیکھی سنتی سنبل کو گیا بھول
میں خود ستی بیخود ہوا بس دل کو گیا بھول

رنگین ادا سے جب تو گیا باغ میں سجن
ہر نقش پا زمیں پہ نہ تھے گل کے دسنتے تھے

چشمِ دریا سے کیوں نہ ہوں طوفاں
اشکِ باراں ہنوز جاری ہے

شوق

شوق:۔ زمانۂ قدیم کا سخن آفرین تھا۔ دنیائے شاعری میں اس کا نام پوشیدہ ہے۔ تذکروں کی ورق گردانی سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ باشندہ دہلی اور مرزا رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ مشکل پسندی اور خیال بندی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

سرشک گرم سے ہو دل کباب درتہ آب	ہُوا ہے چشم کا خانہ خراب درتہ آب
غارت گروں کے ہاتھ سے مانند طفل اشک	جاتا ہوں نقد دل کو مَیں آگے دھرے ہوئے

بقیہ کلام جناب منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی متعلق صفحہ ۱۰۹

حسن

جادو کہ اثر کرے نظر پر	بجلی کہ گرے دل و جگر پر
تنگی ہے دہان تنگ میں تو	سرخی ہونٹوں کے رنگ میں تو
شوخی کی ادا میں شان تیری	داماں حیا میں آن تیری
تو سرمہ چشم فتنہ پیکر	تو رنگ حنائے دست دلبر
سج دھج تو ہے نکھار تو ہے	زیور تو ہے سنگار تو ہے
سادہ رہے تو ہے لطف سی ہیں	ہیں لاکھ بناؤ سادگی میں

بہار

بہار باغ بنکر سمیٹ پڑا ہے حسن پھولوں پر	ہوا سے اُلجھتی ہیں شاخیں کہ گل بیٹھے ہیں پھولوں پر
بہار ہے آخر یہ کیا شئے ڈھونڈتی پھرتی ہو دنیا میں	کہ بھیجی ہر کلی کی کھولتی ہے دشت و صحرا میں
شجر میں گل کو دیکھو کیا گلابی رنگ اس کا ہے	شباب اسکے بدن کو رنگ بنکر پھوٹ نکلا ہے
بہار ایسی ہر لبِ گل ہے صحرا اور گلشن میں	کہ دنیا بھر کے پھولوں کو سمیٹے بیٹھی ہے دامن میں
ہوا کچھ ایسی وارفتہ ہے حسن سبزۂ تر پر	نچھاور کرتی ہے شبنم کے موتی سبزے کے سر پر
تیوں سے جھوم جھوم اُٹھتی ہیں کہ پٹے جھوٹے جھوٹے ہیں	کھڑے شوق ہنستے ہیں کہ گل پٹے ہیں پٹے ہیں

برسات

شادیوں میں مینڈک نہانے ہیں سرود آواز سے	رقص کرتی ہیں لہریں تالاب میں کس ناز سے
وہ ہوائے زور باندھا اور بادل ہٹ گیا	کھل گیا خورشید کا چہرہ کہ پردہ پھٹ گیا

بچھ گیا ہے دھوپ میں سونے کا پتّر ہر طرف	خوب ہر ساقی ہیں کرنیں ہُن زمیں پر ہر طرف
صحن سونے کا ہے چھت سونے کی گھر سونے کے ہیں	پھول پھل پتّے ہیں سونے کے شجر سونے کے ہیں
کیمیا گر ہے مگر عالم میں خورشید فلک	جسکی صنعت سی پہاڑ و بن ہیں سونے کی چمک
مختلف چڑیاں اُڑیں کوّے اُڑے چیلیں اڑیں	اپنے اپنے آشیانے سے ابابیلیں اُڑیں

شوق

شوق:۔ حافظ غلام رسول نام شاگرد حضرت شاہ نصیر دہلوی۔ طبع رسا اور فکر رنگین رکھتے تھے۔ استاد کی طرح سنگلاخ زمینوں میں کئی غزلیں کہکر فصاحت کے پہاڑ کو چیر کر جواہر آبدار نکالتے ہیں۔ خداداد ذہن اور زور طبیعت سے پتھر کو پانی کر دکھاتے ہیں۔ مشّاق اور باکمال شاعر تھے۔ روزمرّہ زبان اور محاورات کی اصلیّت سے ماہر تھے۔ جب استاد کے طرز سے الگ ہو کر کہتے تو بیان سادگی اور سلاست سے مربوط ہوتا۔ نکتہ سنج۔ معنی طراز اپنے معاصرین میں ممتاز۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں کابلی دروازہ کی مسجد کے امام تھے۔ خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق نے ابتداء میں آپ ہی سے اصلاح لی ہے۔ اور یہی ایک شاگرد اُن کے لئے صدہا شاگردوں کے برابر اور فخر استاد تھا۔ حافظ صاحب نے ۱۲۷۲ھ میں وفات پائی۔ آپ کا ناتمام قلمی دیوان مؤلف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ زمانۂ حاضر کے نقّاد عطف و اضافت کے بعد اعلان نون دیکھکر مسکرائیں۔ مگر زبان کا قابلِ قدر سرمایہ محاورات اور امثال کا خزانہ انہیں زمینوں میں مدفون پائیں گے۔ جس ایجاد کا سہرا ان کے سر ہے۔ آپ کے باندھے ہوئے محاورات میں نہ قیاسِ نحوی کو دخل ہو سکتا ہے۔ نہ ضمیر متکلم و غائب کی جستجو کام آسکتی ہے۔ کیونکہ عام نظر سے ان کی تصحیح مخلِ فصاحت ہو جائیگی۔ بعض الفاظ اصل میں جمع ہیں۔ مگر محاورہ میں مفرد ہیں۔ مثلاً۔

لاتے ہیں بجا ہم تو اسے اے شہِ خوباں	سرکار سے اب جو کہ ہے احکام نکلتا

اسی طرح بعض الفاظ مفرد ہیں۔ لیکن محاورہ میں جمع بولے جاتے ہیں حافظ صاحب

کے دیوان میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اور کلام پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ایک ماہرِ فن کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ کو روزمرّہ اور محاورات انتخاب کرنیکا خداداد ملکہ تھا اور انہیں صرف کرنیکا عمدہ سلیقہ۔ آپ کے فیض صحبت سے حضرت ذوق کو یہی بات ہاتھ آگئی تھی۔

جناب شوق کے کلام میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو اس زمانے کے شاعر کا مایۂ ناز ہو سکتی ہیں۔ مگر انتہائے سادگی میں نہ میر کا درد ہے۔ نہ درد جیسا سوز و گداز رعایت لفظی کا شوق کہیں کہیں کلام کو بدمزا بھی کر دیتا ہے۔ مشکل زمینوں میں توسن طبع کو دوڑاتے چلے جاتے ہیں۔ ندیم خیالات ذرّوں کی طرح چمک اٹھتے ہیں دیکھو پری رخان کہن کا بانکپن دکھانے میں کیا غضب ڈھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

گھر سے تشقہ کھینچ کر نکلے لالہ رخاں کیا صندل کا	جادو آنکھیں شوخ نگاہیں قہر ہے ڈورا کاجل کا

پرانے آدمی تھے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ محاورات و امثال کی ردو بدل کئے جانے سے غرابت لفظی کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے انہیں بجنسہٖ نظم کر دیتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

ٹھہرا ہے دل کا تجھ سے کیا زلف کا سودا	اپنی تو وہ مثل ہے اک سر ہزار سودا

زبان کے بہترین نمونے ان کے کلام فصاحت نظام میں موجود ہیں۔ غزلیات کا انتخاب یہ ہے:۔

کیا بات ہے جمع جو تقدیر نے دفتر گناہوں کا	لکھا کیا ہوگا آخر دیکھئے ہم رو سیاہوں کا
سیہ خیمہ نہیں استادہ ہے لیلیٰ کے مرقد پہ	گھٹا سا چھا رہا ہے یہ دھواں مجنوں کی آہوں کا
خال اسکے لب نہیں ہے رخ آتش پہ شوق	آتش پہ دھر دیا ہے یہ دانہ سپند کا
کعبۂ دل کو صنم ظلم سے ڈھایا تم نے	کچھ خدا کا بھی تو اپنے نہیں ڈر نہ ہوا
زلفوں سے اگر دل کو سروکار نہ ہوتا	حق ہے کہ بلا میں گرفتار نہ ہوتا

نہیں بہتر ستانا اے فلک اتنا غریبوں کا — کہیں کیا تیری بیرحمی کو ہم لکھا نصیبوں کا
ستانا ہر گھڑی تو کس لئے عاشق کو ہی اپنے — سمجھ دل اور کا بھی غیرت مہتاب اپنا سا
رخ زرد ہے یہ تیرے بیمار ناتواں کا — شرمندہ جس کے آگے تختہ ہے زعفراں کا
عالم نہ تو ڈبو کہیں گریہ کو ضبط کر — اے چشم اشک بار ہیں اب تارمست لگا
مزا ہے اسلئے گھر گھر کے تجھ کو جانے کا — ہے بریں شوخ ترے جامہ چارخانے کا
بسانِ نقشِ پا کوچہ سے میں ہر گز نہ اٹھوں گا — اگر تم یاں سے اب مجھ کو نکالو گے تو کیا ہو گا
نہ شب کو خواب ہے یاں اور نہ دل کو ہی آرام — ترے فراق میں اب چین اُڑ گیا دل کا
پیدا کریں گے ہم بھی کہیں اور دل لگی — صاحب سے جب سلام و پیام اور کا ہوا
سمجھی ہے تو سراسر اس کو وبالِ گردن — اے شمع تجھ کو سر پر رکھ تاج زر نہ آیا
موسم بھی پھرا اور زمانہ کی ہوا بھی — لیکن وہ مرا سامنے گلفام نہ آیا
بدنام ہوا میں تو ترے عشق میں اے یار — اور لب پہ ترے حیف مرا نام نہ آیا
جا پڑا اس زلف پر شب کیا ہوا پائے خیال — سانپ تاریکی میں آجائے ہے اکثر زیر پا
مہر سے صد چند رتبہ کیوں نہ ہو اس کا بلند — جس کے آیا ہو دلا دوشِ پیمبر زیر پا
دل جسکو دیا ہم نے ہوا دشمنِ جاں وہ — افسوس زمانے میں کوئی کام نہ آیا
استاد نصیر اب یہ تفضل سے تمہارے — ہونا چلا عالم میں سخن عام ہمارا
الجھ رہے ہیں وہ زلفوں سے تار دل سے مرے — گرو کو مانے ہیں یہ اپنے بالکے کیسا
لکھا ہوا ہے یہ اس مہ جبیں کے پردہ پر — نہیں ہے کوئی اب ایسا زمین کے پردہ پر
مرے مزار کے تم گرد کھینچ دو دیوار — سوا ہوں میں کسی پردہ نشیں کے پردہ پر
نگاہ اس کو نہیں میری زندگانی پر — ہزار حیف ہے اب ایسی زندگانی پر
آتا نہیں جو وعدہ خلافی سے صنم باز — بتلاؤں میں کیا اسکو وہ ہے ایک ہی دم باز
چھانکے ہی اس ذقن کو جو پہلو سے خوب دل — ڈرتا ہوں میں کنوئیں نہ اب جائے ڈوب دل

ابرو و چین جبیں و تل۔ در و زنجیر و قفل
مصر تن کے ہیں لگے یہ اے دل در و زنجیر و قفل

ہیں کلید عقل ہوں ملک سخن میں آج شوق
ہیں مرے آگے نہ کچھ مشکل در و زنجیر و قفل

لٹ دھوئیں کی ہے سر شعلہ کہاں شمع لگن
سر کے کھوئے پر کھڑی محفل دلداریں بال

سودائی خبطی۔ وحشی پکارے ہیں سب مجھے
کیا کیا رکھے ہیں اس نے پرے ہنسکے نام تین

بوسہ جب اسکے چشم و رخ و لب کا لوگے شوق
جھک کر کرونگا آپ کو تب میں سلام تین

چٹ پٹ ترا بیمار ہوا تین ہی دن میں
اس واسطے اے شوخ کہیں حرف اجل تین

غربت میں سنا کوہکن و وامق و مجنوں
بھائی مرے ای عشق یہ ہیں بگڑی بدل تین

فوج الم سے یاں ہیں مقابل جان پر اپنی کھیلے ہیں
ہجر میں تیری آفتیں ہم کیا کیا سر پر جھیلے ہیں

لاکھ طرح کا عالم اپنی نظروں سے یاں گذرے ہے
سیر تماشے کو ہم جاتے اب جو میلے ٹھیلے ہیں

ترے عشق میں ہوں میں جاں بلب مئی تجھ ہی سے ہے بس طلب
ادھر آکے گاہ تو غنچہ لب فرا لب سے لب تو ملا کہیں

موسم گل میں ترے بدولت سیر چمن کر لیویں ذرا
کنج قفس سے اب تو رہا کر آہ ہمیں صیاد کہیں

کریں تحسیں سخنداں کیوں نہ ہر اک شعر پر اپنے
کہ طرز گفتگو ہم شوق استادانہ رکھتے ہیں

رنگترے کی تعریف

مزا انگور کا ہے رنگترے میں
عسل زنبور کا ہے رنگترے میں

ہیں اشعار ہلالی اس کی پھانکیں
یہ مضمون دور کا ہے رنگترے ہیں

نہیں ہر اسکی پھانکوں میں یہ ریزہ
یہ لشکر مور کا ہے رنگترے میں

ہے گلگون مجسم یا بھرا خون
کسی مہجور کا ہے رنگترے میں

ہر دم نہ گالیاں دے بت بے حجاب تو
بولوں گا میں تو ہوگا ابھی لاجواب تو

گذرے صبا اگر ادھر کبھو ہمارے یار کو
بھول گیا ہے دل سے کیا عاشق غمگسار کو

قطرۂ مے سے ہیں اگر چور نشے میں ہوں تو کیا
جام شراب ساقیا بھر کے پلا جو ہو سو ہو

چھوڑ کے عارض پہ اب زلفِ سیاہ فام تو
یارو دکھا دے بہم ٹک سحر و شام تو

مارے خوشی کے جی میں نہ پھولا سمایا قیس
آئی اُسے جو ناقۂ لیلےٰ کی بن میں بُو

اس ڈھب سے جا کے خط اسے قاصد تو دیجیو
چھوٹے کہیں نہ اس کی ذرا انجمن میں بُو

کہئیے نہ کیونکہ طوطیِ ہند آج تجھ کو شوق
خسرو کی صاف نکلے ہے تیری سخن میں بُو

رکھ دے بس اپنے ہاتھ سے اے یار آئینہ
حیران ہوگا دیکھ نہ ہر بار آئینہ

تھرکی ڈالی جب اس نے عاشقِ مضطر پہ آنکھ
گاہ تکتا تھا ادھر کو گاہ تھی خنجر پہ آنکھ

مت سمجھ ساقی سرگرداب تو اس کو حباب
جھک رہی ہے یہ کسی میخوار کی ساغر پہ آنکھ

کیا زلف سے گونج الجھی اس کان کے بالے کی
بانہی پہ لڑائی ہے بچھو سے یہ کالے کی

کشتِ دل عاشق کی دشمن ہے یہ آہِ سرد
کیا خاک جلی کھیتی سرسبز ہو پالے کی

ہم خار سے آنکھوں میں کھٹکتے نہ کسی کی
گر یار نہ اس یارِ گل اندام کے ہوتے

خاکستر اب تمام بدن پر لگائیے
اس عشق میں بس آپ کو جوگی بنائیے

سرسبز باغ ان کو اب ایسا دکھائیے
اک دم میں بس ہتھیلی پہ سرسوں جمائیے

پڑھ پڑھ کے روز سورتِ اخلاص کیجے دم
قابو میں اپنے ان کو اسی دم میں لائیے

جی چاہتا ہے مجلس رندان میں جائیے
مئے پی کے آج خوب سی دھومیں مچائیے

اے چشم لختِ دل کا کچھ اپنی نہیں بہا
یہ لعل بے بہا ہے اسے مت بہائیے

قدم رکھے ہے عجب ناز سے بت بدمست
نشے میں چور ہے اور ہاتھ میں گلابی ہے

درنگ آنے میں تیرے جو لمحہ بھر ہو جائے
نہ پائے تو مجھے بستر پہ یاں سحر ہو جائے

کرے جو دیدہ پرنم سے اپنے ہم چشمی
تو پانی پانی خجالت سے ابرِ تر ہو جائے

مالا جپے ہے اشکِ مسلسل کی چشمِ نم
تسبیح بھی ہوئی ہے کہیں بن امام کی

بھر جا نہ بات کی نہیں اس منہ مجھ سے شوق
کھا کر قسم میں کہتا ہوں تیسوں کلام کی

دل کہاں سنگِ پری زلفِ گرہ گیر میں ہے
قید دیوانہ ترا خانۂ زنجیر میں ہے

روبرو جس کے بھرے تیغ صفاہاں پانی	کاٹ ابرو کی میاں وہ تری شمشیر میں ہے

شوق

شوق : محمد قدرت اللہ شوق ابن شیخ قبول محمد صدیقی قصبہ موی مضافات سنبھل کے رہنے والے اور شیخ کریم اللہ شہید کی اولاد سے تھے۔ علوم درسیہ کی تکمیل مولوی غلام طیب ساکن صوبہ بہار سے کی تھی اور فن شعر میں مولوی قیام الدین قائم چاندپوری سے تلمذ تھا۔ نیک طینت بزرگ تھے۔ صاحب تلامذہ کثیر ہوئے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ان سے یادگار ہے جس کا نام طبقات الشعرا ہے جو مؤلف کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ یہ تذکرہ اب تک طبع نہیں ہوا۔ شاعروں کے متعلق آپ اپنے زمانہ کے بہترین محققوں میں تھے۔ تذکرہ طبقات الشعرا کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ معاصرین اور قدما کے حالات اور کلام کی تفتیش و تحقیق میں آپ نے بہت کاوش کی ہے۔

شوق طبیعت دار اور پرگو شاعر تھے۔ بہ اعتبار زمانہ اپنے رنگ میں یکتا تھے۔ آج کل کے متروکات اس وقت فصاحت کی جان سمجھے جاتے تھے۔ کبھی قدرت بھی تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان مرتب ہو گیا تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو:

دین و دل صبر و قرار و خرد و تاب و تواں	گھر کا گھر لٹ گیا اور ہم سے بچایا نہ گیا
کیا کہیں کیسے لٹے بیٹھے ہیں اس بت کی نگاہ	ایسا روٹھا وہ کہ پھر ہم سے منایا نہ گیا
سو جتن لاکھ فسوں [illegible] ہزاروں [illegible]	اس پری زاد کا [illegible] سایہ نہ گیا
کیا دل کا [illegible]	[illegible] آشنا
دین کو کیا [illegible] دنیا بھی نہ کی کچھ [illegible]	شوق ناکام [illegible] نکلا
در بدر خاک [illegible] دیکھا شب و روز	[illegible] جو طالب کوئی زر کا نکلا
[illegible] ضعف کو پہنچا [illegible]	[illegible] وقتوں کا
[illegible]	[illegible]

کیا عشق ہی ہوتا ہے الٰہی مرض الموت
جس رنج کو سنتے ہیں نہ دارو نہ دوا کا

گر اسی طور نت ستائے گا
کس توقع پہ دل لگائے گا

وسعت دل یہ چاہتی ہے مری
لامکاں پہ مکاں بنائے گا

ہے جلوہ حق شوق کے چہرہ سے نمودار
لیتا ہے کوئی جس طرح اوتار اتارا

اٹھا ہے مجھے لیکے پھر آج دل
غضب کا یہ مارا کدھر جائیگا

کہی اس سے قاصد نے کل جا یہ بات　ق
جو تو ٹک تسلّی نہ کر جائے گا

کوئی دم کا مہماں ہے شوق آج
سفر پھر وہ دنیا سے کر جائیگا

لگا کہنے سنکر وہ بیگانہ خو
بلا سے مری گر وہ مر جائے گا

کٹی عمر جس طرح حسرت میں سب
تو یہ دن بھی دم میں گذر جائیگا

جو کل سیر چمن کو گھر سے وہ غنچہ دہاں نکلا
پھٹا گل کا جگر سینہ سے بلبل کے فغاں نکلا

کرے ہے آجکل مدّت سے وہ وعدہ خلاف اتنک
کٹی عمر انتظاری میں نہ آج آیا نہ کل آیا

مغفرت ہاتھ باندھکر آئی
دیکھ میرے گناہ کی کثرت

ہنسی آتی ہے مجھکو بات پر اسکی کہ کہتا ہے
فلانا رونا ہی رہتا ہے پوچھو سبب کیا باعث

حافظ ہے خدا اس کا کہ ہوں جس پہ یہ آفات
غم جور و الم ظلم و ستم آہ فغاں درد

ہوا ہوں بسمل تیغ نگہ مت کھول زلفوں کو
خدا کا واسطہ ٹک ڈالیو یہ دام دم لیکر

سنتے مجھکو ہیں شور و فغاں جان ہم تلک
یہ دھوم ہیں دیکھتے ہو مرے دم قدم تلک

اے شوق تیرے شعر کی اب تو پڑی ہے دھوم
سودا و میر قائم و درد و الم تلک

میرے ملنے سیتی انتا پرہیز
بل بے غیرت اسے کیا کہتے ہیں

آہ ایک دم نہ رہی صحبت یاراں باقی
رہ گئے دل میں مرے داغ ہزاراں باقی

جیوں جیوں چاہیں اسیتیوں تیوں خود آرائی ہوئی
خود پرستی خودنمائی تسپہ خودرائی ہوئی

دلربا دلدار دلبر کیوں نہ سب اس کو کہیں
دلبری کے فن میں حاصل جسکو یکتائی ہوئی

سانپ کی سی لہر اک دل پہ مری پھر جاتی شوق | یاد آتی ہے جب اسکی زلف بل کھائی ہوئی
کیا کہوں اپنے ہیں اس رشکِ چمن کی خوبی | غنچے گل کھاتے ہیں دیکھ اسکے دہن کی خوبی
موجزن جب سے دو آبہ مری چشموں کا ہوا | گر گئی نظروں سے سب گنگ و جمن کی خوبی
گل کترتا ہے ہر اک بات میں تو تو اے شوق | کیا بیاں کیجے ترے طرزِ سخن کی خوبی
ہزاروں صورتیں دیکھیں پہ یہ نقشہ نرالا ہے | یدِ قدرت نے شاید آپکو سانچے میں ڈھالا ہے
ہر اک عضو اس کا جو دیکھو تو عالم سے نرالا ہے | غضب جوڑا عجب مکھڑا ستم کانوں کا بالا ہے
کہے ہیں شوق کے اشعار سن جرأت یہ حسرت سے | عجب انداز ہے کچھ اسکی کیا ہی کہنے والا ہے
غافل تجھے کرتا ہے یہ گھڑیال منادی | گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی
مثلِ گل لاکھ رکھے پردے میں | بوئے الفت چھپی نہیں رہتی
اے خدا یوں بھی کبھی تیری خدائی ہوگی | کہ مجھے اسکی جدائی سے جدائی ہوگی

شوق

شوق :- رائے ٹھاکر پرشاد صاحب کھتری حیدرآبادی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے عزیزوں میں ہیں۔ رسالہ آصفی جو مہاراجہ صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے مہتمم رہ چکے ہیں۔ طبیعت شوخ زبان شستہ ہے:۔

جب کہا میں نے کہ مرتا ہوں تو بولے ہنسکر | کہیں منہ سے بھی کہا کرتے ہیں مرنیوالے
حسن اور عشق کا جھگڑا نہ مٹے گا تا حشر | ہار کر بیٹھ رہے فیصلہ کرنیوالے
بے کسی رو کے جنازہ پہ مرے کہتی ہے | چھوڑ کر مجھکو کہاں جاتا ہے مرنیوالے

شوق

شوق :- منشی غلام محمد صاحب حیدرآبادی۔ صیغہ دار محکمہ معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ حیدرآباد۔ ان کے آبا و اجداد عرب سے آکر سرکار آصفی میں ملازم ہوئے۔ میرزا احمد سلطان غافل دہلوی سے تلمذ ہے۔ سنہ ۱۲[illegible] سال ولادت ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

پائے نظارہ رخ کی صفائی سے پھسل گیا | دل گرتے گرتے چاہِ ذقن میں سنبھل گیا
[illegible] | [illegible] غافل گیا

لاکھوں فتنے اُٹھے ہنگامہ ہوا۔ صور پھنکا
عرصۂ حشر مگر کوچۂ جاناں نہ ہوا

آبِ خنجر سے ترے ہوگئے لاکھوں سیراب
شوقؔ مقتل سے مگر تشنہ گلو آتا ہے

شوق:۔ مولوی منشی سید حسن عطا صاحب خلف الصدق مولوی قاضی احسان اللہ صاحب عباسی ساکن سندیلہ آپ کا خاندان باعتبار شرافت علمی و نسبی ممتاز رہا ہے۔ آپ کے جدِ امجد حضرت ملک العلماء قاضی القضاۃ قاضی نظام الدین صاحب عالمگیر بادشاہ کے شاہزادوں کی تعلیم کی خدمت پر ممتاز ہوئے تھے۔ اس خدمت کے صلہ میں گیارہ موضعے معافی میں مرحمت ہوئے۔ جن کو ایامِ غدر کے قبل ہی آپس کی خانہ جنگیوں کے باعث مولانا منشی حسن عطا صاحب کے پردادا جناب قاضی بشارت اللہ صاحب نے چھوڑ کر اپنے نانہال قصبۂ سندیلہ میں آکر سکونت اختیار کی۔ جناب شوقؔ صاحب دیوان تھے۔ اور علاوہ دیوان کے فنون میں کئی رسالے تصنیف فرمائے تھے۔ مگر سب کلام غیر مطبوعہ رہا۔ آپ کا قلمی دیوان مولوی منشی محمد جعفر حسین صاحب زہری خیرآبادی کے پاس محفوظ ہے۔ آپ کا کلام معمولی ہے۔ تخیل اور اسلوب کی چستی و دلاویزی ناپید ہے۔ ہاں رعایت لفظی سے کوئی شعر خالی نہیں نظر آتا۔ ستر سال کی عمر پاکر ۱۹ء میں انتقال کیا۔

ہے خطِ چینِ جبیں یا مدِ بسم اللہ کا
مصحفِ رخسار ہے یا دل کلام اللہ کا

باتوں ہی باتوں میں دیکھا تم نے کوہِ طور پر
ہوگیا تھا حال کیا موسیٰ کلیم اللہ کا

ذاتِ واحد خطاب ہے تیرا
ہر دو عالم حجاب ہے تیرا

سب جگہ اور پھر کہیں بھی نہیں
یہ عجب کچھ حساب ہے تیرا

میں کہتا ہوں کچھ اور وہ فرماتے ہیں کچھ اور
ڈرتا ہوں کہ پیدا نہ ہو تکرار کی صورت

آتا ہے عیادت کیلئے جب وہ مسیحا
اک دم میں بدل جاتی ہے بیمار کی صورت

اے جنوں ممنونِ عشق یار ہیں
اک گریباں کے ہزاروں تار ہیں

اللہ ری پردہ داریِ اُلفت کہ راہ سے	اب نقش پائے غیر بھی مٹوائے جاتے ہیں
ہؤا ہے قطع تعلّق تمام دنیا سے	بس ایک دل میں تمنّائے وصل یار رہی
تڑپ تڑپ کے کٹی رات کس مصیبت سے	شبِ فراق میں کیا جان بیقرار رہی
اشک رو رو کے بہاتی ہیں قفس میں صیّاد	ہم اسیروں کو یہی دانہ یہی پانی ہے

شوق

شوق :- منشی عبدالعزیز صاحب ساکن دیناگر۔ شاگرد حضرت احسان مرحوم شاہجہانپوری۔ زبان کی صفائی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :-

وہ مری لاش پہ کس ناز سے آکر بولے	روٹھ جائے جو کوئی اس کو منائیں کیونکر
کیا لیگا یہاں آکے بھلا ناوکِ دلدوز	اب خونِ تمنّا بھی مرے دل میں نہیں ہے
اے چرخ مری لاش کو مل جائے جو تربت	اتنی بھی زمیں کوچۂ قاتل میں نہیں ہے

شوق

شوق :- بابو آنندی پرشاد صاحب کھتری مرحوم دہلوی۔ خلف رائے شنکر رائے۔ انگریزی اور فارسی کے ماہر اور کسی قدر سنسکرت سے واقف تھے۔ نہایت متواضع خوش سلیقہ نیک کردار خوش گفتار شاعر تھے۔ فن سخن میں مرزا سالک مرحوم سے مستفید ہوئے۔ کچھ دنوں نہر کے دفتر میں ملازمت کرنے کے بعد ۱۲۹۸ھ میں ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ موزوں طبع نوجوان تھے۔ خیالات میں جدّت زبان میں سلاست تھی۔ کلام میں مزا تھا۔ انتخاب یہ ہے :-

شوق دیوانہ ہے اے حضرت ناصح بیشک	ہرزہ گوئی میں مگر آپ سے کمتر ہوگا
زہر کھاؤں کہ مسیح جھوٹ سب اسکا معلوم	شہر میں شہرہ ہے اس بت کی مسیحائی کا
رہبر راہ عدم کیونکہ نہ قاتل کو کہوں	دم شمشیر ہوا جادہ منزل میرا
اک وہ کہ ان کے ظلم کی عالم میں دھاک ہے	اک ہم کہ شہر شہر میں شہرے وفا کے ہیں
قانون عشق و رسم محبت کو دیکھئے	سمجھے ہیں کہ انہیں مری مہرو وفا کے ہیں
آجائے مہربانی تو یہ جانوں کہ وہ کبھی آئے	بگڑیں یہ کچھ ہوا اس مرے اضطراب میں

نازش ہے اپنے حسن پہ جتنی کہ آپ کو
کچھ اس سے کم نہیں ہے غرورِ وفا مجھے

کچھ رشک لطف غیر سے کچھ رنج ہجر سے
آتا ہے یاد آپ کا عہد وفا مجھے

شوق

شوق :۔ مولوی محمد حسن صاحب ساکن بچھرایوں ضلع مراد آباد۔ ولد مولوی احمد حسن رئیس۔ مولوی نجم الدین برقؔ مرحوم کے تلامذہ سے ہیں۔ بسلسلۂ شاعری حکیم مومن خاں تک پہنچتا ہے۔ شعر گوئی کا شوق ہے مگر اپنے کلام کی طرف سے بالکل بے پروا ہیں۔ بندشیں اچھی۔ مضامین عمدہ۔ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات نکلتی ہے چند متفرق شعر جو انہیں یاد تھے۔ مؤلف کو لکھوا دئے انہیں کو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے :۔

میسر ہی نہیں ہوتی رسائی اسکے دامن تک
پھرا ہوں خاک ہو کر ہمنشیں میں کو بکو برسوں

بیدار ہوں میں یارب یا خواب دیکھتا ہوں
وہ آج جلوہ فرما میرے مکان پہ ہیں

مرے ارمان و حسرت کا خلاصہ یہ ہے بتلا دوں
کہ میرے اس دل پر آرزو کا مدعا تم ہو

کیا تھا غیر کا شکوہ کہ اب اس سے نہ ملئے گا
خفا ہو کر یہ فرمایا بڑے ہی کج ادا تم ہو

وہ بالیں پہ آئے قضا بھی کھڑی ہے
یہ وقت دعا اب یہ نازک گھڑی ہے

دامن کے ٹکڑے جیب کے پرزے کریں گے ہم
آرائش جنوں کا یہ زیور بنائیں گے

سرمہ نے اور آنکھ کو خوں ریز کر دیا
کیا وہ نگاہ ناز کو خنجر بنائیں گے

ساقی یہ اپنا جام و سبو تو اٹھا الگ
ہم ماہ و آفتاب کو ساغر بنائیں گے

دونوں شہید غمزۂ سفاک ہو گئے
تربت دل و جگر کی برابر بنائیں گے

مضطر ادھر جگر ہے ادھر بیقرار دل
ناوک تری نظر کے کہاں گھر بنائیں گے

شوق

شوق :۔ منشی نصیر احمد خاں خلف شفاعت احمد خاں۔ باشندہ رامپور تلمیذ حضرت داغ۔ ملازم ریاست بھوپال۔ استاد کا رنگ تو ہاتھ نہ آیا۔ مگر ضروریات غزل سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ زبان اچھی ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :۔

اپنی تصویر بھی بھیجی نہ تسلّی کے لئے
کسی صورت سے میرے دل کو بہلنے نہ دیا
یہ عجب کام کیا برقِ تجلّی نے تری
طور پر طالبِ دیدار کو جلنے نہ دیا
قتل کرتا رہے وہ زندہ بھی کرتا جائے
حشر تک یونہی رہیں خنجر و سر دونوں ساتھ
تیر دل میں جو لگا یا تو جگر میں پیکاں
ہائے گھائل ہوئے دل اور جگر دونوں ساتھ
پھر دل میں قیامت کی خلش ہونے لگی شوق
پھر چٹکیاں لینے لگی بیداد کسی کی

شوق

شوق، حسن علی خاں دہلوی۔ خان آرزو کے شاگرد نواب عماد الملک غازی الدین کے رشتہ دار، خوش گو اور خوش فکر تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ پایا۔ درحقیقت اچھے استاد کو کلام دکھایا تھا۔ سپاہی پیشہ تھے۔ چنانچہ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں کہ دہلی سے دل برداشتہ ہو کر روہیلکھنڈ میں راجہ بلاس کے ملازم ہو گئے۔ تعقید لفظی، علامت، فاعل کا حذف، بعض حرف کو تقطیع سے خارج کر دینا مثلاً "آج ہی" کو "آجی" باندھنا وغیرہ جو اب متروکات میں داخل ہیں۔ ان کے ہاں موجود ہیں۔ جیسے ان کے معاصرین کے کلام میں بہرحال اچھے کہنے والوں میں تھے۔ کلام یہ ہے

اگر قاصد ترے کوچے سے ٹک جلدی نہ آوےگا
تو پیارے دیکھیو پھر تو کہ میرا جیو ہی جاوےگا
اجی طو تو بہتر وعدہ غلط ہے کل کا
جوں طفلِ اشک میں تو مہماں ہوں کوئی پل کا
کسی کو باغِ دنیا سے نہ دیکھا شاد ہم جاتے
برنگِ شبنم اک عالم یہاں سے چشمِ تر گزرا
عبورِ بحرِ دنیا میں سبکساری سے کرتا ہوں
حباب آسا شمارِ دم سے بے کشتی گزرتا ہوں
ماتم میں میرے کوئی نہ رویا تو غم نہیں
تربت پہ میری شمع کا ہنسنا بھی کم نہیں
تلوار کس پہ کھینچتے ہو ہم تو مر چکے
پیاسے ہو کس کے خون کے ہم میں تو دم نہیں
مدّت سے یہ بحث درمیان ہے
پر علم نہیں کمر کہاں ہے

رباعی

اس دور میں بد قماش اکثر دیکھے
تھے وہ جو غلام تاج بر سر دیکھے
اے گنجفہ باز چرخ تیرے ہاتھوں
اوراقِ جہاں تمام ابتر دیکھے

شوق

شوق: شاہزادہ مرزا افضل علی خاں لکھنوی شاگرد اصغر علی خاں نسیم دہلوی بلند فکر اور روشن خیال تھے۔ عامیانہ خیالات سے کلام کو پاک رکھتے خوبیِ مضامین کا لحاظ تھا۔ فنِ سخن میں ذوقِ سلیم پایا تھا۔ لکھنؤ میں رہ کر دہلی کی شاعری کے مقلد تھے۔ کلام یہ ہے :-

ساتھ ہی دل کو لئے تیر کا پیکاں نکلا
صاحبِ خانہ کے ہمراہ یہ مہماں نکلا

دل۔ جگر۔ جان کا دشمن یہ بنا عشقِ مژہ
خانۂ تن میں رہا تیر سے پہلو ہو کر

باغباں بیٹھنے دیتا نہیں کیوں پاس لئے
گل میں بلبل نہ سما جائیگی کچھ بو ہو کر

کبھی ہم داغ بنکر دامنِ قاتل میں رہتے ہیں
کبھی ہم پاس ہو کر دیدۂ بسمل میں رہتے ہیں

دوست ہے بعد فنا ایک فقط شمعِ مزار
ہے یہی رونے کے لئے ہے یہی جلنے کے لئے

خونِ عاشق انہیں منظور تھا پنہاں کرنا
مہندی ہاتھوں میں ملی رنگ بدلنے کیلئے

نامہ بر اب تجھے کیا غم ہے کہ میرا دلِ زار
ساتھ جاتا ہے ترے جی کے بہلنے کیلئے

درد رہ رہ کے دلِ زار میں جو اٹھتا ہے
اک بہانا ہے یہ کروٹ کے بدلنے کیلئے

شبِ فراق میں دونوں تھے مضطرب کیسے
اثر دعا کے لئے اور دعا اثر کے لئے

گر اُنکی طرف ہے سارا عالم
میری بھی خدایا بے کسی ہے

شوق

شوق: شیخ الٰہی بخش مرحوم۔ دہلی مولد تھا اور آگرہ مسکن۔ مرزا ظفر بخت جہاندار شاہ جواں بخت کی سرکار میں مراسلہ نویس تھے۔ ۱۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ صاحبِ فن تھے۔ اور علاوہ دیوان کے انشائے قوانینِ سلطنت اور مثنوی نل دمن بطور یادگار چھوڑی۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

ناوک ستم کا اور گلِ تر دونوں ایک ہیں
پیری کی آہ و بادِ تند دونوں ایک ہیں

مطلوب دو مکاں ہوں اگر تجھ کو ایک تو
آنکھوں میں میری آگ پھر دونوں ایک ہیں

شوق

شوق: سید اشتیاق حسین صاحب نبیرۂ حضرت شاہ بدیع الحق۔ آپ کے والد

مہر جیون علی صاحب شرفائے شاہجہان آباد سے تھے۔ آپ ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۸ برس کی عمر سے اپنے نانا کے ساتھ رہے اور انہیں کے ہاتھوں تعلیم و تربیت پائی سفر دکن میں بھی حضرت ظہیر کے ہمراہ تھے۔ فن سخن میں جناب ظہیرؔ و حضرت داغؔ کے شاگرد ہیں۔ تصنیف و تالیف کا شوق ہے۔ ایک کتاب سلک مروارید کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ جس میں مختلف اساتذہ کے اشعارِ آبدار جو فراق۔ وصال۔ انتظار۔ یاس و ناکامی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ جمع کئے ہیں۔ عرصہ سے دہلی میں قیام ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے: ؎

رہی جگہ نہ رقیبوں کے گھر بنانے کی	بھلا ہوا ترے دل میں مرا غبار رہا
اب اسکا شکوہ ہی کیا دل تو دے چکے اے شوقؔ	پرائی چیز پہ کیا اپنا اختیار رہا
کبھی عہد و پیماں نہ باندھے جنہوں نے	وہ چلا میری قبر پہ باندھتے ہیں
دیکھے ہیں زمانہ کے حسیں اور بھی ہم نے	جچتا ہی نہیں تیرے سوا کوئی نظر میں
وہ آئیں عیادت کو تو کچھ اور مزہ ہو	جو چاہیئے لذت وہ نہیں درد جگر میں
مرا سر در پہ ٹھکرا کر کہا یوں کج ادائی سے	مقدر کا لکھا مٹتا نہیں ہے جبہ سائی سے
تو نے مارا ہے خرام ناز سے	آ مجھے آکر جلا اعجاز سے
کیا کہا ہے کان میں ہمراز سے	ہم سے بھی کہئے اسی انداز سے

شوقؔ :- مرزا محمد منیر صاحب میرٹھی اکونٹنٹ محکمہ گوالیار۔ شاگرد مولانا شوکت میرٹھی۔ عربی فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ کلام میں سنجیدگی اور متانت ہے۔ کہیں کہیں زبان کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ نمونہ نذر ناظرین ہے: ؎

دلِ مضطر کو قرار آئے تو کیونکر اے شوقؔ	یہ تو قسمت ہی میں قسّام ازل نے نہ دیا
ہے قیامت پائمالِ ناز و اندازِ خرام	تیرے ہر نقشِ قدم پر حشر نے سر رکھ دیا
وائے ارمانِ سبکدوشی کٹا تو سر۔ مگر	بارِ احساں تیغ نے ایک اور مجھ پر رکھ دیا

مشت خاک اپنی ٹھکانے سے لگادی تو نے
ہم دعائیں تجھے اے بادِ صبا دیتے ہیں

آکارِ دل تمام کر اے خنجرِ نگاہ
جز پردہ ہائے چشم کوئی درمیاں نہیں

وہ آئی جھومتی تیغِ تغافل فرقِ ارماں پر
جھکا نا گردنِ تسلیم کا طاعت میں داخل ہے

رازِ دل مشتہر نہ ہو جائے
پردہ خود پردہ در نہ ہو جائے

آپ کے وعدہ ہائے فردا سے
حشر ہی پیشتر نہ ہو جائے

شوق:۔ مولوی حکیم عنایت اللہ فریدآبادی۔ شاہجہان آباد میں تکمیل علمی کے بعد مولانا صہبائیؔ سے فنِ سخن میں تلمذ اختیار کیا۔ استادانِ باکمال شیفتہؔ، ذوقؔ، مومنؔ و غالبؔ وغیرہم کے جلسوں میں شریک رہتے تھے۔ علم طب میں دخل کامل تھا عرصہ تک سرکارِ انگلشیہ میں ملازم بھی رہتے تھے۔ پیرانہ سالی میں پنشن لے کر خانہ نشین ہوئے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ خوش فکر سخن سنج تھے۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں بقید حیات تھے۔ کلام یہ ہے:۔

پس مرگ خاک کو بھی نہ دیا قرار اک جا
کوئی فاتحہ تو پڑھتا جو کہیں مزار ہوتا

اس آن سے دیکھا ہے مجھے آج کسی نے
قابو میں نہ دل ہے نہ سنبھلتا ہے جگر آج

گر جانتے رنگینی یہ سب دل میں ہے تو ہیں
پہلے ہی کرتے ہم دلِ بے آرزو پسند

یاس ہے اور بیکسی کیوں نہوں تنگ یا رب ہم
درد ہے دل میں اسلئے روتے ہیں زار زار ہم

جان سے اپنی تنگ ہیں یہ بھی ہے کوئی زندگی
کرتے ہیں ایک عمر سے موت کا انتظار ہم

رحم آیا انہیں مجھ پر شاید
میرے مرنے کی دعا کرتے ہیں

آرزوئے وصال کرتے ہو
کیا خیالِ محال کرتے ہو

بولے وہ پیار سے اک عالم
کیا تمہیں کچھ کمال کرتے ہو

اپنے پیارے سے امید وفا
شوقؔ تم بھی کمال کرتے ہو

کیوں نہ صہبائی کی شاگردی کا ہو فخر مجھے
لیتے استاد سے تھے شوقؔ تلمذ مجھ کو

چشم آفت نہیں تو پھر کیا ہے
قد قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

شوق یہ پوچھتا ہے قامت یار
گر قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

اور کچھ مانگوں نہ اس بت کے سوا اللہ سے
زاہدا مقبول گر میری دعا ہونے لگے

سب کچھ کیا علاج نہ ہرگز شفا ہوئی
عیسیٰ سے بھی نہ میرے مرض کی دوا ہوئی

کیا سمجھ ہے کہ ہر اک بات کو الٹا سمجھے
ہم برا سمجھے جو اے بت تجھے اچھا سمجھے

یہاں کے آنے پہ راضی تو ہو گئے ہیں وہ
مگر کچھ اور ہے تھوڑی سی گفتگو باقی

نیند آئی جو موذن کو مری بن آئی
ورنہ یوں کب تجھے سحر تک وہ ٹھہرنے والے

اہل ظاہر کا ذرا خوف ہے ہم کو ورنہ
صاف کہہ دیتے کہ اے بت تجھی ہم کیا سمجھے

شوق:- مولوی سید محمد حسین سہارنپوری خلف سید جمعیت علی شایاں کہنہ مشق مضمون نگار ہیں۔ ایک زمانہ میں سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق پر اخبار عام لاہور میں زبردست ریویو کیا تھا۔ میرٹھ میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ عمر اچھی پائی حضرت جلال سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو:-

برباد ہو مٹ جائے کوئی ان کی بلا سے
انکو تو فقط یاد ہے اک لفظ نہیں کا

شاید خیال یار ہے مہماں کہ صبح تک
جھپکی نہیں ہے آنکھ شب انتظار میں

میری قسمت کی رسائی دیکھئے
ان کے در پر جبہہ سائی دیکھئے

جان یہ دیتے ہیں ذکر حور پہ
زاہدوں کی پارسائی دیکھئے

بلبلوں کو ہے گمان شاخ گل
یار کی نازک کلائی دیکھئے

حضرت زاہد بس اب چلتا ہے جام
وہ گھٹا قبلہ سے آئی دیکھئے

لیگئی جان اک نگاہ دلفریب
موت کس حیلہ سے آئی دیکھئے

شام ہی سے رنگ فق ہے شوق کا
کیا ہوتا صبح جدائی دیکھئے

شوق:- مولوی محمد ظہیر احسن خلف شیخ سبحان علی۔ قصبہ نیمہ ضلع پٹنہ کے

رہنے والے تھے۔ علوم عربیہ کی تکمیل علمائے فرنگی محل سے کی۔ تحقیق زبان اردو کا شوق تھا۔ حضرت شمشاد سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ جناب تسلیم لکھنوی سے ارادت تھی۔ سخنور باکمال حضرت جلال لکھنوی سے مناظرہ اور تحریری مباحثہ کرنے کے بعد لکھنؤ میں ان کا شہرہ ہوگیا۔ اور پٹنہ بہار وغیرہ میں کامل الفن مشہور ہوگئے۔ مذہبی تصانیف کے علاوہ جو کتابیں علم ادب کے متعلق لکھی ہیں وہ نہایت کارآمد ہیں۔ رسالہ اصلاح میں متروکات اور اہم اصول معانی سے بحث کی ہے جو بہت مقبول ہوا ازاحۃ الاغلاط میں لغات کی صحت تلفظ وغیرہ کی بحث ہے۔ سرمۂ تحقیق میں الفاظ کی تحقیقات درج ہے۔ بہت مدت تک اخبارات میں اس رسالہ کی بابت مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ آپ ۱۸۹۹ء میں حیات تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

گراتا ہے دل پر قیامت کی بجلی — وہ منہ پھیر کر مسکرانا کسی کا
وہ بھولی سی صورت لڑکپن کی باتیں — ہمیں یاد ہے وہ زمانہ کسی کا
تمہیں عشق میں شوق سب کہتے تھے — مگر تم نے کہنا نہ مانا کسی کا

سینے میں جو دل ہے تو جگر کو نہ جلاؤ — ہمسائے کے گھر آگ لگانا نہیں اچھا
دیکھو نہ کہیں دل کی لگی اور بھڑک جائے — بالین لحد شمع جلانا نہیں اچھا
دامن کبھی جھٹکتے ہیں کبھی چھڑاتے ہیں وہ ہاتھ — اے شوق ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

دیا دل جس کو جب چاہا طبیعت اپنی ڈال اپنا — محبت ہو گئی ہم کو تو حضرت ناصح بگڑتے ہیں

حق سے کرتے تو ہے گلہ اس کا — ٹھہریں جو ہم تو پھر کہیں نہ کہیں
اور ہے دل چرانے والا کون — ہو تو ہو چشم سرمگیں نہ کہیں

تارے بیتاب ہیں جینے سے نکلنے کیلئے — اس شگاف ہے کوئی کہہ دے سنبھلنے کیلئے
ارے مرے جذبۂ دل وقت ہے آ پہنچا — منتظر ہے وہ آج نکلتے ہیں ٹہلنے کے لئے
منفعل شمع میں کیوں ہا شوق جلا ہی تو ہے — کیا ہوا شمع کی تقدیر میں ہے جلنے کیلئے

حسرتیں بھر گئیں اے شوق یہاں تک دل میں
آرزو ڈھونڈتی ہے راہ نکلنے کیلئے

او تغافل شعار کیا کہنا
دل کو تھا دل سے ارتباط ایسا
کہتے ہیں فرط بیخودی اس کو
مر گئے ہم تجھے خبر نہ ہوئی
احتیاج پیام میسر نہ ہوئی
دل گیا پاس سے خبر نہ ہوئی

اے شوق وہی عشق و محبت میں ہے کامل
ہر شے میں جسے جلوہ جاناں نظر آئے

نظر پڑی جو سر راہ اس پری وش پر
تو شیخ جی کہیں جبّہ کہیں چھڑی بھولے

بھڑکی ہے لگی جی کی بجھا کیوں نہیں دیتے
آب دم شمشیر پلا کیوں نہیں دیتے

مانا کہ ان آنکھوں نے کیا خون کسی کا
لب میں ہے جب اعجاز جلا کیوں نہیں دیتے

صبح وصال

ہائے فلک نے قہر یہ ڈھایا
صبح الم کا منہ دکھلایا
بخت نے ایسا پلٹا کھایا
وقت جدائی سر پہ آیا

دیکھ کے غمگین حالت دل کی
رونی ہے دل میں حسرت دل کی

کیجئے کیا اظہار الم کا
کیا ہو بیاں گردوں کے ستم کا
حال ہے روشن حسرت و غم کا
ہائے وہ تارا صبح کا چمکا

بجنے لگا افسوس گجر بھی
بول اٹھے مرغان سحر بھی

عیش کسی عاشق کا نہ بھایا
کم بختوں کو چین نہ آیا
کوّوں نے غل شور مچایا
گھڑیالی نے گھنٹا بجایا

ظالم نے اور آفت ڈھائی

لو وہ اذان کی آواز آئی

جھوم رہے ہیں سب متوالے
باہر نکلے خلوت والے
جاتے ہیں مسجد ہمت والے
پڑھتے ہیں سبحہ طاعت والے

شغل کہیں ہے ذکر خدا کا
ورد کہیں ہے صل علیٰ کا

برہمنوں نے شور مچایا
بت خانہ میں سنکھ بجایا
سارا شوالہ سر پر اٹھایا
سارے جہاں کا دل دہلایا

گھر سے چلے اشنان کو ہندو
ہے گنگا کا شور ہر سو

باد سحر سے غنچے چٹکے
ہیں جو طلوع مہر کے کھٹکے
ٹوٹت ہیں کے قافلے بھٹکے
روتی ہے شبنم گل سے لپٹ کے

کہتی ہے دن کی قسمت چمکی
ہوں مہماں اب کوئی دم کی

باد سحر کے جھونکے سے کھل کے
خندہ رنگیں دیکھ کے گل کے
طرے بکھرے ہیں سنبل کے
زخم ہرے ہیں ہر بلبل کے

صبح جو سر پہ آئی ہوئی ہے
دل کی کلی مرجھائی ہوئی ہے

رہ گئی کچھ کچھ شب کی سیاہی
کیسی بکھری یہ آئی الٰہی
چلنے لگے منزل سے راہی
ہوتی ہے کوئی دم میں تباہی

نقد دل و جاں کھو بیٹھے ہیں
اپنے لاشے کو رو بیٹھے ہیں

صبح ہوئی کیا آئی قیامت
سوئے جو ہیں یہ جانِ نزاکت
ساتھ لگا لائی اک آفت
ان کو ابھی ہے خواب کی غفلت

لیکن کوئی دم میں یہ پیارے
اٹھیں گے پہلو سے ہمارے

درد جگر کی صورت اُٹھ کر
چھوڑ کے ہم کو بستر غم پر
بیٹھنے والے ہیں کب دم بھر
گھر کو سدھاریں گے یہ مقرر

لاکھ کریں گے منّت و زاری
کب یہ سنیں گے بات ہماری

لو جاگے۔ لی بخت نے کروٹ
ہائے رے ان کی یہ گھبراہٹ
مُنہ سے ہٹایا اپنا گھونگھٹ
دیکھنے ہی صبح اُٹھّے جھٹ پٹ

نیند کے جھونکے کچھ بیداری
ملتے اُٹھّے آنکھ خماری

شوق

شوق:۔ محمد ریاض احمد ولد شیخ عزیز احمد مرحوم بدایونی۔ بدایوں میں بچّوں کو انگریزی پڑھاتے رہے ہیں۔ سیدھے سادے صاف شعر کہتے ہیں۔ کلام یہ ہے

نکلی تو میری جان گیا تو مرا جگر
ناصح کے شر سے شوق بچائے خدا مجھے
تیری گرہ سے اے دل ناشاد کیا گیا
کم بخت پھر دماغ پھرانے کو آگیا

وفورِ ناتوانی ہے یہاں تک
رسائی کس طرح ہو نامہ بر کی
دل ہی الفت میں ساتھ چھوڑ گیا
آہ بیکار نالہ بے تاثیر

کہ نالہ بھی نہیں آتا زباں تک
نہ پہونچے جس جگہ وہم و گماں تک
کس کا اب آسرا کرے کوئی
چپ نہ بیٹھے تو کیا کرے کوئی

شوق

شوق:۔ حکیم اسرار الحق خلف حکیم مولوی عبد القیوم صدیقی وفریستی امروہی

فنِ طب کچھ اپنے والد اور کچھ جناب حکیم عبدالسلام مرحوم اور کچھ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے حاصل کیا۔ صوفی منش آدمی تھے۔ شاہ سید علاؤالدین صاحب کی خدمت میں بلا ناغہ روزانہ حاضر ہوا کرتے۔ اس سے ان کی مستقل مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ شوقؔ صاحب مقرر بھی اچھے تھے تصنیف و تالیف کا بھی بہت شوق تھا۔ افسوس ہے کہ ان کی تمام کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ شوقؔ مرحوم نے فنِ شعر کی ابتدا مولوی اصغر علی ثابتؔ رامپوری سے کی۔ اس کے بعد مولوی قطب الدین صاحب قطبؔ امروہوی سے بھی استفادہ کیا۔ آخر زمانے میں کسی کو کلام نہ دکھاتے سنہ ۱۳۴۹ھ میں انتقال کیا۔ ایک غزل جناب افسر صدیقی صاحب امروہوی نے کراچی سے روانہ فرمائی ہے وہ حاضر ہے: ؎

سب میں ظاہر ہیں مگر سب میں نہاں رہتے ہیں
خود نشاں دیکھے وہ بے نام و نشاں رہتے ہیں

ہیں وہی اول و آخر وہی ظاہر باطن
بھید کھلتا نہیں کچھ بھی وہ کہاں رہتے ہیں

ہم تو مٹ کر بھی رہے مجرمِ جرمِ الفت
وہ مٹا کر بھی مسیحائے زماں رہتے ہیں

جاگتا رہتا ہے سوتے میں بھی جادو ان کا
تیر انداز وہ بے تیر و کماں رہتے ہیں

آنے دیتے ہی نہیں اُن کے سوا کوئی خیال
دل کے ارمان ہی دل کے نگراں رہتے ہیں

آہ اے بے کسی دوراں ترے بیمار فراق
مرتے مرتے بھی سوئے در نگراں رہتے ہیں

ہم تو مشرک ہوں اگر غیر کی جانب دیکھیں
آپ ہر دل میں کہیں صورتِ جاں رہتے ہیں

مسجد و دیر و کلیسا و کنشت و کعبہ
سب یہ خالی ہیں تو پھر آپ کہاں رہتے ہیں

بے حجابی میں بھی پردہ نہیں اٹھتا رخ کا
دل میں آکر بھی وہ آنکھوں سے نہاں رہتے ہیں

دیر و کعبہ میں عبث شیخ و برہمن ہیں مقیم
وہ یہاں رہتے ہیں حاشا نہ وہاں رہتے ہیں

وہ دکھاتے ہیں ہر اک چیز میں جلوہ لیکن
ڈھونڈنے والوں کی نظروں سے نہاں رہتے ہیں

حضرتِ شوقؔ یہ جانبازی کی جرأت کب تک
رات دن آپ تو مصروف فغاں رہتے ہیں

شوق

شوق:- پنڈت جگ موہن ناتھ صاحب رینہ خلف پنڈت وشیشور ناتھ رینہ۔ یہ خاندان کشمیری پنڈتوں میں معزز شمار ہوتا ہے۔ اور تین پشت سے دہلی سے جاورہ گیا ہوا ہے۔ جسونت راؤ ہلکر والیِ اندور کے ساتھ نواب میر خاں اور نواب غفور خاں نے پنجاب کی لڑائیوں میں دادِ شجاعت دی۔ جب امن قائم ہوا تو غفور خاں کو مالوہ میں سات آٹھ لاکھ کا علاقہ عطا ہوا اور انہوں نے جاورہ کو اپنا صدر حکومت قرار دیا۔ اس وقت شوقؔ صاحب کے جدِّ امجد پنڈت شیو ناتھ دیوان مقرر ہوئے حکام انگریزی میں بھی اچھا رسوخ تھا۔ اس وجہ سے شوق صاحب ۱۸۹۰ء میں صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ اب چند سال سے مدت ملازمت کے اختتام پر پنشن پا رہے ہیں۔ جناب شوق نے طبیعت رنگین اور ذہن رسا پایا ہے عنفوانِ شباب سے شعر شاعری کا شوق رہا۔ خوب کہنے لگے۔ چونکہ پہلے حضرت امیر مغفور اور ان کے بعد نوح مچھلی شہری مرحوم کے فیضِ تلمّذ سے بہرہ یاب رہے اس لئے کلام میں متغزلانہ رنگ اور اسلوب میں شیوا بیانی پیدا ہو گئی جو قابلِ داد ہے حال میں آپ نے اردو فارسی شاعری پر ایک بڑے احسان کا کام کیا ہے۔ یعنی ایک بسیط و مصوّر تذکرہ مدوّن و شائع فرمایا ہے۔ جس میں اُن کشمیری پنڈت شعراء کے حالات و کلام درج ہیں جنہوں نے فارسی یا اُردو میں سخن سرائی کی ہے نمونہ کلام یہ ہے

مَیں تو اس سے اک دلِ مظلوم ہی مانگا کیا	کاتبِ سوزِ ازل کیا جانے کیا لکھا کیا
چشمِ گریاں تو ہماری اشک ہی پیتی رہی	رنگِ رخ نے رازِ دل اُڑ اُڑ کے سب افشا کیا
طوفِ کعبہ ہو کہ ہو سیرِ صنم خانہ عشق	شبنم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا غالب
نہ ان کو توڑنا ساقی نہ ویرانے میں رکھ دینا	یہ شیشے جتنے خالی ہیں پہ بجانے میں رکھ دینا
بوقتِ امتحاں اے دل رہے کچھ پاس خودداری	کہیں سر پائے قاتل پر نہ گھبرانے میں رکھ دینا
دل میں آج آئی ستمگار یہ کیا	مجھ سے ہمدردی کا اظہار یہ کیا

سچ کہو دل میں تمہارے کیا ہے — لغزشیں ہیں دمِ اقرار یہ کیا
سخت جاں بھی تو نہیں ہیں ایسا — دم چرانے لگی تلوار یہ کیا
شوق اٹھو بھی کہاں بیٹھ رہے — دو قدم ہے درِ دلدار یہ کیا

میکدہ چھوڑتے تو چھوڑ دیا — اب ٹھکانا نظر نہیں آتا
کسی حیلے اجل نہیں ٹلتی — کچھ بہانا نظر نہیں آتا
شوق کس رنگ میں ہو تم ڈوبے — کیا زمانہ نظر نہیں آتا

دل سے پوچھو کیا ہوا تھا اور کیوں خاموش تھا — آنکھ دو دیدہ تھی اتنا مجھے بس ہوش تھا
بیخودی سے لذتِ جامِ خودی اترا تو پھر — ایک ہی ساغر ملا ایسا کہ میں مدہوش تھا

یہ حالت ہو مرے مستِ جنوں کی جوشِ وحشت میں — کبھی پڑتا ہے دامن پہ کبھی چاکِ گریباں پر
بتوں کے آگے سجدہ کرتے کس نے شوق کو دیکھا — ارے توبہ یہ تہمت اور اک مردِ مسلماں پر

حسرتیں کہتی تھیں کیونکر پاؤں پھیلائینگے ہم — وسعتِ دل کو جو دیکھا وہ بھی حیراں ہو گئیں
جن شکایت کے لیے پنہاں ہو یہ لب واقف نہ تھے — چشمِ خوں آلود سے آخر نمایاں ہو گئیں

دکھڑے یہ آج سنئے کس سے زباں تو ہے — کچھ شکایت اسکی بھولی ہوئی داستاں ہیں یا
سب پوچھتے ہیں شہرِ خموشاں میں کون ہو — حیراں ہیں کیا بتائیں مسافر کہاں کے ہیں

کسی کا بختِ خوابیدہ ہوں یا پائے حنا میں ہوں — کسی حسرت بھرے دل کی اک آہِ نارسا میں ہوں
بیانِ نالۂ دل ہو کہ یا تاب لے دامن میں — نہیں گو کچھ مگر سازِ شکستہ کی صدا میں ہوں

ہونا تھا جو وہ ہو گیا اس کا گلہ نہیں فراق — دل پہ جو کچھ گذر گئی اس کی تو ہمیں خبر نہیں
[illegible] حالِ دل پہ جو گذرے ساز میں — عشق کے راز کا بیاں ان سے [illegible]
جلتی ہے شمع بزم میں [illegible] — دونوں جلے ہیں [illegible] عشق کے سوز و ساز میں

[illegible]
[illegible] چلنے والو
[illegible]

اے شوقِ دیدۂ چشمِ بصیرت سے کام اگر — بے پردہ خود نقاب کرے حسنِ یار کو

چلنے لگے عدم سے تو کچھ آگیا خیال — لے آئے ساتھ ہستیِ ناپائیدار کو

نہیں ہے ذکرِ حق سے خالی ہو حق بادہ نوشوں کی — صدائے نعرۂ مستانہ ہے تکبیرِ مے خانہ

پڑی ہیں پاؤں میں مستوں کے موجِ مے کی زنجیریں — اسیرِ بیخودی سب ہیں یہ ہے تعزیرِ میخانہ

شکستِ توبہ کی بنیاد تا برسوں رہے قائم — ہماری خاک ہوگی شاملِ تعمیرِ میخانہ

اٹھو اے شوق اب تم کر چکے ہو خم کے خم خالی — تمہاری کوئی ملکیت نہیں جاگیرِ میخانہ

مجھ میں باقی ہی اب رہا کیا ہے — دیکھئے مرضیِ خدا کیا ہے

ہیں خطاوار ہی سہی لیکن — سن تو لو پہلے ماجرا کیا ہے

دیر و کعبہ میں کس کا چرچا تھا — تو نے آخر وہاں سنا کیا ہے

لبِ زخمِ جگر تو ہنستے ہیں — تو نے اے بخیہ گر سیا کیا ہے

نیند اے چارہ گر نہیں آتی — شام سے تا سحر نہیں آتی

ایک اک غش میں ناتوانی سے — سانس دو دو پہر نہیں آتی

مے یہ کیسی پلائی ساقی نے — بیخودی کی خبر نہیں آتی

بہرِ تسکینِ دل کوئی تدبیر — تجھ کو اے چارہ گر نہیں آتی

جا کے بت خانہ میں بھی دیکھ لیا — کوئی صورت نظر نہیں آتی

سیرِ چمن کو آئے تو یہ تازہ گل کھلا — جاتے ہیں بوئے گل کو پریشاں کئے ہوئے

کل تک مجھے تھا عزت و ناموس کا خیال — بیٹھا ہوں آج چاک گریباں کئے ہوئے

پھر میکدے کو لے ہی چلا شوقِ میکشی — توبہ کو آج اپنی پشیماں کئے ہوئے

ہاں گسل دردِ جگر خون رلاتا ہے مجھے — اب تو کچھ رنگ دگرگوں نظر آتا ہے مجھے

میری ہستی کی حقیقت یہ ہے اُس کے آگے — ہوں میں اک حرف وہ لکھ لکھ کے مٹاتا ہے مجھے

تابِ رفتار نہیں منزلِ مقصود ہے دور — جذبۂ شوق ہی کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

قصے دونوں کے ادھورے ہی رہے جاتے ہیں
مستِ ازل سب جمع ہوئے ہیں لاؤ سبو کچھ کام چلے
دل کو ہم نے اپنا جانا ہم سی خطا یہ فاش ہوئی
بلبلو اب تو قیدِ قفس ہے دیکھیں کب تک چھٹنا ہو
تیری وحدت میں ہے کثرت کی بھی نیرنگی
پتے پتے کی زباں دیتی ہے درسِ وحدت
صبح ہوتے ہی ہوئی بزمِ شبینہ برہم
وفورِ درد میں ضبطِ فغاں رہے نہ رہے
دمِ اخیر تو سن لو جو دل پہ گذری ہے
بس آج قصۂ بسمل کا خاتمہ ہو جائے
ہم کو دل دیکے جفاؤں کا پتہ ملتا ہے
سوزِ پنہاں۔ غمِ ہجراں۔ تپشِ دل کے سوا
جستجو کرتے رہیں ہم دیر و حرم میں ناحق
دور سے منزل کو زار و ناتواں دیکھا کئے
یہ کسے معلوم منزل تک وہ پہنچے یا نہیں
میں ہوں سرمستِ ازل خمخانۂ جاوید کا
دل ہی خود سر ہیں تم سودائی تو پھر کیونکر نبھے
جلوہ حسنِ بتاں سے ہے یہ ظاہر ہوتا
جاں بلب ہے کوئی تا صبح رہے یا نہ رہے
شوق تو بندۂ الفت ہے اسے کیا پروا
دیکھتے دیکھتے نیرنگِ دو عالم کی فنا

دل کو میں اپنی تو وہ اپنی سناتا ہے مجھے
ساقی کو ہاں پاس بٹھا کر یار و دورِ جام چلے
دھوکا جو دے وقت پہ ہم کو ایسے سے کیا کام چلے
تم کو مبارک سیرِ گلشن ہم تو اسیرِ دام چلے
اس تماشہ سے مگر آنکھ ابھی بیگانہ ہے
سبق آموز مرا سبزۂ بیگانہ ہے
نہ وہ ساقی نہ وہ ساغر نہ وہ پیمانہ ہے
یہ رازِ دل مجھے شک ہے نہاں رہے نہ رہے
کسے امید ہے منہ میں زباں رہے نہ رہے
بلا سے آپ کا خنجر رواں رہے نہ رہے
سچ بتاؤ تمہیں کیا اہلِ جفا ملتا ہے
اور بھی کچھ تمہیں اربابِ وفا ملتا ہے
ڈھونڈنے سے کہیں بندے کو خدا ملتا ہے
بیٹھے ہم حسرت سے گردِ کارواں دیکھا کئے
جا بجا ہم تو نشانِ رفتگاں دیکھا کئے
چاہئے ساقی نہ جام و بادہ و مینا مجھے
پردہ چھوٹے دل کو ہے اور دل تو ہے پردا مجھے
پسِ پردہ یہ کسی اور کی رعنائی ہے
اس کی کچھ سن لو ابھی طاقتِ گویائی ہے
لاکھ کوئی کہے دیوانہ ہے سودائی ہے
کھو دیا اپنا بھرم چشمِ تماشائی نے

ذوق نظارہ میں پنہاں تھا فریبِ ہستی خود تماشا بھی ہے خود محوِ تماشا بھی ہے	کھو دیا دل کہیں منّت کشِ رعنائی نے رنگ بدلا ہے نرالا ترے سودائی نے

شوق

شوق :- علی محمد صاحب شوق ساکن منگرول۔ معمولی فکر کے شاعر ہیں۔ کلام سے سادہ گوئی اور سلاست ظاہر ہے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ کلام یہ ہے :-

ہو نظر سے کہیں اوجھل تو قیامت ہو جائے کام کیا کیا مرے بن بن کے بگڑ جاتے ہیں	عشق آنکھوں کو ہی اتنا تری تصویر کیساتھ کامیابی کو بھی کچھ لاگ ہے تدبیر کیساتھ

رحم کی آس اِک ستمگر سے تم نے سیکھا ہے یہ بگڑ جانا پاؤں پھیلا کے سو رہے ہیں ہم توڑتا ہے وہ بات بات میں دل	کہیں نکلا ہے موم پتھّر سے کس کے بگڑے ہوئے مقدّر سے چین پایا یہ مل کے خنجر سے شیشہ ٹکرا رہا ہے پتھّر سے

شوق

شوق :- حکیم تصدّق حسین خاں معروف بہ نواب میرزا۔ لکھنوی۔ شاگرد خواجہ آتش۔ ان کی شہرت کے اربعہ عناصر چار مثنویاں ہیں۔ یعنی بہارِ عشق۔ زہرِ عشق فریبِ عشق۔ لذّتِ عشق۔ یہ مختصر مثنویاں گویا اس زمانے کی رندیت اور عیاشانہ زندگی کا کھلے عشقبازی کا دفتر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان مثنویوں کا موضوع خیالی مضمون آرائی نہیں بلکہ آپ بیتی وارداتیں ہیں۔ ان مثنویوں میں سے اکثر سلاست بیان۔ واقعہ نگاری کی حسنِ ادا۔ فصاحت اور شگفتگی اسلوب اور صحتِ روزمرّہ کے اعتبار سے بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن افسوس سے کہا جاتا ہے کہ بدتہذیبی اور عیاشانہ آوارگی کی پھٹکار اُن اوصاف پر جن کا ابھی ذکر ہوا مٹھیاں بھر بھر کر خاک ڈالتی ہے کاش نواب مرزا پاک محبّت۔ مظاہر قدرت۔ تصوّف یا اخلاق جیسے موضوع پر قلم اٹھاتے۔ احساسات نفیس اور جذبات لطیف کی چمن طرازی کرتے تو ہم خرما و ہم ثواب کا مضمون تھا۔ مدّت تک ان مثنویوں کی نشر و طباعت حکماً بند رہی۔ اب یہ قید

اٹھا دی گئی ہے۔ سنہ ۱۸۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ شوق کبھی کبھی غزل بھی کہتے تھے۔ مگر غزل میں وہ بات نہیں جو مثنوی میں ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو :-

خوش چشم ہے تو تجھ سے زمانے کی لڑی آنکھ
کس کس کی تری آنکھ کے اوپر نہ پڑی آنکھ

وہ بھی ہر کوئی حسن جیسے صورت تصویر
حیراں نہ رہے دیکھ کے دو چار گھڑی آنکھ

منظور تھا اے حور نہ دیکھوں تجھے لیکن
انسان تو تھا رہ نہ سکا جا ہی پڑی آنکھ

ایک ایک سرو دلچسپ ہے جو عضو بدن ہے
رہ رہ گئی پھر لوٹ ہے جس جا پہ پڑی آنکھ

ہم جان گئے آنکھ ملاؤ نہ ملاؤ
بگڑے ہوئے تیور ہیں تمہارے کئی دن سے

دیوانہ بھی سودائی بھی فرماتے ہیں اکثر
ان ناموں سے جاتے ہیں پکارے کئی دن سے

آخر مری آہوں نے اثر اپنا دکھایا
گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں بیچارے کئی دن سے

اک شب سے گئے ان سے نہاں ہے تو شوق
آتے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے

شوق

شوق :- منشی ماکھن لال باشندہ بریلی شاگرد حضرت امیر مینائی و تسلیم بریلوی طبیعت میں جدت فکر میں پرواز تھی۔ ذہن کی رسائی قابل داد تھی۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ مرحوم سادہ زبان میں مضامین بلند ادا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

ناحق ارمان ہے قاتل کو تماشا کیسا
محو لذت ہوں دم نزع تڑپنا کیسا

تھی کہاں تاب ستم وہ بھی مٹا دی تو نے
بن گیا تجھ پہ ستم اے ستم آرا کیسا

شوق کہتا ہے کہ پھر عرض کروں حسن طلب
شرم کہتی ہے کہ ہر بار تقاضا کیسا

ضعف نے بلبل تصویر بنایا مجھ کو
اب بلانے کی بھی طاقت نہیں نالہ کیسا

میری قسمت میں تو اک فرقت [illegible] شوق
وصل کہتے ہیں کسے یار کا جلوہ کیسا

اس بے خبر سے کوئی تو جا کے سنائے حال
ہے ایک سی زباں پہ مری داستان [illegible]

شہر شہر [illegible] شوق خلق میں [illegible] حال کی
ہر ناصح بھی [illegible] بیٹھ گئے [illegible] سے آپ

اللہ مٹائے اس بُت مغرور کی خودی
کہتا ہے طنز سے مجھے مانگیں خدا سے آپ

خزانہ جن کا پُر ہے ان میں دیکھا عیب خسّت کا
کریمی کی صفت جن میں ہے ان کا ہاتھ خالی ہے

ہوس ہر عیش کی دل میں نہ ہے کیا عشق حاصل ہو
بھرا ہے شیشۂ اس مے سے جو کیفیت سے خالی ہے

شرمندۂ گناہ کا اعزاز دیکھئے
آغوش میں لئے ہوئے رحمت خدا کی ہے

شوق :- پنڈت پرتھی ناتھ خلف پنڈت نرنجن ناتھ صاحب مشتاق مؤلف تذکرہ چمنستانِ کشمیر۔ پنڈت بشمبر ناتھ صاحب دہلوی آپ کے دادا دہلی سے جا کر الہ آباد میں مقیم ہوئے۔ اور علم و فضل حسنِ سلوک و حبِ وطن کی وجہ سے صوبۂ آئین کے مردِ بزرگ تسلیم کئے گئے۔ آپ کے خاندان کا شمار کشمیری پنڈتوں کے معزز خاندانوں میں ہے۔ آپ ۱۸۸۳ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ شوق صاحب نے طبیعت اچھی پائی ہے۔ علاوہ غزل کے جدید قسم کے موضوعوں پر بھی لکھتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

یہ بھی اِک ادنیٰ کراماتِ فسونِ حسن تھی
قطرۂ خون پر نظر اس کی پڑی دل ہو گیا

عشق کے اعجاز سے یہ منزلت دل کو ملی
اب تو میرا دل بھی دل کہنے کے قابل ہو گیا

جو نیر ادھر آتا وہ تیر ادا ہوتا
بھر ٹیس وہی اٹھتی پھر زخم ہرا ہوتا

قسّامِ ازل تو نے انسان کے پہلو میں
جو چاہے دیا ہوتا یہ دل نہ دیا ہوتا

کسی کا کیا بھروسہ جا کے اس سے کچھ کا کچھ کہدے
پیام اپنا لئے جاتا ہے دل پیغامبر ہو کر

پیدا مرے افسانے سے ہو درد جگر میں
کھنچ آئے زمانہ وہ ہو تسخیر اثر میں

وہ مسکرا کے اور گراتے ہیں بجلیاں
مجھ دل جلے پہ تھوڑے ستم آسماں کے ہیں

اس زمانہ میں نہیں گذری کسی کی ایک سی
یوں دلاسا دیکے دل کو شاد کر لیتا ہوں میں

تڑپ نصیب ہوئی سوزشِ نہاں سی ہمیں
وفورِ غم میں تشفّی ملی فغاں سے ہمیں

یہ چار تنکے ہی بس کائنات اپنی ہیں
قفس میں ڈال نہ صیاد آشیاں سے ہمیں

جہاں میں آ تو گئے ہیں مگر نہیں معلوم
حیات لائی ہے اس دور میں کہاں سے ہمیں

ہستی کا ہوش آتے ہی مخمور ہو گیا
لایا ہوں ساتھ اپنے ازل سے خمار کو

اگر دل ضبط سے تنگ آ کے سرگرم فغاں پھر ہو
زمیں بدلے نئی صورت سے دور آسماں پھر ہو

نہ وہ بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
تو کیونکر اعتبار انقلاب آسماں پھر ہو

کر چکے طے انتہائی مرحلے تدبیر کے
اب رہے باقی کرشمے دیکھنے تقدیر کے

کھینچ لائی انکو یاں تک جنکو تھا آنے میں عار
ہو سکے دیکھے تو کوئی آہ دامن گیر کے

دل کی خاطر کھو چکے صبر و تحمل عقل و ہوش
رہ گئے نالے سو وہ ہیں منتظر تاثیر کے

ہوں گنہگار محبت یہ بھی کیا کم گناہ
کیا ضرورت عذر وہ ڈھونڈیں مری تقصیر کے

میرا جوش جنوں جو بڑھنے لگا
لوگ سمجھے بہار آئی ہے

خندہ زن گل ہوئے کھلیں کلیاں
دل میں کیا جانے کیا سمائی ہے

موت آئی ہے کیسے جانے دوں
یہی اک عمر کی کمائی ہے

ان سے کرتے رہے امید وفا
جن کا شیوہ ہی بے وفائی ہے

مایوسیاں ہیں میں ہوں ضبط غم نہاں ہے
جو سن سکے نہ کوئی وہ میری داستاں ہے

مجھ بیکس کو لیکر شب غم آئی ہے
بھیڑ کی بھیڑ ہے تنہائی کی تنہائی ہے

ضبط کرتا ہوں تو آتا ہے کلیجہ منہ کو
آہ کرتا ہوں تو اس شوخ کی رسوائی ہے

حب وطن

ترا ہی نام زمانے میں سب سے پیارا ہے
تو واں کا نور ہے آنکھوں کا میری تارا ہے

کوئی ملا نہ زمانہ کو چھان مارا ہے
یہ کہہ سکیں کہ ہم تیرے ہیں تو ہمارا ہے

جہاں میں جنکی ہے یاں سے وطن پرستی ہے
انہیں کی زندگی ہے انہیں کی ہستی ہے

چلے خلاف اگر اب بھی راہ فطرت کے
تو ہو چکے نہ اٹھانے اصول قدرت کے

رہے نفاق اگر یوں ہی اہلِ ملت کے
تو پھر عبث ہیں گلے اور شکوے قسمت کے

وطن کے نام کو تم خیرباد کہہ دینا
اور اپنی قوم کو تم نامراد کہہ دینا

قرارِ دل کو نہیں بے کسی کا عالم ہے
وطن میں خونِ تمنّا کا اپنی ماتم ہے
زمانہ ہنستا ہے ہم پہ ہمارا سر خم ہے
جواب دیں بھی تو کیا دیں کہ ہم میں کیا دم ہے

ہمارے دل میں جو الفت کی شمع جل جائے
تو جلد بادِ مخالف کا رُخ بدل جائے

پنہائی ہند کو بیڑی دغا کے ہاتھوں نے
اسیر ہم کو کیا ملک کے بد صفاتوں نے
تمام کام کیا ان کی کوری باتوں نے
دیا فریب بھی کیسا بلا کی گھاتوں نے

جو اب بھی رازِ حقیقت سمجھ میں آجائے
تو جلد رنگ زمانہ پہ اپنا چھا جائے

نہ ہو گلوں سے مزیّن تو پھر چمن کیا ہے
نہ گائے راگ وطن کا تو وہ دہن کیا ہے
چلے نہ راہِ وفا پر تو پھر چلن کیا ہے
ترے رفیق کو اندیشۂ محن کیا ہے

وفا کی راہ میں آسن جمائے بیٹھے ہیں
ترے ہی نام پہ دھونی رمائے بیٹھے ہیں

وفا سے شوقؔ جو دل بیقرار ہو جائے
تو جلد ختم حدِ انتظار ہو جائے۔
ہراس کیا ہے جو وہ جاں نثار ہو جائے
وطن کا ڈوبتا بیڑا بھی پار ہو جائے

جہاں میں کام وہ کر جاؤ آن رہ جائے
جو مٹ بھی جاؤ تو مٹنے کی شان رہ جائے

شوقؔ :- میر عبدالرؤف جعفری خلف مولوی عبدالکریم جعفری حصہ دار موضع اسلام آباد۔ نواب مقدم جنگ کے وارث ہیں۔ آپ کے والد اورنگ آباد

کے منصف و مفتی رہ چکے ہیں۔ اور وہ نواب قائم یار جنگ کے استاد تھے۔ ان کے بزرگ مضافات شیراز سے ہندوستان میں آئے تھے۔ اب سو سال سے زاید عرصہ سے ان کا خاندان دکن میں آباد ہے۔ سید شاہ عبد الحق اور مقدم جنگ ان کے اسلاف میں نہایت نامور تھے۔ شوق صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ابتدا میں مولوی سرفراز علی صاحب وشفقی سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر حضرت حبیب کنتوری سے فیض سخن حاصل کیا۔ صیغہ داری معتمدی تعمیرات عامہ سرکار آصفیہ پر مامور ہیں۔

کلام یہ ہے :ـ

جہاں میں آکے خاصانِ خدا ستی ہیں پیدا ہیں
یہ دار الامتحاں باعث ہے عیش جاودانی کا

شہادت ہو گئی وجہ فروغ عاشق مضطر
کشا ہے مرکہ گل کترا ہے شمع زندگانی کا

چھپے ہیں پردۂ دل میں وہ آنکھوں سے نہاں ہو کر
کھلا ہے مجھ پہ عقدہ اب یہ مت لن ترانی کا

یہ لعل بے بہا جن کا سر شوریدہ ہے معدن
جگر کا وہ سے آئے ہیں زباں تک نکل گئے ہیں

اے فلک تجھ سے بر آئی اک جہاں کی آرزو
ہم جہاں سے بیچ لے اس جانِ جہاں کی آرزو

واسطے دو دن کے ہوتے ہو کیوں قصر بلند
نا فلو۔ بے سود ہے نام و نشاں کی آرزو

ذکر ان باتوں کا کیا جب دل ہی پہلو میں نہ ہو
شوق کیسا کس کی حسرت اور کہاں کی آرزو

وہ چال چل کہ دل نہ کسی کا ہو پائمال
آنا خیال عالم رفعت میں چاہئے۔

شوق :۔ رائے دولت رائے ولد رائے شیو سنگھ کا یستھ باشندہ لکھنؤ محلہ اشرف آباد شاگرد جناب منشی ماہیؔ۔ وہاں زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے ایک غزل کے چند شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :ـ

یاد دنداں میں رہیں جانب اختر آنکھیں
کیا کہوں بند ہوئیں رات نہ دم بھر آنکھیں

شوق دیدار سے از بسکہ ہیں منتظر آنکھیں
ہیں کبھی مہ کی طرف اور کبھی در پر آنکھیں

دیدۂ نرگس ہیں پیش نظر اس رخ روشن کا نیاں
جھلکتے ہیں خورشید سے دن بھر آنکھیں

نہیں معلوم ترے طالب دیدار کو آہ	خواب کیا چیز ہے لگ جاتی ہیں کیونکر آنکھیں
دیکھ لے شوق ذرا گلشن عالم کی بہار	بند ہو جائینگی اک روز مقرر آنکھیں

شوق

شوق:- شنکردت ورما ولد چودھری عطر چند یادوبنسی راجپوت ہیں۔ نومشق نوجوان ہیں۔ یکم دسمبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے۔ پنجابی۔ ہندی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف ہیں۔ تین چار برس سے شعر کہتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک سیّد دل محمد صاحب فضا سے تلمّذ رہا۔ ۱۹۳۱ء سے خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت سے اصلاح لینی شروع کی ہے۔ ۸ شعر روانہ کئے تھے۔ جن میں سے مندرجۂ ذیل بغرض ملاحظہ درج ہیں:-

قبضہ ترا دلوں پر سکّہ ترا جہاں پر	تو ہے خدائے عالم۔ عالم غلام تیرا
راہب نے خاک چھانی زاہد نے ڈھونڈ مارا	لیکن نہ پاسکے وہ اعلیٰ مقام تیرا
آئے جو در پہ تیرے خالی نہ اس کو پھیرے	جاری جہان میں ہے کیا فیض عام تیرا

شوق

شوق:- منشی شیخ احمد علی قدوائی خلف شیخ کاظم علی قیس۔ آپ قاضی قدوۃ الدین رومی کی اولاد میں تھے۔ یہ خاندان اودھ میں عالی نسب اور گرامی قدر سمجھا جاتا ہے۔ حضرت شوق کی ولادت قصبہ جگور ضلع لکھنؤ میں ۱۸۵۲ء میں ہوئی ابھی دو ڈھائی برس کے تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم دس گیارہ سال کی عمر تک والدہ کی سرپرستی میں گھر پر ہوتی رہی جس کے بعد شیخ امیرالزمان صدیقی جوان کے بہنوئی تھے۔ انہیں اپنے ساتھ اناؤ لے گئے۔ اور جب وہ ایک عہدہ پر فائز ہو کر رامپور گئے تو حضرت شوق کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اور وہاں اُن کی فارسی اور عربی کی تعلیم شروع کرائی۔ پھر جب صدیقی صاحب رامپور سے سہسوان ضلع بدایوں آئے۔ تو اُن کو بھی ساتھ آنا پڑا۔ سہسوان میں جناب شوق نے مولانا ریاض الحسن مرحوم سے علوم عربیہ کی تحصیل کی اور وہیں سکول

میں انٹرنس تک انگریزی بھی پڑھی۔ ابھی اٹھارہ برس کی عمر تھی کہ درس و تدریس کا
سلسلہ بند کر کے ان کو وطن میں آنا پڑا۔ اب ان کا قیام کئی برس تک لکھنؤ میں ہوا۔
نوجوانی کا زمانہ اور لکھنؤ میں قیام سونے پر سہاگہ تھا۔ یہاں ذوق سخن کی ابتدا
ہوئی۔ تھوڑے دنوں کے شغل کے بعد آپ حضرت تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں اسیرؔ
مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اسیرؔ مرحوم رشتہ میں ان کے دادا ہوتے
تھے۔ منشی امتیاز علی مرحوم سابق وزیر ریاست بھوپال پھوپھی زاد بھائی تھے اس
توسل سے اسی اثنا میں فکر معاش نے گھیرا تو کچھ مدت فیض آباد میں عہدۂ تحصیلداری
پر مامور رہ کر ملازمت چھوڑ دی اور لکھنؤ چلے آئے اور اخبار آزاد نکال بیٹھے۔ یہ
اخبار اپنے وقت میں مسالے کے اعتبار سے بہت دلچسپ تھا۔ کچھ برس اس
شغل میں رہ کر اسے ترک کر دیا۔ اور بھوپال میں جا کر ملازم ہو گئے جہاں نظامت
کے عہدے تک پہنچ کر پنشن یاب ہوئے۔ آخر عمر میں رامپور میں کتب خانہ سرکاری
کے انصرام سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ رامپور کا کتب خانہ تھا یا محکمہ مال کا دفتر اور
کچہری آپ کے ادبی مشاغل برابر جاری رہے۔ آخر عمر میں بوڑھے ضعیف اور
مستغنی ہو کر ضلع بارہ بنکی میں آ کر اس ناگزیر ساعت کا انتظار کرنے لگے ؂

اُردو ادب کی خدمت اور اصلاح مذاق جو شوق نے کی ہر ایک سے نہیں
بن پڑتی۔ اسے حسن اتفاق کہیے کہ لکھنؤ نہ ان کا مولد و منشا تھا اور نہ ابتدائی عمر
کا مسکن۔ وہ لکھنؤ ہو یا دہلی وہ لوگ جو ان مرکزی مقامات میں پیدا ہوتے اور وہیں
بڑھتے چڑھتے ہیں۔ ان میں اہل زبان ہونے کا زعم اور پندار پیدا ہو جاتا ہے جس کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عموماً ان کا ذہن پوری طرح پر انتقادی نہیں ہوتا ہے۔ یہ نہ وہ مسند اور
منشور کے دائرے سے نکل کر زبان اور ادب کو ترقی کی شاہراہ پر لا سکتے ہیں۔
حضرت شوق زبان اور ادب کے ساتھ اس طرح مسلوک ہوئے جس طرح ایک علم

کیمیا کا شائق و متحقق اپنے معمل میں مختلف آلات اور اشیاء سے مسلوک ہوتا ہے۔ اُن کی ادبی اور لسانیاتی تنقیدیں سائنٹیفک شان رکھتی ہیں۔ اور ادب کے متجسس کے لئے سر مشق کا حکم رکھتی ہیں۔ آزاد۔ اودھ پنچ۔ زمانہ اور صبح امید آپ کے ادبی مقالات سے اکثر مالا مال ہوتے رہے ہیں۔ زبان کے معاملہ میں راقم کے خیال میں جو نظر غائر جناب شوق نے پائی تھی وہ کم آدمیوں کا حصہ ہے۔

جب آپ لکھنؤ میں تھے تو مشاعروں میں اکثر شرکت فرمایا کرتے تھے ہفتہ وار مشاعرے امیر مرحوم کے مکان پر بھی ہوا کرتے اور اصلاح و تحقیق زبان کے بارے میں مباحثے رہتے۔ ان میں نواب مہدی علی خاں۔ نواب سرفراز الدولہ اور نواب سراج الدولہ جیسے امرا بھی شریک ہوا کرتے۔ ہر کہیں اردو سے متعلق مختلف مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ حضرت شوق ان مباحثوں سے فائدہ اٹھاتے اور اپنی تحقیق فن کو بڑھاتے۔ لکھنؤ کے قیام میں ہی آپ نے مثنوی ترانۂ شوق تصنیف فرمائی۔ جس کی اپنے وقت میں بہت شہرت ہوئی۔ اسی زمانے کے ایک مشاعرے کا ان کا یہ شعر بہت پھلا پھولا تھا اور ہر شخص کی زبان پر تھا ؎

جھرمٹ سے عاشقوں کی وہ گھبرا کے اس قدر | قرآن اٹھا رہے ہیں کہ بندہ حسیں نہیں

تھوڑے دنوں میں وہ صحبتیں درہم برہم ہوگئیں اور زمانہ کا مذاق بدل گیا۔ شوق مرحوم کے ادبی کارنامے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اپنے عہد کے بہترین ماہرین فن اور ادیبوں میں تھے۔ آپ کی ہمہ گیر طبیعت اور تبحر کا بیان ایک دفتر چاہتا ہے۔ اکثر علمی مباحثوں میں آپ نے حصہ لیا۔ اور اپنے تئیں شریک غالب ثابت کیا۔ آپ کی فضیلت اور پایۂ ادب آپ کے معاصرین کو تسلیم تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا کہ آپ ادیب ہونے کے علاوہ مصلح ادب بھی تھے۔ اگر آپ کی غزلیں میر ممبر دَر کی یاد کو تازہ کرتی ہیں تو آپ کی معرکتہ الآرا تصنیف "عالم خیال" جو چار مثنویوں کا مجموعہ ہے اردو ادب

اور اسلوب شاعری میں ایک نیا باب کھولتا ہے۔ اس پر آپ کے دوست اور مداح
بابو جوالا پرشاد برق لکھنوی مرحوم نے نہایت عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ مثنویوں
کا یہ مجموعہ اردو نظم کا نیا راستہ نکالتا ہے۔ اس میں کسرۂ اضافت کہیں نہیں آتا۔ اس
کے علاوہ ایک ایک شعر جذبات لطیف اور احساس واقعی کا آئینہ بردار ہے۔ راقم
کے نزدیک جہاں تک اصلی واردات قلب کا تعلق ہے یہ مثنویاں اپنی نوعیت کی
اولین کتاب ہیں۔ گھریلو تعلقات میں فطرت کی عکاسی حضرت شوق پر ختم ہے۔
ایک اور مجموعہ آپ کی مثنویوں کا گنجینہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بعض
نظمیں استدلالیہ بھی ہیں۔ جدید طرز کی ایک اور نظم نیرنگ خیال آپ کی تصنیف
سے ہے جس کے چار جز چار مختلف بحور میں ہیں۔ یہ جدت بھی مرحوم ادیب کے
بعض اجتہادوں کی طرح تقلید کے قابل ہے۔ ایک ہی بحر میں بہت سے شعر
خاصکر جبکہ مثنوی لمبی ہو قارئین کے لئے اکتانے والے ہوتے ہیں۔ ہندی میں بابا گسائیں
تلسی داس نے اس قباحت کے دفع کی یہ تدبیر نکالی کہ اپنی مثنوی رامائن تو ساری
کی ساری ایک ہی بحر میں رکھی۔ لیکن مثنوی کے تھوڑے تھوڑے اشعار کے بعد
اور دوسری اصناف شعر مثل دوہے وغیرہ کے بیچ بیچ میں داخل کر دئے۔ شوق
مرحوم کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے آزاد کی طرح پنجاب میں نئی (نیچرل) شاعری
کی بنیاد نہیں ڈالی۔ بلکہ لکھنؤ میں بیٹھکر جدت آفرینی اور اپنے ادبی اجتہادات کی
اشاعت کی۔

قاسم و زہرہ اور ایک اور ڈراما بھی آپ کی تصنیف سے ہیں۔ لیکن آپ
کا کوئی ڈراما مقبول نہ ہوا۔ بہرحال یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نقادان اردو کو ادب کی اس
صنف کی جانب توجہ ہونے لگی۔ ایک مسدس بلبل و نہار بھی آپ کی تصنیف سے
شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا دیوان فیضان شوق کے

نام سے شائع ہو گیا ہے۔ جس میں غزلیات کے علاوہ چند قطعے اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ کے نثر کے مضامین تنقیدی اور مقالات ادبی بھی کتابی صورت میں شائع کر دئے جائیں جو لٹریچر کے نکات اور زبان کے اہم مسائل سے مملو ہیں۔

آگے لکھا گیا ہے کہ شوق کی غزلیں میر کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ غزل میں اگر کسی شاعر نے میر تقی کی واقعی اور عملی تقلید کی تو وہ منشی احمد علی شوق ہی ہیں۔ میر مبرور اور ان کے کلام سے شوق کو عشق تھا۔ پھر یہ روحانی ہم نشینی جمال آفرینی کیوں نہ کرتی۔ فرماتے ہیں۔ ؎

خدا بخشے بہت ہی شوق ہم کو یاد آتا ہے
وہ دل والا تھا درد اس میں جناب میر کا سا تھا

ایک اور غزل کا مقطع ہے۔

دکھاؤں شوق ہر ہر لفظ سے میں جذب کی قوت
جو مجھ پر مہرباں روح جناب میر ہو جائے

شوق مرحوم نے نہ صرف یہ کیا کہ جدت آفرینی۔ ذوق سلیم اور اجتہاد صالح سے اُردو کے تموّل و تمدّن کے سامانوں میں ایزادی کی بلکہ جب دیکھا کہ ناسمجھی یا ذکاوت احساس کی تحریک سے لفظی تنقید کے مکروہ پہلو اور متروکات کی تنگ دامانی کو رواج دینے میں لوگ ساعی ہیں ان کو روکا اور عالمانہ مقالات اور اس سے بڑھ کر اپنے طرزِ عمل سے ان کی تکذیب اور تردید کرتے رہے۔ مثلاً گو کہ۔ "پہ" بمعنی "پر"۔ "یوں ہی" بجائے "یونہیں" تلک وغیرہ کلمات ان کے ہاں بار بار آئے ہیں۔ قصہ مختصر تنقید۔ زبان کے تموّل۔ اسلوب اور صنف کے بارے میں اور نظم و نثر کو تازگی بخشنے میں جو کارِ نمایاں حضرت شوق سے بن پڑا۔ وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوا کرتا۔

سدا رہے نام اللہ کا۔ آخر یہ عالم متبحر اور ادیب کامل جس کے احسانات سے

اُردو زبان اور ادب عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ساٹھ برس اُردو کی خدمت کر کے تہتر سال کی عمر میں ۲۷ راپریل ۱۹۲۵ء کو جان بحق ہوا۔

ان کے بیٹے منشی طاہر علی صاحب بی اے حکومت ہند کے دفتر وزارت میں معزز عہدے پر مامور ہیں اور مرحوم مؤلف تذکرہ ہذا کے احباب میں ہیں شوق کے عزیز شاگرد منشی محمد حسین صاحب محوی نے بہت محنت سے پرانے رسالوں اور اخباروں سے لیکر ان کا کلام مؤلف تذکرہ ہذا کے پاس بھیجا۔ اگرچہ اب فیضان شوق شائع ہو گیا تاہم محوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا راقم کا فرض ہے۔ منشی خورشید علی مہ دہلوی سابق مدیر روزانہ اخبار دہلی۔ مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹر (جو آپکے نواسہ بھی ہیں) آپکے شاگردوں میں ممتاز ہیں شوق مرحوم اور مؤلف مرحوم سے برسوں خط و کتابت رہی۔ لیکن بعض اتفاقات ایسے پیش آتے رہے کہ ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔ اب اس کا کیا ذکر۔ دونوں جنت میں ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:-

خرد کو عجز زیبا ہے ادب سے دم بخود ہو کر
کہ نہیں ہی معرفت تک خبر ممکن ہے رسا ہونا

خطا سے پیشتر ہیں ہم خطا کا معترف یارب
بشر ہوں اور نہیں ممکن بشر کا بے خطا ہونا

نہیں کیوں محرم رکھوا تیرے صحیفۂ عفو سے مجھکو
نہیں منظور یارب مجھکو اپنا پارسا ہونا

بکتے بکتے تو تو لے ناصح مرا سر کھا گیا
دل گیا میرا گیا نیری گرہ سے کیا گیا

ضبط گریہ نے کیا میری سب امیدوں کا خون
یہ سمجھ بیٹھا وہ بے پروا کہ اب صبر آ گیا

تمہاری غیر کی ناصح کی اب تو سب کی سنی ہیں
کسی کی ہم نہیں سنتے خود بھی اک زمانہ تھا

دل کھوتا ہی اس سے ہم کو راز عشق کہنا تھا
کھد کا بھید ہی لنکا ڈھانے اپنا سمجھ رہنا تھا

ابرو نے کعبہ آج سے یہ نام رکھدیا
ہم نے اُٹھا کے طاق پہ اسلام رکھدیا

لجب نام سنکے لگے مانگنے حسیں
کس نے ذرا سے خوان کا دل نام رکھدیا

جوڑا جو بندھ گیا تو شے دل کہاں پھنسیں
تو نے ادھر لپیٹ کے کیوں دام رکھدیا

گل ہو سکے ہیں کیا ہنسنا۔ ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گذرا رونے ہی جنم میرا

جس رستے سے شحنہ آئے وہ رستہ ہی کیوں رکھو
سات سمندر پار ہی کعبہ سوچو اے مسجد والو
دل مرا ٹوٹا تو اس کو کچھ ملال آہی گیا
ہنس کے بولے جب پھنسا بالوں میں خون آلودہ دل
تیر سے دل کو لگاوٹ ہے کہ اس کا پیکاں
سینکڑوں خوش قامت دلبر ہیں اک تم بھی سہی
لے گئے وہ میرے دل کے ساتھ دنیا بھر کا حسن
خدا بخشے بہت ہی شوق ہم کو یاد آتا ہے
ہوں گے وہ اسکے شہر جگنو نہ کہہ دینا کہیں
منہ کی کھاتے کھاتے خاموشی میں اب کہتے ہیں حال
بدلی نہ میں بناؤں نہ گھرنے کا حکم دوں
کچھ ہٹا رنگ اسکی مہندی کا تو لطف آنے لگا
دشوار ہو گیا ہے مجھ کو خود اپنا ملنا
اوسط کا رنگ پایا صرف اس حسین رخ نے
ہے زیر جبیں نقش قدم ایک حسیں کا
گھبرا کے سینے میں دل صد چاک کے ٹکڑے
دل میں نہ تو قوت ہے نہ خون اور نہ امید
اٹھتا ہی نہیں درد سینے سے اشک ہے یا دل
جس دن سے قد اس کا ہوا رفتار پہ مائل
الجھن سی ہے دل اے شوق پریشان کئے سے
اے بت آشنا نہ ستا مجھ کو کہ مسجد ڈھونڈوں

بیٹھ کے اندر چمن لو رند و دروازہ میخانے کا
آؤ چلیں بھی چار قدم ہے دروازہ بتخانے کا
اپنے بچپن کے کھلونے کا خیال آہی گیا
ہال پھیلایا تھا میں نے اسمیں لال آہی گیا
ہے نکیلا مرے بانکے کی نظر ہی کا سا
باغ الفت میں نہ بادہ اور اک لوٹا ہوا
جمع تھا اس میں مری آنکھوں کا سب لوٹا ہوا
وہ دل والا تھا ورد اسمیں جناب میر کا سا تھا
دیکھنا شب کو تماشہ تم ہماری آہ کا
ہم نے بدلا ہے طریقہ اس سے رسم و راہ کا
تو یہ جو ٹوٹ جائے تو میرا قصور کیا
چاند کا ٹکڑا وہ ہر ناخن پہ چمکانے لگا
ہے کیا وسیع عالم میری رہ دگی کا
لالے کا رنگ گہرا اور گل کا رنگ پھیکا
ٹھیکا میری قسمت نے لیا روئے زمیں کا
پیوند کہیں میں نے لگایا ہے کہیں کا
یہ گھر ہے کسی خانہ بر نہ انداز مکیں کا
جو ہے وہی ہو رہتا ہے گر پڑ کے یہیں کا
گھر دیکھ لیا فتنۂ محشر نے زمیں کا
زلفوں ہی کے سر میں اسے بار آؤں تو اچھا
سر کو پٹکوں گا کہاں میں جو یہ در چھوٹ دل کا

حسن خالق نے دیا تھا تو دیا تھا لیکن

اے مرے طالع ناساز ترے بخت پہ حیف

لطف میں غیر کی شرکت ہو تو میں جور سے خوش

حیف کم حوصلگی پر کہ جفا سے پہلے

اترا کے آئینے میں چڑھاتے تھے اپنا منہ

یہ بیخودی ہے کہ ہم پوچھتے ہیں لوگوں سے

رہ گیا عرض تمنا پہ تبسم کر کے وہ

ہنسنے میں بھی آنکھوں سے نکل آتے ہیں آنسو

ضعف سے کچھ کیا نہیں جاتا

کیا کروں میں جو کچھ کہے ناصح

دل کے کہنے نہ عشق میں تم شوق

اب اس سے بڑھ کے کوئی طرز دل شکن سوچو

ذلیل اس نے کچھ ایسا کیا کہ صورت اشک

عدو کو ہجر میں دل یا جگر نہیں آتا

جفا پہ شکر کا امیدوار کیوں آیا

بتوں کے بدلے یہاں بس خدا کا نام ہو اب

ہے وعدہ شام کا اور ان سے اضطراب کیسا تھ

تضحیک مکرر کا ارادہ ہے کہ اس نے

نہ جس میں آہ نہ دیوانہ پن نہ دامن چاک

وہ آج اگر مری بے تابیوں کے منکر ہیں

پڑی ہے ان کو مگر ایسی جو الٹی کہ کہتے ہیں

یہ بھی کیا اس نے کہا تھا کہ ستمگر ہونا

تیری قسمت میں تھا میرا ہی مقدر ہونا

کون چاہے کسی دشمن کے برابر ہونا

دل کو میں نذر تمنائے جفا کر بیٹھا

دیکھا مجھے تو چھپ گئے منہ چھپا لیا

کہیں مکان اسی شہر میں ہمارا تھا

فیصلہ مشکل ہوا اقرار یا انکار کا

غم دیدہ ہیں ہم لوگ ہمیں لطف طرب کیا

دل کے پانی پیا نہیں جاتا

منہ کسی کا سیا نہیں جاتا

صبر تم سے کیا نہیں جاتا

ستم تو میری محبت کو کچھ گھٹا نہ سکا

گرا نظر سے تو کوئی مجھے اٹھا نہ سکا

اغل بغل مجھے کوئی نظر نہیں آتا

مری وفا کا اسے اعتبار کیوں آیا

یہیں ایسے کعبے سے گذرا مرا اسلام ہو اب

میں لڑ رہا ہوں سویرے ہی سحر کہ شام ہو اب

پھر مجھ کو بٹھایا مرے دامن کو دبا کر

وہ زندگی کے لئے ننگ ہے شباب نہیں

تو کل کہیں گے کہ بجلی میں اضطراب نہیں

یہیں تم مجھ سے کہہ دو تو نہیں کہنا ہے محشر میں

دل لے کے گئی ہے کہ جگر لیکے گئی ہے
آج سُنبل - کل بلا - پرسوں کہوں کا کل کو سانپ
کبھی تولہ - کبھی ماشہ جو مزاج اس کا ہے
گور میں دو چار گز کپڑے کے شرمندہ ہیں شوق
وہ خوش کہ ہیں جگر کو نظر میں لئے ہوئے
سن کے میرا نام بولے کون شوق
تو اب اٹھنے پہ ہر یہ کہہ کے کہ نیند آئی ہے
حسن نے عشق پہ حملہ کیا دو شکلوں سے
کیا کہیں زاہد بتوں سے کب کی رسم و راہ ہے
رشک کہتا ہے کہ اسکو میں کہیں جانے نہ دوں
دیکھنا ہو کچھ تو زاہد میرے بتخانے کو چل
بتوں نکلے سامنے محشر میں میری سی نہیں کہتے
ظاہر ہے میری شکل سے جو میرا حال ہے
زلف پر پیچ کا سودا لے دل
چشم جاناں کا کرشمہ دیکھو
صرف زنار ہی کیا ہے اے شوق
ہی درد دل کے مارے ہونٹوں پہ آ رہا ہے
ان بتوں ہی سے زمانے میں ہے جو کچھ کام ہے
دیکھ چل کر اپنے عاشق کو کہ بیچارے کیسا تھا
درد جاتا ہی نہیں اور اشک تھمنے ہی نہیں
کچھ دل کی سناؤں کچھ جگر کی

کچھ تو مرے پہلو سے نظر لے کے گئی ہے
لاکھ شوخ تُنے گرد تیرے سر کی چھوڑوں تو سہی
کل بدل جائے گا یہ رنگ جو آج اس کا ہے
اور اس دنیا سے ہم کیا خاک بچھڑے گئے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے
سینکڑوں دنیا میں ہیں اس نام کے
دشمن جان تمنا تیری انگڑائی ہے
کچھ خداداد ہے کچھ اس کی خود آرائی ہے
ہم سے اور ان سے بہت سوز و نکی یاد اللہ ہے
جس طرف رخ ہو یہ کہہ دوں میرے گھر کی راہ ہے
تیری مسجد میں تو بس اللہ ہی اللہ ہے
پہ سب کہتے ہیں منہ دیکھی خدا لگتی نہیں کہتے
پوچھو نہ کچھ فقیر کی صورت سوال ہے
کچھ تیری گانٹھ گرہ میں ہے بھی
خود ہی میکش بھی ہے خود ہی مے بھی
بول دی ہم نے بتوں کی جے بھی
اپنے ہی تن کا پھوڑا ہم کو ستا رہا ہے
میں تو کہتا ہوں کہ بس آگے خدا کا نام ہے
زندگی وہ کر رہی ہے موت کا جو کام ہے
عشق کے ہر کام کو آغاز بے انجام ہے
بیٹھو تو کہوں ادھر ادھر کی

نہ کسی نظر کوئی جادو ہوئی نظر نہ ہوئی
وہ دل کو لے گئی لیکن مجھے خبر نہ ہوئی

سخن کے میکدے میں شوق میں نے جاکے دیکھا
کہ مے غالب نے پی لی صرف دردِ جام باقی ہے

ہوئی ہے اس سے محبت میں تازگی پیدا
مناؤں گا نہیں سو بار میں خفا کرکے

قطعہ

ہم کو سامانِ تشفی مل گیا تقدیر سے
خو دہوں کاہل اور کوسیں بخت نا فرجام کو

حق پرستی چھوڑ دی رسم اخوت چھوڑ دی
طاق نسیاں پر دھرے بیٹھے ہیں ہم اسلام کو

ہو گئے ہیں کتنے بے پروا زمانے سے کہ ہم
سمجھے ہیں لڑکوں کی پھرکی گردشِ ایام کو

یوں نہیں کھینچے لئے جاتی ہے ذلت جس طرح
مچھلیوں کو پھانسکر صیاد کھینچے دام کو

کر دیا ہے مردہ دل اتنا ہجوم یاس نے
کچھ نہیں احساس ناکامی دل ناکام کو

ہو نہیں سکتا جہاں میں اوج بے اسباب اوج
اتنا زینہ چاہیئے ہو جتنی رفعت بام کو

اب بھی سیدھی راہ مل جائے جو آؤ ہوش میں
ہے غنیمت صبح کا بھولا جو آئے شام کو

رباعی

دنیا میں وقار واوج کچھ کھیل نہیں
مشکل یہ ہے کہ پھوٹ ہے میل نہیں

افلاس و نفاق و جہل اس پر نخوت
اے شوق منڈھے چڑھے یہ وہ بیل نہیں

شیدا ۔ منشی نبی بخش ولد میاں محمد بخش دارو غہ مرحوم ساکن لاہور موچی دروازہ کشمیری الاصل میرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی مسیحیت و مہدویت کے قائل ہیں۔ ماسٹر نعمت علی خاں صاحب اثر سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ عرصہ ہوا گورنمنٹ سنٹرل پریس شملہ کے سٹور کیپر تھے۔ کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے:۔

رد و کد ہم سے ہے اے چرخ ستمگار یہ کیا
رنج پر رنج ہے آزار پہ آزار یہ کیا

لو آؤ ذرا بیٹھو مرے دیدۂ تر میں
آجائے گا ساون کا مزا ایک نظر میں

شیدا

شرفا میں تھے۔ راقم السطور اکثر انکی خدمت میں جایا کرتا تھا۔ انتخاب کلام یہ ہے۔

تجھے دیکھکر ہم نے کیا کیا نہ دیکھا ۔۔۔ وہ تھا کون سا جو تماشا نہ دیکھا
نہ تھی ایک بھی چیز جس میں کہ ہم نے ۔۔۔ جمالِ رخِ عالم آرا نہ دیکھا
نظر کیا لڑی تھی کہ بجلی گری تھی ۔۔۔ کہیں ہم نے ایسا تماشا نہ دیکھا
نہ سمجھو وہ آنکھیں ہیں بس دیکھنے کی ۔۔۔ تمہارا جن آنکھوں نے جلوہ نہ دیکھا
بُرے حال سے آج آیا تھا شیدا ۔۔۔ دوانے کا تم نے تماشا نہ دیکھا
اگرچہ مجھ سے بھی اچھی طرح کہا نہ گیا ۔۔۔ پر اچھے اچھوں سے دکھڑا مرا سُنا نہ گیا
جو ضبط ہو نہ سکے اس کو کیا کرے انساں ۔۔۔ ٹپک پڑے مرے آنسو جو غم سہا نہ گیا

نہیں اک فقط میں ہی قربان تم پر ۔۔۔ فدا ہے زمانہ مری جان تم پر
نرالی ہیں سب سے ادائیں تمہاری ۔۔۔ نہ ریجھے بھلا کیونکہ انسان تم پر
یہ کہتے ہو مجھ سے کہو کب ملو گے ۔۔۔ یہ کیا خوب فقرہ ہے قربان تم پر
بھلا تم کو شیدا سے کیا ہے تعلق ۔۔۔ اُٹھاتے ہیں کیوں لوگ طوفان تم پر
مانگ زلفوں میں کیا نکالی ہے ۔۔۔ اک بلا میں بلا نکالی ہے۔
جاؤ دشمن کے گھر بلا سے مری ۔۔۔ تم نے چڑ میری کیا نکالی ہے
دیکھنے کے دکھانے کے دن ہیں ۔۔۔ یہ کہاں کی حیا نکالی ہے
تو نے رندوں کو چھیڑ کر واعظ ۔۔۔ چھیڑ مردِ خدا نکالی ہے۔

شیدا:۔ ٹھاکر بھیروں سنگھ صاحب جھالا۔ مصاحب سرکار بھلوہ کلام اور حالات زیادہ نہ مل سکے:۔

جفا کرکے کہتے ہیں خاموش رہنا ۔۔۔ کہ تانے ترے مجھکو رسوا کرینگے
کہا رحم کیجے تو بولے یہ ہنسکر ۔۔۔ کہ پھر آپ اُلفت کا دعویٰ کرینگے

شیدا:۔ نواب معین الدّین خاں نبیرۂ نواب غازی الدین خاں نظام رئیس کالپی شعرا

شیدا
شیدا

محتسب کی نہ حکومت نہ یہاں قاضی کی
دَور دورہ مرے ساقی کا ہے میخانے میں

بے قراری سے ہے کیفیت رقص بسمل
دیکھ لو سیر کہ مقتل میں تماشا ہوں میں

میری آنکھوں سے غم ہجر میں بہتے ہیں اشک
اپنی تقدیر کے لکھے کو مٹاتا ہوں میں

ہر اک حسین کا نہ شیدا ہو کہد و شیدا سے
جو قدر دل کی کرے اس کو دلرُبا سمجھے

عاشقوں کو نہ کرو قتل کہ پچھتاؤ گے
قدر ارباب وفا بعد فنا ہوتی ہے

یہی گلہ ہے کہ خط کیا نہ آئی ابھی تک
کیا نہ یاد بھی بھولے سے تم نے جا کے مجھے

خطا کسی کی ہو کوئی ہو موروِ الزام
بتوں نے طعنے دئے آہ نارسا کے مجھے

اثر کیسا الٰہی آہ سوزاں نے دکھایا ہے
کہ میرا جی جلایا ہے بتوں کا دل دکھایا ہے

دُعا ور دِ زباں ہے وصل کی بیٹھا ہوں مسجد میں
خدا سے لو لگائی ہے بتوں سے دل لگایا ہے

شیدا

شیدا:۔ حافظ محمد فاروق تلمیذ جناب ناطق لکھنوی۔ ۱۸۷۴ء میں بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ اُردو فارسی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف تھے۔ کہتے ہیں کہ انہیں کئی ہزار شعر حفظ تھے۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں کمال حاصل تھا۔ افسوس یہ ہے کہ مرحوم کا کلام ضایع ہو گیا۔ کیونکہ حالت سفر میں انتقال کیا۔ اور اولاد یا دوست کوئی ہمراہ نہ تھا۔ چند اشعار جو دستیاب ہوئے درج ذیل ہیں:۔

وہ جانگدازیاں ہیں نہ وہ اشکباریاں
اللہ رے ضبطِ غم کی کفایت شعاریاں

ہر جگہ ہے میکدہ جب ایک میخانہ نہ ہو
بادہ بے اندازہ پی جب کوئی پیمانہ نہ ہو

سب آفتوں سے زندگی دل گذر گئی
اک آرزوئے مرگ تھی سو وہ بھی مرگئی

دل تک جو اس کی جلوہ گری کی خبر گئی
آنکھوں سے مثل برق تڑپ کر نظر گئی

شیدا

شیدا:۔ منشی سید معشوق احمد خلف جناب شمیم برادر جناب ریاض۔ خوش فکر ہیں۔ طبیعت میں شوخی زیادہ ہے۔ انداز بیان دلکش ہے۔ حضرت وسیم خیرآبادی سے

مشورۂ سخن فرماتے ہیں:۔

ہیں اُن سے دُور ہوں مرا دل اُنکے پاس ہے
اس کے نصیب اچھے ہیں میرے نصیب سے

دل تھا وہ نذرِ غمزہ و انداز ہو چکا
اب کیا حضور چاہتے ہیں مجھ غریب سے

دیکھے تو شوق میں کوئی دیوانگی مری
تدبیر وصل پوچھ رہا ہوں رقیب سے

حشر میں میری زباں پر جو شکایت آئی
چٹکیاں لے کے وہ بولے کہ یہ کیا ہوتا ہے

جان دینے سے محبت میں ہوا یہ انجام
آج تک قیس ترا ذکرِ وفا ہوتا ہے

پڑی ان پر نظر جس کی وہ ان کا ہوگیا بندہ
دل آجاتا ہے صورت دیکھکر ان مہ جمالوں کی

کہاں کا دل ارے واعظ حسیں تو جان لیتے ہیں
نگاہیں آپ نے دیکھیں کہاں دل لینے والوں کی

شیدا

شیدا۔ قاضی قمر الدین احمد باشندہ قاضی پور۔ شوخ طبع اور عالی خیال ہیں انداز بیان میں چلبلاہٹ ہے:۔

کلیجہ چٹکیوں سے یوں تو مل دیتا ہے رہ رہ کر
چھپا ہے کوئی پہلو میں مرے درد نہاں ہو کر

نہ کچھ مسیح سے مطلب نہ کچھ فلاطوں سے
تمہیں کو درد تمہیں کو دوا سمجھتے ہیں

بھلے وہی ہیں زمانے میں دیکھو اے شیدا
جو اپنے آپ کو سب سے بُرا سمجھتے ہیں

وہ روکیں لاکھ ہاتھ اپنا چھری کب رکنے والی ہے
کہیں رکنے سے رکتی ہے قضا بھی مرنے والوں کی

بہا کے آنکھوں سے کس دن نہیں لہو آئے
تمہاری بزم سے جب آئے سرخرو آئے

اک نظر جلوۂ دیدار دکھاتے جاتے
داغِ حسرت مرے سینے سے مٹاتے جاتے

یہ دلفریب ادائیں یہ شکل زاہد کُش
ہر ایک دل میں نہ کیوں تیری آرزو آئے

شیدا

شیدا۔ سید غلام محی الدین خلف سید غلام جیلانی۔ ساکن آگرہ۔ شاگرد میر محبوب علی سلیس۔ ۱۲۸۶ھ میں بیس سال کی عمر تھی۔ مولوی نیاز علی صاحب پریشان سندیلوی مصنف تذکرہ شعر و سخن کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اسی زمانہ کی ایک غزل کے یہ چند اشعار ہیں:

ازل کے روز سے یہ مظہر نور خدا ٹھہرے
رسولِ ہاشمی آئینۂ قدرت نما ٹھہرے

ہمارے خانۂ دل میں پریزادوں کا قبضہ ہے
بٹھے مہمان سرکش ہیں پرائے گھر میں آٹھہرے

رقیبوں میں نہیں ممکن ہے شیدا وصل کی صورت
جو اپنا مدعی نکلے تو دل کا مدعا ٹھہرے

شیدا

شیدا :- قاضی میر قربان علی صاحب خلف قاضی سید محمد علی دہلوی ساکن قدیم بستی نظام الدین اولیا۔ علم عروض میں دخل تھا۔ فکر رسا رکھتے تھے۔ مشکل زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ معرفت و حقیقت کے مضامین کیفیت سے لبریز ہیں۔ علاوہ نظم کے نثر میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ فنِ شعر میں خدا بخش خاں صاحب متخلص بہ تنویر سے تلمذ تھا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے :-

نغمہ کہیں ہے بلبلِ شیریں مقال کا
نالہ کہیں ہے قمری شوریدہ حال کا

جن و بشر ہیں زلفِ مسلسل کے معتقد
کیا سلسلہ ہے یہ کسی صاحب کمال کا

نہ جام برف دے ساقی نہ کاسا مے لا
خمار عشق ہو جس سے شتاب وہ شے لا

کسی یہ بلبل بیدل کا آج ماتم ہے
چمن سے آتی ہے یارو صدائے واویلا

عشق میں درد و غم و رنج و الم چاروں ایک
دشمن جاں ہیں یہ عاشق کے بہم چاروں ایک

شوخی و ناز و ادا اور نگہ قہر انداز
مجھکو تو ہیں یہ ترے سر کی قسم چاروں ایک

دلبر آرام جاں لے گیا آرام دل
لے گیا آرام دل۔ دلبر آرام جاں

اے مرے غنچہ دہاں ہنس کے ذرا بول تو
ہنس کے ذرا بول تو اے مرے غنچہ دہن

نظیر رکھتا نہیں حسن بے نظیر اس کا
جو لاجواب ہو اس کا بھلا جواب کہاں

میری زنجیر جنوں اور یار کی زنجیر زلف
خوب باندھا عشق نے زنجیر سے زنجیر کو

بن نہیں آتی ہے مجھ کو کوئی بھی تدبیر وصل
بدلوں گر بدلے کوئی تقدیر سے تقدیر کو

جبہ سائی لاکھ کی پر وہ نہ مانا سنگ دل
کس طرح پلٹے کوئی تدبیر سے تقدیر کو

گلشن دنیائے فانی اور ہے
سیر باغ جاودانی اور ہے

رقصِ بسمل کو جو اک کھیل تماشا سمجھے	ہائے بیتابیٔ دل کو وہ مری کیا سمجھے

شیدا

شیدا:۔ صاحب عالم میرزا قمرالدین عرف میر کلو نبیرۂ شاہ عالم ثانی و داماد ابوظفر بہادر شاہ۔ میرزا آغاجان کے بیٹے اور خاقانی ہند حضرت ذوق کے شاگرد تھے ہنگامۂ غدر میں پچھتر برس کی عمر تھی۔ الزام بغاوت میں انہیں پھانسی دیگئی۔ کلام یہ ہے۔

تو نے وفا کا ثمرہ خانہ خراب دیکھا	کہتے نہ تھے ہم اے دل مت نام لے وفا کا
خبر نہیں وہ کہاں جا کے قافلہ بچھڑا	عدم سے آئی نہ یارانِ رفتگاں کی خبر
نہیں معلوم کیا ہُوا دل کو	ایک مدّت سے ہے تہی پہلو
اک نگہ میں کردیا دیکھا نہ دیوانہ تجھے	ہم نہ کہتے تھے کہ شیدا اس پری وش سے نہ مل

شیدا

شیدا:۔ حکیم اسلام بیگ نبیرۂ حکیم نصر اللہ خاں وصّال شاہجہان آباد کے رہنے والے صاحب فکر سلیم تھے۔ ریاست پٹیالہ میں ملازم تھے۔ کلام مزیدار ہوتا ہے۔ چند شعر یہ ہیں:۔

ہم کو تقدیر سے مرنا بھی میسّر نہ ہُوا	دوست کیا دشمن جانی بھی ستمگر نہ ہُوا
کچھ اور ہوتی بلا گر نہ آسماں ہوتا	بلائیں لکھی تھیں اپنی ازل سے قسمت میں
رہ جائے آبرو مژۂ اشک بار کی	پھر آب کی دھوم دھام ہے ابر بہار کی

شیدا

شیدا:۔ میر چھبو خاں مرحوم شاگرد مومن و مصاحب نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ فکر میں رسائی تھی۔ بندش میں صفائی۔ کلام میں اپنے اُستاد کا رنگ قائم رکھا ہے۔ سنہ ۱۲۷ھ میں بعالم شباب وفات پائی۔ انتخاب یہ ہے:۔

پردہ نگاہ جس میں عنایت عیاں نہیں	ناشکر ہم نہیں ہیں ادھر کو نگاہ ہے
مر جائے کوئی۔ اور کسی کو خبر نہ ہو	دریا بہیں کہاں۔ کہیں مژگان بھی تر نہ ہو
کہتے ہیں زہر دے کے الٰہی اثر نہ ہو	وہ دشمنی میں لوپرے ہوں یہ بات بھی نہیں
نظر پڑا تھا کل اک مضطرب غبار مجھے	کہیں وہی نہ ہو شیدا کہ اسکے کوچہ میں

شیدا

شیدا:۔ حافظ محمد اسحاق دہلوی تلمیذ و برادر اصغر مولانا راسخ۔ خلف مولوی محمد حسین صاحب فقیر۔ پہلے ستم تخلص تھا۔ بعد کو شیدا تخلص کیا۔ چند روز فکر سخن کر کے۔ شاعری سے دست بردار ہوگئے۔ کچھ مدت ہوئی جب ایک رسالہ "الوعظ" کے نام سے نکالتے تھے۔ ابتدائی عمر کا کلام یہ ہے۔

ہائے دل تیرے صدقے تری باتوں کے نثار
یوں زباں ڈھونڈتے نہ پائینگے نکل کر باہر

شیخ کی شان میں گستاخ بنوں میں توبہ
لوگ کہتے ہیں نکالے گئے بت خانے سے

دل لیا جس کا اسی کی جان کے دشمن ہوئے
ساری دنیا سے نرالا آپ کا دستور ہے

یاں تو اپنے حوصلے سے بھی کیا تھا ٹھیک کام
جان و دل دے کر وہ لوٹے بس یہی مقدور ہے

خدا حافظ مسافر۔ کوچۂ جاناں کی منزل کے
اسی رستے میں لٹتے ہیں ہزاروں قافلے دل کے

شیدا

شیدا:۔ منشی چندی پرشاد نگم دہلوی۔ خلف منشی رائے بیداس۔ کایستھوں کے معزز فرقہ سے تعلق ہے۔ آپ کے بزرگ اکبر اعظم کے عہد میں جاجمئو ضلع کانپور سے دہلی میں آئے اور میر منشی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ سنا جاتا ہے کہ بہادر شاہ کے وقت تک یہ عہدہ اس خاندان میں رہا۔ وہ لوگ زمانہ کی روش کے مطابق فارسی اور عربی میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ شیدا صاحب کے دادا شاعر تھے اور شوق تخلص کرتے تھے۔ آپ کے والد حقیر تخلص کرتے تھے۔ گویا شاعری شیدا صاحب کو بزرگوں سے میراث میں پہنچی۔ شیدا صاحب کی فارسی کی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ پھر علی گڑھ کالج میں ایف اے تک انگریزی کی تعلیم پائی۔ اسوقت مختلف تجارتی دفتروں میں کام کرتے ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مولانا عبدالرحمن راسخ مرحوم سے تلمذ ہے۔ شیدا صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں قدما کے طرز کے شیدا ہیں اور اسے خوب نباہتے ہیں۔ زبان کی فصاحت اور محاورے کی صحت آپ کے کلام کا جوہر ہیں۔ علاوہ غزل کے نظموں میں بھی گل افشانی فرماتے ہیں۔ رموز فن سے آگاہ ہیں۔ جب ذیل اصحاب کو آپ سے تلمذ ہے۔ سید نواب حسین

صاحب سفیر سہسوی۔ حکیم مدن لال صاحب مدنؔ دہلوی۔ پنڈت وشوا ناتھ صاحب رضا امرتسری۔ بابو چھیتر مل صاحب شمیمؔ بھرتپوری اور صدیق حسن صاحب صدیق دہلوی حضرت شیدا کی تاریخ ولادت ۲۵ فروری ۱۹۰۷ء ہے اب کلام ملاحظہ ہو۔

بعد مدت دل شیدا ترا ارمان نکلا
موت کے بھیس میں وہ دشمن ایماں نکلا

آج خورشید قیامت کے چھٹینگے چھکے
جل کے فرقت میں شرار دل سوزاں نکلا

صد شکر ضبط راز نہاں پردہ پوش تھا
رگ رگ میں ورنہ بادۂ عرفاں کا جوش تھا

ہوش آگیا تو آپ تھے غائب نگاہ سے
آپ آگئے تو پھر سر و پا کا نہ ہوش تھا

بت کر دیا ہے جلوۂ حیرت طراز نے
گویا کہ میں جہاں میں زبان خموش تھا

جلوۂ حق کا کرشمہ صاف پیمانے میں تھا
اک سرور بیخودی کا رنگ میخانے میں تھا

بیخودی شوق سے یہ لطف جل جانے میں تھا
شمع کی دل کی لگی کا سوز پروانے میں تھا

ظاہر و باطن اسی بت کا ہے جلوہ چارسو
کعبہ میں روپوش تھا پیدا جو بتخانے میں تھا

آگیا ہے کس کا پرتو نور بنکر آنکھ میں
جلوہ فرما کون میرے دل کے کاشانے میں تھا

یہ بھی ہیں شاید شراب معرفت کے تشنہ کام
حضرت شیدا کا کل کچھ ذکر میخانے میں تھا

دکھایا یاس نے وہ عالم ہو ہم کو فرقت میں
دل ویراں شدہ کے گوشہ گوشہ میں بیاباں تھا

نہ کیوں گرتے ہی گم ہو کوچۂ چاک گریباں میں
کہ ہر آنسو مرے دل کا کسی کا راز پنہاں تھا

تری آنکھوں نے خونریزی وہ کی ہے بزم عالم میں
نگاہیں جسطرف کو اٹھ گئیں گنج شہیداں تھا

طالب دیدار سے تھی لن ترانی کیا ضرور
برق کے پردہ میں یہ کیا ناز معشوقانہ تھا

پلادی آنکھ نے ساقی کی وہ مئے الفت
ہمیں تو حشر کے دن بھی عجب خمار رہا

دکھائی رحمت باری نے شان غفاری
جہان بھر میں نہ کوئی گناہ گار رہا

کھل جائیگی سب تم کو جفاؤں کی حقیقت
جاؤ گے کہاں عرصۂ محشر سے نکل کر

نکل آیا ہے مقتل میں نگاہ یار کا جوبن
چڑھا ہے چار چلّو خون تیغ اصفہانی پر

لئے جوش جنوں میں پنجۂ وحشت نے وہ لتے
گریباں منزلوں تک ڈھونڈتا پھرتا ہے داماں کو

رہِ بیخودی میں وہ بات ہی جو مٹے ہیں انکو ثبات ہے
یہ وہ شاخِ نخلِ حیات ہے کہ جو خشک ہو کے ہری رہی

درو بام سے وہ ہوا عیاں کہ جو لامکاں میں بھی نہاں ہے
ہوا شکل آئینہ کل جہاں یہ نظر میں جلوہ گری رہی

سماں کثرت کا وحدت میں نگاہِ حق نما لائی
تماشا آنکھ کی پتلی زمانے کا دکھا لائی

جگر میں دم نہیں باقی نہ قطرہ خون کا دل میں
نگاہِ رخنہ گر کی چاہ پیغامِ قضا لائی

تصور ہے کسی کے عارضِ پُر نور کا دل میں
کہ آہِ نیم شب خورشیدِ محشر کو لگا لائی

ہم سے وہ بس میں ستم کش جو برابر میں رہے
کچھ وہ گھبرائے سے شرمائے سے محشر میں رہے

قتل کا لطف تو جب ہے سرِ مقتل قاتل
دم مرے سینے سے کھنچکر ترے خنجر میں رہے

دُنیا میں مثلِ نقشِ قدم اپنا حال ہے
بیٹھے جہاں وہاں سے پھر اُٹھنا محال ہے

پیرِ مغاں ہے کیا کسی زاہد کی روح بند
اس سبز سبز شیشے میں کیا لال لال ہے

ارماں نکل رہے ہیں پہلو بدل بدل کے
خنجر لگا رہا ہے قاتل سنبھل سنبھل کے

وہ مست ناز ہر سو جلوہ دکھا رہا ہے
آنکھوں میں بس رہا ہے دلمیں سما رہا ہے

شیدا ۔ منشی گرچرن لال ولد منشی گومتی پرشاد کایستھ سریواستو متوطن نبی نگر پرگنہ لاہرپور ضلع سیتاپور سال ولادت ۱۸۹۸ء شاگرد جناب میر نوروز علی عاشق سیتاپوری کہتے ہیں کہ دیوان مرتب ہو چکا ہے۔ مگر ہنوز شائع نہیں ہوا۔ اس وقت کورٹ آف وارڈس سیتاپور میں ضلعدار ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

پھر بہار آئی ہے پھر جوشِ جنوں بڑھتا ہے
چارہ گر ہونگے رفو چاک گریباں کیونکر

اب کہاں جائیں ٹھکانا بھی کہیں ہے ان کا
میرے مرنے پہ نہ ماتم کریں ارمان کیونکر

سمجھیں نہ آپ اس کو مرے دل کا آبلہ
سو حسرتیں ہیں دفن ذرا سے مزار میں

رند وہ رند کہ خُم پی کے بھی عار نہ ہو
مست وہ مست کہ تا حشر جو ہشیار نہ ہو

اک نہ اک روز نہیں دیکھ ہی لینگے شیدا
پردہ جب ہے کہ قیامت میں بھی دیدار نہ ہو

شیدا۔ مولوی سید نظیر حسین صاحب لکھنوی۔ آپ نواب مہدی حسین صاحب ماہر کے فرزند دلبند تھے۔ آپ کا عرف نواب بڑے صاحب تھا۔ قریب دس برس ہوئے انتقال کیا۔ علم عروض۔ معانی اور بیان میں کافی واقفیت حاصل تھی۔ نازک خیال اور مضمون آفرینی کی جانب رجحان ہے۔ اشعار میں لکھنؤ کا رنگ قدیم جھلکتا ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

بزم میں ساغر لئے جب وہ مہِ انور آ اٹھا ۔۔۔ جھوم کر آئی گھٹا گھنگھور ابر تر اٹھا

نشۂ دورِ جوانی خود ہے اپنی دیکھ بھال ۔۔۔ اب تو اس عالم میں تیرا بھی نیا عالم ہوا

ذبح کو میرے دہن ہاتھوں سے خنجر اٹھ سکا ۔۔۔ پھر انہیں ہاتھوں سے کیونکر غیر کا ماتم ہوا

گالیاں کھائیں نہ کیوں چھیڑے اسکو شبِ وصل ۔۔۔ لطف ملتا ہے عجب اس کے بگڑ جانے میں

تھم کے یہ دریا ڈبو ہی دے گا کشتی عمر کی ۔۔۔ روکنا اچھا نہیں ہے آنسوؤں کے تار کو

شیدا۔ حکیم میر محمد رسول خاں بہادر رضوی تخلف الصدق حکیم میر ہاشم علی خاں سال پیدائش ۱۲۶۹ھ ہے۔ آپ کے مسلسل حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ میر صاحب موصوف قصبۂ موہان ضلع اناؤ کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ نواب میر مظفر علی خاں وحید علی خاں اکبر شاہ ثانی کے عہد میں امرائے دربار تھے۔ جن کو اعتماد الملک معتمد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اور بستی کے علاقہ میں وحول پور کے نزدیک ایک لاکھ روپیہ کی جاگیر عطیۂ شاہی تھی۔ آپ کے بزرگ طبابت میں طاق اور نباضی میں مشتاق تھے۔ آپ کے جد امجد حکیم میر کاظم علی خاں صاحب [illegible] عالی جاہ مہاراجہ دولت راؤ سیندھیا کے طبیب خاص رہ چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سکندر جاہ مرحوم دکن کے فرمانروا تھے۔ ان کے علاج ضرب المثل بن گئے تھے۔ ان کو مہاراجہ سیا جی راؤ ثانی گائکوار بڑودہ نے معالجہ کے لئے طلب کیا۔ اور ان کی خدمات کا معقول صلہ دیا۔ مہاراجہ چندو لال صاحب بہادر شاداں سابق مدار المہام حیدرآباد دکن سے اس خاندان کے بڑے تعلقات تھے۔

حضرت شیدا آخر دم تک مہاراجہ سیاجی راؤ والیٔ بڑودہ کے حاضر باش طبیب رہے جنہوں نے اپنی مصاحبت اور کونسل عالیہ کی ممبری سے آپ کی قدر افزائی فرمائی۔

آپ کو خوش قسمتی سے شفیق اور کاملین زمانہ اساتذہ ہاتھ آئے۔ علوم رسمیہ مولوی غلام حسنین صاحب کنتوروی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے حاصل کئے فن شعر گوئی میں انیسؔ مرحوم سے اصلاح لی۔ فن طب کے علاوہ علم ریاضی میں تبحّر حاصل تھا۔ عربی فارسی کے ادیب تھے۔ فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرثیہ۔ قصیدہ۔ غزل کے علاوہ فن تاریخ گوئی سے خاص مناسبت تھی۔ سنہ ۱۳۱۲ھ میں جب آپ دوبارہ حیدرآباد تشریف لے گئے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاہ سے ملے جو اُس زمانہ میں مدارالمہام تھے۔ آپ نے اپنے قدیمانہ تعلقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ رباعی پیش کی:-

رباعی

چوں سلسلۂ لطف ز اجداد آمد　　دیرینہ عنایات بمن یاد آمد
جدم شدہ در دورۂ جدت شاداں　　شیدا ز کرم ہائے تو ہم شاد آمد

کلام کا نمونہ یہ ہے:-

غیر کو صاحبِ وفا کہنا　　اس سمجھ کا تمہاری کیا کہنا
سنگدل تھا مگر پگھل ہی گیا　　دردِ دل اور پھر مرا کہنا

کاٹ دیتے ہیں ہر اک بات مری جھنجھلا کر　　آج غصہ میں وہ تلوار لئے بیٹھے ہیں
ان کی الفت نے یہ رسوا کیا آخر شیدا　　ہم تماشا سرِ بازار لئے بیٹھے ہیں
گر یونہی گھر میں ہے غیروں کی حکومت تو پھر　　آپ کس بات پہ سرکار بنے بیٹھے ہیں

سلام

نہ ظالم نہ شاہِ زماں رہ گئے　　سلامی ستم کے بیاں رہ گئے
نکل آیا حرؔ تیر سا فوج سے　　کماں دار کھینچے کماں رہ گئے

کا انداز نرالا ہے۔ طرز شعر خوانی سے حسن کلام دوبالا ہو جاتا ہے۔

مدت ہوئی شغل صحافت کی طرف رجوع لائے۔ اس وقت آپ ہندوستان کے اُردو اخبار نویسوں میں عمدہ لکھنے والے شمار کئے جاتے ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں آپ نے دہلی سے ایک اخبار دوست نامی نکالا تھا۔ مگر اس زمانہ میں اخبارات کا عہد ابتدائی تھا۔ یہ پرچہ کچھ دنوں آب و تاب سے نکلا۔ پھر بند ہو گیا۔ ۱۸۹۵ء میں آپ اخبار "سول اینڈ ملٹری نیوز" لدھیانہ کے ایڈیٹر رہے۔ جو فوجی ملازمین کا آرگن تھا۔ کئی برس تک یہ اخبار آپ کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد سودیشی تحریک شروع ہوئی۔ ملک میں بیداری کے آثار نمایاں ہوئے ہندوستان میں اخبار نویسی کا نیا دور شروع ہوا۔ اس زمانہ میں آپ لاہور میں اخبار کیسری اور ہندوستان کے ایڈیٹر تھے۔ لاہور میں کئی برس تک روزانہ اخباروں کو چلاتے رہے۔ اس کے بعد منشی نوبت رائے نظر مرحوم کے زمانہ میں اودھ اخبار کے اڈیٹوریل اسٹاف میں ملازم ہو گئے۔ مگر پنجاب کی محبت نے انہیں زیادہ دنوں تک لکھنؤ میں نہ رہنے دیا۔ اور پھر لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا۔ کچھ مدت دہلی کے اخبار ریاست سے متعلق تھے۔ شیدا صاحب نکتہ سنجی، ذہانت، شستگی زبان کی وجہ سے ہر ادبی مجلس میں محظوظ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ پر مذاق کی خبریں شائع کرنے اور ان کے عنوانات گھڑنے میں آپ کو اعلےٰ درجہ کا ملکہ ہے۔ انگریزی رسائل وجرائد کے ترجمہ کرنے کی لیاقت عمدہ ہے۔ آپ عرصہ دراز تک اخبارات میں بھوتوں کے وجود پر سلسلہ وار مضمون لکھتے رہے ہیں۔ اور ان میں روحانی نکات کو ظاہر کیا ہے۔ غرض آپ جس طرح ایک مشہور مضمون نگار ہیں اسی طرح نشکریں مقال شاعر ہیں۔ ابتدا میں منشی بہاری لال مشتاق دہلوی شاگرد حضرت غالب کو دو چار غزلیں دکھائی ہیں۔ پھر دہلی رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جو کچھ لکھا اس پر کسی سے اصلاح نہ لی آپ غالب سے عقیدت رکھتے ہیں۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں:-

نہیں پسند کسی کا کلام اے شیدا ۔۔۔ سوائے غالب شیریں سخن سرا کے مجھے

کس کی نگاہ پھر گئی آنکھوں کے سامنے | پاؤں کی سدہ ہے اب نہ خبر مجھکو سر کی ہے

شیدا

شیدا ۔ مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خاں صاحب رئیس اعظم دہلی۔ آپ کے اسلاف کشمیر سے ہندوستان میں آئے اور دہلی کو مستقر بنایا۔ آپ کے خاندان میں عالمگیر کے وقت سے طبابت چلی آتی ہے۔ آپ کے اجداد نے اس فنِ شریف میں بہت کچھ نام پیدا کیا۔ آپ بھی اپنے زمانہ میں یکتائے روزگار تھے۔ آپکا تبحّر علمی اور استعداد کُلّی اپنی آپ نظیر تھا۔ اطراف وجوانب سے ہزاروں مریض آتے اور شفا پاتے۔ ہندوستان کا بچّہ بچّہ ان کے نام نامی سے واقف ہے۔

اگر آپ صدائے احتجاج بلند نہ کرتے تو علوم مغربی کی اشاعت اور ڈاکٹری نے یونانی طبابت کی گذشتہ عظمت کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔ حکیم صاحب موصوف نے اپنی سعی بلیغ سے یونانی طبابت اور ویدک کے ستارۂ اقبال کو بلندی پر پہنچا کر ارباب ملک کے دل پر نقش کر دیا۔ کہ ہندوستان میں معالجہ کے وہ طریق زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جو اسکی آب وہوا سے مناسبت رکھتے ہوں اور طبائع کے موافق ہوں۔ دورِ حاضر میں آپ کی ذات سے یونانی طبابت کو جو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اور جدید تحقیقات سے اس میں جس قدر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس پر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرقی دنیا کو ناز ہے۔ طبّی کانفرنس کی بنیاد آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے پڑی۔ اور آپ کے وقت میں دواخانہ کی ترقی اور دواؤں کے ملنے میں جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ وہ پبلک کو آپ کا شکر گذار بناتی ہیں۔

جس طرح آپ ایک نامی اور زبردست طبیب تھے۔ اسی طرح سنجیدہ سیاسی لیڈر بھی تھے۔ آپ کے دل میں ملک اور قوم کی محبّت کوٹ کوٹ کر بھری تھی سیاسی زندگی کی چپقلش نے آپ کی ذات کو نقصانات عظیم پہنچائے۔ مگر بہبودی وطن کی فکر آپ کے دل سے نہ جانی تھی نہ گئی۔ میدانِ عمل میں ثابت قدم رہ کر جو عظیم الشان قربانیاں آپ نے کیں۔ وہ ایسی نہیں ہیں کہ محبّانِ وطن کے دل سے فراموش ہو جائیں۔ آپ کا

عشق سے پوچھا تھا میں سوزِ نہاں کی داستاں
نالۂ جاں گداز نے اُٹھ کے بتا دیا کہ یوں

شکوے بہت ہیں وقت کم تند ہے یار میں خموش
فکر ہے آج بزم میں یوں کہوں ماجرا کہ یوں

مستیِ ناز کا سبق بھول گیا ہے دل مرا
روزنِ در سے جھانک کر یاد اُسے دلا کہ یوں

لطف ہو یا عتاب ہو دونوں ہیں ایک سی مگر
تجھکو خبر نہیں رہی کہتے ہیں یوں جفا کہ یوں

زہر آسان ہے۔ دشوار نہیں کچھ طاقت
کھیل الفت کے مگر کھیلنے آسان نہیں

تجھے کہاں تم۔ نہ چھپاؤ کہ سمجھتا ہوں میں
تم ہوشیار مگر میں بھی تو نادان نہیں

نگاہِ ناز سے بسمل ہیں اہلِ انجمن سارے
چھپا ہے فتنۂ محشر تمہاری چشمِ پُرفن میں

الٰہی خیر پھر کوئی نیا گل کھلنے والا ہے
اشارے ہو رہے ہیں میرے دل اور انکی چتون میں

کتنا ہی دردِ دل ہو مگر چشم تر نہ ہو
مرنا بھلا ہے ضبط کی طاقت اگر نہ ہو

ایسی تو بات اثر نہیں بیتابیِ فراق
نالے کروں میں اور کسی کو خبر نہ ہو

لازم ہے پاسِ رازِ محبت میں اسقدر
دل میں جو درد ہو جگر کو خبر نہ ہو

شیدا: جناب چودھری سید جواد حسین صاحب ساکن منجھن پور ضلع الہ آباد۔ شاعر خوش گفتار ہیں۔ مگر فکرِ سخن کیطرف توجہ کم فرماتے ہیں۔ آدمی خلیق وضعدار باعزت اور ملنسار ہیں۔ یہ ان کا کلام ہے۔

آئینہ ہے ہاتھ میں زلفوں کو سلجھاتے ہوئے
آرہے ہیں کس نزاکت سے وہ بل کھاتے ہوئے

ناگہانی مرگ کی میری خبر سنکر کہا
یوں نہ دیکھا تھا کسی کا دم نکلتے جاتے ہوئے

لا ذوال افسوس غیروں پر بھی ظاہر ہو گیا
سامنے میرے جو دیکھا ان کو شرماتے ہوئے

جیتے جی شیدا کے آنا ہے اگر تو آیئے
فائدہ کیا بعدِ مرگ آئے تو پچھتاتے ہوئے

شیدا: خواجہ غلام حسن میرٹھ شاگرد حضرت ناظم۔ مضمون آفریں طبیعت پائی ہے کلام سے پختگی اور متانت ظاہر ہوتی ہے۔ کلام یہ ہے۔

کوئی نلیاں سے پوچھے حال میری چشمِ گریاں کا
کہ پل میں موتیوں سے بھر دیا دامن گلستاں کا

حقیقت آفتاب چرخ کی عالم پہ روشن ہے
پہ اک ذرا ہوا پیدا ہے میرے زخم پنہاں کا

خیر توبہ کی ہو ابر آیا الٰہی توبہ
رہن پیمانہ اسی عہد میں پیماں ہوگا

دیکھ کر آئینہ خانے کو وہ ہونگے حیراں
آئینہ خانہ انہیں دیکھ کے حیران ہوگا

زلف سلجھانے کا آیا بھی تو کب ان کو خیال
جب مرا مجموعۂ خاطر پریشاں ہوگیا

شیدا

شیدا ۔ جناب چودھری بابو رام صاحب ولد چودھری لال بہاری صاحب کایست سری واستو۔ قصبہ مچھریٹہ ضلع سیتاپور میں زمیندار تھے ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ عدم توجہی سے زمینداری کھو بیٹھے۔ دیوان چھپنے گیا تلف ہوگیا۔ آخر عمر میں ضعف بصارت وضعف دماغ کی وجہ سے شاعری سے دست بردار ہوگئے تھے ۱۹۲۶ء میں بعمر ۷۵ سال انتقال فرمایا۔ آپ کے صاحبزادہ منشی [illegible] سروپ خزانہ صدر کلکٹری سیتاپور میں ملازم ہیں۔ اور ضبط تخلص کرتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

نالہ مرا دل میں ترے گھر کر نہیں سکتا
تجھ میں کبھی تیر اثر کر نہیں سکتا

عشق لب شیریں سے ہوا زندہ جاوید
میں تیغ کی تلخی کا خطر کر نہیں سکتا

پہلو میں زیارت کیلئے کعبۂ دل ہے
زاہد سوے حرم میں سفر کر نہیں سکتا

غش آگیا دیکھ کے جو چہرۂ خورشید
[illegible] پہ نظر اس کے قمر کر نہیں سکتا

کچھ سنگدلی نے کام نہ تیرے نے کیا
[illegible] زلف گرہ گیر نے کیا

تدبیر کی خطا ہے نہ کوشش کا کچھ قصور
جو سرنوشت میں تھا وہ تقدیر نے کیا

نکل کے پہلو سے کس طرف تو دل پریشاں ہوا روانا
[illegible] کوچہ میں اسکے پہنچ کر یہاں سے [illegible] ہوگا آنا

ندا یہ آئی گلشن کو وہ [illegible] آگئی کیا [illegible]
فضا سے [illegible] میں شور [illegible] بلبلوں کا [illegible]

[illegible]
[illegible] کردیا

لے [illegible] مضمون کہہ سکتے ہیں
آئینہ آئینہ دیکھے تو حیران ہوتا

یکساں ہیں مجھے گلشن توحید میں دونوں
گل دوست اگر ہونگے عدو خار نہ ہوگا

مسدس

کیا کروں سیر چمن کیا گل خنداں دیکھوں
بوئے گل سونگھوں میں کیا رنگ گلستاں دیکھوں
چشم مشتاق سے کیا روئے حسیناں دیکھوں
کس لئے مصر میں جا کر مہ کنعاں دیکھوں
کوئی جز اس کے نہیں ہے مجھے منظور نظر
حسن و خوبی میں نہ دیکھا کوئی اس سے برتر

اس کا دیوانہ ہوں دیوانۂ دنیا میں نہیں
حسن فانی کا کبھی محو تماشا میں نہیں
کنج وحدت سے نکلکر کہیں جاتا میں نہیں
دشت پیمائی کا دلدادہ و شیدا میں نہیں
جس کو آزاد کیا اس نے وہ کب ہوگا اسیر
لوگ کہتے ہیں مرے قید کی ناحق تدبیر

شیدا

شیدا۔ مرزا عالیجاہ بہادر فیض آبادی خلف دلیر الدولہ مرزا محمد علی خاں عرف آغا حیدر۔ شاگرد مرزا سرفراز علی قادر۔ شاعر پرگو اور نازک خیال تھے۔ مضمون آفرینی اور خیال بندی کیطرف رغبت تھی۔ زبان صاف ہے۔ رعایت لفظی کے دلدادہ اور استعارات پر فریفتہ تھے۔ پورانی چال کے اچھے شاعر تھے۔ صاحب دیوان تھے یہ کلام ہے:

پاؤں کیا کوچۂ دلدار سے اٹھنے کے نہیں
سر عشاق در یار سے اٹھنے کے نہیں

چھپائے سے نہیں چھپتی محبت کی کبھی چتون
جو دیکھو غور سے ظاہر ہے دلکا راز آنکھوں میں

عجب کیا ہے صنم گر پتلیاں آنکھوں کی بول اٹھیں
تو وہ رشک مسیحا ہے کہ ہے اعجاز آنکھوں میں

حرف مطلب جو کہوں ملتا ہے یہ صاف جواب
تم کو منظور نہ ہو ہے ہم کو وہ منظور نہیں

خاموشیوں میں بھی ہے رضامندیوں کی بو
منظور ہاں نہیں ہے تو پیارے نہیں نہ ہو

کیوں کعبہ و کنشت میں ہوتا ہے تو خراب
جسکی تجھے تلاش ہے ظالم یہیں نہ ہو

سوزش عشق سمایا ہے دل بیتاب میں ہے
ہائے حیرت ہے یہاں آگ جو سیماب میں ہے

کبھی ٹکڑے لفافے کے کبھی پرزے مرے خط کے
جلا کر بھی شرارت پھر جو بیٹھے بیٹھے سوجھیگی
اچانک پھر کسی کے حال پر کچھ رحم آئے گا
سرنامہ لگا کر مہر اپنے نام نامی کی
غرض لکھا مٹائیں گے مرا ہر سطر لکھ لکھ کر
کہینگے تجھ سے جا جیتے مرے کی کچھ خبر لانا

منگا کر شمع آگے خوب جل جل کر جلا لینگے
بنا کر ان کے پروانے گھڑی بھر کھیلیں کھا لینگے
تو وہ کاغذ قلم اور روشنائی سب منگا لینگے
پھر اوپر اسکے کچھ لکھینگے لکھکر چھیلیں چھا لینگے
لباس ماتمی خط کو مرے پہلے پنھائینگے
مگر یہ کہتے ہی تیری طرف گردن جھکا لینگے

کہینگے تجھ سے جو کچھ تو وہ شیدا اسے چھپائیگا
خدا جانے کہ دم دیکر وہ کیا پٹی پڑھا لیں گے

شیدا۔ ہز ہائینس نواب محمد احمد علی خاں بہادر فرمانروائے ریاست مالیر کوٹلہ۔ آپ نواب ابراہیم علی خاں کے فرزند اکبر اور جانشین ہیں۔ مشتاقان سخن آپکے انداز بیان اور لطف زبان کا مزہ لیتے ہیں۔ ہر شعر صاف اور سلیس ہے۔ بندش نہایت چست اور نفیس ہے۔ زور طبع کو خوب جانتے ہیں۔ علم بدیع سے بھی بے خبر نہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

رباعی

پی ہے جو شراب ارغوانی ہم نے
شادی و سرور میں گذاری شیدا

پایا ہے عجب لطف جوانی ہم نے
کس لطف سے اپنی زندگانی ہم نے

غزل

بچانا جان کا عشق رخ و گیسو میں مشکل ہے
ازل سے جلوہ گاہ حسن معشوقاں مرا دل ہے
کہاں حسن رخ روشن سے انکے چاند کو نسبت

طبیعت ہر ادھر مائل ادھر الجھا ہوا دل ہے
یہ پریوں کا اکھاڑا ہے حسینوں کی یہ محفل ہے
وہ گھٹتا ہے یہ بڑھتا ہے وہ ناقص ہے یہ کامل ہے

تمہیں ہم جانتے ہیں غیر کو تم پیار کرتے ہو
نباہیں کس طرح تم سے یہی تو سخت مشکل ہے

نمک چھڑکا ہے کیا اُس شوخ کے شور محبت نے
کہ مُنہ کھولے ہوئے اس شوق میں ہر زخم بسمل ہے

سوال وصل پہ ہر بار یوں ہنس ہنس کے کہتے ہیں
چلو رہنے بھی دو کیا چھیڑ کی باتوں سے حاصل ہے

محبت کیا جتائیں اس بت بیدرد سے شیدا
زمانہ بھر کا ہے جو بیوفا دل اس پہ مائل ہے

شیدا۔ نواب مرزا محمد شفیع خاں بہادر نیشاپوری۔ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ بہت پیارا اور دلنشین کلام ہے۔ کلام سے پُختہ رنگی نمایاں ہے۔ یہ چند اشعار انکے ہیں۔

کبھی اس دلکی وفاؤں پہ مجھے ناز بھی تھا
اک زمانہ میں یہی ہمدم و دمساز بھی تھا

جام کوثر ہی کی واعظ نے نہ کی تھی توصیف
بلکہ کچھ تذکرۂ بادۂ شیراز بھی تھا

یاد پیری میں جوانی کی نہ آئے کیونکر
کہ اس انجام کا آخر کوئی آغاز بھی تھا

قتلِ عشاق پہ بیباک نہ تھا یوں پہلے
بانکپن میں تری کچھ شرم کا انداز بھی تھا

یاد ہیں اسکے عجب لطف اٹھائے شب ہجر
غم بھی تھا عیش بھی تھا سوز بھی تھا ساز بھی تھا

ہُوا کن حسرتوں کا خون دل میں
کہ بوٹے خوں سے آہ خونچکاں میں

شیدا

شیدا۔ محمد علی مراد آباد کے باشندے ملازمت پیشہ اور موزوں طبع شخص تھے اٹھارہویں صدی کے آخر میں حیات تھے۔ زیادہ حال اور کلام دستیاب نہ ہو سکا جسقدر ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے وہ سوا سو برس گزشتہ کی زبان کا نمونہ ہے۔

سبب تو قتل کا شیدا کے اس سوا نہ سنا
ہلا تھا دو ہی بوسے کو اس کا لب اک دن

پڑی ہے جی ہی کے پیچھے یہ بے کلی دل کی
کسی ہوا سینی کھلتی نہیں کلی دل کی

ہزار دام یوں تو ہیں پہ نہیں پیچ بلا ہے یہ زلف
کہ جس کے پیچ سے آگے نہ کچھ چلی دل کی

بتاں کے عشق کے شعلہ سے خاک بھی نہ رہی
جو کچھ متاع تھی گل ہیں سو سب جلی دل کی

چمکتے ہیں ستارے جس طرح تاریک آدا میں
تہ بازو ہیں زیر آستیں یوں نور تن چمکے

شیدا

شیدا:- پنڈت گنگا پرشاد رامپوری۔ شاگرد جناب تسلیم لکھنوی۔ زبان میں سادگی۔ طبیعت میں روانی ہے۔ بلیغ مضامین کو صفائی سے ادا کرتے ہیں۔ معاملہ کے شعر خوب کہتے ہیں۔ کلام یہ ہے:-

گھیرے ہوئے ہو چارہ گرو مجکو کس لئے
کیا دیکھتے ہو کوئی تماشا نہیں ہوں میں

میری وفا کی ایک زمانے میں دھوم ہے
نزدیک آپ کے مگر اچھا نہیں ہوں میں

میں نے کہا نہ میرے ہوئے تم نہ غیر کے
بولے کہ تم کو کیا جو کسی کا نہیں ہوں میں

وہ گئے غیر کے گھر مجھ سے بگڑ کر دیکھو
یوں بگڑ جاتا ہے دم بھر میں مقدر دیکھو

رقص بسمل کی ذرا سیر گھڑی بھر دیکھو
تیغ کھینچی ہے تو اک ہاتھ لگا کر دیکھو

کیسے ارمان سے ہیں دیکھ رہا ہوں تم کو
میری جانب تو ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو

پھر اُسی طرح نکالو مرے دل کی حسرت
پھر مجھے تم اُسی انداز سے ہنسکر دیکھو

کیا کہوں تم سے مزہ عشق میں کیا ہے ناصح
تم بھی دل اپنا کسی بت سے لگا کر دیکھو

حال ابتر ہے بہت ہجر میں میرا شیدا
دیکھئے اب بھی نہ آیا وہ ستمگر دیکھو

پونچھتے ہیں اپنے دامن سے وہ اشک
آنسوؤں کی یہ روانی اور ہے

عمر جاتی ہے نظر آتی نہیں
اپنی کشتی کی روانی اور ہے

قتل ہو کر زندۂ جاوید ہیں
یہ ہماری زندگانی اور ہے

شیدا

شیدا:- کسی گمنام شاعر کا تخلص ہے۔ جو شاہجہان آباد میں شاہ عالم ثانی کے عہد میں حلقہ بندی کا کام کر کے اپنی اوقات بسر کیا کرتا تھا۔ میر مہندی بیدار سے تلمذ تھا۔ اسکے سوا حال معلوم نہ ہوا۔ شوق کے تذکرے کی ترتیب سے قبل انتقال کر چکا تھا۔

لیکے دل کو دلربا کیوں اب قسم کھاتے ہو تم
ہم نظر بازوں کے آگے سے کہاں جاتے ہو تم

اک نرالے شہر میں بانکے تمھیں پیدا ہوئے
ہر گھڑی تیغ و سپر لے کے دھمکاتے ہو تم

آگے تم سے کیا توقع ہو کہ شیدا کو میاں
ایک بوسے پر چھری تلوار بتلاتے ہو تم

شیدا

شیدا۔ میرزا محمود بیگ صاحب ساکن ریاست چرکھاری ملک بندیل کھنڈ۔ ان کے والد ماجد ریاست میں جیل کے داروغہ تھے۔ خود کچھ زمانہ گذرا کسی دفتر میں کلرک تھے۔ حضرت فتنہ سندیلوی سے تلمذ تھا۔ عمر قریب ۵۰ سال کے ہوگی۔ یہ چند اشعار ان کے ہیں:۔

بھر رہا ہے نقش سرو وہ پر فن کیسا
جھلملاتا ہے چراغ سر مدفن کیسا

لیکے شیدا کا وہ دل جان کے اب خواہاں ہیں
یہ تو سب ہوش کی باتیں ہیں لڑکپن کیسا

پرسانِ حال خود ہی سمجھ لینگے حال دل
قطرہ کوئی لہو کا اگر چشم تر میں ہے

پہنچی ہے حدِ مشق تصور یہاں تک اب
ہر دم جمال یار کا جلوہ نظر میں ہے

شیدا

شیدا۔ ٹھاکر گجادھر پرشاد رئیس وزمیندار بسولیا ضلع سیتاپور۔ شعر کی بندشیں صاف ہوتی ہیں۔ طبیعت میں کسی قدر شوخی ہے۔

بروز حشر تمہیں دور ہی سے دیکھ کے ہم
پکار اٹھیں گے کہ دیکھو وہ فتنہ خو آئے

لئے ہوئے کہاں بیٹھے ہیں بوتلیں شیدا
کہو کہ شیخ نہ اس وقت روبرو آئے

شیدا

شیدا۔ مولوی عبدالحمید مسرامی شاگرد حضرت کوثر خیرآبادی و جناب وسیم۔ تخیل بلند ہے۔ فرسودہ مضامین کو نئے لباس میں مزین کرتے ہیں۔ بعض اشعار میں زبان کا بھی لطف ہے:۔

بن کر ستارہ دامن گردوں میں رہ گیا
ذرہ ہوا بلند جو اپنے غبار کا

ملتا کسی سے عیب نہیں ہے خطا معاف
کیوں توڑتے ہو دل کسی امیدوار کا

سب یہاں کے بیٹھے اونکی زباں میں بند ہیں
بنگیا آئینہ میں گو خوبیاں دیکھ کر

شیدا

شیدا۔ شیخ غفور بخش صاحب آپ کے آبا و اجداد کالپی کے رہنے والے تھے غدر کے بعد شاہ جہاں پور میں قیام پذیر ہوئے۔ جناب شیدا شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ فارسی و ریاضی میں استعداد قابل ہے۔ اردو میں بھی اچھا دخل ہے شاعری

کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ اور خود بھی صاحب تلامذہ ہیں۔ آپ کے چند شاگردوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔ شمس، جناب مرتضےٰ خاں صاحب۔ ۲۔ محسن، جناب محمد محسن صاحب۔ ۳۔ برق جناب محمد وکیع صاحب۔ ۴۔ جناب افق اٹاوی۔ ۵۔ جناب عاشق اٹاوی۔

علم ریاضی اور شعر و شاعری میں کئی رسالے آپ کی تصنیفات سے ہیں آپ نے ایک ماہانہ رسالہ موسومہ ہلال بھی جاری کیا تھا۔ جو آپ کی ادارت میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک اٹاوہ سے نکلتا رہا۔ علاوہ شاعر ہونے کے آپ ایک نہایت کامیاب معلم بھی ہیں۔ آپ نے ۷ سال تک مدرسہ انجمن ہدایت الاسلام اٹاوہ کی ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دیئے ہیں اور فی الحال سپروائزر میونسپل بورڈ ہیں

نہایت منکسر المزاج۔ خلیق۔ متین اور مرنجان و مرنج بزرگ ہیں۔ بیشتر وقت علمی مشاغل میں بسر فرماتے ہیں۔

آپ کی شاعری صرف غزل گوئی تک محدود نہیں۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ زبان شستہ۔ اسلوب بیان دلکش اور تخیل پاکیزہ ہوتی ہے غزل کی طرح نظم میں بھی حسن بیان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

تھاما ہے جس نے ہاتھ جہاں میں یتیم کا
حقدار ہو گیا وہ ثواب عظیم کا

ان کو بلایا حق نے وہ خود طور پر گئے
رتبہ یہ تھا نبی کا وہ رتبہ کلیم کا

واعظ اٹھے ہو ہشت روز حساب کیا
شیدا کو آسرا ہے عفو الرحیم کا

چارہ گر بیتابیٔ قلب و جگر دیکھا کیا
اور میں حیرت سے شکل چارہ گر دیکھا کیا

دل ہمارا آپ کی ہر دم نظر دیکھا کیا
جو مقدر نے دکھایا عمر بھر دیکھا کیا

دیکھنا تھا کچھ تو چشم شوق کو وہ دیکھتا
ہاتھ رکھا نبض پر کیا چارہ گر دیکھا کیا

کس قدر رنجور کیا اک وعدۂ دیدار نے
شام ہی سے کوئی آثار سحر دیکھا کیا

تھی رہائی کی تمنا یا قضا کا انتظار
اک گرفتار قفس کیوں سوئے در دیکھا کیا

دشمن بھی دیکھکر کف افسوس مل گیا
بدلے نہ تم اگرچہ زمانہ بدل گیا

تاریکیاں ہی کیوں نظر آتی ہیں چارسو
آنکھیں بدل گئیں کہ زمانہ بدل گیا

یہاں آکر نہ واعظ بے پئے جا
تبرک میکدے کا کچھ لئے جا

ملائے جا مری نظروں سے نظریں
یونہیں بوچھار تیروں کی کئے جا

خدا جانے یہ کب تک تم کہو گے
کوئی دن اور وعدے پر جئے جا

جنوں یہ کہہ رہا ہے مسکرا کر
جو سی سکتا ہے تو دامن سئے جا

جب تک کہ نہ ہو عشق میں دیوانہ کسی کا
کیا خاک کوئی سمجھیگا افسانہ کسی کا

کس بات کی امید کرے پھر کوئی تم سے
تم نے تو کبھی حال بھی پوچھا نہ کسی کا

زانو پہ لٹاتے ہیں وہ بیہوش سمجھکر
اب ہوش میں کیا آئیگا دیوانہ کسی کا

کچھ ہوش دیا ہے جسے دنیا میں خدا نے
بہتر ہے کہ ہوجائے وہ دیوانہ کسی کا

شیدا عبث اس سے تمھیں امید وفا ہے
ہوگا وہ ہمارا نہ تمہارا نہ کسی کا

وہ بھی کیا دن تھے کہ واقف ہی نہ تھے مشکل سے ہم
آشیانہ کی ہوا کھاتے تھے ٹھنڈے دل سے ہم

کس قدر بیخود رہے وارفتگی دل سے ہم
آہ! قاتل کا پتہ پوچھا کئے قاتل سے ہم

کوئی سن پائے اگر تو ہم کو دیوانہ کہے
چپکے چپکے وہ کیا کرتے ہیں باتیں دل سے ہم

اک یہی لے دے کے ہے اجڑے ہوئے گھر کا چراغ
کس طرح داغ محبت کو مٹا دیں دل سے ہم

دل پر اضطراب لایا ہوں
شوخیوں کا جواب لایا ہوں

کرم بے شمار دکھلا دے
گنہ بے حساب لایا ہوں

نقد دل ان کو دے کے اے شیدا
جان پر خود عذاب لایا ہوں

کسی کی مسرت سے غم کو نہ بدلا
ترے غم کشوں کی یہ خودداریاں ہیں

مریض محبت کا بچنا ہے مشکل
کہ دل ایک ہے لاکھ بیماریاں ہیں

جو لگ جائے نشانے پر اسی کو تیر کہتے ہیں ۔ جو کام آ جائے موقعہ پر اسے تدبیر کہتے ہیں

وہ کیا تصویر جو دیوار پر لٹکائی جاتی ہے ۔ جو دل کے آئینے میں ہو اسے تصویر کہتے ہیں

جہاں آیا مرے دلمیں تمنا بنگیا دل کی ۔ تری چٹکی میں جب تک تیر ہے سب تیر کہتے ہیں

بیخودی کہتی ہے محبوب کا جلوہ دیکھو ۔ دیکھتے کیوں نہیں اے حضرت موسیٰ دیکھو

جان پر کھیل گیا اور تمہیں چاہا دیکھو ۔ میرا دل میری نظر میرا کلیجا دیکھو

جام جمشید مرا دل ہے کہاں جاتے ہو ۔ یہیں بیٹھے ہوئے دنیا کا تماشا دیکھو

کس طریقے سے سکھاتے ہیں وہ مرنا مجھکو ۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ پروانے کا جلنا دیکھو

ہم اپنا جان کے کہنے میں آ گئے دل کے ۔ یہ کیا خبر تھی کہ دے گا فریب یہ دل کے

وہ یادگار ستم ہیں یہ یادگار وفا ۔ وہ تیرے تیر کے ٹکڑے ہیں یہ مرے دل کے

شیدا

شیدا:۔ منشی بشیر حسن صاحب ریختی گو اکبر آبادی۔ چند سال قبل بمبئی میں قیام تھا۔ انہوں نے اس نئی روشنی کے زمانہ میں جان صاحب کے رنگ کو اختیار کیا ہے۔ ریختی کہتے ہیں۔ عورتوں کے محاورات اور بول چال کو نظم کرتے ہیں۔ ہر شعر ضلع جگت سے آراستہ ہے۔ لیکن سعادت یار خاں رنگین کا ریختی ایجاد کرنے سے صرف یہ منشا نہ تھا۔ کہ تلازمہ بندی سے شعر کی نوک پلک درست کریں۔ بلکہ ان کا مقصد زبانِ نسواں کی حفاظت تھا۔ شیدا صاحب کے یہاں ٹکسالی محاورات کم ہوتے ہیں۔ بازاری محاورات زیادہ نظم کرتے ہیں:۔

آج کل اے چچی شیدا کا عجب نقشہ ہے ۔ باتیں کرتا ہے نگوڑا مری تصویر کیسا بھی

یہ تاک جھانک تری ہر کہیں چلی ہو گی ۔ مگر نہ دال گلی میں مری گلی ہو گی

ہیں صاف کہتی ہوں گیندو کا نام بد ہو گا ۔ گلاب خاں کو اگر اتنی بے کلی ہو گی

شمس النسا نہ جانئے مرزا قمر مجھے ۔ آتی ہے کل سے آپ کی بدلی نظر مجھے

گلشن لگا کے عیب مجھے ہو گی کب نہال ۔ اس صبر کا تو دے گا خدا ہی ثمر مجھے

شیدا تمہاری چاہ میں ایسی ہوں باولی | میکے میں بیٹھے دیکھو ہوا سال بھر مجھے

شیدا

شیدا۔ منشی سید کفایت علی صاحب مچھلی شہری۔ حضرت شہیر کے عزیز اور تلمیذ ہیں۔ بتلانا بجائے بتانا اور دکھلانا بجائے دکھانا۔ ان کے خیال میں مخل فصاحت نہیں ہے۔

آتی ہے یہ آوازِ دلِ زار و حزیں سے
الفت نہ کرے کوئی کسی پردہ نشیں سے
دکھلا دو ذرا عارضِ تاباں کی تجلی
سرکا دو نقابِ رخِ پُر نور کہیں سے
دل جس نے چرایا ہے پتہ اس کا لگے گا
زندہ ہیں تو ہم ڈھونڈ نکالیں گے کہیں سے

شیدا

شیدا۔ منشی نبی بخش۔ داناپوری۔ شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ صوفی مشرب صاف باطن بزرگ تھے۔ ہمیشہ مشائخ کی صحبت میں رہتے تھے۔ ان کا دیوان رموز بلیغ کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔ تذکرہ ضیغم سے چند شعر انتخاب کئے جاتے ہیں:۔

جو جاتا ہے شیدا کوئی واپس نہیں آتا
ہاں سچ ہے کہ لگ جاتا ہے دل جا کے وطن میں
عکسِ رخ سے ہو یہ حیراں بندہ پرور آئینہ
چشم جوہر کی بنے پتلی سمٹ کر آئینہ
آفتاب چرخ چارم جب نہیں کہتی ہے خلق
دیکھتے ہیں سورہ والشمس پڑھ کر آئینہ
پڑ گیا ہے جب سے ان کو اپنی خود بینی کا شوق
ہاتھ سے چھٹتا نہیں ہے ان کے دم بھر آئینہ
عکس افگن ہو جو ان شیدا جمالِ روئے یار
کہہ اٹھے بیساختہ اللہ و اکبر آئینہ

شیدا

شیدا۔ جناب سید علی حیدر صاحب ساکن محلہ افضل پور شہر عظیم آباد۔ آپ کے والد ماجد سید شاہ ولی حیدر ولی تلمیذ مرزا دبیر مرحوم تھے۔ شاعری کا کا شوق جناب شیدا کو بچپن ہی سے ہے جناب شاد عظیم آبادی سے مشورہ سخن کرتے رہتے ہیں۔ استعداد علمی اچھی ہے۔ زبان صاف اور مضامین سنجیدہ ہوتے ہیں علاوہ غزل کے نوحے اور سلام بھی کہتے ہیں۔ عمر اس وقت تقریباً ۵۰ سال کی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سنئے گا کوئی تو محشر میں مدعا اپنا — بس ایک ہے یہی لے دے کے آسرا اپنا
نہ مثلِ بانگِ جرس کس طرح کروں فریاد — لٹا ہے راہ میں دن رہتے قافلہ اپنا
مرا فسانۂ غم سن تو لو پھر اس کے بعد — تمہیں یقین نہ کرنے کا اختیار رہا
نکل گئی شبِ غم تجھ سے آہ آخر کو — ذرا سی بات پہ اے دل نہ اختیار رہا
آباد ہو گی مسجد زاہد تری کہاں سے — میخانے کھل گئے ہیں پہلے ہی کچھ اذاں سے
ہیں حسرتوں کو اپنی واللہ رو چکا تھا — امید بندھ گئی کچھ قاصد ترے بیاں سے
اس ڈر سے اپنے دل میں اک پھانس چبھ رہی ہے — کیا جانیں کیا وہ پوچھیں کیا نکلے یاں زباں سے
ترکِ ادب ہے ناصح یوں ان کا ذکر کرنا — پہلے درود پڑھ لے تب نام لے زباں سے
قاتل تری گلی کو مرنے پہ بھی نہ چھوڑوں — ڈانڈا ملا ہوا ہے فردوس کا یہاں سے
جب دل ہی اپنا غم سے مرجھا رہا ہے شیدا — مطلب بہار سے کیا پھر کام کیا خزاں سے

شیدائی

شیدائی۔ منشی رحیم داد خاں۔ باشندۂ جاورہ تلمیذ صاحب زادہ شرف سلیم الطبع اور سادہ زبان ہیں۔

حرم ہاں دیر میں کعبہ میں مسجد میں کلیسا میں — تصور میں نظر میں دل میں میرے جا بجا تم ہو
پھرو محشر میں اٹھلاتے ہوئے کیوں خوف ہو تم کو — تمہارے اہل محشر مالک روزِ جزا تم ہو
جگر کے پار ہوا دل میں جا کے بیٹھ گیا — تمہارے تیر نظر میں کمال کیسا ہے

شیریں

شیریں:۔ جناب نواب شاہجہان بیگم صاحبہ سابق والیہ ریاست بھوپال۔ آپ ۶ ماہ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ مطابق ۲ جولائی ۱۸۳۸ء کو قلعہ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ نواب سکندر بیگم صاحبہ نے نہایت ناز و نعمت سے آپ کو پرورش کیا۔ بیگمات خواتین کی طرح تعلیم پائی ۱۸۵۵ء میں بخشی باقی محمد خاں بہادر نصرت جنگ سے شادی ہو گئی۔

۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو بیگم صاحبہ مسند نشین ریاست ہوئیں۔ نظم و نسق کی قابلیت

ابتدا ہی سے تھی۔ آپ نے والیہ ملک ہو کر قوانین دیوانی و فوجداری و مال وغیرہ میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ شہر کی صفائی و روشنی۔ ریلوے کا اجرا۔ محکمہ وظائف و مصارف آپ کے عہد کی عمدہ یادگار ہیں۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد ۸ نومبر ۱۸۷۱ء کو لارڈ ارل میو گورنر جنرل بہادر کی منظوری سے آپ کا عقد ثانی نواب مولوی محمد صدیق حسن خاں کے ساتھ ہوا۔ مولوی صاحب مرحوم سکندر بیگم صاحبہ کے عہد میں افسر مدارس و مہتمم عملۂ تاریخ نگاری مقرر ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ کی سعی و کوشش سے انہیں سرکار انگریزی کی جانب سے امیر الملک والاجاہ کا خطاب ملا۔ نواب صاحب نے ۱۲۹۸ھ وفات پائی اور شاہجہان بیگم صاحبہ نے ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔

آپ اہل سخن کی قدردان تھیں۔ آغا کمال الدین سنجر شیرازی۔ حافظ محمد خاں شہیر جیسے شعراء آپ کی طرف سے معقول وظائف پاتے تھے۔ ۱۲۹۸ھ میں آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہے:۔

پیچ جو اس زلف کا یاد آ گیا　　سانپ مرے سینے پہ لہرا گیا

روشنی مہر کی ذرہ سے بھی کم ہو جاتی　　خیر گذری جو ترے رخ کے مقابل نہ ہوا

اسیر ہونے میں یہ دغدغہ ہے دل کو لگا　　پھرائے دیکھیے قسمت کہاں کہاں صیاد

فرقت میں تری کرتا ہوں دونوں کی تسلی　　رکھتا ہوں کبھی دل پہ کبھی ہاتھ جگر پہ

صانع مطلق نے عالم کو بنایا ہے طلسم　　عقل کیوں حیران نہ ہو دنیا کی صنعت دیکھکر

بکھرنا جو زلفوں کا یاد آ گیا　　تو اس دم ہے کیا کیا پریشان ہم

دیکھیے انجام کیا ہوتا ہے میرے عشق کا　　سخت مشکل ہے کہ میں واقف کچھ اس فن سے نہیں

زیبا وہ رخ ہے قامت رعنا پہ اسطرح　　خورشید کا ہے پھول صنوبر کی ڈال میں

کیا تم سے بیاں ہوں کہ تمہارے فراق میں　　اتنے ستم اٹھائے کہ جن کا بیان نہیں

سنئے ذرا اپنے غم کی کہانی سنائیں ہم　　وہ حرف ہائے کچھ ایسی بڑی داستاں نہیں

لگاؤ دل کا اگر واں نہیں تو یاں بھی نہیں
محبتوں کی نظر واں نہیں تو یاں بھی نہیں

پھر بہار آئی پھرے بلبل دلگیر کے دن
سیکڑوں کوس گئے گردش تقدیر کے دن

جوانی میں ہوا یوں عشق ہمکو مہ جبینوں کا
صنم کا کھیل اکثر کھیلتے تھے ہم لڑکپن میں

ماہ کو داغ غلامی جس کے چہرے نے دیا
اسکی پرچھائیں سے ہو کیونکر مقابل چاندنی

زیر کاکل ہے یہ عالم اس رخ پُر نور کا
ابر تیرہ میں ہو جیسے جلوہ گستر چاندنی

شب وصلت بھی دامن گیر ہے اندیشۂ فرقت
سحر تو دور ہے میرا ابھی سے دم نکلتا ہے

شیفتہ :- حافظ بڈھا صاحب۔ قصبۂ تھانا بھون ضلع مظفر نگر کے رہنے والے۔ زمانہ قدیم کے شعرا میں تھے۔ قدرت اللہ شوق کے تذکرہ سے چند اشعار انتخاب کئے جاتے ہیں۔

دل سے سب دور کریں فکر غم و شادی کا
چشم بد دور میں اوستاد ہوں آزادی کا

جادۂ راہ عدم نکلے ترے کوچہ سے
رتبہ پہنچا ہے کہاں تک تری صیادی کا

شاہی حسن مسلّم ہے بتاں راج کرو
پر یہ دل ملک ہمارا ہے نہ تاراج کرو

دختر رز کو بھرے بیٹھے ہو محفل میں لئے
میکشو تاک کی حرمت کی تو کچھ لاج کرو

رخ سے جسوقت وہ برقع کو اٹھا دیتا ہے
رنگ کچھ اور ہی عالم کا دکھا دیتا ہے

شیفتہ :- حاجی مصطفےٰ خاں بہادر مرحوم رئیس دہلی و جاگیردار جہانگیر آباد۔ خلف عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضےٰ خاں بہادر مظفر جنگ۔ ان کے دادا کوہاٹ سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے والد نواب مرتضیٰ خاں نے لارڈ لیک کی رفاقت میں کارنمایاں کئے جس کے صلہ میں ہوڈل پلول کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جاگیر میں دیا وہ علاقہ اس خاندان کے پاس سے نکل گیا۔ لیکن جہانگیر آباد کا علاقہ واقع ضلع میرٹھ جو انہوں نے خریدا تھا۔ اب تک ان کی اولاد کے قبضے میں ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کی ولادت سنہ ۱۸۰۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت شروع ہو کر تکمیل کو پہنچی۔ عربی کے اچھے عالم اور فارسی کے عالم متبحر تھے۔ حج بیت اللہ سے بھی شرف اندوز

ہوئے۔ فارسی کے بھی اعلےٰ پایہ کے شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتیؔ تخلص تھا۔ اور مرزا غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ اردو میں مومن خاں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے صحبتیں ایسی اٹھائیں جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ زمانہ تھا کہ غالب اور مومن کے سوا ذوقؔ۔ نصیرؔ۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔ مولانا امام بخش صہبائی اور نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں وغیرہم کا نام ادب اور شاعری کے افق پر مہر نیمروز کی طرح چمک رہا تھا۔ تعلیم مکمل صحبت اتنی اعلےٰ اس پر طبیعت دقیقہ رس اور مذاق سلیم پھر شیفتہ مرحوم اُردو شاعری کے حق میں وہ کچھ کیوں نہ کر جاتے۔ جو انہوں نے کیا انہوں نے یہ کیا کہ اُردو شاعری یعنی غزل میں جو عوامیت اور سخافت آگئی تھی۔ اس کے روکنے اور لفظ کے ساتھ کلام میں متانت اور طاقت ڈالنے اور حسن ادا میں چستی اور دلاویزی پیدا کرنے میں مرزا غالب کے ساتھ اتحاد عمل کی طرح ڈالی۔ راقم کی رائے میں مرزا نوشہ کو شیفتہ پر ان دو وجوہ سے شرف اور فوقیت حاصل ہے ایک تو اولیت اور دوسرے اسلوب کلام کی اصلاح کے ساتھ تخئیلی صناعی اور علویت اس کا ثبوت شیفتہ کا کلام اور خاصکر ایسے شعر ہیں۔

شیفتہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول
اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

مختصر یہ کہ ان کی شاعری تخئیل اور اسلوب کی صناعی اور فنی محاسن سے آگے نہیں جاتی۔ تخئیل کی بلند پروازی ان کے ہاں ہے تو مگر کم۔ مرزا غالب کے لئے یہ بھی غنیمت تھا۔ اور وہ ان کی حوصلہ افزائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں :۔

ہند را خوشش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ و آنگاہ
حسرتیؔ۔ اشرفؔ و آزردہ بود اعظم شاں
غالبؔ نہ حسرتیؔ چہ سرائی کہ در غزل
چوں او تلاشِ معنی و مضموں نکردہ کس

قصہ مختصر نتیجہ یہ ہوا کہ دلی کی کہولت تجدید شباب سے اور لکھنؤ کی "دیوانی جوانی" صحیح الدماغی اور سلامت روی سے بدل گئی۔

شیفتہ جیسے اعلےٰ درجے کے شاعر تھے۔ ویسے ہی نقاد اور سخن فہم بھی تھے

یہ ان کی تصانیف ہیں۔ دیوان اردو۔ دیوان فارسی۔ مجموعہ کلام نثر و خطوط فارسی۔ ایک سفرنامہ مسمے ترغیب السالک الی احسن المسالک۔ اس کا فارسی نام رہ آورد ہے۔ اور تذکرہ گلشن بیخار۔ یعنی اردو شاعروں کا تذکرہ فارسی زبان ہیں۔ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت ان کی عمر بیس سے کچھ کم ہی تھی۔ یہ عمر وہ ماحول اور میلان طبع۔ پھر جو نظیر اکبر آبادی کی نسبت اُنھوں نے یہ لکھدیا کہ :۔

"اشعار بسیار دارد کہ بزبان سوقیئں جاریست
نظر بہ آں ابیات در اعداد شعرا نشاید شش شمرد"

تو تعجب کا مقام نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک شاعری موضوع کی قید اور داخلیت سے معرا نتھی۔ اور محض غزل اور مجاز کے مجلس ہیں مقید تھی۔

شیفتہ اور ان کے معاصرین وہ لطیف فضاء دنیائے اُردو میں پیدا کر گئے جو تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ کاش وہ بزرگ چالیس پچاس برس بعد پیدا ہوئے ہوتے۔ نواب شیفتہ صرف شاعر اور ادیب ہی نہ تھے۔ بلکہ ادیب ساز بھی تھے

خواجہ الطاف حسین حالیؔ مرزا غالب کی سفارش سے نواب شیفتہ کے فرزند ارجمند نقش بند خاں کی اتالیقی پہ ملازم ہوئے۔ انہوں نے شاید غالب کی شاگردی سے اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جتنا شیفتہ کی صحبت سے۔ کلام کی طرح شیفتہ کا شعار بھی متانت اور وجاہت سے آراستہ تھا۔ راقم کی رائے میں اگلے وقتوں میں جو درجہ میر درد کا میر اور مرزا کے مواجہہ میں تھا۔ اس سے کچھ زیادہ ہی نواب شیفتہ کا درجہ غالب اور ذوق۔ ناسخ اور آتش کے مواجہہ میں ہے۔ آخر اس صاحب کمال نے ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا نمونہ کلام یہ ہے :-

جب سے عطا ہوا ہمیں خلعت حیات کا
کچھ اور رنگ ڈھنگ ہوا کائنات کا

شیشہ اُتار شکوے کو بالائے طاق رکھ
کیا اعتبار زندگیِ بے ثبات کا

یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا
ہاں عالم شہود ہے آئینہ ذات کا

اے مرگ آکہ میری بھی رہ جائے آبرو
رکھا ہے اس نے سوگ عدو کی وفات کا

کیا فائدہ نصیحت ناسود مند کا
کیا خوب پند گو بھی ہے محتاج پند کا

جب میں نہیں پسند تو پھر اور آپ کے
عاشق ہوں اُس کی خاطر مشکل پسند کا

نالہ تو نارسا نہیں کیونکر گلہ کروں
میں شکوہ سنج ہوں تیری کاخ بلند کا

کچھ انتظار مجھ کو نہ مے کا نہ ساز کا
ناچار ہوں کہ حکم نہیں کشف راز کا

ایمن ہیں اہل جذبہ کہ رہبر ہے ان کے ساتھ
سالک کو ہے خیال نشیب و فراز کا

پانی وضو کا لاؤ۔ رُخ شمع زرد ہے
مینا اُٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا

ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا
سمجھے جو گرمی ہنگامہ جلانا دل کا

ہم سے پوچھیں کہ ابھی کھیل میں کھوئی ہے عمر
کھیل جو لوگ سمجھتے ہیں لگانا دل کا

مصروف ہے بہت وہ مسیحا علاج میں
ہم بھی ذرا علاج کریں گے طبیب کا

شعلہ رو یار شعلہ رنگ شراب
کام یاں کیا ہے دامن تر کا

اس نے عاشق لکھا عدو کو لقب — ہائے لکھا مرے مقدر کا
قبر پہ وہ بت گلفام آیا — بارے مرنا تو مرے کام آیا
نہ لکھنا تھا غم ناکامیٔ عشق — جواب نامۂ بے مدعا کیا
کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا
آپ جو ہنستے رہے شب بزم میں — جان کو دشمن کی میں رو دیا کیا

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین — دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا
یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی — صبح تک وعدہ دیدار نے سونے نہ دیا

کہاں پھر وہ نایاب پایا جسے — غلط شوق ہے جنس نایاب کا
میں بے جرم رہتا ہوں خائف کہ واں — جفا میں نہیں دخل اسباب کا

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام — بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
نان و نمک کی تھی ہمیں توفیق شیفتہ — ساز و نوا کے واسطے برگ و نوا نہ تھا
حسرت سے اسکے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھئے — اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا
ساقی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو — مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا
دشمن کے فعل کی نہیں توجیہ کیا ضرور — تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا
شیفتہ ہجر میں تو نالۂ شبگیر نہ کھینچ — صبح ہونے کی نہیں خجلت تاثیر نہ کھینچ
چارہ گر فکر کر اس میں کہ مقدر بدلے — ورنہ بیہودہ اذیت پئے تدبیر نہ کھینچ

ہر بن مو سے دھواں اٹھتا ہے — آتش غم کو چھپاؤں کیونکر
میرے آنے سے تم اٹھ جاتے ہو — بزم دشمن میں نہ جاؤں کیونکر
یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ — اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

کچھ ہم قتل سے نہیں آنکھیں نہیں اشک سے سرخ — کھاتا ہے جوش خوں تری تلوار دیکھکر
جاتے ہیں اور منع کی طاقت نہیں مگر — رہ جائیں آپ وہ مجھے ناچار دیکھکر

کم رغبتی سے لیتے ہیں دل ہوشیار ہیں
بڑھتا ہے مول شوق خریدار دیکھکر

کہتا تھا وقت مرگ یہ ہر اک سے شیفتہ
دیتا کسی کو دل تو وفادار دیکھکر

قدح سے دل ہے مراد اور نگہ سے عشق غرض
ہیں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں زباں بادہ فروش

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا
ملیگا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

اس تیرہ شب میں جائینگے کیونکر عدو کے گھر
میرا رقیب وہ ہے جو ان کو دکھائے شمع

مطبوع یار کو ہے جفا اور جفا کو ہم
کہتی ہے بد عدو کو وفا اور وفا کو ہم

ہیں جاں بلب کسی کے اشارہ کی دیر ہے
دیکھی ہے اُس نگہ کو قضا اور قضا کو ہم

بچتے ہیں اسقدر جو ادھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوہ دل شورش ادا سے ہم

کم فہم ہیں تو کم ہیں پریشانیوں میں ہم
دانائیوں سے اچھے ہیں نادانیوں میں ہم

شعر اب میں نہ کہونگا کہ کوئی پڑھتا تھا
اپنے حالی مرے اشعار ترے کوچہ میں

ملک الموت کے گھر کا تھا ارادہ اپنا
لے گیا شوق غلط کار ترے کوچہ میں

کیا تجاہل سے یہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو
تیرے کوچہ میں ستمگار ترے کوچہ میں

واں ہے وہ نغمہ جس سے کہ حوروں کے ہوش جائیں
یاں ہے وہ نالہ جس سے فرشتے حذر کریں

اہلِ زمانہ دیکھتے ہیں عیب ہی کو بس
کیا فائدہ کہ شیفتہ عرض ہنر کریں

کس نے سنا دیا دل حیرت زدہ کا حال
یہ کیا ہوا کہ آئینہ اب روبرو نہیں

بے طاقتی نے کام سے یہ کھو دیا کہ بس
دل گم ہوا ہے اور سر جستجو نہیں

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب میں کوشش
ورنہ کچھ غیر سوا ہم سے جسارت میں نہیں

دل کے بدلے میں طلبگار نہیں کچھ تم سے
شیفتہ زمرۂ ارباب تجارت میں نہیں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

عذر اک ہاتھ لگا ہے انہیں یاں آنے میں
کیوں کہا میں نے کہ چلئے مرے غمخانے میں

مت چھیڑ کہ یار سے جدا ہوں
اے مرگ میں آپ مر رہا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملئے
کہتا ہے وہ کیا میں بے وفا ہوں

کن حسرتوں سے مرتے ہیں ہم تم کو غم نہیں
اپنی بھی مرگ مرگِ تمنا سے کم نہیں

شکوہ آئینِ محبت میں ہے ایجادِ لطیف
نسخۂ اصل میں ہرچند کہ یہ باب نہیں

واں شوق داستان ہے یاں داستانِ شوق
پر کیا کروں کہ دوست کوئی قصہ خواں نہیں

حرفِ درشتِ غیر سبک وضع بھی سہے
میں وہ ہوں جس پہ بارِ امانت گراں نہیں

ہم آج تک چھپاتے ہیں یاروں سے رازِ عشق
حالانکہ دشمنوں سے یہ قصہ نہاں نہیں

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ
آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

ہستی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

حجابِ منظر مقصود ہے طلسمِ خودی
جو یہ طلسم نہ ٹوٹے تو فتح باب نہ ہو

غیرت سے حرفِ تمنائے جفا کہتے ہو
کس کو کہتے ہو خبر ہی نہیں کیا کہتے ہو

اڑتی سی شیفتہ کی خبر یہ سنی ہے آج
لیکن خدا کرے یہ خبر معتبر نہ ہو

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

کچھ وہی ہے بے قراری تسکیں
وہی تسکین بے قراری ہے

ہرچند کہ ہے آپ سے ملنے کی تمنا
پر آپ سے ملنے کی تمنا نہیں رکھتے

دل لگایا تو ناصحوں کو کیا
بات جو اپنے جی میں آتی ہے

جس لب کے بوسے غیر لیں اس لب سے شیفتہ
کمبخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

قطعہ

منظور ہے جلیلہ کو ہر شے کی معرفت
حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ارباب حکمت نظری کو عمل نہیں
جن کو کہ دستگاہ ہے فنِ نجوم میں
مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
جی میں کسی کے خواہش آرائش لباس
کوئی طلب میں اشہب گلگوں نظیر کی
کوئی فدائے قامت آفت خرام ہے
ناحق کسی کو شکر کسی کو شکایتیں
کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ

اہل کلام کو ہوس قیل و قال ہے
عمر ان کی صرف زائچۂ ماہ و سال ہے
منعم غریق لجۂ بیم و زوال ہے
دل میں کسی کے حسرت جاہ و جلال ہے
کوئی اسیر شوق شکار غزال ہے
کوئی خراب نرگس جادو مثال ہے
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے
اس کا جو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

شیفتہ: بابو سوہن لال صاحب۔ عرصہ ہوا علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے افسوس کہ مزید حالات نہ معلوم ہو سکے۔ یہ کلام ان کا ہے۔

دل کہاں سے کہاں کو جا نکلا
ہاتھ قاتل کا جب پڑا بھرپور
غیر کے ساتھ اور یہ رسوائی
شرم کیا کیا نہ تھی گناہوں سے

تم تو تم وہ بھی بے وفا نکلا
زخم کے منہ سے مرحبا نکلا
نام یہ آپ کا بُرا نکلا
در توبہ مگر کھلا نکلا

دل دیکھئے یوں نہ رنج محبت میں چاہئے
ساقی وہی نگاہ وہی آنکھ پھیر لے
اے شیفتہ نہ آپ بگاڑیں رقیب سے

کچھ شکر کی جگہ بھی شکایت میں چاہئے
اک جام اور مجھ کو مروت میں چاہئے
دشمن سے دوستی بھی ضرورت میں چاہئے

شیفتہ: سید محمد حسن صاحب۔ ساکن قصبہ سندیلہ۔ ڈپٹی کلکٹر ہیں پوری بغرض تحصیل علم لکھنؤ گئے اور وہیں حضرت اسیر کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ شیریں مقال شاعر تھے۔ مولوی نیاز علی صاحب پریشان کے خاص عزیز اور حضرت قانع سندیلوی کے نانہالی بزرگوں میں تھے۔ کلام یہ ہے:

تری زلفوں کے سودائی نہ دو دن ایک جا ٹھہرے	کبھی جنگل میں جا ٹھہرے کبھی بستی میں آ ٹھہرے
مقابل اس ستمگر کے کوئی جانباز کیا ٹھہرے	ستم جس کا کرم ٹھہرے جفا جسکی وفا ٹھہرے
قیامت عاصیوں کا انتظار روز فردا ہے	مری خاطر سے یا رب آج ہی روز جزا ٹھہرے
قضا کا سامنا ہی ڈر سے آنکھیں تلملاتی ہیں	رخ سفاک پر میری نگاہ یاس کیا ٹھہرے
جمال روئے جاناں دیکھئے کب جلوہ آرا ہو	کئی دن سے تو راہوں پر ہیں مشتاق لقا ٹھہرے

شیفتہ

شیفتہ: منشی محمد علی خاں ولد لطف اللہ خاں ساکن راوت پور آگرہ ان کے بزرگ کوہاٹ سے آکر فرخ آباد میں نواب بنگش کے ملازم ہوئے۔ ایام غدر میں خیر خواہی کے صلہ میں مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا والی گوالیار نے ان کی کچھ پنشن بھی کردی تھی۔ فیروز خاں صاحب فیروز اپنے تذکرہ میں ۱۳۰۳ھ میں ان کی عمر ۶۷ برس کی لکھتے ہیں۔ اور حضرت داغ کا شاگرد بتاتے ہیں۔ ؎

ہوائے گور غریباں سے دور دور آیا	یہ کس کی خاک اڑا کر اسے شعور آیا
ہو گیا نقطۂ موہوم دہن کو لکھ کر	فکر کرتا جو سخن کی تو مرا سر پھرتا
ہر وقت نہیں کا تو سبق یاد ہے ان کو	بھولے سے کبھی کہتے ہوئے ہاں نہیں دیکھا

شیفتہ

شیفتہ: منشی سید کاظم حسین کنتوری خلف سید خادم حسین باشندہ کنتور ضلع بارہ بنکی صوبہ اودھ۔ اپنے وقت کے مطابق کہتے تھے۔ طبیعت کا زور مراعات النظیر اور روزمرہ کی پیش نظر باتوں پر صرف کرتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ یہ ان کا کلام ہے۔

جا چکی تھی جان اپنی صدمہ ہائے ہجر سے	آ گئے تم خیر جینے کا سہارا ہو گیا
اگر دم بھر کو بے پردہ رخ دلدار ہو جاتا	تماشا گاہ عالم حشر کا بازار ہو جاتا
نہ دل سے عشق جاتا ہے نہ وہ سفاک آتا ہے	مجھے تو ہر طرح اے شیفتہ مشکل ہے مشکل پر
ٹھکانا کیا کہیں افتادگان دشت وحشت کا	یہ سیچا ہے جہاں بیٹھے بسر کر دی وہیں سو رہے

جلا کر دل مضامین کو سخنور مول لیتے ہیں
لہو کو خشک کرکے مصرعِ تر مول لیتے ہیں

زبردستی سے لینا مفت لینا کام ہے ان کا
کہیں عشاق کے دل کو ستمگر مول لیتے ہیں

متاعِ حسن ہم نے مول لی ہے نقدِ جاں دیکر
سب اچھی چیز کو قیمت بڑھا کر مول لیتے ہیں

خوش سرو جواں ہزاروں مٹی میں گڑ گئے ہیں
لاکھوں بنے بنائے نقشے بگڑ گئے ہیں

نشتر سے کم نہیں ہیں اے شوخ تیری باتیں
بانوں سے تیری دل میں ناسور پڑ گئے ہیں

اللہ کا خیال بھی عشقِ بتاں میں ہے
جاتا ہوں بتکدہ کو تو کعبہ کی راہ سے

صدمۂ عشق سے گھبراؤ نہ اے حضرتِ دل
اور دیکھو گے بہت کچھ ابھی دیکھا کیا ہے

غربت میں بیکسوں کو میسر نہیں کفن
لپٹی ہے لاش چادرِ گردِ ملال سے

پھیرے گا مردہ مرا سوئے خانۂ محبوب
لحد میں لاش سیدھی کی نہ قبلہ رو میری

شیفتہ

شیفتہ:۔ سید عبداللطیف گیاوی۔ نخمے نواب صاحب رئیس گیا کے دفتر میں منشی تھے۔ ۴ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ایک طوائف کے مکان پر شراب نوشی کے جلسہ میں شریک تھے کسی نے ساغرِ مے میں زہر ملا کر دے دیا۔ جس کے پیتے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گئے:۔

غلطاں ہے کون خاک پہ ہے کون جاں بلب
تم جھانک کر ذرا پسِ دیوار دیکھنا

اللہ ری ڈھٹائی کہ وہ بزمِ ناز میں
کہتے ہیں اس طرف نہ خبردار دیکھنا

صبحِ شبِ وصال وہ اس کا سدھارنا
حسرت سے میرا ہر در و دیوار دیکھنا

شیفتہ

شیفتہ:۔ داروغہ شیخ سرفراز علی خاں خلف انتظام علی خاں صاحب شاگرد اسیر لکھنوی ۱۸۶۷ء میں سلون کے ناظم تھے، سید حسین مرزا صاحب عشق اور جناب انیس لکھنوی کے ہم مشاعرہ تھے۔ ۱۲۹۴ھ کے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی۔ اس کا انتخاب یہ ہے:۔

ترشش کر بہت بڑھی اللہ کیا توقیر پتھر کی
جگہ کعبہ میں پائی دیکھنا اللہ رے پتھر کی

ہمارا شیشۂ دل ہو چکا ہے چور مدت سے	کہاں تک بارشیں اے آسماں پیہم پتھر کی
جگہ دل میں جو دیں اس بت کو ہم تقصیر کیا واعظ	خدا کے گھر میں کیا پہلے نہ تھی تصویر پتھر کی
در بت پر جبیں سائی کرے جب با خدا مجھ سا	چمک جائے نہ کیوں اے شیفتہ تقدیر پتھر کی

شیون

شیون:۔ جعفر علی متخلص بہ شیون۔ ابن شیخ باقر علی۔ کاکوری کے رہنے والے تھے۔ بقول جناب مولوی محمد علی حیدر صاحب علوی کاکوروی مصنف "تذکرہ مشاہیر کاکوری"۔ بہت قابل انشا پرداز تھے۔ حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندر قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ شعر و سخن میں مولوی محی الدین خان ذوقی سے تلمذ تھا۔ سنا جاتا ہے کہ نظم و نثر کلام بہت کچھ تھا، مگر بیشتر کلام ضائع ہو گیا۔ فارسی میں بھی نظم و نثر دونوں ہی لکھی ہیں۔ کلام اردو کا نمونہ یہ ہے:۔

کہیں ایسا نہ ہو وحشت زدہ کی نیند اچٹ جائے	مسیحا قبر پر رکھنا قدم آہستہ آہستہ
بس مدت ہی نیند آئی کہو بھولو نسی غنچوں سے	ہمنشیں تربت پہ از رہ کرم آہستہ آہستہ
کہو شیون نہ بگڑیں وہ ابھی تو ہجر تازہ ہے	یہ زور وحشت دل ہو گا کم آہستہ آہستہ
دل و دین و جوانی کھو کے دولت ہاتھ آئی ہے	محبت کو نہ چھوڑینگے بہت کچھ کھو کے پائی ہے

شیون

شیون:۔ عبدالرزاق صاحب باشندہ ناسک زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا طرز بیان سے نومشق معلوم ہوتے ہیں۔ زبان صاف ہے:۔

پھیری ہے سر محفل شمشیر نظر تو نے	کیوں قتل پر اے قاتل باندھی ہے کمر تو نے
کیوں کنج قفس میں تو گلشن سے ہمیں لایا	صیاد ہے کیا مقصد کترے ہیں جو پر تو نے

کیا کیا نہ ستایا ہے شیون کو شب فرقت
بیتابی دل تو نے اے درد جگر تو نے

شعلہ

شعلہ :- لالہ دوارکا داس۔ خلف لالہ نرائن داس مالک دکان دوا خانہ انگریزی واقعہ انارکلی لاہور۔ معزز فرقہ کھتری سے اور لاہور کے رہنے والے ہیں۔ پیدائش سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں اور اُردو سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ طبیعت شاعری سے مناسبت رکھتی ہے۔ خوش فکر ہیں۔ مگر کم کہتے ہیں۔ جو کچھ بھی کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ یہ نمونۂ کلام ہے:-

طبیعت میری یونہی گھبرائے گی کیا
مجھے موت سے پہلے موت آئیگی کیا

دیکھ کر کالی گھٹا آنکھوں میں آنسو آگئے
پھر کسی کی یاد نے اک درد پیدا کر دیا

اے دلِ ہنگامہ پرور اے سکوں ناآشنا
راز جو میں نے چھپایا تو نے افشا کر دیا

خدا کا نام سنا ہے مگر پتہ نہ ملا
کسی کو بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا

نہ ہے نصیب کہ بجلی نے شمع دکھلائی
بہت تلاش کے بعد آج آشیانہ نہ ملا

گیا میں کعبہ بھی اور بتکدے بھی ہو آیا
کہیں بھی تیرے سوا کوئی دوسرا نہ ملا

تلاشِ حق میں نہ دنیا کو چھوڑ اے زاہد
کہیں کا بھی نہ رہے گا اگر خدا نہ ملا

تمام عمر تلاشِ معاش میں گذری
ملی تو زیست مگر زیست کا مزا نہ ملا

بتوں کو چھوڑ کے کھوئے گئے کدھر شعلہ
خدا کی راہ میں اپنا بھی کچھ پتہ نہ ملا

جب سے کسی کے حسن کا دیوانہ ہو گیا
دل بے نیاز کعبہ و بُت خانہ ہو گیا

کوئی تمہارا حسن جہاں سوز دیکھکر
دنیائے ہست و بود سے بیگانہ ہوگیا

وارفتگیِ شعلۂ شوریدہ سر نہ پوچھ
دیوانہ تو نے کردیا دیوانہ ہوگیا

مری زباں سے مرے غم کا ماجرا سن لے
کہ سلب ہونے کو ہے طاقتِ بیاں صیاد

نہیں ہے تاب نظارہ قفس پہ سے بجلی
میں دیکھتا ہوں کہ جلتا ہے آشیاں صیاد

ہر بات کا جو تیری بگڑ کر جواب دے
اُس بدزباں سے شعلہ کبھی گفتگو نہ کر

تیرے بغیر کون ہے پرسانِ حالِ دل
موت اور زندگی ہے برابر ترے بغیر

ہاں تیرے دم سے رونقِ بزمِ شہود تھی
ہاں زندگی سے موت ہے بہتر ترے بغیر

ناآشنائے فکر تھے دیوانگانِ شوق
ہونا پڑا ہے رنج کا خوگر ترے بغیر

مجھ سکون ناآشنا کی بے بسی تو دیکھئے
زندگی میں زندگی کا آسرا ملتا نہیں

مجھے وہ جرأتِ رندانہ بخش اے ساقیِ کوثر
کہ اپنے دلکو وقفِ اشتیاقِ ہاؤ ہو کرلوں

لڑکپن کے دن بادشاہی کے دن ہیں
جوانی کے دن کم نگاہی کے دن ہیں

اجڑتا ہے کسی کا گھر تو کوئی شاد ہوتا ہے
بہت ہنستی ہے دنیا جب کوئی برباد ہوتا ہے

میرے صبر کی انتہا دیکھ لیجے
پھر اپنا بھی زورِ جفا دیکھ لیجے

لیکے دل مجھکو دولتِ غم دی
خوب نعم البدل دیا تو نے

یا تو نگاہِ لطف سے دیکھا نہ کیجئے
گر دیکھئے تو دیکھ کے پردا نہ کیجئے

ناکامِ آرزو کو ناکام رہنے دیجے
بدنام ہو چکا ہوں بدنام رہنے دیجے

سمجھائیے نہ مجھ کو انجامِ شوق بے حد
ہاں مجھ کو بے نیازِ انجام رہنے دیجے

مرنے کے بعد جاگے ہیں کسکے نصیب آج
یہ کسکے غم میں آج کوئی سوگوار ہے

دنیا کی کچھ نہ پوچھئے بس رہنے دیجئے
دنیا بکارِ خویش بہت ہوشیار ہے

کیا پوچھتے ہو شعلۂ شوریدہ سر کا حال
بے چارہ مضطرب ہے بہت بیقرار ہے

مجھے غمہائے ہست و بود نے برباد کر ڈالا
مری تقدیر کی برگشتہ سامانی نہیں جاتی

نجانے کون سے غم نے کیا یہ حال شعلہ کا
کہ بیچارے کی صورت بھی تو پہچانی نہیں جاتی

شوق

شوق:- جناب حافظ احمد علی خانصاحب رامپوری خلف اصغر علی خاں صاحب تحصیلدار شرفائے رامپور میں نامدار تھے۔ انکے بزرگ زمانہ قدیم سے ریاست کے نمک خوار معتمد اور دربار میں ذی رسوخ رہے جناب شوقؔ سخن سنج۔ علم دوست ادیب تھے نظم و نثر دل آویز لکھتے۔ سفرنامۂ ابن جبیر کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا عہد پیری میں بھی طبیعت جوان تھی شعر میں عاشقانہ معاملات کو خوب ادا کرتے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

یارب تو مجھے غیر کی تقدیر عطا کر
میں تجھ سے کسی چیز کا سائل نہیں آتا
تمہاری جدائی میں مرنا گوارا
عدو کی خوشامد ہو مشکل یہی ہے
مجھے زندہ رہنا ہے وعدہ پر آساں
مگر وعدہ پورا ہو مشکل یہی ہے

شوق

شوق:- نواب منجھو صاحب لکھنوی تلمیذ حضرت جلیس مرحوم اور حالات نہ معلوم ہو سکے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

اک نہ اک طوفان ناحق لے پری پیکر اٹھا
کوئی آ بیٹھا جو محفل میں تری رو کر اٹھا
آگیا وقت خمار آنے لگیں انگڑائیاں
ساقیا جلدی سے ہو لے اٹھ نہ میں ساغر اٹھا
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے شمع تھی روتی ضرور
بزم میں تیرے شہیدانہ کا ماتم ہوا
اک نہ اک ایذا رہی فرقت میں ہم کو تا سحر
درد دل کا بڑھ گیا درد جگر کچھ کم ہوا

شوق

شوق:- مشتاق احمد صاحب رئیس موضع مونڈا پانڈے ضلع بریلی۔ حضرت بشیر کے

تلامذہ سے ہیں۔ پرانی روش کے دلدادہ ہیں۔ تشبیہ و استعارہ کو پسند کرتے ہیں ؎

تری زلف معنبر کا اگر مضموں رقم ہوگا	سیاہی مشک ہوگی سنبل تر کا قلم ہوگا
تصور میں در دنداں کے جب اے شوق روتا ہوں	تو میری چشم دریا بار سے موتی بکھرتے ہیں

شوق

شوق:۔ جناب میرزا محمد آقا جان صاحب لکھنوی۔ تلمیذ جناب امیر زندہ دل سخنور۔ معنی پرست شاعر تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے: ؎

یہ کہتا قاصد اس پردہ نشیں سے	کہ آیا ہے کسی کا خط کہیں سے
تغافل نے اداؤں نے کسی کی	مجھے تو کھو دیا دنیا و دیں سے
ہزاروں نے کفن میں منہ چھپایا	جو دیکھا تم نے چشم شرمگیں سے

شوق:۔ مراد علی شاہ خلف منشی مہتاب شاہ۔ لاہور کے رہنے والے اور حضرت خورشید لکھنوی کے تلمیذ تھے۔ مضامین قدیم پہ خامہ فرسائی کرتے۔ نمونہ کلام یہ ہے: ؎

جلتا ہے سوز عشق سے یہ جسم مثل شمع	پروانوں کی طرح سے ہیں ارماں نثار دل
اے شوق پہلے مانگ کے دل ہم سے لیجئے	اب کہہ رہے ہیں ہم سے اٹھے گا نہ بار دل

شوق

شوق:۔ سید صالح حسین خلف مولوی نجم الحسن صاحب مرحوم۔ عمر تخمیناً ۴۴ سال ساکن محلہ مبارک لین۔ چھپرہ ضلع سارن۔ علی گڑھ کالج میں بی۔ اے تک تعلیم پائی ہے۔ جناب سید معین الدین احمد صاحب قیس رضوی اپنی تصنیف گلشن حیات میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ جناب شوق ایک سچے مسلمان۔ پابند صوم و صلوٰۃ اور ہمدرد قوم ہیں۔ زبان با اثر۔ خیالات بلند و عارفانہ ہیں۔ نشست الفاظ و سہولت نظم کا لحاظ رکھتے ہیں۔ حضرت شاد عظیم آبادی سے تلمذ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے: ؎

یوں تو فرقت کی ہر اک رات ہے آفات کی رات	پر غضب ڈھاتی ہے بے یار کی برسات کی رات

دیکھکر آنکھ تری بزم میں سب تھے مدہوش
کیا بھلی لگتی تھی وہ بزم خرابات کی رات

ڈالے نہ آنکھ حور بھی گر آرزو کرے
یہ شان ہے اسی ترے خانہ خراب کی

روئیں نہ دوست نزع کی حالت کو دیکھکر
کٹتی ہے میرے پاؤں سے بیڑی عذاب کی

نرگس فقط تجھی کو نہیں انتظار دید
دریا میں کتنی پھوٹی ہیں آنکھیں حباب کی

کیا جانئے گل کھلیں گے کیا کیا
آتے ہیں بھرے ہوئے چمن سے

شوخی پہ ہے شباب حیا پیش و پس میں ہے
بچپن نثار ہونے کو اگلے برس میں ہے

چہرہ اداس رہنے کا کچھ پوچھئے نہ حال
اپنی ہنسی خوشی کسی ظالم کے بس میں ہے

شوق

شوق:- چودھری مصطفٰے حسین صاحب۔ رئیس ضلع بارہ بنکی شاگرد حضرت ثاقب بدایونی۔ سنجیدہ طبع۔ زود فکر ہیں۔ بندشیں صاف ہوتی ہیں اور ترکیبیں سلجھی ہوئی۔ کلام یہ ہے:؂

ذرا سا کام بھی لے جذب کامل ہو نہیں سکتا
کسی صورت سوا ان کا دل مرا دل ہو نہیں سکتا

یہ کیا ہے آج وہ کیوں خود بخود شرمائے جاتے ہیں
یہ کیا بات آئینہ ان کے مقابل ہو نہیں سکتا

رہ رہ کے اب بھی ہوتی ہے لے پارہ گر خلش
باقی ہے جو زخم جگر خاک ہو گئے

اے شوق باغ دہر کی لوٹی نہ کچھ بہار
ہم آتے ہی شباب حسینوں پہ مر گئے

شوق

شوق:- شیخ عنایت اللہ صاحب سجان پور ضلع گورداسپور کے باشندے ہیں۔ ۲۵ر اپریل ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے ان کے والد منشی عزیز الدین صاحب محکمہ جنگلات میں ڈپٹی انجینیر کے عہدہ پر متعین رہ چکے ہیں ؀

شوق صاحب ابتدائے عمر سے شعر و سخن کے مفتون ہیں۔ اردو فارسی میں کافی استعداد ہے۔ انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم پائی ہے۔ پنجاب کی ادبی انجمنوں اور مشاعروں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ انھوں نے کیمبل پور میں انجمن خادمان ادب کی داغ بیل ڈالی تھی۔ راولپنڈی جیسے مقام پر مجلس مشاعرہ کا انعقاد و انھیں کی تائید و جہد سے

تھا۔ طبیعت مضمون آفرین ہے۔ مگر صحتِ زبان کا چنداں لحاظ نہیں۔ متروک الفاظ تلک، وغیرہ بے تکلف شعر میں لکھ جاتے ہیں۔ بندشیں۔ ترکیبیں دورِ موجودہ کے اخباری شعرا سے ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ مگر کہیں کہیں چشم سرگیں۔ تیکھی چتون۔ اُٹھتے جوبن کے مضامین عاشقانہ شاعری کی گذشتہ تاریخ کو یاد دلا دیتے ہیں۔ بایں ہمہ کلام کا حصّہ معنوی خوبیوں اور شوکت الفاظ سے لبریز ہے۔ مگر کہیں کہیں محتاجِ اصلاح ہے شعر زوردار کہتے ہیں۔ طبیعت شاعری کے مناسب اور موزوں پائی ہے مشق اور مشورہ سلیم سے کلام میں ترقی کی امید ہے۔ آپ زبان کے ہمدرد اور علم ادب کے شیدائی ہیں۔ مؤلفِ تذکرہ ہذا کے پاس جو چند اوراق بغرض اندراج تذکرہ روانہ کئے تھے۔ اُن کا انتخاب درج کیا جاتا ہے:۔

نہاں مری بیخودی میں گویا ہزار رنگ آفریدیاں ہیں
بنے ہیں جو نقش اُنکے در پر نیاز ہر وہ مری جبیں کا

ادھر بیمار غم کا آخری دو ہچکیاں لینا
اُدھر اُن کا سنورنا سیر کو تیار ہو جانا

چھپا کنا حسن کا اور قلب مضطر کا تڑپ اٹھنا
کسی کا جھانک لینا اور پس دیوار ہو جانا

کارواں منزل پہ پہنچا اور یہاں
پاؤں پھیلائے ہوئے سویا کیا

دل کو پایا کار فرمائے جہان حسن و عشق
اس سے بڑھکر اور کوئی رہبرِ کامل نہ تھا

رہ گیا ایک داغ سا بجھ گئی شمعِ انبساط
گردشِ چرخِ پیر نے منظرِ غم دکھا دیا

وہ مسکرا کے دل پہ گراتے ہیں بجلیاں
ارمان پوچھتے ہیں دلِ بے قرار کا

کہتے ہیں یاد کرکے مرے دل کے داغ وہ
دیکھی تھی ہم نے سیر چراغاں مگر کہیں

یہ تو ممکن ہی نہیں وہ ہمیں آزاد کریں
لاکھ دل کھول کے ہم نالہ و فریاد کریں

تمنا ہو اگر نظارہ سیر چراغاں کی
ہزار در داغ روشن ہیں مرا دل دیکھتے جاؤ

کیا پوچھتے ہیں لوگ مری زندگی کا راز
وہ گلستاں ہوں جو کبھی پھولا پھلا نہ ہو

جل جائے اک شرارۂ برقِ [illegible] جو
دل ہو بشر کا اور وہ درد آشنا نہ ہو

وہ رُوٹھے رہے ہیں مناتا رہا	اسی کشمکش میں سحر ہو گئی
بھلا کیا ہاتھ آیا ہے صبا کے	چراغ تربت بیکس بجھا کے
نہ پوچھو ماجرائے شام فرقت	پھرا اکثر مرا دم لب پہ آکے
ذرا دیکھو قدار شمع محفل	کہ کیسی دم بخود ہے سر کٹا کے
سخت جاں ہوں میں دم ذبح ہی تشویش مجھے	ٹکڑے ٹکڑے نہ کہیں خنجر قاتل ہو جائے
نقشے قدم قدم پہ قیامت کے دیکھ لیں	اُن کا خرام ناز اگر فتنہ جو رہے

شوق

شوق:۔ سید احمد حسین کاکوری۔ ۱۹۰۰ء میں بمقام کلکتہ قیام پذیر تھے۔ شعر میں معاملہ خوب کہتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

دل سوز درد مند کوئی ہم نشیں نہیں	دنیا میں رسم مہر و وفا اب کہیں نہیں
غیروں سے ملکے سہتے ہو رسوائیاں مگر	اس پر بھی اعتبار کہ قابل ہمیں نہیں
گلگونۂ شفق بھی ان آنکھوں کا فیض ہے	اشکوں سے لالہ زار فقط آستیں نہیں
جب سے چھوا ہے غم نے کچھ بھی ساز و برگ عیش	درد دل کی لذتیں راحت کا ساماں ہو گئیں

شوق

شوق:۔ ڈاکٹر مہادیو پرشاد صاحب لکھنوی ولد منشی بھیروں پرشاد صاحب مرحوم کایستھ سری واستو۔ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بڑے بھائی جناب بالا پرشاد صاحب مرحوم لکھنؤ کی تجارت پیشہ جماعت میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے جناب شوق نے ۱۹۰۵ء سے تجارت کی تربیت حاصل کر کے ۱۹۰۷ء سے ایک دوکان امین آباد میں کھولی۔ جو اب تک قائم ہے۔ ۱۹۱۵ء سے ہومیو پیتھک ڈاکٹری شروع کی جس میں آپ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ لکھنؤ کے چند بہترین اطبا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے مطب سے غریب امیر سب کو مفت دوا تقسیم ہوتی ہے ۱۹۱۰ء سے شاعری کا شوق ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جناب ریاض سے تلمذ اختیار کیا۔ خود اپنے مکان پر بھی نہایت کامیاب مشاعرے کئے کئی سال سے طبع

مشاغل میں اسقدر مصروف رہتے ہیں۔ کہ شاعری بالکل ترک کردی ہے۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہیں:۔

اب ہو کہ نہ ہو حشر میں دیدار کسی کا
ہے ناز کہ میں بھی ہوں گنہگار کسی کا

کچھ دیر سے مطلب ہے نہ کعبہ سے غرض ہے
منہ دیکھتے ہیں کافر و دیندار کسی کا

یہ بھی نگہ شوق کی تقدیر کا لکھا
بند آج ہوا روزنِ دیوار کسی کا

شوق رسوا ہو نہ کوئی اس نظر سے دیکھنا
بزم میں آنسو نہ نکلیں چشم تر سے دیکھنا

دولتِ دیدار سنتا ہوں لٹے گی حشر میں
دیکھنے والو انھیں میری نظر سے دیکھنا

شکر ہے اتنا تو شب کو پوچھتے تھے غیر سے
یہ صدا نالوں کی آتی ہے کدھر سے دیکھنا

اپنی زلفوں کی تو سن لیجئے سنئے نہ مری
کان میں کہتی ہیں کچھ حال پریشاں میرا

قبر پر غیر کی سنتا ہوں جلاؤ گے چراغ
کام چل جائے تو لے لو دلِ سوزاں میرا

چھالے تلوؤں میں خلش دل میں زباں پر کانٹے
شوق منہ دیکھتے ہیں خار بیاباں میرا

نسیم شمع لحد کو ذرا بچائے ہوئے
کہ مرمٹوں کا کوئی اور سوگوار نہیں

پہنچ کے تیری گلی میں نہ یہ بہک جائیں
جناب خضر کا بھی ہم کو اعتبار نہیں

بہار آئی ہے تم نے ضرور پی ہو گی
تمہاری توبہ کا اے شوق اعتبار نہیں

بس مردن بھی سب کہتے ہیں کچھ ہے سانس بسمل ہیں
یہ کیا اعجاز ہے یارب ہو لئے کوئے قاتل میں

بتوں کا نام تو وردِ زباں ہر وقت رہتا ہے
خدا کو یاد کرنا ہے مگر انسان مشکل میں

یہ سچ ہے شوق کہنے کو تو اس دنیا میں لاکھوں ہیں
وہ انسان ہے جو کام آئے کسی بیکس کی مشکل میں

نہ جانے اصل قاتل کون ہے لیکن زمانے میں
یہ جتنے مرنے والے ہیں تمہارا نام لیتے ہیں

گئے پہلو سے مدت ہو گئی لیکن یہ عالم ہے
جو دل کا نام آتا ہے کلیجہ تھام لیتے ہیں

مر کے کیا قبر میں راحت ہو گی
آنکھ کھلتے ہی قیامت ہو گی

تم دمِ نزع ذرا ہٹ جانا
نگہِ یاس قیامت ہو گی

یہی کافی ہے مرے جاتے ہیں　　اور کیا شرح محبت ہوگی

دم نکلنے دو مرا پھر جانا　　اک ذرا دیر کی زحمت ہوگی

جا کے کعبہ سے پھر آئے اے شوق　　بتکدے میں کوئی صورت ہوگی

کہتی ہے اب روش یہی لیل و نہار کی　　ناساز ہے ہوا چمن روزگار کی

دامن اٹھا کے چلنے سے بدنامیاں ہوئیں　　ہستی ہی ورنہ کیا تھی چراغ مزار کی

بیکسی دیکھ کوئی گھر نہ ملے گا ایسا　　قدم آگے نہ بڑھانا مرے ویرانے سے

اے فلک صبح شب وصل ہی وہ جاتے ہیں　　فرش مہتاب اُٹھا لے مرے کاشانے سے

کیوں مجھے کوئی کہے عقل سے بیگانہ ہے　　تم اگر ناز سے کہہ دو مرا دیوانہ ہے

رات دن اب ہیں در یار کے سجدے اے شوق　　یہی کعبہ ہے ہمارا یہی بت خانہ ہے

کٹی ہیں رو رو کے غم کی راتیں تڑپ تڑپ کر سحر ہوئی ہے　　نہ پوچھے حال مجھ حزیں کا یہ عمر یوں ہی بسر ہوئی ہے

اٹھے تھے بستر سے شادماں ہم پڑا یہ دھوکا ہوا شب غم　　چمک تھی زخم جگر کی ہمدم اسی کو سمجھے سحر ہوئی ہے

کہاں وہ شب بھر میں ختم ہونا کہاں وہ جل جل کے عمر کھونا　　ترے جگر سوختہ کے آگے خفیف شمع سحر ہوئی ہے

کچھ آنکھ نرگس کی بھی ہے پرنم ٹپک رہی ہے جو اشک شبنم　　چمن میں اس کا ہے آج ماتم گلوں میں جس کی بسر ہوئی ہے

شوق

شوق: منشی بینا کنور پرشاد صاحب نگم [illegible] تلمیذ حضرت آغا شاعر دہلوی۔ آپ کے کلام کا مجموعہ (جس میں علاوہ غزلوں کے مختلف مضامین پر نظمیں بھی ہیں)۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دو ایک برس بعد انتقال کیا۔ محاورات اور سلاست زبان آپ کے کلام کے جوہر ہیں۔ آپ کی نظمیں بیشتر حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہیں یا اخلاقی مضامین سے متعلق ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

پیام ایک آیا ہوا ہے کسی کا　　سنو تم سے کچھ مدعا ہے کسی کا

عبث ہم پہ محفل میں [illegible] ہیں　　نظارا بھلا ہم نے کیا ہے کسی کا

خدا کے لئے روٹھنا چھوڑئے اب　　کہ آنکھوں میں دم آ چلا ہے کسی کا

دیکھ لے آکر کوئی ذوقِ تمنّا کی بہار
دم رُک چلا ہے ضعف سے مجھ خستہ حال کا
جوشِ وحشت نے ہمیں جان سے بیزار کیا
آنا تو درکنار خطِ شوق بھی نہیں
کیوں چڑھی تیوری کہو تو کیا ہوا
آج تو ساقی اُلٹ دے خم کے خم
چارہ گر پھر ٹیس سے رہنے لگی
رمضان ختم ہوا عید کی صورت دیکھی
ہر بات ایک چال ہے ہر چال اک فریب
کدھر ہے ساقی مہوش کہ اب تو جاں چلی
پھر فلک ہی کو کیا غرض ہم سے
سحر کرتے ہیں ہم فرقت کی راتیں
وعدے پہ ستمگر کے یقین آ نہیں سکتا
اے شوق ہوا حضرت شاعر سے تلمذ
ناکامیوں نے خوب نکالے ہیں حوصلے
ہم کو معلوم ہوا دل میں ہے تصویر عدو
دم میں دم آئے ذرا چین ملے دل ٹھہرے
تم نہ آؤ گے نہ آؤ گے غلط کہتے ہو
پہنچا دیا ہے مجھ کو عزیزوں نے گور تک
انتہا ہے یاس تھی میری مرے خط کا جواب
دیکھنا محفل میں کوئی اس پری کی شوخیاں

آنکھ سے جو خون کا آنسو گرا دل ہو گیا
جاؤ بھی اب یہ وقت نہیں دیکھ بھال کا
ابھی دامن نہ سیا تھا کہ گریبان نکلا
قاصد گیا تو اسکو بھی رستہ بتا دیا
ابروؤں پر بل ہے کیوں آیا ہوا
کیا ہوا کیا ابر سے چھایا ہوا
پھر کوئی زخم کہن تازہ ہوا
لے چلی جانب میخانہ تمنّائے شراب
جو دوست ہوں رقیب کے ہیں میری تاک میں
مہینوں ہو گئے دیکھے شراب کی صورت
جب تمہیں کو نہیں ہمارا درد
تری تصویر سینے سے لگا کر
تحریر کا رنگ اور ہے قاصد کا بیاں اور
اب رنگِ زباں اور ہے انداز بیاں اور
حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر
نیچی نظریں نہ کریں سر نہ جھکائیں کیونکر
قصۂ دردِ شبِ ہجر سنائیں کیونکر
میں نہ مانوں گا نہ مانوں گا بہانہ ہے مگر
صد شکر آگیا ہے مسافر وطن کے پاس
رو دیا بس دیکھتے ہی نامہ بر میری طرف
جام دشمن کو دیا اور ہے نظر میری طرف

فلک کے ستم دیکھے بھالے ہوئے ہیں
ترے جور سب سے نرالے ہوئے ہیں

کسی کی بزم میں رہ کر یہ رُتبہ شوقؔ نے پایا
کہ اب دشمن تو دشمن دوست بھی سب رشک کرتے ہیں

وہیں ہم کو ہوتی ہے مٹنے کی حسرت
جہاں نیز انقش قدم دیکھتے ہیں

کس کی اس زلف تک رسائی ہے
دل بیتاب شامت آئی ہے

کس ہوا میں ہے کہ ملتا ہی نہیں اس کا دماغ
کس کے کوچہ سے نسیم سحری آئی ہے

جیتے جی دل نہ لگائینگے کسی سے اے شوقؔ
اب تو ہم نے بھی محبت کی قسم کھائی ہے

شوق

شوق:۔ محمد عبد اللطیف مالک اخبار شوخ مونگیر شاگرد جلال لکھنوی زبان صاف ہے۔ طرز ادا بھی بُری نہیں۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

وہی شکل پھرتی ہے آنکھوں میں ہر دم
غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا

دل اپنا سوئے قبلہ کرنا نہیں رُخ
ستم تھا صنم تیرا در دیکھ لینا

توقع نہ وعدہ۔ مگر اپنی خو ہے
تری راہ شام و سحر دیکھ لینا

یہ کیسی کھٹک ہو گئی دل میں پیدا
پھر ادھر جانے والے ادھر دیکھ لینا

انھیں پر بس اے شوقؔ بجلی گریگی
ان آہوں کا اپنی اثر دیکھ لینا

شوق

شوق:۔ محمد عبد العلی سندیلوی۔ خلف مولوی علی حسن۔ شوقؔ کا سن اسوقت چوالیس سال کے قریب ہوگا۔ شرفا کے خاندان سے ہیں۔ ان کے نانا منشی عاشق علی اٹاوہ میں کلکٹری کے سررشتہ دار تھے۔ وہاں ان کی ملک کے کچھ مکان تھے جن کے مالک اب شوقؔ صاحب ہیں۔ پہلے سندیلہ میں بنک گھر پھر میونسپل کمیٹی میں ملازمت کا سلسلہ رہا۔ وہاں سے مستعفی ہوکر اب ایک وقف کے مدرسے میں جو سندیلہ ہی میں ہے۔ معلم اعلےٰ ہیں۔ تعلیم انٹرنس تک ہوئی۔ طبیعت میں مزاح اور دل لگی کا مادّہ از حد ہے۔ جو کبھی ستم ظریفی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ابھی چند برس گزرے کیا کیا۔ کہ پندرہ غزلیں تصنیف فرماکر چالیس کے قریب اساتذہ

عصر اور ادیبوں کے پاس بغرض اصلاح بھیجیں۔ صرف چند اصحاب نے کم فرصتی کی وجہ سے انکار کیا۔ ورنہ سب اس اصلاحی جال میں پھنس گئے۔ یہ غزلیں اور ان پر اصلاحیں شوق صاحب نے ۱۹۲۶ء میں کتاب کی شکل میں شائع کر دی ہیں۔ اور غضب یہ کیا ہے کہ اس سلسلے میں حضرات اساتذہ کے جو نجی خطوط آئے تھے وہ بھی شائع کر دئے ہیں۔ شوق صاحب نے تو ان سادہ دل اُستادوں کو بنایا۔ لیکن نقادانِ سخن کو طبع آزمائی کا ایک مضمون ہاتھ آگیا۔ کتاب چھپنے پر مہینوں تک ان اصلاحوں پر نقد و نظر ہوتا رہا۔ اس کتاب کا نام اصلاح سخن رکھا ہے۔ شوق صاحب کی طبیعت میں شعریت ضرور ہے۔ بہت کم کہتے ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی کہتے ہیں۔ اچھا ہوتا ہے۔ کلام جاندار ہے۔ ملاحظہ ہو:-

خوبرویوں سے کہیں کہہ کے محبت اے شوق
اب اپنا دل تنگ ہے زندان تمنا

تیری نگہ لطف تھی تمہید محبت
اک نگاہ یاس سے قاتل کے تیور بجھ گئے

آہ ظالم ہو چکی اک منتظر کی آنکھ بند
سا تھ دینا جا ذرا اے ضبط تھوڑی دیر اور

زباں سے اُف نہ کرنا شمع ساں جل جل کے جل جانا
حیات و موت بجز امید و بیم کیا ہے

یہی دو حرف آہ سرد کے شرح غم دل ہیں
مآل کار اپنی ہستئ موہوم کا یہ ہے

زباں پر ذکر۔ دل میں یاد۔ اور سر میں ترا سودا
نہ پوچھو کوئے محبت کی واردات کا حال

نہ خدا کے لئے محصورِ بلا ہو جانا
اللہ رے یہ جوشش فراوان تمنا

میری نگہ شوق ہے عنوانِ تمنا
اک چھینٹے سے لہو کے کند خنجر ہو گیا

اب ترا آنا نہ آنا سب برابر ہو گیا
دم اِدھر نکلا کہ میدان وفا سر ہو گیا

بالآخر رفتہ رفتہ حد ہستی سے گزر جانا
نہ جینا سہل ہے جتنا نہ ہے آسان مر جانا

طویل اک داستاں ہے جس کو تم نے مختصر جانا
حیات چند روزہ۔ وہ بھی غفلت میں گنوا جانا

نظر کو جستجو تیری جہاں جانا جدھر جانا
کہ ایک دشمن جنس وفا نے لوٹ لیا

کیوں اُلجھتے ہو سنورنے کی نہیں زلف دراز　　کہیں یہ بھی مری بگڑی ہوئی تقدیر نہ ہو
عشق کی ہے یہ کرامت مجھے ساکت پاکر　　ان کو دھوکا ہے کہ یہ بھی مری تصویر نہ ہو

پس فنا بھی مری بے قراریاں نہ گئیں　　تڑپ مٹے یہ بھی ہر ذرۂ غبار میں ہے
جدھر نگاہ پھری سامنے وہ شکل تھی شوق　　یہ رنگ آنکھ کا اب جوش انتظار میں ہے

جو آتا ہے تو آکر دیکھ جا وقت آخر ہے　　ہُوا جاتا ہے دم بھر میں کوئی تصویر عبرت کی

یہ دل کے بہلنے کی تدبیر نظر آئی　　بند آنکھ جو کی تیری تصویر نظر آئی
یہ عالم یہ محویت یہ جذب تصور ہے　　ہر چیز میں تیری ہی تصویر نظر آئی

بالآخر بے زبانی پر دہاں زخم بسمل کی　　زبان تیغ قاتل سے صدائے آفریں نکلی
نگاہ شوق کی گرمی سے اڑ جاتا ہو رنگ اس کا　　تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نازنیں نکلی

آئینہ خیال کی صورت نمائیاں　　تصویر کھینچتی ہیں شباب بہار کی
کس کو دماغ سیر چمن لے صبا یہاں　　سر میں بھری ہوئی ہے ہوا کوئے یار کی

ہستی کا کچھ آسرا نہیں ہے　　یہ نقش تو دیر پا نہیں ہے
کشتی کا خدا تو ہے نگہبان　　کیا ڈر ہے جو ناخدا نہیں ہے
بیجا ہے ہزاروں کا شکوہ　　یہ کون کہے بجا نہیں ہے

تو رہے دیدہ و دل کا اثر مشق خیال　　بند آنکھوں سے ہمیشہ تری صورت دیکھی

ایسی کیا خوشخبری لائے ہوا کے جھونکے　　دل مسرت سے اچھلنے لگا دیوانو نکلے

لخت لخت دل صد پارہ کی اُف ری نعشیں　　اک اک ٹکڑے میں سو ٹکڑے ہیں پیکانوں کے

غفلت سے آنکھ کھول کے دیکھا تو یہ کھلا　　ساری خرابیوں کی بنا ما و من میں تھی

شوقی

شوقی:- مولوی ستار حسن صاحب اوورسیر نہر سرہند۔ تلمیذ مولوی احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی کلام میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ کلام یہ ہے:-

بہادیں ہم تو پانی کی طرح خوں اپنے ارماں کا　　مٹے بھی یا خدا دھبا کہیں قاتل کے داماں کا

بچکے تیغ یاس سے حسرت نے لی دل میں پناہ　　المدد شوق تپاں ۔ گھر میں خدا کی خون نہو

رُباعی

عشاق کی تم شرر فشانی دیکھو
دلدادوں کی اپنے تفتہ جانی دیکھو
خود شمع کو آگ لگ نہ جائے کیونکر
پروانہ کا یہ سوز نہانی دیکھو

شوکت

شوکت :- منشی محمد یعقوب ۔ ساکن بھتری ضلع غازیپور شاگرد جلال لکھنوی مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کا لطف بھی کلام میں موجود ہے ۔ تشبیہ اور استعارہ کا استعمال کم ہے ۔ رعایت لفظی کی پابندی سے بعض اشعار میں آمد کا مزا نہیں آتا ۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

بعد مرگ اس رشک گل نے یوں چڑھائے آ کے پھول
دست رنگیں میں لئے ہیں وہ لبالب ساغر
کہتی ہے دل سے آنکھ مجھے جانتا نہیں
آوارگی سے اپنی ہوئی عشق کی نمود
لائے وہ ولجو نکے ہیں جو داغ داغ ہوں
اُن کی نزاکتوں کا بھلا پوچھنا ہے کیا
شوکت وہ تیرہ بخت ہوں روز الست سے
لگاوٹوں کو بھلا اُن کی کون پہچانے
تحفظ ابرو کا چاہیئے ہر ایک حالت میں

کھل کھلا کر ہنس پڑا عاشق کا مدفن دیکھکر
دیکھئے کس کو مئے ہوش رُبا دیتے ہیں
گھر میں لگاؤں آگ وہ گھر کا چراغ ہوں
میں بے نشانیوں سے خود اپنا سراغ ہوں
مدفن وہ عاشقوں کے ہیں جو بے چراغ ہوں
غنچوں کے مسکرانے سے جو بد دماغ ہوں
مرقد پہ میرے آپ سے سب گل چراغ ہوں
لگاہ ناز میں ہے لطف بھی غضب بھی ہے
جہاں میں قدر گوہر کی فقط ہوتی ہے پانی سے

شوکت

شوکت :- جناب نواب یار محمد خاں خلف اصغر نواب فوجدار محمد خاں مرحوم ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے ۔ نواب شاہجہان بیگم مرحومہ رئیسہ بھوپال سے قرابت قریبہ ہے ۔ استعداد علمی معقول تھی ۔ اور فن آبائی یعنی سپہگری میں دستگاہ کامل پہلے آپ

نے مرزا غالب کو اپنا کلام دکھلایا۔ پھر مولانا محمد عباس رفعت کو استاد بنایا۔ تصانیف ہیں دیوان شوکت۔ تذکرہ فرح بخش۔ چار باغ شوکت۔ گلدستۂ نرگس۔ ہفت خوان شوکت قرابادین شوکت۔ بازنامہ۔ فیل نامہ۔ مراسلات شوکت۔ انشائے نور چشم۔ شہنشاہ نامہ وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ بہت سے علوم و فنون سے دلبستگی رکھتے تھے۔ چند اشعار حاضر ہیں:

یوں ہر اک کوچۂ سفاک سے باہر نکلا
کوئی بسمل کوئی زخمی کوئی مضطر نکلا

آ گئی موت مگر ہم کو یہ حسرت ہی رہی
دم نہ بیمار کا عیسیٰ کے قدم پر نکلا

ہست اور نیست میں ہے سب کو کلام
عقل حیراں دہان تنگ میں ہے

وہ بھی کچھ کم نہیں ہے رستم سے
نشۂ زر کی جو ترنگ میں ہے

شوکت:۔ مولوی محمد رفیق انصاری۔ زمانہ حاضر کے ترقی یافتہ شاعر ہیں ملازمت کے سلسلہ میں چین کے دارالسلطنت پیکن ہو آئے۔ عرصہ ہوا رسالہ مخزن میں اپنا کلام بھیجتے تھے۔ ہجر و وصل کے راگ میں مناظر فطرت اور کرشمہ قدرت کا بیان کرتے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:

بلا کی غمزۂ ستم کی گھاتیں لٹا اس کے آنکھیں بنا کے باتیں
وہ باتوں باتوں میں لیکے دل دکھا دکھا کر بتا بتا کر

ہماری بھی کر تو آزمائش ذرا تو رخ سے نقاب اٹھا کر
کلیم ہونگے وہ جنکو بے ہوش کر دیا اک جھلک دکھا کر

نہ کیجے ماہ پریاں جہاں سے کیوں دو چار آنکھیں
خدا نے زندگی دیکھنے کو دی ہیں قدرت کی بہار آنکھیں

مار والے رہ عشق دوست لطف زندگی تب ہے
کہ ہو دل مضطرب آٹھوں پہر اور اشکبار آنکھیں

یہ منزل جائینگی رستہ دیکھتے ہی دیکھتے اک دن
کریں گی کب تلک آخر تمہارا انتظار آنکھیں

تماشائے دو عالم کو جو یہ نیرنگیاں بخشیں
تو دو چار اور بھی ہوتیں الٰہی پروردگار آنکھیں

نہ بولے پھر بھی سب کچھ کہہ گئیں آنکھوں ہی آنکھوں میں
ہیں شوکت بے زبان دل وہ ان کی پڑھ گیا آنکھیں

شوکت:۔ سید کاظم علی صاحب بلگرامی۔ آپ سادات بلگرام سے ہیں۔ ۱۲۱۰

شوکت

شوکت

رمضان المبارک ۱۲۹۳ھ روز سہ شنبہ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے مولانا غلام علی صاحب آزاد مؤلف تذکرہ خزانۂ عامرہ آپ کے اجداد میں ہیں۔ نازک خیال شاعر ہیں۔ طبیعت نہایت رسا ہے۔ پہلے حضرت امیر مینائی مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ان کے بعد حضرت جلیل سے استفادۂ سخن حاصل کرتے رہے۔ انتخاب کلام یہ ہے۔

تمہارا نام جو سن پایا ہے شوالوں میں	ملے ہیں کعبہ نشیں جا کے دیروالوں میں
ادھر قفس تو ادھر باغ پھنک گیا سارا	بلا کی آگ بھری ہے ہمارے نالوں میں
خیال مرگ کو سمجھے تھے خواب مر کے کھلا	کہ تھا وہ خواب گئی عمر جن خیالوں میں
کہیں نکلتے ہیں بیدرد بے سبب آنسو	ضرور بھٹیں لگی میرے دل کے چھالوں میں
عجیب رنگ ہے شمع لحد کے پھولوں کا	نہ ہنسنے والوں میں ہیں یہ نہ رونے والوں میں
زباں حال سے سب اپنا حال کہتے ہیں	نئی طرح کی خموشی ہے مرنے والوں میں

شوکت :- آل احمد صاحب خلف سید اصغر علی مرحوم متوطن موضع روہائی ضلع گیا۔ مولوی حکیم اولاد علی کاہش جونپوری شاگرد شیخ مصحفی سے تحصیل علم کی۔ بعد تحصیل فارسی و عربی۔ مختاری کا امتحان دے کر کامیاب ہوئے۔ ایک عرصہ تک مختاری کرتے رہے۔ آخر عمر میں ریاست بادشاہ نواب صاحب رئیس عظیم آباد کے مختار عام اور مینجر ہو گئے۔ ۱۳۱۷ھ میں بعمر ۶۵ سال رہگرائے عالم آخرت ہوئے ایک دیوان اردو اُن سے یادگار ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:؎

شوکت

یہ سوز ہے نالہ و فغاں کا کہ غل ہے عالم میں الاماں کا
نکل رہا ہے دم انس و جاں کا زمیں کو دھڑکا ہے آسماں کا

غضب ہیں آنکھیں بلا نگاہیں کہ کھنچ رہی ہیں ہزاروں آہیں
مرے وہ بے موت جس کو چاہیں بُرا ہے احوال اک جہاں کا

وثوق وعدے پہ ان کے کیا ہو کبھی جو وعدہ وفا ہُوا ہو

توانگی باتوں کی دل میں جا ہو نہیں ہے پاس انکو کچھ زباں کا
نہ آئینگے وہ بُلا کے دیکھو جو دیکھنا ہو تو جا کے دیکھو
مناؤ جا کے منا کے دیکھو خیال کیسا یہاں وہاں کا
کبھی فغاں ہے کبھی بکا ہے یہ رات دن کا جو مشغلہ ہے
بُرا ہے شوکت بہت بُرا ہے خلل ہی اسمیں تمہاری جاں کا

سمجھتا ہے کہیں دیوانہ کچھ بھی
یہ دیوانے ہیں جو سمجھا رہے ہیں

گھبرا گیا ہوں زندگیِ مستعار سے
اے مرگ مجھکو ایک گھڑی ایکسال ہے

آنکھوں میں پھر رہی ہے شب وروز شکل یار
پھر جائے اور سمت نظر کیا مجال ہے

بیکار حسرتیں ہیں تمنائیں ہیں فضول
شوکت خیال وصل خیال محال ہے

شوکت :- خان بہادر قاضی محمد شوکت حسین خاں خلف الصدق قاضی محمد تجمل حسین خاں صاحب رؤسائے مراد آباد میں معزز ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے وقت سے مراد آباد میں رہتے چلے آئے ہیں۔ عہدۂ قضا بھی اسی زمانہ میں عطا ہوا تھا۔ موجودہ حکام بھی آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں ۱۸۸۶ء کی پیدائش ہے۔ ابتدائے عمر سے شاعری کا شوق ہے۔ حضرت داغ کے قدیم شاگرد ہیں۔ آغاز شباب میں شاہد سخن کے دلدادہ تھے۔ ان دنوں میں حضرت داغ کا قیام رامپور میں تھا۔ وہ رامپور سے آتے اور جاتے مراد آباد میں شوکت باغ میں قیام کرتے۔ شعر و سخن کا شغل جاری ہوتا۔ وہیں شاگردوں کے کلام میں اصلاح دیجاتی۔ قاضی صاحب نے استاد کے فیض صحبت سے عرصہ تک استفادہ حاصل کیا ہے۔ ایک زمانہ میں آپ کے دولت کدہ پر ماہانہ مشاعرہ ہوتا گلدستۂ شوکت سخن جاری تھا۔ جس میں چیدہ کلام کی اشاعت کا انتظام تھا جب حضرت داغ نے رامپور کو خیرباد کہا تو مراد آباد کی بزم سخن بھی درہم برہم ہوگئی

قاضی صاحب کا شوق بھی کم ہوگیا۔ بلدیہ کی ممبری۔ آنریری مجسٹریٹی کے خدمات اور علاقہ کی نگرانی میں مصروف رہنے سے ادھر توجہ نہ ہوئی۔ تاہم جس زمانہ میں آپ نے کہا جو کچھ کہا خوب کہا۔ ۱۹۲۶ء میں ڈیرہ دون میں ایک بزم مشاعرہ منعقد کی جس میں اکثر اساتذہ شریک تھے۔ آپ کے کلام میں اپنے استاد کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ روزمرہ صاف اور تشبیہات اور استعارات دلکش استعمال کرتے ہیں۔ وسیع مضامین کو مختصر الفاظ میں خوب ادا کرتے ہیں محاسن و معائب شعر سے باخبر ہیں۔ اُستاد کا رنگ اکثر اشعار میں جھلکتا ہے۔ اگر آپ نے ترک سخن نہ کیا ہوتا۔ تو اب تک کئی دیوان مرتب ہو چکے ہوتے۔ کلیاتِ شوکت معروف بہ شوکتِ سخن ۱۹۱۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مؤلف تذکرہ ہذا کے مخلص دوستوں میں تھے۔ دو سال کے قریب ہوئے کہ انتقال کیا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو:۔

وہ ہر بات پر رُوٹھ جانا کسی کا
وہ رُوٹھے ہوئے کو منانا کسی کا

وہ ہنگامِ محشر مری داد خواہی
وہ کچھ سوچ کر مسکرانا کسی کا

دل زار میں چٹکیاں لے رہا ہے
تسلّی مجھے دے کے جانا کسی کا

بچینگے بھلا آپ شوکت سے کب تک
لگا لے گا وہ راہ پر دیکھ لینا

یہ نہ کہئے ترے مرنے سے مرا کیا ہوگا
آپ کے سر کی قسم آپ کا چرچا ہوگا

نہ رکھا اس لگاوٹ نے کہیں کا
عداوت تھی کسی کا پیار کیا تھا

کیا حقیقت دولتِ دنیا کی اس کے روبرو
مل گیا سب کچھ اگر معشوق اچھا مل گیا

کیا کہوں خاک کہوں طول ہی افسانۂ غم
عرصۂ حشر فقط چار پہر کا ٹھیرا

کیا کہا اس جستجو سے تم کو کیا مل جائیگا
آپ کیا ہیں ڈھونڈھنے سے تو خدا ملجائیگا

محبت اگر ہے تو رنجش بھی ہوگی
کبھی طے یہ جھگڑا ہوا ہے نہ ہوگا

مریضِ محبت نہ سنبھلا نہ سنبھلے
وہ کمبخت اچھا ہوا ہے نہ ہوگا

دل نہ بہلا کسی سے اور کہیں
آخرش پھر اسی کو پیار کیا

وہ بھی یارب نہ چین سے بیٹھے
جس نے یوں مجھ کو بے قرار کیا

خون مرا معجزۂ عشق سے
تیری ہتھیلی میں حنا ہوگیا

جاتے جاتے جس طرح راحت گئی
آتے آتے صبر بھی آجائے گا

ہاتھ سے شوکت کو اے ظالم نہ کھو
آدمی ایسا نہ پھر ہاتھ نہ آئیگا

جب ان سے مانگتا ہوں دل یہ کہکر ٹال دیتے ہیں
ادھر دیکھو ادھر دیکھو یہاں ہوگا وہاں ہوگا

اے فسوں ساز ستمگار بھری محفل میں
اُف ترا آنکھوں ہی آنکھوں میں اُڑانا دل کا

جب مچل کر مرے پہلو سے نکل جاتا ہے
کوچۂ یار میں ملتا ہے ٹھکانا دل کا

صدقے ایسے بھولے پن کے اس لڑکپن پر نثار
سُن کے میرا قصۂ غم کہتے ہیں پھر کیا ہوا

جب وہ دشمن تھی مرے ساری خدائی تھی دوست
اب جو وہ دوست ہیں دشمن ہے زمانہ میرا

نہیں معلوم یہ شوخی ہے کہ نادانی ہے
وہ ابھی کھیل سمجھتے ہیں ستانا میرا

وہ حیا سے کچھ نہ بولے دم صبح وقتِ رخصت
مگر آنکھ اُٹھا اُٹھا کر مجھے بار بار دیکھا

کبھی یہ خوش ہوں کہ اچھا ہوا جو کچھ نہ کہا
کبھی یہ رنج ہے کیوں حالِ دل بیاں نہ ہوا

جگر میں درد رہا دل میں اضطراب رہا
ترے فراق کا صدمہ کہاں کہاں نہ ہوا

کھا کھا کے ستمگر تری تلوار کا چرکا
ہنسنا کوئی دیکھے دہنِ زخمِ جگر کا

دیکھ لو دل کی خرابی میں ہے نقصاں کس کا
سوچ لو گھر یہ بگڑتا ہے مری جاں کس کا

آہ وزاری سے جتایا تو جتایا کیا عشق
لطف تو جب ہے کہ ہو جائے خبر آپ سے آپ

نہ قضا آئے نہ وہ آئیں نہ صبر آتا ہے
سب کے سب پھر گئے تاثیر دُعا کی صورت

مجھ سے ہے سارا زمانہ آجکل بگڑا ہوا
انکی عادت کیطرح مری طبیعت کیطرح

کوئی ہو تو شبِ فرقت میں جس سے دل بہلے
الٰہی درد ہو ہمدرد ہم زباں فریاد

یہ نہیں زلفِ پریشاں کہ بنائے سے بنے
بات جب اپنی بگڑ جائے بنائیں کیونکر

رنگ کیا تھا بزم کا واں ہم نشیں تھا کون کون

چُپ رہوں میں تو وہ مغرور بتاتے ہیں مجھے

نہ ملا ہے نہ ملے گا مرے شکووں کا جواب

چھوڑ دو حسن پرستی کا یہ لپکا شوکت

بگڑے بنے۔ بلا سے مری کچھ ہوا کرے

اٹھا جو بزم سے میں تو نگاہ تک نہ اٹھی

نہ کیجیے تذکرہ میرا عدو سے

زلفِ رسا سے پوچھ لو دل چھیننے کے پیچ

اشارہ ہوں کسی ابرو کا خنجر مجھ سے کہتا ہے

ضبط کر ضبط اے دلِ مضطر

دل دیا ہے نیا نیا ہم نے

شمع کی طرح گھل رہا ہے بدن

انقلابِ دہر سے ہیں بے خطر رنگیں نہاد

خلق سے اخفائے جوہر ہے شرافت کی دلیل

یہ کس بیتاب کی آہیں تمہیں بے چین کرتی ہیں

نہ میں حرفِ غلط ہوں جو مٹائیں صفحۂ دل سے

دلِ ناداں کو فرقت میں یہی کہہ کر روکا ہے

ہوں صحبتِ احباب میں پر سب سے جدا ہوں

نہ پوچھو ہم سے کیوں بیٹھے ہوئے آنسو بہاتے ہیں

جوابِ نامۂ دلبر نہ لائے نامہ بر یا رب

ہمارے ہاتھ کو لپکا ہے دامن چاک کرنیکا

نامہ بر آیا ہے تو کس کس کو بیٹھا چھوڑ کر

بات کہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ فریاد نہ کر

نہ سنا ہے نہ سنے وہ یہ فسانہ ہرگز

بھول کر بھی نہ کہیں آنکھ لگانا ہرگز

اب مجھ کو تیری زلفِ پریشاں سے کیا غرض

چلے رقیب تو اُٹھ کر کہا خدا حافظ

جہاں کی بات ہو رکھئے وہیں تک

چوری کی گھات سیکھ لو دُزدِ حنا سے تم

قضا ہنس ہنس کے کہتی ہے کہ قاتل کی ادا ہوں میں

دیکھ اپنے پرائے بیٹھے ہیں

تازہ اک چوٹ کھائے بیٹھے ہیں

لو کسی سے لگائے بیٹھے ہیں

گلشنِ تصویر میں خوفِ خزاں ہوتا نہیں

آتشِ یاقوت سے شعلہ عیاں ہوتا نہیں

یہ کس کے نالۂ دل رات بھر تم کو جگاتے ہیں

نہ میں نقشِ کفِ پا ہوں جو وہ مجھ کو مٹاتے ہیں

ذرا تو صبر کر وہ کوئی دم میں آئے جاتے ہیں

کیفیتِ غربت مجھے حاصل ہے وطن میں

وہ چرچے یاد آتے ہیں وہ جلسے یاد آتے ہیں

زبانی یہ کہے آ کر چلو تم کو بلاتے ہیں

حفاظت سے ذرا رکھئے قیامت اپنے داماں کو

رخ روشن کو چھپایا نہ کرو پردے میں
شمع رخسار چراغ تہ داماں کیوں ہو

ہے جو مرنا ہی عدو کو تو کہیں اور مرے
آپ کی جان سے دور آپ پہ قرباں کیوں ہو

اس کے آتے ہی سب ارمان دلی بر آئے
کوئی حسرت نہ رہی دل میں قسم کھانے کو

ہمارے قتل کا الزام دیکھو کس کے سر ٹھہرے
ادا کچھ اور کہتی ہے قضا کچھ اور کہتی ہے

ہم اپنا خون سمجھے تھے ستمگر تیری گردن پر
مگر ان گورے ہاتھوں کی حنا کچھ اور کہتی ہے

دعائیں مانگتے پھرتے ہیں سب احباب جینے کی
سرہانے میرے ہنس ہنس کر قضا کچھ اور کہتی ہے

شکایت نہ تم سے نہ چرخ بریں سے
ہمیں اپنی قسمت سے لینا نہیں ہے

کچھ حیا بھی آنکھ میں تھی کچھ جوانی کا بھی جوش
وہ سوال وصل پر گردن جھکا کر رہ گئے

رخ سے بل کرتی ہیں شانے سے الجھ پڑتی ہیں
تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

قیامت کرے گی جوانی تمہاری
ابھی خیر سے ابتدا ہو رہی ہے

وہ محشر اٹھاتے ہوئے آرہے ہیں
قیامت میں آفت بپا ہو رہی ہے

جسے دیکھتا ہوں وہ عاشق ہے تیرا
خدا کی خدائی فدا ہو رہی ہے

وہ آئے ہیں مرے گھر آپ سے آپ
خدا کی شان ہے قدرت خدا کی

اب تو دل دیگر ہے جور و ستم
خیر آگے کو نصیحت ہو گئی

گرہ سی ہے جو زلفوں میں تمہارے
یہی ہے ہاں ہمارا دل یہی ہے

دل دیا بھی تو دیا ہم نے کسے وائے نصیب
جان پہچان ہے جس سے نہ شناسائی ہے

جب تک جواں تھی ہجر کی گھڑیاں گنا کئے
پیری میں فکر پڑ گئی روز حساب کی

مجھ کو سنا سنا کے وہ کہتے ہیں غیر سے
کچھ لوگ آج بزم سے اٹھوائے جائیں گے

یہ ابر یہ بہار یہ ساقی یہ جام مے
مستوں پہ آج رحمت پروردگار ہے

ان سے اب باقی ہے اتنی راہ رسم
مل گئے صاحب سلامت ہو گئی

شوکت :- دیوگام کے کسی شوخ طبع رنگین مزاج شاعر کا تخلص ہے۔ باوجود

کوشش کے نام اور حالات معلوم نہ ہوسکے۔ کلام سے کہنہ مشقی پائی جاتی ہے۔
مندرجۂ ذیل یہ تین اشعار ان کے ہیں:-

خم کے عوض اِک سبو بہت ہے	بلبل تجھے گُل کی بُو بہت ہے
اثباتِ دہن میں اُس پری کے	گنجائشِ گفتگو بہت ہے
جب سے مرے حلق پر پھرا ہے	خنجر ترا سرخ رُو بہت ہے

شوکت:- مولوی احمد حسن باشندہ موضع رامپور ضلع سہارنپور۔ عربی اور فارسی میں صاحب استعداد۔ اُردو میں شعر کے نقاد۔ اعلےٰ درجہ کے نثار۔ مشہور مضمون نگار تھے۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کرنے کے بعد آپ نے اخباری دنیا میں قدم رکھا۔ دہلی میں خیر خواہ عالم اور لاہور میں اخبار کوہِ نور کے ایڈیٹر رہے شگفتہ چلبلی کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اخبار نویسی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ کبھی اس زمانہ کے لیڈروں کی خبر لی۔ کبھی مقرروں پر اعتراضات کئے۔ کبھی شعرا سے چھیڑ چھاڑ کی۔ لاہور چھوڑنے کے بعد لکھنؤ میں اودھ اخبار کے صیغہ ادارت میں ہو گئے۔ یہاں منشی نولکشور کے کتب خانہ کا مطالعہ کیا اور علمی استعداد کو بڑھایا۔ عرصہ تک ادبی اخلاقی اور تمدنی مضامین دیکھتے رہے۔ وہاں بھی زیادہ عرصہ چلبلی سے نہ رہے غلام محمد خاں طپش اور ان سے بگاڑ ہو گیا۔ اخبارات میں فریقین کے زوردار مضامین نکلے اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑنے کے بعد میرٹھ میں تشریف لائے، اخبار شحنۂ ہند جاری کیا۔ غیر مقلدین کی تائید کرنے سے نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے حوصلہ افزائی کی ان کا سالانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اسی زمانہ میں بعض دل آزار فقرے ان کے قلم سے نکل گئے حنفی جماعت سے ضبط نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زدوکوب تک نوبت پہنچی۔ آپ حضرت یزدانی میرٹھی کے ہمعصر تھے۔ ان سے اُن سے ہمیشہ چلتی رہتی سجاد حسین ریحانی طوطیٔ ہند کے ایڈیٹر کا بھی انہوں نے مقابلہ کیا۔ بھوپال کی امداد

بند ہو جانے کے بعد اخبار شحنۂ ہند مذہبی پالیسی کا اخبار نہ رہا۔ بلکہ اس میں شعراء پر اعتراض ہونے لگے۔ اسمیں شک نہیں کہ آپ اُردو زبان میں فنِ "تنقید" کی ابتدا کرنے والوں میں ہیں۔ مگر ذاتی کاوش کی وجہ سے اس کو آخر وقت تک نباہ نہ سکے۔ عربی شعراء میں متنبی پر اعتراضات جڑے۔ اصلاحیں فرمائیں، فارسی میں نظامی۔ عُرفی اور نظیری پر نکتہ چینیاں کیں۔ اُردو میں غالب۔ مومن کے منہ آئے۔ خاقانی اور بیدل کا کلام بھی اصلاح سے نہیں بچا۔ رسالہ پروانہ کے صفحات دنگل تھے۔ جس میں شوکت جیسے پیر کہن سال جوان طبع شعرا سے زور آزمائی کرتے تھے۔ خودستائی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ فارسی میں خاقانی اور اُردو میں غالب کے کمال کا اعتراف تھا۔ قصائد خاقانی اور دیوان غالب اُردو کی شرح لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ خودستائی کیوجہ سے ان کی قدر نہ ہوئی۔ ورنہ بہ فنِ سخن کے اچھے ماہر ادیب تھے۔ شاگردوں کے کلام کو اصلاح خوب دیتے تھے۔ اردگرد شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ماننا پڑے گا۔ کہ علم و فضل اور ادبی مستعدی میں آپ کے معاصرین میں کوئی آپ سے بڑھ کر نہ تھا۔ آپ کی جگہ اپنے زمانے کے اعلیٰ ادیبوں اور فاضلوں میں ہے اگرچہ شوریدہ مزاجی کیوجہ سے آپ کو اپنے کمالات کی پوری داد نہ ملی۔ لیکن آپکی لیاقت کا لوہا ہر ایک کو ماننا پڑا۔ اپنے کو مجدد السنہ شرقیہ لکھتے اور لکھواتے تے۔ فارسی کلام متانت اور سنجیدگی سے معمور ہے۔ اردو میں اکثر مومن خاں کی تقلید کرتے۔ بلاغت اور پختگی آپ کے کلام کا خاص وصف ہے۔ بعض مضامین بہت ادق آجاتے ہیں۔ شعرائے متاخرین میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ چند سال ہوئے انتقال کیا۔ اب کلام ملاحظہ ہو

بے ثباتی کی ہوا میں اُڑ رہا ہوں رات دن	یا خدا رنگ پریدہ ہوں میں کس تصویر کا
اہلِ زر کو زر ہی کرتا ہے گرفتارِ بلا	فلس ماہی خود ہے حلقہ دامِ ماہی گیر کا
ہیں نکمے نوجواں گر ہمتِ پیراں نہ ہو	منحصر ہے پر کمانوں کے ہے اُڑنا تیر کا

ازل سے چشم نظارہ ہے گلچیں حسنِ جاناں کا
ہُوا کم ایک بھی پتا نہ ابتک اس گلستاں کا

بہار ایسی دکھائی آبلوں کی خونفشانی نے
کہ پھولوں پر لگا تلنے ہر اک کانٹا بیاباں کا

تھا عشوہ فتنہ خیز مکین و مکاں نہ تھا
تھا جلوہ برق ریزِ زمین و زماں نہ تھا

پہنچتے تھے بگولے آسماں تک دورِ وحشت میں
کہ میرے پاؤں کی چکر سے چکر میں بیاباں تھا

مشربِ جام و صراحی رقص آزاد نہ تھا
دست ساقی رات رہنِ بیعتِ خُم خانہ تھا

خوابِ غفلت نے تھپک رکھا تھا گوشِ ہوش کو
صرف ایک افسوں ہماری عمر کا افسانہ تھا

چشم پوشی شمع کی دیوارِ نظارہ نہ تھی
پردۂ فانوس نورِ دیدۂ پروانہ تھا

وہ بت ہیں شرم سے بوسوں کی گویا
لگیں مہریں لبِ مہر مبیں پہ

تمنا ہے تمہارے کشتۂ ناموس الفت کی
کہ چشم جوہر خنجر سے بھی مقتل میں پردا ہو

کیا ہے مجکو پامالِ خرام اک فتنہ قامت نے
ہیولی مہر محشر کا بنائیں گے مری گِل سے

خدا کا گھر بھی نکلا دل لگی کی شکل سے خالی
مری چھاتی پہ توڑے سنگ اسود کم نہیں سِل سے

بغل میں اسکے دریا ہے مگر ہے خشک لب پھر بھی
جہاں میں شورِ بختی کسکی ہوگی بڑھ کے ساحل سے

کب کشودِ کار ہو گر ہو نہ مژگاں کی خلش
زخمِ دل کی فتح ہے وابستہ نوکِ تیر سے

عروجِ خاکساری خاک تجھ سے اے زمیں بنتا
مری خاک آسماں سے بھی کبھی دب کر نہیں نکلی

مرقع عالم صورت کا دیکھا چشم وحدت سے
تو ہر صورت سے شکلِ شانِ صورت آفریں نکلی

بڑا دھوکا دیا زاہد نے مجھ سید سے مسلماں کو
کہاں مے خلد میں تو نہر شیر و انگبیں نکلی

رباعی

تار نفس سرد میں غم کی لے ہے
اس بزم میں خون جگر و دل مے ہے
ہے نغمۂ جانفزا فقط خاموشی
گلبانگ شکست رنگ بانگ نے ہے

شوکت:- محمد شوکت حسین صاحب رئیس قصبۂ نہٹور ضلع بجنور۔ خوش مزاج

زندہ دل ہیں۔ کلام سادہ ہے نمونہ ملاحظہ :۔

بُت خانہ و کعبہ کو سمجھتا ہے برابر
شوکت سا کوئی ہم نے مسلماں نہیں دیکھا

وفا شعاروں کو جی کھول کر ستا لیں آپ
نہ لب کھلیں گے کبھی شکوۂ جفا کیلئے

شوکت :۔ منشی محمد اسمٰعیل خاں صاحب۔ ساکن کلکتہ شاگرد ناسخ مرحوم۔ رفعت خیال و حسن مقال قابل داد ہے۔ اچھا شعر کہتے ہیں۔ انتخاب یہ ہے :۔

گلہ کس سے کروں درد جگر کا
ہوا ہے ناک میں دم چارہ گر کا

تجلی طور پر جو حضرتِ موسیٰ نے دیکھی تھی
میسر ہو مجھے گھر بیٹھے اُس کا دیکھنا یارب

یارب نہ کرنا مجھکو کبھی مبتلائے حرص
تنگ ہے جگہ بھی رہنے کو دل میں نہ پائے حرص

پھر بہار آئی ہوا پھر جوشش سودا کا فزوں
دوڑتا ہے ہاتھ پھر اپنا گریباں کیطرف

اگرچہ منزلِ ہستی بھی رکھتی ہے بہت وسعت
سمند عمر میرا طے کرے گا دو قرار ونمیں

دعائے مرگِ دشمن اسلئے کرتا نہیں حق سے
نصیب دشمناں وہ بھی تو ہونگے سوگوار ونمیں

شوکت

شوکت :۔ میر حسین علی مفتی صدر الدین خاں مرحوم صدر الصدور دہلی کے ناظر عدالت تھے۔ موزوں طبع شاعر اور علوم متعارفہ میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے :۔

زاہد خود کام کرتا ہے ستائش حور کی
تو بھی تو رخ سے نقاب اپنی پری پیکر اٹھا

دورِ چشمِ یار میں سب ہو گئے باہم رقیب
ایک ادنےٰ سا فریب نرگس مستانہ تھا

ساقی ترے طفیل سے ہم کو مے مدام
معلوم ہی نہیں کدھر آیا کدھر گیا

اُس سنگدل کے دلمیں تو تاثیر کچھ نہ کی
کیا فائدہ فلک سے جو نالہ گذر گیا

جی لگ گیا قفس ہی میں کچھ نہیں خیال
موسم بہار کا کدھر آیا کدھر گیا

شوکت نے جان دی ترے در پہ ہزار بار
وہ مرتے مرتے آہ بڑا کام کرے گا

جو حرم سے مستی کے کعبہ میں نہ ہو تو رہ نہ ہو
میکدے کا تو خدا کے فضل سے ہے در کھلا

جبکہ ابرو کا اشارہ ہی کرے عالم کو قتل
اُس ستمگر کی بلا لیتی ہے خنجر ہاتھ میں

وصل کا وعدہ نہیں تو قتل کا وعدہ سہی　　　دل کے بہلانے کو میری کوئی صورت چاہیئے

شوکت

شوکت:۔ میر شوکت علی خلف سید عوض علی ڈپٹی کلکٹر اودھ ۱۳۰۳ھ میں ۲۵ سال عمر تھی۔ اور الہ آباد میں سرکاری ملازم تھے۔ سید محمد نوح رئیس مچھلی شہر کے حقیقی بھانجے ہیں۔ تلمذ بھی انہیں سے ہے۔ رعایات لفظی کا شوق ہے:۔

آپ کے عاشق کی تربت پر چڑھانے کیلئے　　　چاندنی مہتاب لایا شامیانے کے لئے
عارضِ تاباں پہ انکے گیسوئے پیچاں نہیں　　　جال ہے یہ طائر دل کے پھنسانے کیلئے
اور بھی تو ہیں کسی پر ظلم یہ ہوتا نہیں　　　کیا ہمیں اک عاشقوں میں ہیں ستانے کیلئے

شوکت

شوکت:۔ سید یعقوب حسین باشندۂ دیوبند۔ مولانا سیف الحق صاحب ادیب مرحوم کے شاگردوں میں ہیں۔ مولوی انوار الحق میر منشی ریذیڈنسی راجپوتانہ کے صاحبزادوں کو درس دیتے تھے:۔

ایسی خاموشی بھی ہجر یار میں اچھی نہیں　　　ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
چلے ہیں میکدے میں منہ چھپا کر حضرت واعظ　　　الٰہی ڈھانک لے رحمت سے پردہ پارسائی کا
قیامت کا ہے وعدہ گر جواب صاف پر الجھو　　　یہ قسمت ہے تمنا کی مقدر ہے وہ ارماں کا

شوکت

شوکت:۔ ڈاکٹر محمد علی خاں صاحب لکھنوی حضرت فصاحت لکھنوی مرحوم سے تلمذ رکھتے تھے۔ دیرینہ سال بزرگ تھے۔ مگر شعر کے تیور خوب ہوتے تھے طبیعت میں روانی تھی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

سب کی آنکھیں میں جھکی تو شوق سے خنجر اٹھا　　　جاں نثاروں سے یہ کیسی شرم قاتل سر اٹھا
عمر بھر ایذائیں جھیلیں سوئے ہیں اب چین سے　　　اُن کے کشتوں کو نہ اے ہنگامہ محشر اٹھا
ہے یہ مطلب تیرا جس دل میں رہے تڑپا کیے　　　چٹکیاں لیتا سکھاتا ہے کوئی سوفار کو
چٹکے غنچے۔ گل کھلے چہکے عنادل باغ میں　　　فصل گل آتے ہی سامان خزاں برہم ہوا

شوکت:۔ حلیف علی شوکت چھریرے بدن کے اور بہت نحیف آدمی تھے۔ نہایت

خوش خلق وشیریں زبان تھے۔ شاعری میں غلام علی عشرت کے شاگرد تھے۔ طبیعت کا میلان میر سوز و سید انشا کی طرز پر تھا۔ پرانے آدمی تھے۔ پرانی زبان ہے :-

کس سے پوچھوں کیا کروں بیٹھے بٹھائے ہمدمو
آہ کل اک راہ چلتا دل کو لے چلتا ہوا

تری آنکھوں کے ڈوروں کا تصور جب میں کرتا ہوں
تو ٹوٹے ہے وہیں زخم دل صد چاک کا ٹانکا

حیران ہوں موجد تری تصویر کا ہے کون
مانی سے یہ نقشہ ہے کہ بہزاد سے ایجاد

پھر پھر کے نہ چوسوں لب میگوں ترے کیونکر
چھٹتی ہے کہیں مے لب میخوار سی لگ کر

تجھ کو کیا ہم باز آئے خیر خواہی سے تری
ناصحا اپنا تو سر پھٹتا ہے اس تکرار سے

نہ تیری سرخ چوڑی سی شفق ہی خوں میں غلطاں ہے
قبائے گل کا بھی تو چاک تا دامن گریباں ہے

شوریدہ

شوریدہ :- شجاع الدین خاں خلف الصدق وجہ الدین خاں نبیرۂ نواب عظمت اللہ بقول تذکرہ شوق جوان۔ قابل خوش اخلاق اور جملہ اوصاف میں طاق تھے۔ چند اشعار جو ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ اُن کی طبع رسا اور ذوق سلیم کا کافی ثبوت ہیں :-

آبلے پڑتے ہیں دم لیتے زبان پر اپنی
کب بیاں کر سکیں یہ سوز دروں ہم اپنا

بے کسی میں نہیں یاری کی کسی سے اُمید
دل سلامت ہے اور دیدۂ پُر نم اپنا

صبح تک شمع جلی دیکھ مرا سوز و گداز
داغ فرقت سے ہوا رات وہ عالم اپنا

بسکہ پُر خوں دل ہمارا درد سے لبریز ہے
ہر فغاں ہے غم فزا ہر نالہ وحشت خیز ہے

عشق کے کوچہ میں یکساں ہیں فقیر و بادشاہ
کون سمجھے واں کہ وہ فرہاد وہ پرویز ہے

کچھ ادب مانع ہے کچھ تیرا شکوہ حسن و ناز
ورنہ دل شکووں سے تیرے بیوفا لبریز ہے

شہباز

شہباز :- مولوی عبد الغفور صاحب۔ قابل ادیب اور انشا پرداز تھے۔ کلکتہ کے اخبار "دار السلطنت" اور "اردو گائڈ" میں خوش بیانی اور شوخ نگاری کے نمونے دکھا چکے ہیں۔ جناب سید محمد صاحب آزاد کے رفیق تھے۔ اور وہ ان کی قدر کرتے تھے۔ حضرت آزاد مرحوم نے جو ظریفانہ مضامین اودھ پنچ میں لکھے تھے۔ انہیں آپ نے "خیالات آزاد"

کے نام سے مرتب کر کے چھپوایا۔ بنگالی مسلمانوں میں قابل انگریزی دان تھے۔ اورنگ آباد
کے کالج میں علمِ طبعیات کے پروفیسر مقرر کئے گئے تھے۔ طبیعت مضمون نگاری اور
شاعری کے مناسب تھی۔ ان کی اکثر مزیدار نظمیں اودھ پنچ کے دورِ آخر میں شائع ہو
چکی ہیں۔ نظامی پریس بدایوں نے ان کو مجموعی تشکل میں "خیالاتِ شہباز" کے نام سے
شائع کیا۔ نظیر اکبر آبادی کی سوانحعمری یعنی "زندگانی بے نظیر" بھی انھیں کے زورِ قلم کا نتیجہ
ہے۔ رباعیات کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ انہوں نے زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے
بعض مغربی استعارات و تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ اور صدیوں کے فرسودہ خیالات
سے اپنی شاعری کو بچایا ہے۔ عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

کیوں نہ آیا قتل کو میرے وہ قاتل کیا ہوا　　جذبۂ شوقِ شہادت جذب کامل کیا ہوا
دیدۂ خونبار بتلا ہے کہاں لختِ جگر　　پہلوئے بیتاب فرما پارۂ دل کیا ہوا

اغمازِ نگہ آپ کو ہے ورنہ ہمارا　　دل تیر سے باہر نہ جگر تیر سے باہر
ہاں دید میسر نہیں اور شوق وہ چاہیے　　جو بات کہ ہو گردشِ تقدیر سے باہر
قول سے پہلے ہے اثر مطلوب　　آہ سے پہلے ہے اثر کی تلاش

رباعیات

رنگین ہیں اُس صاحبِ قدرت کے بھید
چھپتی ہے ہری دوب، جو کالی بکری
ہر رنگ میں قدرت ہے جھلکتی جاوید
ہے لال لہو کہیں۔ کہیں دودھ سفید

لکھنے بابو سوانح کے اہین ہیں انگریز
اعمال ہیں اپنے ذرہ ذرہ لکھتے
ہر حال میں اپنے نکتہ چین ہیں انگریز
آپ اپنے کراماً کاتبین ہیں انگریز

کس لطف سے کھیت میں کھلی ہیں کلیاں
تسبیح زمرّدیں سے ہے ان کو لگاؤ
آباد ہیں اُس سبز نگر کی گلیاں
ہیں کس کی یہ انگلیاں مٹر کی پھلیاں

ہے بزم میں ایک صدر و پائیں ہم کو
ملحوظ ہیں اخلاق کے آئیں ہم کو
ہم غیر سے بھی کرتے ہیں بھائی کا سلوک
شیرازہ اتفاق ہے دیں ہم کو
کیونکر کوئی اسرار الٰہی جانے
کیا تاب کہ انسان کماہی جانے
آنکھوں سی حباب دہم اٹھنا معلوم
باتیں یہ خدا کی ہیں خدا ہی جانے

حسین ساگر (حیدرآباد دکن)

صفت ہے کونسی وہ شیخ حوضِ کوثر میں
نہیں لوجہ حسن جو حسین ساگر میں
بنائیں اس کو ہم آئینہ سکندر جب
کہ لہریں ایسی ہوں آئینہ سکندر میں
نکل رہی ہیں لطافت سے موج کی سطریں
بھری ہوئی ہے بلاغت صبا کی مسطر میں

میں

کبھی حسن انجام ہوں میں ابد میں
ازل میں کبھی حسنِ آغاز ہوں میں
سمجھ میں حکیموں کی کچھ بھی نہ آیا
خدا جانے کیا بھید کیا راز ہوں میں

آبِ رواں

انگریز شاعر سوڈی کے طرز پر

اڑا طرز خرام البیلیوں سے
چلا آبِ رواں اٹکھیلیوں سے
کھلاتا کھیلتا ہنستا ہنساتا
تھرکتا۔ ناچتا گاتا بجاتا
مٹکتا۔ جھومتا۔ تنتا۔ اکڑتا
گرجتا۔ گونجتا۔ بنتا۔ بگڑتا
بھلکتا۔ جھلملاتا۔ جگمگاتا
پھسلتا۔ لڑکھڑاتا۔ ڈگمگاتا
لپکتا۔ دوڑتا۔ پھرتی دکھاتا
اچھلتا۔ کودتا چکر لگاتا

سمٹتا۔ پھیلتا۔ مڑتا۔ مڑاتا
الف ہوتا بڑا کاوے لگاتا
کبھی گھوڑ دوڑ میں کف منہ پہ لاتا
گریباں چاک کرتا سر پٹکتا
اُٹھا کر سونڈ فوّارہ اڑاتا
تڑپتا۔ لوٹتا۔ چڑھتا اُترتا
کھسکتا۔ بھاگتا۔ رُکتا۔ پھڑکتا
کبھی ڈنٹر پیلتا جوڑی ہلاتا
پہاڑوں کا کہیں دامن دباتا
صدف میں گوہر نایاب بھرتا
زمرد پر کہیں پارہ بچھاتا
سناری چھیڑتا۔ ارگن بجاتا
کٹر بجرے کو مرغابی بناتا
مکلّف منبر پہ چادر بچھاتا
بڑھاتا ہر طرف موجوں پہ موجیں
پنہاتا شمس کو زرتار سائے
کھلاتا روز و شب سورج کے غوطے
زمیں کی گود میں گرداب بھرتا
بناتا مورچے توپیں چڑھاتا
نگلتا سیپیاں موتی اُگلتا
گراتا پھینکتا۔ چنتا۔ اُٹھاتا

اُبھرتا۔ ڈوبتا۔ اُڑتا۔ اڑاتا
دولتی چھانتا۔ پتنگ اُڑاتا
کبھی فوجوں میں گھسکر ہنہناتا
رگڑتا ایڑیاں دامن جھٹکتا
دھوئیں کے زور سے پارہ اُڑاتا
جھپٹتا۔ باولا ہوتا۔ بپھرتا
جھٹکتا۔ جھاڑتا۔ بہتا۔ بھڑکتا
کبھی خم ٹھوکتا تیوری چڑھاتا
درختوں کی کہیں شاخیں ہلاتا
گہر کی شیشیوں میں آب بھرتا
کہیں پارے کو فیروزہ اڑاتا
اِدھر حوریں۔ اُدھر پریاں نچاتا
بشر کو مردم آبی بناتا
معلق شہر کو دعوت کھلاتا
چڑھاتا ہر طرف فوجوں پہ فوجیں
بناتا چاند سے چاندی کے پائے
اڑاتا عقل کے ہاتھوں کے طوطے
بھنور کی ناف میں سیماب بھرتا
سجاتا پلٹنیں فوجیں بڑھاتا
جماتا قفلیاں۔ سانچے میں ڈھلتا
چمٹتا۔ چومتا۔ پلٹتا۔ سماتا

کبھی پچکاریوں کا ڈالتا ڈھنگ
دہاں بنکر کہیں جا چاٹتا سنگ

کبھی پتھر سے ٹکراتا ہوا سر
کبھی ذرّوں پہ چمکاتا ہوا زر

نگینے سنگ ریزوں کے بناتا
طلسمی سُرمہ آنکھوں میں لگاتا

غرض آبِ رواں یوں جہد کرتا
ہر اک کوشش میں سو سو عہد کرتا

ہزاروں تازہ دم چشموں سے ملتا
کروڑوں پیاسے ہم چشموں سے ملتا

جلو میں ندیوں نالوں کو لیتا
کروڑوں کشتیاں اُلفت کی کھیتا

سمندر

بڑی ہی اک عظیم الشّان شے ہے
پڑے جس میں کروڑوں ابن طے ہے

ہزاروں جس میں مخفی گنج شاہی
کروڑوں جس میں اسرار الٰہی

خیالوں سے بڑھا پھیلاؤ جس کا
سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا

نگاہیں جس کا پایاں پا نہ سکتیں
حدیں جس کا سرا بتلا نہ سکتیں

فلک جس کے قدم لینے کو جھکتا
زمانہ جس پہ دم لینے کو جھکتا

ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں
بلا گرداں ہے جس کا مہر گردوں

گھٹا چمکی ہوئی جس کی بدولت
شفق پھُولی ہوئی جس کی بدولت

پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ
جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ

جہازوں کو جہاں قطرے نچاتے
چٹانوں کو جہاں ذرّے نچاتے

جہاں ہر بوند بنتی بندھیا چل
جہاں ہر موج جلتی سو ہما چل

ہم آغوشی

عبارت مختصر اُٹھ کے سنبھل کے
مطابق فارسی کی اس مثل کے

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

بنا آبِ رواں اِک قلزمِ جوش
ہُوا آخر سمندر سے ہم آغوش

شہرت

شہرت:۔ منشی مہربان علی خاں متوطن میرٹھ۔ شاگرد حکیم میر محمد خاں مضطر معمولی فکر کے شاعر تھے۔ غدر کے پندرہ بیس برس بعد بریلی میں رہتے تھے کلام حاضر ہے

نور اللہ کا آنکھوں میں سماجاتا ہے
میں وہ میکش ہوں کہ بعد مرگ میری خاک سے
وہ کون ہے کہ جو اس میکدے میں عالم کے
وہ ہم کو ساقیا اِک جام مئے عنایت ہو
عیادت کو آیا وہ رشک مسیح

جلوۂ حسن بتاں پہ جو نظر کرتے ہیں
کیا عجب اے میکشو جو میکدہ تعمیر ہو
پیئے شراب خودی اور ہوشیار رہے
کہ جس کا نشہ ہمیں تا دم شمار رہے
مری زیست بار دگر ہوگئی

شہرت:۔ صاحب زادہ احمد حسین خاں ساکن رامپور تلمیذ داغ۔ خوش فکر ہیں۔ زبان صاف ہے۔ طبیعت اچھی ہے۔ یہ کلام ہے۔

دن رات کے یہ صدمے زندہ نہ رہنے دیتے
دیر و حرم کا پردہ اُٹھ جائے تو میں پوچھوں
ناحق بگڑ رہے ہو شہرت کی کیا خطا ہے
ضبطِ غم اس طرح نہیں ہوتا
تم جو چاہو تو روز کا جھگڑا

وعدہ کسی کا لیکن ہم کو جلا رہا ہے
اب کون ایک جلوہ ہر جا دکھا رہا ہے
یہ جھوٹی سچی باتیں دشمن بنا رہا ہے
خون جب تک جگر نہ ہو جائے
ختم اِک بات پر نہ ہو جائے

شہرت

شہرت:۔ امیر بخش دہلوی خلف علیسیٰ خاں تلمیذ ثناء اللہ خاں فراقؔ۔ دکن پہنچکر راجہ چندولال کے ملازم ہوئے۔ غدر سے بیس پچیس برس پیشتر دکن میں برسر روزگار تھے۔ خوش فکر شاعر تھے۔ کلام یہ ہے:۔

ہزار افسوس اب یوں خاک میں ملنا ہی شہرت
ہو کے ہر اک پہ مبتلا سہنا ہے جور اور جفا

یہ طفلِ اشک وہ ہے اپنی جو آنکھوں میں پلتا تھا
اسمیں ہی اس کو کیا مزا یہ تو ہمیں بتائیے دل

دم دلاسے جانتے ہیں سب ترے ایجان ہم　　دل جو دیں بیٹھیں تجھے ایسے نہیں نادان ہم
وہ تو کہتا ہے قسم ہے ہم اِدھر دیکھیں تو　　چل تو اے آہ رسا تیرا اثر دیکھیں تو
حسرت پڑی ٹپکتی ہے شمع مزار سے　　آئینہ کو جلا دو ہمارے غبار سے

شہرت

شہرت:۔ منشی محمد علی دہلوی۔ محمد یحییٰ اماںؔ کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ قدرت اللہ شوقؔ لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں اچھے شعرا میں گنے جاتے تھے۔ کلام سیدھا سادہ اور صاف ہے۔

دیوانہ پن یہاں تک مشہور ہے ہمارا　　ہر خار کی زباں پر مذکور ہے ہمارا
کر کے ناخوش مجھے محفل سے اٹھا مت ظالم　　کرتے ہیں اسکی خوشی اپنے جو گھر آتا ہے
گھر سے لڑکے کو اکیلا نہیں جانے دیتے　　اس لئے اشک کے ہمراہ جگر آتا ہے
کم نصیبی سے ملاقات نہیں ہوتی آہ　　جب میں جاتا ہوں اُدھر تب وہ اِدھر آتا ہے
میرے ہی گھر کی طرف اُسکے قدم اٹھتے ہیں　　میں تو حیران ہوں وہ آج کدھر آتا ہے
نہیں معلوم کہ کیوں آج نہایت غمگیں　　شہرت اُس کوچہ سے با دیدۂ تر آتا ہے
دل ڈھونڈھتے ہو پاس مرے دل تو واں ہے　　ایک شعلۂ آتش ہے کہ پہلو میں نہاں ہے
آپس میں یوں وہ کہتے ہیں سب پڑھکے فاتحہ　　شہرت تھا جن کا نام یہ اُن کا مزار ہے

شہرت

شہرت:۔ صاحب عالم میرزا حاجی خلف مرزا قیام الدین ابن شاہ عالم بادشاہ شروع میں حافظ عبد الرحمٰن خان احسانؔ اور افضل الدین ممنونؔ سے اصلاح لی۔ ان کی وفات کے بعد مفتی صدر الدین خان آزردہ کو غزل دکھائی۔ ۱۲۷۱ھ میں تیس برس کا سن تھا۔ غدر سے پہلے انتقال کیا۔ مرثیہ گو۔ اور صاحب دیوان تھے۔ کلام میں تازگی ہے۔ اسلوب چستہ اور تخیل اعلےٰ ہے۔ یہ اُن کا کلام ہے:۔

غبار اٹھا نہ مت دل سے وہ سینہ لے ظالم　　ہمارا نہ جہان کو اک وہ تنہی آسماں ہوتا
ہم نری چیز سمجھتے تھے۔ یہ مینا نے ہیں　　نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا

کچھ نشاں مجھ بے نشاں کا بعد مردن بن گیا
حسرتیں ہو ہو کے یکجا جمع۔ مدفن بن گیا

ہائے جی بھر کے وہ دیدار میسر نہ ہُوا
حشر کا دن شب غم کے بھی برابر نہ ہُوا

کفر و دیں میں کچھ نہ تھا عقدہ بجز بند نقاب
اس کے اُٹھتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہو گیا

کیا وہ جگر کہ جس پہ نہیں داغ جانگداز
کیا دل وہ بیقرار جو آٹھوں پہر نہیں

یہ تو خبر نہیں ہے کہ کیا حال ہے پر آج
شہرت کا بار بار ہے جاناں جگر پہ ہاتھ

نہ چھوٹا زلف سے دل۔ اور نہ تم زلفیں بنائے سے
یہ وہ جنجال ہے جس سے نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

اُٹھے تو نالہ کش ہوئے۔ بیٹھے تو آہ کی
کیا یاد ہم کریں گے کہ ہم نے بھی چاہ کی

کس کس کی جان لیکے بڑھائی ہے اپنی عمر
میرے ستانے کو فلک بد شعار نے

لبوں پہ آنے نہ پایا تھا اپنے حرف امید
کہ اتنی دیر میں وہ ہو گئے خفا ہم سے

شہرت

شہرت:۔ منشی ہیرا لال۔ ڈپٹی کلکٹر۔ دیوانِ ریاست الور۔ متوطن خورجہ ضلع بلند شہر۔ شاگرد منشی پربھیشری سہائے مسرور۔ ان کے والد منشی ابدل رائے ولیش خورجہ کے ساہوکاروں میں تھے۔ زبان اچھی ہے۔ جدت طرازی طبیعت میں زیادہ ہے اور تخئیل بھی پاکیزہ ہے۔ یہ ان کے کلام کا انتخاب ہے:۔

نہ کر محرومیِ دیدار کا شکوہ تو اے زاہد
پڑا ہے پردہ آنکھوں پر تری ہی غم عبادت کا

اب خنجر کی لگائی ہے ستمگر نے سبیل
دہن زخم جگر کو لب سائل سمجھا

چھپتے اگر وہ ہم سے تو چھپتا نہ راز عشق
پردہ رہا اسی میں کہ پردہ نہیں رہا

رہے دیر و حرم میں جس کے جویا رات دن شہرت
وہ نکلا دل کے پہلو میں کہاں ڈھونڈا کہاں پایا

ہُوا معلوم چھٹنا عمر بھر بند تعلق سے
غم دنیا سے گر چھوٹے غم عقبیٰ نکل آیا

ہُوا اچھا سمجھ کر اپنے دل میں ہم چلے آئے
نہ تھا بد مستیِ ساقی سے رنگِ انجمن اچھا

اک سرسری نگہ سے ہوا کام ہی تمام
یہ تیر نیم کش بھی بڑا کارگر ہُوا

تو ہے تو تری بدولت اے دل
کیا کیا نہ ستم اٹھائیں گے ہم

شہرت

شہرت :- سید باقر حسن عرف اچھے صاحب لکھنوی خلف جناب میر سید حسن صاحب متخلص بہ لطافت۔ آپ کے جدِ امجد ہندوستان کے مشہور شاعر جناب سید آغا حسن صاحب امانت تھے۔ بلحاظ شرافت و عزت ان کا خاندان ممتاز ہے۔ جناب امانت کے دو صاحبزادوں میں ایک جناب لطافت مرحوم تھے۔ جو جناب شہرت کے والد ماجد تھے۔ دوسرے فرزند سید عباس حسن صاحب فصاحت مرحوم تھے جنہوں نے حال ہی میں کربلائے معلی میں انتقال فرمایا۔

جناب شہرت ۱۸ ماہ رجب ۱۲۸۳ھ کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے اور ان کے والد نے ان کا تاریخی نام شہرت حسین رکھا۔ ابتدائی درسیات کی تکمیل کے بعد ۱۶ یا ۱۷ برس کے سن میں اپنے والد کے شاگرد رشید اور عربی و فارسی و عروض کے بڑے ماہر جناب قاری یعقوب علی خاں صاحب نصرت لکھنوی سے تعلیم فارسی۔ عربی اور فنِ عروض وغیرہ حاصل کیا۔ جناب شہرت نے کچھ دنوں اپنے والد سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد قریب دس برس تک اپنے چچا جناب فصاحت سے اصلاح لیتے رہے۔ آخر کار رنگ کلام کے اختلاف کی وجہ سے جناب فصاحت سے اصلاح لینا ترک کر دیا۔ اور اساتذۂ فن کی کتابوں اور دواوین کو بطور استاد سامنے رکھا اور پھر اصلاح کی نوبت باقی نہیں رہی۔

جناب شہرت شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کی سرکار میں ملازم رہے اور وہاں نواب میر محمد حسین خاں صاحب شاگرد جناب میر مونس مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اور ان کے اصرار سے ان کے دو تین مشاعروں میں بھی شرکت کی پھر اودھ کے مشہور علم دوست تعلقہ دار راجہ نوشاد علی خاں صاحب مرحوم تعلقہ دار ضلع بارہ بنکی سے برسوں مخلصانہ مراسم رہے ان کی صحبت میں شعر و شاعری کے خوب چرچے رہتے تھے۔ اب کچھ عرصہ سے جناب شہرت کا زیادہ حصہ وقت اپنے قدیم کرمفرما

اور باوضع مخلص علم دوست جناب سید علی حامد صاحب حامد رئیس جون پور اور اڈیشنل جج صوبہ اودھ کے ساتھ گذرتا ہے۔

جناب شہرت کی عمر ۱۹۳۱ء میں ۶۵ یا ۶۶ سال تھی۔ ہر رنگ کے مضامین میں غزل کہنے اور اصلاح دینے پر قادر ہیں۔ فن عروض اور نکات شاعری سے باخبر ہیں۔ کلام میں مزا اور پختگی ہے۔ نہایت خلیق۔ بے نفس عبادت گذار۔ قانع اور منکسر مزاج ہیں اور عہد قدیم کے اخلاق کی یادگار۔ بلحاظ کمالات شاعری خاندان امانت کے درخشندہ آفتاب ہیں۔ بڑے بڑے کامل شعراء کا زمانہ دیکھا ہے۔ شاعری کے سلسلہ میں جسقدر جھگڑے اور جتھے بندیاں ہوتی ہیں ان سب سے یہ الگ رہے۔ شعراء اور رؤسا سب انکی عزت کرتے ہیں مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے اب جناب شہرت کے جواہر افکار ملاحظہ ہوں:۔

انتخاب غزلیات

کسی نے بزم میں پہلے ادھر دیکھا ادھر دیکھا
ادا کے ساتھ پھر خنجر کمر سے کھینچکر دیکھا

فلک کو ہجر کی شب پاس ہی با چشم تر دیکھا
نہ جب تصویر دود آہ میں رنگ اثر دیکھا

یوں نہ انگشت نما لے مہ نو تو ہوتا
لوگ آنکھوں پہ جگہ دیتے جو ابرو ہوتا

بات وہ میرے رلانے کو نکالی ہوتی
جسمیں ہنسنے کا بھی صاحب کوئی پہلو ہوتا

یاد آگیا جو طول مجھے زلف یار کا
ٹوٹا نہ سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

عاشق بتوں پہ کیوں ہوئے پوچھیگا جب خدا
کہدونگا روز حشر کہ دل کا قصور تھا

وہ ترک دل سے مرے کھینچ لے عتاب میں تیر
بہت کشاکش ارماں سے ہے عذاب میں تیر

تری نگہ کا نہیں ساغر شراب میں تیر
ہر ایک کو نظر آتا ہے آفتاب میں تیر

بلبل کی ہی بہار میں پھولوں سے بڑھ کے بو
باہر پہنچ گئی وہ یہ اندر چمن کے ہیں

دو طرح کی بہار ہے میرے مزار پر
کچھ پھول ہیں چراغ کی کچھ گل چمن کے ہیں

شہرت ہماری نظم کا شہرہ ہے دُور دُور
ہم خوشہ چیں جو خرمن اہلِ سخن کے ہیں

فرقت میں اسلئے ہے خیالِ وصالِ یار
کچھ تو رہے خوشی کا بھی پہلو ملال میں

سجدہ کعبہ میں کیا چوم کے بتخانے کو
آج سوجھی یہ نئی آپ کے دیوانے کو

دل میں وہ قصر ہے اور قصر میں جلوہ اس کا
کہ ہے کعبہ لئے آغوش میں بتخانے کو

اَب مجھے بیدم کیا دونوں طرح تقدیر نے
کچھ اُڑائے ہوش تُو نے کچھ تری تصویر نے

خون کی رفتار روکی حسن کی تاثیر نے
کر دیا تصویر مجھ کو آپ کی تصویر نے

جو آج آئینہ فنا سے دوچار اپنی نظر ہوئی ہے
بناتی ہے جو بہر و نکی کثرت اِدھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے

وہیں دُعا بھی وہیں اثر بھی وہیں تصور وہیں نظر بھی
وہیں یہ دل بھی وہیں جگر بھی اِدھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے

وُہ اُٹھ کے پہلو سے جا رہا ہے اندھیرا آنکھوں میں آ رہا ہے
فلک یہ کس کو چڑھا رہا ہے۔ یہ کیا مقدر دکھا رہا ہے

ٹکڑے ٹکڑے پیرہن کیجے جنوں کا ہے یہ حکم
نام کو بس اک نفس کا تار رہنے دیجئے

جینے سے یاس بھی ہے امید شفا بھی ہے
بالیں پہ میری وہ بھی کھڑے ہیں قضا بھی ہے

میری ہی آہ سے نہیں اُلٹی نقاب رُخ
غصہ فقط مجھی پہ نہ کیجے ہوا بھی ہے

ایک قصیدہ کے دو شعر

جب کہ مجلس میں کہوں میں سرِ منبر جب لک
دل کہے صلِّ علیٰ لب کہیں حیدر حیدر

یا خدا روزِ جزا سب کہیں نفسی نفسی
ہم اُٹھیں قبر سے کہتے ہوئے حیدر حیدر

رباعی

ذرّہ کی طرح سے کم حقیقت بھی ہوں
مشہور برائے نام شہرت بھی ہوں

طالب بھی شرف کہ ہوں لطافت کا خلف
پیرو بھی نبیرۂ امانت بھی ہوں

شہرت: منشی نثار علی دہلوی۔ افسر سررشتہ تعلیم ریاست جموں و کشمیر آپ کے

والد منشی حسین علی فرحت شاہ نصیر مرحوم کے تلامذہ سے تھے۔ آپ نے پہلے اپنے والد سے اصلاح لی پھر حکیم مولا بخش قلق کے شاگرد ہوئے۔ قدیم انشاء پرداز اور ابتدائی دور کے اخبار نویس تھے۔ اخبار انجمن پنجاب۔ پنجاب پنچ۔ خیر خواہ عالم دہلی وغیرہ کے ایڈیٹر اور کشمیر۔ جے پور۔ میرٹھ میں برسر ملازمت رہے۔ باوجود پیرانہ سالی قلم کو ہاتھ سے نہ رکھا۔ کئی سال لاہور میں مضمون نگاری کرتے رہے۔ دیسی ریاستوں کے معاملات پر خامہ فرسائی کا ملکہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے قریب لاہور میں انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

رکھ دیا مثلِ تبرک طاق میں کیوں دی بھی دے
ساقیا کیا جام نے زاہد کا ایماں ہو گیا

کیا کان میں کہا کہ وہ مجھ سے بدل گیا
افسوس ہے کہ جوڑ رقیبوں کا چل گیا

یہ ہے لحاظ تیرا مجھے کوئے غیر میں
آنکھوں کے بل گیا میں کبھی سر کے بل گیا

یہ جنت ایک چھوٹا سا باغ ہے اس گل کے ایواں کا
جہنم اک شرارہ ہے ہمارے داغ سوزاں کا

فنا ہوتے ہی پہنچا ایک منزل اس سے بھی آگے
پتہ کوئی بتاتا ہی نہ تھا عمر گریزاں کا

ہیں سب میں داغ لیکن ہیں ستارے اس میں نور افشاں
کہاں ہے ماہ میں عالم ترے ماتھے کی افشاں کا

ہو گئی سرخی نمایاں دیدۂ مخمور میں
آتشِ سیال آئی ساغر بلور میں

شہرت :- میرزا محمد مہدی علی خاں خلف میرزا مہدی حسن خاں رفعت لکھنوی۔ شوخ بیان ہیں۔ طبیعت چلتی ہوئی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

قاصد بھی گیا ہوا ہے دل بھی
کوئی نہ پھرا ادھر سے جا کر

کہتے ہیں شفا کی بو ہے ان میں
میرے پھولوں میں پھول اٹھا کر

مجھ کو ہر بار دیکھتی ہے
تیری تصویر مسکرا کر

شہید :- جناب منشی محمد بخش شہید ابن منشی خدا بخش خوش نویس باشندہ قصبہ سنڈیلہ ضلع ہردوئی شاگرد حضرت ناسخ و میر علی اوسط رشک مرحوم۔

جناب شہید نے محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ بادشاہانِ اودھ کا زمانہ دیکھا ۱۲۳۳ھ میں ان کے والد منشی خدا بخش کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ انہوں نے خواجہ وزیر اور حضرت اسیر کی صحبتیں اٹھائی تھیں۔ ان حضرات کے مکانوں پر جس جس طرح میں مشاعرے ہوا کرتے تھے ان میں انکی غزلیں موجود ہیں ۱۲۷۰ھ میں حیات تھے۔ سنِ وفات نہ معلوم ہو سکا۔ شباب وشیب کا زمانہ لکھنؤ کے شعرا کی صحبتوں میں گذرا۔ خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے رعایت لفظی کے دلدادہ تھے اور اپنے استاد حضرت ناسخ کے پیرو۔ بڑی بڑی مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں۔ کوئی شعر مضمون آفرینی اور جدت طرازی سے خالی نہیں۔ لیکن سوز وگداز ان کے کلام میں کم نظر آتا ہے مگر یہ مجبور تھے۔ کیونکہ وہ زمانہ ایسی ہی شاعری کو پسند کرتا تھا۔ ہر طرف گل وبلبل کے افسانے اپنا رنگ جمائے ہوئے تھے۔ شہید کا کلام اپنے معاصرین کے کلام سے کسی طرح کم نہیں۔ قصائد۔ غزلیات۔ رباعیات۔ مثنویاں اور تاریخیں کثرت سے کہی ہیں۔ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور اپنے عقائد کے بہت سخت پابند تھے۔ اچھے پرگو شاعر تھے مگر جیسا کہ اس زمانے کا مذاق تھا۔ کلام میں رکاکت اور ابتذال کی کمی نہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہتا ہے کون یہ کہ مجھے شہد ناب دو
لیکن زبان کا کہ دہن کا لعاب دو

کیا شوخ ہے کہ ہونٹھ مسی میں نہ ملائے ہونٹھ
دانتوں سے اس صنم نے مری کاٹ کھائے ہونٹھ

کہا جاتا ہے کہ کلام میں اکثر فارسی اشعار کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً بیدل کا ایک شعر ہے:۔

مردہ ہم فکر قیامت دارد
آرمیدن چہ قدر دشوار است

جناب شہید فرماتے ہیں :ـ

لحد میں بھی یہ دھڑکا ہے کہ محشر سر پہ آتا ہے
نہیں ہے جائے آسائش کہیں سارے زمانہ میں

مگر یہ کوئی عیب نہیں۔ اس کو ترجمہ کہا جائے یا توارُد۔ کس کے کلام سے نہیں نکالا جا سکتا ہے۔ سوال سلیقہ ادا کا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

افشاں ہے زلفِ شب پہ نہیں ہیں نجوم چرخ
تاروں سی کس نے چہرہ سنوارا ہے رات کا

شہید تیغِ عشق اپنا ہی کرا اپنی تمنا ہے
کہ مرنا معرکہ میں نام ہے مردِ سپاہی کا

بجا کہتے ہیں انساں کو کٹھری کا جل کی دنیا کو
نہیں ممکن لگے دھبا نہ عصیاں کی سیاہی کا

سیکھ لے انداز اگر بلبل مری فریاد کا
گُل تو کیا ہے ٹکڑے ہو جائے جگر صیاد کا

واہ رے ذوقِ گرفتاری کہ پھر مدت کے بعد
ڈھونڈ کر ہم نے نکالا آپ گھر صیاد کا

تا بہ لب آیا نہ کوئی حرف تک اللہ رے رعب
سامنے اس بت کے جا کر میں بھی پتھر ہو گیا

ہنسوں کہ زرد ہے رُخ مثل زعفراں اپنا
نہیں بہار سے کم موسم خزاں اپنا

کلام یار سے ثابت دہانِ تنگ ہوا
بتا دیا مجھے عنقا نے آشیاں اپنا

یہ محو ہم ہیں تری یاد میں کہ خود پہ بھی
کبھی گمان ہے تیرا کبھی گماں اپنا

شہید حضرتِ ناسخ کے انتظار میں رفتہ
یہی کلام ہے ہر لحظہ ہر زماں اپنا

دمیکہ یار گذارد قدم بخانۂ ما
سزد کہ کعبہ شود سنگ آستانۂ ما

نام آیا جب آشنائی کا
پھر گلہ کیا ہے بے وفائی کا

شاخ طوبےٰ کا ہاتھ آتا ہے
ہاتھ آنا تری کلائی کا

حال بخت سیاہ کا جو لکھوں
رنگ اُڑ جائے روشنائی کا

بیٹھے کیا ہو چلو شہید کہیں
وقت ہے قسمت آزمائی کا

شکوہ جفاؤں کا نہ دلِ زار نے کیا
سمجھا اسے کرم جو ستم یار نے کیا

دل جلاتا تجھے حاصل ہو صفائے باطن
ہاتھ جلتا نہ اگر یوں یدِ بیضا ہوتا

اثرِ تربیتِ حضرتِ ناسخ ہے شہید
شہرہ کیوں کر نہ بھلا میرے سخن کا ہوتا

ہولی میں سرخ رنگِ رخِ یار ہوگیا
چہرہ گلال ملنے سے گلنار ہوگیا

ہمیشہ عارضِ پرنور بے حجاب رہا
اک آفتابِ قیامت تہِ نقاب رہا

سبک روانِ جہاں سب سے رہتے ہیں بالا
کبھی حباب نہ دریا میں زیرِ آب آیا

اس مرتبہ ہے مجھکو توارد سے تنافر
چھوڑ دیتے قدم نقشِ قدم پر نہیں رکھتا

ساقی کی جدائی نے بنایا مجھے زاہد
اب گھر میں کبھی شیشہ و ساغر نہیں رکھتا

کم ہنڈولے سے نہیں پست و بلندِ آسماں
ہوگیا کوئی تو نیچا کوئی اونچا ہوگیا

اس کے جلوے سے منور ہوگئے دیوار و در
تھا جو روزن میرے گھر میں چشمِ بینا ہوگیا

رشک ہو کیونکر نہ ہر عاشق کو اس انجام پر
تختیوں میں پڑھکے وہ قرآن میرے نام پر

ایکدن اس گل کی آنکھوں کا کیا تھا سامنا
آجتک پتھر پہ پتھر پڑتے ہیں بادام پر

نانِ جو میں پہ کیوں نہ کروں بار بار شکر
مجھسا فقیر اور یہ نعمت ہزار شکر

خواب میں آکے وہ بت کہتا ہے
دیکھ لے دولتِ بیدار ہوں میں

دل روشن کا پھنسنا یاد آیا زلفِ پیچاں میں
اگر جگنو کبھی چمکا شبِ تاریکِ ہجراں میں

لگائے وار اس شیریں ادا نے مجھ پہ ہنس ہنس کر
نمک کی جا بھروں شکر دہانِ زخمِ خنداں میں

کب ترے در پہ اژدہام نہیں
حشر کس روز زیرِ بام نہیں

تنِ پرنور اس کو کہتے ہیں
سایہ تک بھی سیاہ فام نہیں

ساقیا نت پئیں گے چلو سے
ہاتھ تو ہیں بلا سے جام نہیں

ایک دم لگتی نہیں اپنی پلک سے اب پلک
کس کی یارب طالبِ دیدار آنکھیں ہوگئیں

میں کہاں بارِ غمِ فرقتِ احباب کہاں — صدمۂ ہجر اٹھاؤں یہ مجھے تاب کہاں
یہی کہتے ہوئے ساتھ انکے چلے جاتے ہیں — لئے جاتے ہو ہمارا دل بیتاب کہاں

کس نے چھپا لیا رُخ روشن نقاب میں — فرق آگیا ہے روشنی آفتاب میں
کس طرح کوئی اُن سے بر آئے کلام میں — کہئے جو ایک بات تو وہ دیں جواب دو

قدر کیا جنّت میں ہوگی نیر کے آگے حور کی — رُخ ترا سب کو دکھائے گا تجلّی طور کی

یہ بھی کہا نہ یار نے منہ سے کہ بیٹھ جا — شرمندگی کمال ہوئی جا کے سامنے
اس پیار کی نگاہ سے دیکھا کہ مر گیا — مجنوں جو آگیا کبھی لیلےٰ کے سامنے

رات دن درد کش ساقی مخمور رہے — نشۂ آنکھوں میں رہا نشہ میں ہم چور رہے

بچایا فلسفی کو آپ نے کس کس توہّم سے — دہن تھا شکل نقطہ خط بنا موجِ تبسم سے
ترے دست نگاریں کا کہاں مضمون باندھا ہے — نکالی ہے نئی رنگت کی مچھلی بحرِ قلزم سے

لب پر آئے گی جو میری داستاں — بزم ساری نوحہ گر ہو جائے گی

شہید:- جناب میر احمد علی خاں صاحب شاگرد رشید حضرت شاہ نصیر دہلوی۔ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے۔ آب و دانہ کی کشش نے دکن میں پہنچا دیا۔ اور پھر یہ وہیں ہو رہے۔ حضرت ذوقؔ کے ہمعصر تھے۔ اشعار مزیدار ہوتے ہیں محاورات کی خوبی اور مضمون کی خوش اسلوبی دل نشین ہے۔ طبیعت جدّت آفریں۔ قدیم مضامین کو نیا جامہ پہنایا ہے۔ زبان و تخئیل میں وہی زمزمے ہیں۔ جو حاتم اور سودا کی زبان پر تھے۔ ادائے بیان کی لطافت نے ان کو دلفریب بنا دیا ہے ۱۲۷۰ھ میں بعہد نواب سکندر جاہ مرحوم دکن میں موجود تھے۔ رؤسائے حیدر آباد کی قدر دانی سے سرفراز اور دربار میں ممتاز تھے۔ "میر الشعرا" کا خطاب پایا تھا۔

دیوان ۱۳۰۹ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کا تاریخی نام نظم شہید ہے۔ ان کو متروکات کا بیشتر لحاظ تھا۔ ٹک۔ تلک۔ متروک الاستعمال الفاظ کلام میں

یں ہیں تو سہی مگر خال خال - انتخاب یہ ہے ؎

اعضا ہیں سڈول ایسے کہ صناعِ ازل نے ۔۔۔ سلانچے میں ہی قدرت کے تری جسم کو ڈھالا

نوکِ سرِ ہر خار گلِ باغِ ارم ہے ۔۔۔ جس دشت میں پھوٹا ہی مرے پاؤں کا چھالا

ہے تنِ کاہیدہ کو کتنا غنیمت رنگِ زرد ۔۔۔ ہر قدم پر ہے تماشا کہربا و کاہ کا

وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا ۔۔۔ اس کے گھر میرا آنا جانا تھا

یار کی چشمِ مست کے آگے ۔۔۔ پانی پانی شراب خانہ تھا

یادِ رُخ نے صورتِ آئینہ حیران کر دیا ۔۔۔ فکر نے زلفِ پریشاں کی ۔ پریشان کر دیا

باعثِ رونق تھی جب ہم سے قفس آباد تھا ۔۔۔ داغِ دل اپنا چراغِ خانۂ صیاد تھا

دیوانہ ہوں ساقی تری جادو نظری کا ۔۔۔ جلوہ نظر آیا مجھے شیشہ میں پری کا

اُڑ تو بھی کہ جاتا ہے اُڑا رنگ ہمارا ۔۔۔ اے ہوش ارادہ ہے اگر ہم سفری کا

ہستی ہے شہید اہلِ سخن کی تو سخن سے ۔۔۔ گر میں نہ رہونگا مرا دیوان رہیگا

تری تلاش ہیں آئے عدم سے ہم یاں تک ۔۔۔ وگرنہ ہستی ناپائدار میں کیا تھا

زخموں سے تن بنا ہے مرا صورتِ چمن ۔۔۔ داغوں سے سینہ تختہ ہے اک لالہ زار کا

نام کو ہر چند زندہ ہوں مگر بے جان ہوں ۔۔۔ ایک عالم ہے مرا اور طائرِ تصویر کا

جوں عکسِ چراغاں ہو تہ آب نمایاں ۔۔۔ یوں جامۂ آبی میں ہے رنگ اسکی بدن کا

ڈروں میں کس لئے رنجش سے پیار میں کیا تھا ۔۔۔ میں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا

اے وائے ہم آپ ہو گئے گم ۔۔۔ لیکن نہ ملا سراغ دل کا

جلوہ عارض پہ ہے اُسکی زلفِ مشکیں فام کا ۔۔۔ سر زمیں پہ روم کے اُترا ہے لشکر شام کا

ناصح خدا کے واسطے جا اپنی راہ لے ۔۔۔ بیٹھا ہے کیوں عبث مری چھاتی کا سل بنا

کشتہ تو ہیں سب آپکے پر ہے یہی حسرت ۔۔۔ میں کشتۂ شمشیرِ تغافل نظر آیا

تجھ کو لطیف طبع کیا شکل بوئے گل ۔۔۔ مجھ کو برنگِ بادِ صبا دربدر کیا

طرز اس تری غزل کی نئی دیکھکر شہید
یاروں نے وجد کیا کہوں میں کسقدر کیا

شہ نصیر اک مرا اُستادِ یگانہ ہے شہید
میرے اشعار میں اُستاد کا ڈھنگ آہی گیا

کب دل میں ترے خال کا سودا نہیں آتا
کب گانو میں گوکل کے کنھیا نہیں آتا

کہتے ہیں جسے عشق حقیقت میں خدا نے
ہے نورِ خدا قالبِ انسان میں ڈالا

ہے طرز کہنہ شعر کی اب مجھ سے تو شہید
مضمون نئے زباں نئی ہے سخن نیا

تلاشِ دیں نہ رہی فکر دنیوی کے سبب
بتوں کو چھوڑیئے اب کس لئے خدا تو گیا

کان کے بالے میں دُر ملتا ہے اُس مغرور کا
جھولتا ہے جیسے گہوارے میں بچہ حُور کا

تیرے قامت نے کیا خوب ہی سیدھا اسکو
سروِ گلشن کو بہت دعویٰ رعنائی تھا

ہم ہوں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کب ہو جنّت میں گذر ہم سے گنہگاروں کا

حلقۂ گیسو سے اس کے سبزۂ خط کو کیا گزند
جب زمرد پر نظر کی سانپ اندھا ہو گیا

جب چمن میں یاد آیا ساقیِ توبہ شکن
ساغرِ مے گل بنا اور سروِ مینا ہو گیا

دیکھا نہ باغ حیف یہ پھُولا پھلا ہُوا
ہیں فصلِ گل کے بعد قفس سے رہا ہُوا

مجھکو کلام دوست کو افسانہ کیا ضرور
کیوں غیر کی سُنے دل دیوانہ کیا ضرور

چل دیئے صبر و خرد بیتابیِ دل دیکھ کر
راہ لی ہمراہیوں نے وقتِ مشکل دیکھکر

کیا ذکر ہے ناصح مرے دامانِ قبا کا
وحشت میں کروں چاک گریبان سحر تک

مرنا مرا سُن وہ شوخ بیباک
کہنے لگا "خس کم و جہاں پاک"

سیر اک جہاں کی کرتے ہیں دل کے مکاں میں ہم
اُڑتے ہیں شکلِ مرغِ نظر آشیاں میں ہم

آنکھوں سے منفعل ہے رواں کاروانِ اشک
یوسف کیطرح رہتے ہیں اب کارواں میں ہم

تقلید کب پہنچتی ہے تحقیق کو شہید
ہندی ہیں شعر کہتے ہیں ہندی زباں میں ہم

بتوں کو کیا کوئی الزام دے کہ ہے معدوم
وفا کی جنس خدائی کے کارخانے میں

جو تیرے جی میں آئے سو تو کہہ لے ناصحا
ہم کو کہاں دماغ کہ ہم گفتگو کریں

کانٹے پڑے اب سوزِ دروں سے ہیں زباں میں
جوں شمع ہے آتش مرے تارِ رگِ جاں میں

آرزو اچھی ہے وصلِ یار کی
اور کوئی آرزو اچھی نہیں

تری تلاش میں ہیں سب کے سب نہ ایک نہ دو
تمام رکھتے ہیں تیری طلب نہ ایک نہ دو

غنچہ و گل سے غرض کیا مرغِ حسرت زاد کو
آنکھ جب کھولی تو دیکھا صورتِ صیاد کو

منظور ہے گر مشقِ ستم اور زیادہ
کیجے سرِ عشاق قلم اور زیادہ

کیا نغمہ و ترانہ ہو کیا شاہد و شراب
جو کچھ تمہیں حرام ہے ہم کو حلال ہے

کم قیامت ہے اس کے قامت سے
ہے دوبالا وہ قد قیامت سے

ہوش اڑتے ہیں مستی میں تری جلوہ گری سے
نسبت جو تجھے مے سے تو مے کو ہے پری سے

حضرتِ دل تم کو قاصد جان کر بھیجا وہاں
کیا قیامت ہو کہ تم جا کر وہیں کے ہو رہے

غیر حالت تری اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
سانس لینی تجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

دیکھا تو حسن و عشق میں الفت کمال ہے
یاں دل پہ داغ ہے تو وہاں رخ پہ خال ہے

شہید

شہید:- مچھن صاحب۔ باشندہ لکھنؤ شاگرد حضرت جاوید لکھنوی یہ شعر ان کے ہیں۔

میری قسمت کی برائی سب پہ ظاہر ہو گئی
نام جس نے لے لیا میرا اسے بھی غم ہوا

خوگرِ ایذا ہوا اک مدت سے ہے بیمارِ ہجر
درد جتنا بڑھ گیا اس کو بھی سمجھا کم ہوا

حالِ دل کہنا ہو جو کچھ ان سے کہہ لے اے شہید
رحم کی چتون بتاتی ہے کہ غصہ کم ہوا

شہید

شہید:- مولوی مولانا صبغت اللہ۔ علمائے فرنگی محل کے خاندان سے ہیں عربی میں معقول استعداد ہے۔ آپ دینی اور قومی کاموں سے نہایت دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس وقت (۱۹۳۲ء) عمر ۳۵ سال کے قریب ہے۔ کچھ زمانہ تک اخبار خادم الحرمین کی ادارت فرمائی ہے۔ فن شعر میں جناب آرزو لکھنوی سے تلمذ ہے۔

چھپو نہ تیغِ ادا کی جھلک دکھا کے مجھے
نہیں شہیدوں میں ملنا لہو لگا کے مجھے

بھٹکتا پھرتا ہے صحرا نورد عشق ابتک	خضر بھی بھاگ گئے راستہ بھلا کے مجھے
شہید جن کی کدورت گئی نہ تا دمِ مرگ	وہ آج روتے ہیں کیوں خاک میں ملا کے مجھے

شہید

شہید:۔ مولوی غلام امام صاحب شاگرد مرزا قتیل و مصحفی۔ باشندہ امیٹھی ضلع لکھنؤ۔ آپکے والد مشہور مشائخ سے تھے۔ آپ نے آغا اسمٰعیل مازندرانی سے عروض علمِ معانی کی کتابیں پڑھیں۔ زبان فارسی میں پوری استعداد تھی۔ صنائع بدائع پر عبور تھا۔ فارسی میں صاحب دیوان تھے۔ انکو اپنی فارسی دانی پہ ناز تھا۔ مگر حضرت غالبؔ مرحوم نے اپنے ایک شاگرد کو خط لکھتے ہوئے ان کے کلام پر کوئی عمدہ رائے ظاہر نہیں کی ہے کبھی کبھی اُردو زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔ اُردو نثر میں روضۂ تاج گنج کی تعریف خوب لکھی ہے۔ انشائے بہار بے خزاں۔ مولود شریف۔ رمز الشہادتین۔ آپ کی تصنیفات سے ہیں۔ اور مقبول خاص و عام ہیں۔ آغا سید محمد اصفہانی اور مرزا ناطق مکرانی کے ہمعصر و ہم مشاعرہ تھے قتیل اور مصحفی کے علاوہ شیخ غلام مینا ساحرؔ سے بھی استفادہ حاصل کیا تھا۔ الہ آباد میں عہدۂ پیشکاری صدر ر۔ نظامت پہ فائز تھے اپنے گھر پر مجلس میلاد کرتے اور تازہ نعتیہ کلام نہایت خوش الحانی سے پڑھتے۔ نواب محی الدولہ بہادر نے ان کے نعتیہ کلام کی شہرت سُنی تو ایک ہزار روپیہ زاد راہ بھیجکر حیدرآباد دکن میں بلایا۔ آپ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد وہاں تشریف لے گئے۔ سرکار نظام سے چار سو روپیہ ماہوار آپ کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔ جب آپ نے دکن سے حج کا عزم کیا۔ تو راجہ گردھاری پرشاد باقی نے زاد راہ اپنی جیب خاص سے مرحمت فرمایا۔ اور پانچسو روپیہ نواب سرسالار جنگ نے عطا کئے۔ نواب کلب علیخاں خلد آشیاں بھی آپ کی قدر فرماتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ اس عالم فانی سے سفر آخرت کیا۔

آپ کا اُردو کلام نعتیہ دستیاب ہوا۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

بند اوّل از ترجیع بند

قدِ رعنا کی ادا جامۂ زیبا کی پھبن
سرمہ گیں آنکھ غضب ناز بھری وہ چتون
وہ عمامے کی سجاوٹ وہ جبین روشن
اور وہ مکھڑے کی تجلّی وہ بیاضِ گردن
وہ عبائے عربی اور وہ نیچا دامن
دلربا یانہ وہ رفتار وہ بلیساختہ پن
مُردہ بھی دیکھے تو کر چاک گریبان کفن
اُٹھ چلے قبر سے بیتاب زباں پر یہ سخن
مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

بند مخمسہ بر غزل خسرو

ہے ختم تیری ذات پر اوصافِ امت پروری
اللہ کے محبوب سے کس کو مجال ہمسری
پائی ہے کس محبوب نے یہ دلبری یہ سروری
نواز پری چابک تری وز برگِ گل نازک تری
وز ہر چہ گویم بہتری حقّا عجائب دلبری

ہمسر نہیں تیرا کوئی حور و ملک جنّ و بشر
مکھڑے سے تیرے سر بسر نورِ خدا ہے جلوہ گر
لیکن چراغِ مہر کر ڈھونڈے فلک بھی دربدر
ہرگز نیاید در نظر صورت ز رویت خوبتر
شمسی ندانم یا قمر یا زہرۂ یا مشتری

از قصۂ حضرت حلیمہ سعدیہ

ایک عاشق تھی حلیمہؓ دائی
جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی
اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
یعنی اُس شاہ کو لائی گھر میں
نور اللہ کو لائی گھر میں
واہ کیا طالع بیدار ملے
جس کو کونین کا سردار ملے
نور سے کیوں نہ ہو معمور وہ گھر
جلوہ افزا ہو جہاں پیغمبر
کس طرح گھر نہ ہو وہ نورانی
جس کی جبرئیل کرے دربانی

آستانہ ہُوا وہ شام و سحر
سجدہ گاہِ ملک و جنّ و بشر

در و دیوار سے آتی تھی صدا
کہ حلیمہ پہ ہُوا فضلِ خدا

شکر کرتی تھی خدا کا پیہم
کہ نہ تھے مستحق اس فضل کے ہم

حق نے بخشی مجھے دولت یہ عجیب
مجھ حلیمہؓ کے کہاں تھے یہ نصیب

دُودھ اُس گل کو پلاتی تھی وہ
گل سی پھولی نہ سماتی تھی وہ

کبھی مکھڑے کی بلائیں لیتی
صدقے ہو ہو کے دعائیں دیتی

کبھی صورت کا تماشا کرتی
ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کرتی

چومتی تھی کبھی پیشانی کو
کبھی اُس چہرۂ نورانی کو

کبھی نہلاتی تھی خوش ہو ہو کر
پانی پیتی تھی قدم دھو دھو کر

اسی قصّہ کا آخری حصّہ

بہرِ محبوب تھا آنا جانا
واہ کیا خوب تھا آنا جانا

یاں نہ آنا ہے نہ جانا بنتا
نہ تو رہنے کا ٹھکانا بنتا

حرصِ دنیا کے جو پابند ہیں ہم
دل سنبھلتا نہیں معذور ہیں ہم

ہم کو واں جانے کا مقدور نہیں
وہ اگر چاہیں تو کچھ دور نہیں

کون حالِ دلِ ناشاد سُنے
بیکسوں کی وُہی فریاد سُنے

آستانے پہ بلائے ہم کو
اپنا دیدار دکھائے ہم کو

از قصّہ اسٹن حنانہ

واں ملک مائلِ نظارہ ہُوا
یاں جگر غم سے پارہ پارہ ہُوا

ساری رونق گئی نگار کے ساتھ
رنگ جاتا رہا بہار کے ساتھ

جب وہ جھمگھٹ گیا رقیب کی پاس
کون آتا ہے پھر غریب کے پاس

نہ ملی جب سعادتِ پابوس
دل سے بولا کہ صد ہزار افسوس

ہیں نے جس کے لئے وطن چھوڑا
اُس نے صد حیف مجھ سے منہ موڑا

سر پہ آرا چلا تبر کھایا
نخل سے کٹ کے یہ ثمر پایا

گھر بھی چھوٹا دیار بھی چھوٹا
کیا ستم ہے کہ یار بھی چھوٹا

کچھ تو مجھ سے ہوئی ہے ایسی خطا
کہ جُدا ہو گیا وہ مہر لقا

کچھ تو ایسا ہُوا ہے مجھ سے گناہ
کہ خفا ہو گیا وہ غیرت ماہ

کچھ تو ایسا ہُوا ہے مجھ سے قصور
کہ ہُوا اُس نگار سے مہجور

کچھ تو ایسی ہی میں نے کی تقصیر
کہ ہوئی میرے حق میں یوں تعزیر

کیا کروں بے بسی سے ہوں مجبور
کہ زمیں سخت آسماں ہے دور

شہید:- مولوی فخر الدین حسین خاں۔ وطن شاہجہان پور تھا۔ غدر سے پیشتر شاہجہان آباد میں مسکن اختیار کر لیا تھا۔ فارسی و اُردو میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ مرزا شاہرخ خلف بہادر شاہ کی اُستادی کے وسیلے سے دفتر شاہی کے عہدہ سررشتہ داری پر ممتاز ہوئے۔ خوش اخلاق و مرجع ارباب تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔ کلام یہ ہے:-

شہید

سینہ ہے آئینہ مرا اس میں ہے تیرا خیال
دل نے تیری شکل کا اک دوسرا پیدا کیا

وہ تپش ہے میرے نامہ میں کہ بس تڑپا کیا
جب تلک بال کبوتر سے نہ اس کو وا کیا

مرغ دل چہرہ گلفام کو گلشن سمجھا
حلقۂ کاکل پیچاں کو نشیمن سمجھا

ہوا سینہ میں آتش زن تصوّر کس کے عارض کا
کہ چھالا داغ دل کا رشک ہے خورشید تاباں کا

شہید:- شیو مرزا کے ایک عزیز کا تخلص ہے۔ نام معلوم نہ ہوا۔ کلام سے پختگی ٹپکتی ہے۔ کلام یہ ہے:-

بہار آخر ہوئی جب ہم ہوئے آزاد یا قسمت
گئے برباد اپنے نالہ و فریاد یا قسمت
شہید آخر مقرر تھا ہمیں حسرت میں جی دینا
ہمارے سر پہ آکر پھر گیا جلاد یا قسمت

شہید:- مولوی سید حسن مجتبیٰ لکھنوی۔ حضرت خورشید کے برادر عم زاد و شاگرد تھے۔ شاعر خوش فکر تھے۔ زبان شستہ ہے۔ ۱۹۲۸ء کے قریب انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:-

جوش وحشت میں جو پڑ جائیگی مجنوں کی نگاہ
محمل لیلےٰ کا پردہ دھجیاں ہو جائے گا
ذکر عصیاں پر جھکالوں گا جو میں سر حشر میں
کیا مرا مالک نہ مجھ پر مہرباں ہو جائے گا
غیر سے کہتے رہے جو میرے غم کی داستاں
دیکھئے کس کی زباں پر کس کا افسانہ رہا
اس طرح سے گذر گئی اے دل شب وصال
جس طرح دیکھتے ہیں کوئی چیز خواب میں

بُرائی آگئی جب ان کے جی میں
تو خاک اچھے رہے ہم عاشقی میں
اثر تیرا کبھی کم ہو نہ اے عشق
رہوں میں ہوش میں یا بیخودی میں
شہید بے نوا کا پوچھنا کیا
پڑا ہوگا وہ دلبر کی گلی میں

وفا کا دھیان جفا میں جو ہو ستمگر کو
ٹھہر ٹھہر کے پھرائے گلے پہ خنجر کو
دل عاشقوں کے اس سے نکلتے نہیں کبھی
کیا پیچ ان کی زلف شکن در شکن میں ہے
جل کے بھی صدقہ قدم پر شمع کے پروانہ ہے
اس کو جرأت کہتے ہیں یہ ہمت مردانہ ہے
ساربان نے جب کہا لیلیٰ سے کچھ کہتا ہے قیس
آئی محمل سے صدا بکنے دے یہ دیوانہ ہے
کیں صلح کی باتیں مری بالیں پہ دم نزع
پھر ٹال دیا موت کو بہلا کے کسی نے

شہید:- سید نور شہید از فرزندان سید محمد شاہ جہان آبادی۔ قدرت اللہ شوق کے زمانہ میں حیات تھے۔ افسوس ہے کہ زیادہ حال دریافت نہ ہو سکا۔

آتا ہے مجھ پہ درد کو بے اختیار درد
روتا ہے دیکھ حال مرا زار زار درد
میں نہ مرتا بلبلوں کے آشیاں ہوتے خراب
کچھ بھی ہوتی باغباں سے گر شناسائی مجھے

شہید۔ مولوی سید احسن صاحب نقوی۔ رئیس شمس آباد ضلع فرخ آباد ڈی۔ ٹی۔ ایس۔ آفس ٹونڈلہ میں ہیڈ کلرک تھے۔ طبیعت قدرتاً شاعری کیطرف مائل تھی۔ عرصۂ دراز سے کچھ حال معلوم نہیں ہوا۔ دورانِ قیام کانپور میں حضرت ناطق لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا۔ شعر میں جذبات غم کا اظہار زیادہ تر ہوتا ہے کلام یہ ہے:-

یہ قیدِ فصلِ گل کاٹے نہیں کٹتی ہے زنداں میں
ہمیں زندہ ہی چُن دیگر کوئی دیوار گلستاں میں

کرامت تھی کہ حکمت تھی تری زلفِ پریشاں میں
اِدھر سُونگھا اُدھر جاں آگئی بیمارِ ہجراں میں

ذرا اے چلنے والے پاؤں رکھ آہستہ آہستہ
شہید ناز محوِ خواب ہے گورِ غریباں میں

ہو چکی صحت عیادت کے لئے وہ آچکے
دم کوئی دم کا ہے اب مہمان تنِ بیمار میں

تم کو دیکھا جان میں بیمار کے جان آگئی
قطرۂ آبِ بقا ہے شربتِ دیدار میں

چاند سے رخسار کے بوسے لئے ہیں زلف نے
دیکھئے کیا دوستی ہے کافر و دیندار میں

ایک تو ہے ہجر کے صدمے اٹھاتا ہے شہید
ایک بُلبل ہے لئے پھرتی ہے گُل منقار میں

میں تکتا ہوں نہیں حسرت سے وہ آنسو بہاتی ہیں
محبت کا مزہ آیا ہے وقتِ واپسیں مجھکو

تصوّر میں جو اُس کوچہ کے آنکھیں بند کرتا ہوں
دکھا دیتا ہے دل تصویرِ فردوسِ بریں مجھکو

وہ مشتاقِ شہادت ہوں گلا خود رکھدوں خنجر پر
مری ہمت پہ قاتل بھی کہے صد آفریں مجھکو

اگر لیجائے قسمت روضۂ شاہِ شہیداں تک
شہید آئے نظر دنیا ہی میں خلدِ بریں مجھکو

ادائے قتل بھی ان کی ادائے دلنشیں ہوتی
چھری چلتی گلے پر لب پہ میرے آفریں ہوتی

میں تکتا ہوں نہیں حسرت سے وہ آنسو بہاتی ہیں
ٹھہر جا موت شوقِ دید کی سیری نہیں ہوتی

وہ بولا محشر میں آتے خود خدا کو اُن پہ پیار آتا
حیا سے سر جھکا ہوتا نگاہ شرمگیں ہوتی

شہید ناز کی کیا موت تھی وہ خود یہ کہتی ہیں
بہت ہوتی ہیں موتیں موت پر ایسی نہیں ہوتی

کفن میں شرم نے منہ اپنا ہم چھپائے ہوئے
تصور تک گئے صورت نئی بنائے ہوئے

ہمارے پاس نہیں کوئی شئے تبرک کے قابل
دل و جگر ہیں سو وہ بھی جلے جلائے ہوئے

کرم سے عفو سے خاطر ہو مرنے والوں کی
الٰہی آئے ہیں مہماں ترے بلائے ہوئے

کہاں کا دعویٰ خوں حشر میں یہ اور ہے حشر
کھڑے ہیں سامنے میرے وہ سر جھکائے ہوئے

شہید موت مبارک کہ زندگی ہے یہی
وہ تیری قبر کو سینے سے ہیں لگائے ہوئے

شہید: محمد باقر طہرانی الاصل تھے۔ گجرات میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۸۵ھ میں اورنگ آباد میں قیام تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ عہد عتیق کی زبان ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

غنیم نفس کو ہرگز نہ دے دستِ تصرّف توں
خدا کیواسطے ایدل شرم رکھ اپنی بستی کا

توں قانونِ عمل کا تار مت توڑ
کمر طاعت سوں خم کر چنگ ہو جا

شہید اس نفس کافر کیش کو مار
حقیقت کا مظہر جنگ ہو جا

شہید اوراق ہستی جمع کر جیوں بیٹرہ پاں توں
یہ رنگیں بھیس سوں شاید کہ معنی یار کو پہنچے

شہیدی: منشی کرامت علیخاں شہیدی۔ باشندہ موضع ہڑیاپور ضلع اناؤ صوبہ اودھ۔ عروض اور حساب کے علم میں لاجواب تھے۔ ان کے والد ایک ہوشیار اور قابل معلّم تھے۔ راجہ ٹکیٹ رائے جو لکھنؤ کے قدیم رؤسا میں نامور تھے۔ فارسی میں حضرت شہیدی کے والد کے شاگرد تھے۔ شہیدی عالم شباب میں لکھنؤ تشریف لیگئے یہ وہ زمانہ تھا کہ شیخ ناسخ کی اُستادی کا عَلَم شہرت بلند ہو رہا تھا۔ آپ نے شیخ صاحب سے ملاقات کرنی چاہی۔ وہ غرور بیجا اور تفاخر سے ایک نوجوان شوخ مزاج شاعر کو دھیان میں نہ لائے۔ اور اپنی زیارت سے محروم رکھا۔ یہ نہایت آزردہ ہوئے۔ شیخ صاحب کے ملازم سے دیوان منگوایا اور اسی وقت ان کی مشہور غزل پہ غزل کہی اور وہ وہیں چھوڑ کر چلدئے۔ غزل مذکورہ کا مطلع یہ ہے۔ ؎

مرا سینہ ہے مشرق بود و باشِ شیر یزداں کا
فضائے لامکاں سی قرب ہے میری نیستاں کا

شیخ صاحب نے ہرچند تلاش کیا۔ مگر پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ صرف اتنی سی بات ہے جس پر تذکرہ نگاروں نے طرح طرح کے حاشئے چڑھائے ہیں۔ اور شہیدی کو ناسخ کا شاگرد مشہور کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ابتدا میں مصحفی کے شاگرد تھے۔ اور بزمانۂ آمد و رفت دہلی چند غزلوں میں

شہید

شہیدی

شاہ نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی۔ شاہ صاحب کی ایک غزل پر ایک مخمس بھی ان کا موجود ہے۔
"سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ فقیرانہ لباس میں کئی بار دہلی آئے مشاعروں میں طبع خداداد کے جوہر دکھلائے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک انگریز کے منشی مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ دہلی میں وارد ہوئے۔ ان کا قیام اکثر پنجاب و گجرات میں رہا ہے۔ کبھی کبھی دلی میں آجاتے ۱۸۵۰ء میں شیفتہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ "مردے بے تکلف وارستہ مزاج۔ وسیع المشرب اور آزادانہ زندگی بسر کرنے والا ہے"۔
آغاز شباب میں عشق مجازی کے مرد میدان تھے۔ بقول فرانسیسی تذکرہ نگار گارساں دتاسی۔ یہ ایک لڑکے گنگا پرشاد پر عاشق تھے۔ اور ذوقِ محبت میں اس کو خدائی اختیارات دیدئے تھے۔ وہ ان کی نگاہ میں قدرت کے تمام کاموں پر حکمران تھا۔ ہر ایک کتاب پر جو ان کی ملکیت تھی بجائے بسم اللہ اور یا فتاح کے گنگا پرشاد کا نام لکھ دیا کرتے۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہیدی نرگس شہلا، چشم غزالاں سے صرف عالم خیال میں متاثر نہ ہوئے۔ بلکہ عشق کے حقیقی جذبات اور دلی واردات کو اپنی شاعری میں ظاہر کرتے اور بہ فحوائے ع ۔ جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا۔
سیرگاہ مجاز کے بعد طریقِ فقراء اختیار کر لیا۔ بریلی میں عرصہ تک کمبل پوش بن کر رہے۔ بعض لوگوں کو ان کی کرامت کا بھی عقیدہ ہے ۱۲۵۵ھ میں سفر حجاز طے کرتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے اور ادائے حج کے بعد مدینۂ منورہ کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ چہارم صفر ۱۲۵۶ھ کو ابھی مدینے کے قرب وجوار ہی میں تھے کہ دُور سے گنبد روضۂ مبارک کو دیکھ کر عالم بیتابی میں رحلت فرمائی۔ اپنے بزرگانِ مذہب کی ستائش ہر قوم کی شاعری میں داخل ہے۔ نعت میں عجم و عرب کے شعرا کی طرح شہیدی نے بھی نام پایا ہے۔ اور وہ ہندوستان کے پہلے نعت گو شاعر ہیں جن کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور بلا کا اثر ہے۔ ان کے کامل شاعر ہونے

میں کلام نہیں۔ آپ کی شاعری کا زمانہ عہد قدیم سے بہت متصل تھا۔ اس لئے کہیں کہیں پرانے الفاظ نظر آتے ہیں۔ مگر درد اور عاشقانہ مضامین کے تیر ونشتر دل میں چبھ جاتے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے :۔

چمن پیرائے کن فرّاش جسکی بزم رنگیں میں
بہار آفرینش ایک بوٹا اسکی مسند کا

تمنّا ہے درختوں پر ترے روضہ کی جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقیّد کا

شوق وصال سینہ میں آزار بن گیا
میں خواہش طبیب میں بیمار بن گیا

معرکہ میں عاشقی کی فتح اسکے نام ہے
خنجر بیداد سے جو خستہ تن ٹکڑے ہوا

عبث رنج دیتا ہے تو مجھکو ناصح
نہ ہوگا یہ سودا بھی جب سر نہ ہوگا

دل سی دلدار ہے جب دل نہیں کیسا دلدار
جاں سے جاناں ہی چلی جان تو جاناں کیسا

مینہ کے بدلے مے برستی کوسوں میخانے کی گرد
گر مرا ساقی دعائے ابر رحمت مانگتا

عشق میں ہی بار ناموس دو عالم میرے سر
ضعف سی ملتی تو میں تھوڑی سی مہلت مانگتا

ہو کے رخصت کیا خجل بیٹھا ہوں انکی بزم میں
کاش پہلے اپنے دل سی میں اجازت مانگتا

یہی نماز جماعت ہے رندوں کی زاہد
کہ جھکتے ہیں جھکے جس دم امام شیشہ کا

جس کو سینہ سے نکالا تو نے پیکاں جانکر
دل ہی اے قاتل وہ تیرے عاشق دلگیر کا

ہو چلا خنجر بیداد سے بسمل ٹھنڈا
لے ہوا اب تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

سینہ پر مہندی بھرے ہاتھو نکو رکھکر بولا
لے شہیدی۔ ترا بس اب تو ہوا دل ٹھنڈا

غیر کے کہنے پہ ناداں مجھ سے بدظن ہو گیا
جھوٹ کو بھی کیا اثر ہے دوست دشمن ہو گیا

دل نے رسوا چار سُو ہم کو کیا
دربدر اور کُو بکو ہم کو کیا

گذر جی سے اگر طالب ہے عمر جاودانی کا
چھپا ہے گور کی ظلمت میں چشمہ زندگانی کا

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

ادب نہ وادی وحشت کی مجھ سی ترک ہوئے
جنوں میں ہوش رہا ہے برہنہ پائی کا

لذت قتل سے آگاہ جو قاتل ہوتا | اپنے خنجر کے تلے آپ ہی بسمل ہوتا

عام ہیں اسکے تو الطاف شہیدی سب پر | تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

گر ہمارے میکدے میں ہو گذر | خم کے بدلے توبہ توڑے محتسب

پہلو میں تپش دل کو ہے بسمل کے برابر | بسمل بھی نہ تڑپے گا مرے دل کے برابر

اسقدر ظالم نہیں ہیں قابل آزار ہم | اب ترے دشمن ہی آخر کبھی تھے یار ہم

کہتے ہیں وہ دیکھنا ہم کو بہت اچھا نہیں | ان سے کہدو آپ بھی آئینہ کم دیکھا کریں

عاشقوں پر اسقدر ظلم و ستم اچھا نہیں | دیکھ اے ظالم کہے دیتے ہیں ہم اچھا نہیں

کی ہے وحشت کر دنوں میں ہم نے اک عالم کی سیر | یار کے کوچہ سے کچھ باغ ارم اچھا نہیں

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری | اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

قطعہ

اک روز میں نے پوچھا کہ اے جان بے سبب | آزردہ خاطروں کے ستانے سے فائدہ

بولے کہ ہاں جی ہاں بڑے بیدادگر ہیں ہم | پر ہم سے دل کسی کو لگانے سے فائدہ

دل کے جانے کا شہیدی حادثہ ایسا نہیں | کچھ نہ روئے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے | دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

جی چاہیگا جسکو اسے چاہا نہ کریں گے | ہم عشق و ہوس کو کبھی یکجا نہ کریں گے

کیوں دل سے نہ مٹ جائیگا اندیشۂ حرماں | جب ہم نے یہ ٹھانی کہ تمنا نہ کریں گے

مشام بلبل میں رشک گل سے ہنوز بو بھی گئی ہے | ابھی وہ نام خدا ہے غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے

بلا کو اسکی خبر ہے کہتے ہیں کسکو معشوق کیا ہے عاشق | ہنوز کانوں میں اس پری کی گفتگو بھی نہیں گئی ہے

شہیدی سے نہیں واقف ہیں ہم اتنا تو واقف ہیں | کوئی راتوں کو یاں کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

شہیدی: سید محمد نوح رئیس مچھلی شہر خلف میر رعایت علی۔ ان کے والد کو خیر خواہی کے صلہ میں سرکار انگریزی سے تین ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر ملی تھی۔ مگر رئیسانہ شان و شوکت کے برقرار رکھنے میں اس کا بڑا حصہ تلف ہوگیا۔ دولت تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے

وہ کس کی ہو کر رہی ہے۔ مگر علم و ہنر عمر بھر انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ سید صاحب موصوف ذی استعداد اور باکمال بزرگ تھے۔ فنِ شعر میں سب سے پہلے خواجہ بادشاہ سفیر خلف خواجہ وزیر لکھنوی سے استفادہ کیا اس کے بعد سید اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی کے شاگرد ہوئے۔ فرخ آباد میں عرصہ تک ان سے مستفید ہوئے۔ کلام میں زور اور طبیعت میں شوخی ہے۔ بندش صاف اور مضامین اعلےٰ ہوتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو

بُرا ہوں میں جبھی تک تم مجھے جبتک نہیں ملتے
جو مل جاؤ تو کوئی مجھ سے اچھا ہو نہیں سکتا

بھلا سُنو تو سہی کیا خطا ہوئی مجھ سی
بتا ئیے تو مجھے کیا قصور میں نے کیا

حُور و کوثر کے بھلاوے میں نہ زاہد آئینگے
تُو نے اسے شیخ کہا اور اُنھیں باور آیا

تم اگر ہو تو لطفِ دنیا ہے
جاں ہے تو جہان ہے گویا

نشانِ خدا بتوں میں جو تُو دیکھتا نہیں
اے شیخ یہ قصور ہے تیری نگاہ کا

اے بُتِ خدا سے مانگوں میں کیونکر دعائے وصل
پتھّر کے نیچے ہاتھ ہے میرا دبا ہُوا

مٹے گا دیدۂ تر سے نصیب کا لکھا
پھر لگا رونے سے پانی میرے مقدّر پر

پردہ میں بھی شوخی و شرارت نہیں جاتی
بجلی سی نظر لڑتی ہے چلمن سے نکل کر

ٹھہر جائے دل۔ جانِ مضطر نہ نکلے
کوئی آکے یہ کہدے وہ آرہے ہیں

ادھر دیکھ اے چشمِ مخمورِ ساقی
ترے مست پھر ہوش میں آرہے ہیں

ہو دیکھنا اگر ستمِ روزگار کو
دیکھو قفس میں مجھ کو چمن میں بہار کو

رکھتے نہیں کسی سے تکدّر ہم اپنا دل
آئینہ میں جگہ نہیں دیتے غبار کو

خرابی جو نہ لکھی ہو مری قسمت میں اب لکھ دو
بڑھا دو اور بھی کچھ تم خطِ تقدیر کے نیچے

میں اس نامہ سے باز آیا میں ایسے خط سے درگذرا
سلام غیر بھی ہے یار کی تحریر کے نیچے

اے شیخ اگر شراب حقیقت میں ہی خراب
تو خاص کیوں کیا اسے جنّت کے واسطے

سچ ہے مریضِ ہجر و محبت کی جان کیا
کیوں کوئی آئے میری عیادت کے واسطے

بہار میکدہ آئیگی حوض کوثر پر
وہاں بھی رند و نکی ٹکڑی الگ جمی ہوگی
وصال حور کی ہے کیوں ہوس تجھو اے شیخ
ارے وہ تجھ سے کہیں عمر میں بڑی ہوگی

عجب انداز ہیں اس خوش ادا کے
کہ شوخی ناز اٹھاتی ہے حیا کے

ہر دم کی بیقراری و فریاد و آہ سے
دل خون ہو کے بہہ گیا آنکھوں کی راہ سے

لب بند ہیں اس چشم فسوں کار کے آگے
عیسیٰ کی بھی چلتی نہیں بیمار کے آگے

گاہک کوئی دل کا ہو تو ہم حال بتائیں
قیمت کہی جاتی ہے خریدار کے آگے

اللہ سلامت رکھے خوبانِ جہاں کو
دنیا میں مزا خلد کا آنا ہے انہیں سے

اُٹھنا درِ جاناں سے تو دشوار ہے یا رب
ہاں سہل یہ ہے تو مجھے دنیا سے اُٹھا لے

دُنیا نہ سہی حشر سہی آج نہیں کل
دیکھیں گے کسی دن تو تمھیں دیکھنے والے

مزا جاتا رہا جینے کا تو جینے سے کیا حاصل
خدا بخشے جوانی ہی نہیں تو زندگی کیسی

رباعی

کچھ نیک عمل نہ بہر انجام کیا
دُنیا کے مزے اڑائے آرام کیا
کھایا پیا۔ سوئے جاگے اُٹھے بیٹھے
کام اتنے کئے مگر نہ کچھ کام کیا

شہیر:- حافظ خان محمد خاں المخاطب بہ افتخار الشعرا۔ ان کے والد مولوی غلام محمد خاں تحصیلدار اضلاع متوسط ریاست رامپور کے باشندے تھے لیکن ملازمت کے باعث زیادہ تر بھوپال میں رہے۔ مرزا غالب کے تلامذہ میں تھے۔ فارسی میں اچھا ملکہ تھا۔ نظم و نثر برجستہ لکھتے۔ جملہ اصناف سخن میں اپنے اُستاد کی پیروی کرتے۔ نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے بیٹوں کے اُستاد رہے تھے۔ شعر کے حسن و قبح کو سمجھتے تھے۔ ان کے ارد گرد شاگردوں کا مجمع رہتا فارسی زیادہ کہتے تھے۔ اُردو کلام جو کچھ دستیاب ہُوا مندرجہ ذیل ہے:-

ہیں نامدار ہجر عدو کا مگار وصل
وہ کام کر گیا ہے تو وہ نام کر گیا

پوچھو نہ اہلِ عشق کو کیا ہیں کہاں کے ہیں
اچھے ہیں جس طرح کے ہیں جو ہیں جہاں کے ہیں

غیر تھا بدمستِ مے ہم کامیاب
یار بھی قسمت سے اچھے پڑے ہے

بزمِ جاناں میں جو جاتا ہوں تو فرماتے ہیں
ایک یہ بھی مرے ایّام کی شامت آئی

شہیر

شہیر محمد یعقوب علی خاں خلف محمد جعفر علی خاں باشندۂ ریاست رامپور یہ شعر ان کے ہیں:

کیوں باغ میں چلتے ہو ادا سے
کیوں ملتے ہو دل کلی کلی کا

حیا سے تم جو چھپتے ہو چھپو آ کر مرے دل میں
کہ اس سی کوئی خلوت خانہ اچھا ہو نہیں سکتا

وہ مجھ سے پوچھتے تیری دل میں آرزو کیا ہے
کہوں کیا مجھ سے اظہارِ تمنّا ہو نہیں سکتا

شیخ

شیخ شیخ مصطفےٰ حسین قوم شیخ قریشی ولد شیخ مرتضےٰ حسین مرحوم۔ وطن قدیم لکھنؤ۔ عمر تخمیناً ۳۵ سال۔ تعلیم ابتدائی مدرسۂ ناظمیہ چاہ کنکر لکھنؤ میں پائی۔ جو اب ناظمیہ کالج کے نام سے مشہور ہے۔ بعدہٗ جناب احسن مرزا صاحب شرر لکھنوی مصنّف کتاب "فلسفہ صرف و نحو" سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ۲۲ سال تک شہزادی مکرمہ منیر النساء نواب بادشاہ بہو صاحبہ مرحوم کے ہاں ملازم رہے۔ اب بارہ سال سے ایک نرس ری کے کارخانہ میں ملازم ہیں۔ ڈیوڑھی چھوٹی شہزادی صاحبہ مرحومہ میں رہتے ہیں۔ شعر گوئی کا ذوق ہے کلام احدیت طرز سے معصوم ہے پھر بھی بعض شعر بہت اچھے کہتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہائے کس ظالم سے یارانہ ہوا
جو نہ اپنا اور نہ بیگانا ہوا

نشۂ ہستی سے غافل ہوشیار
عمر کا لبریز پیمانہ ہوا

ہنس کے فرماتے ہیں مجکو یاد ہیں
قیس جن باتوں پہ دیوانہ ہوا

تم وہاں بھی یاد آؤگے ہمیں
جب ہمارا خُلد میں جانا ہوا

کیا بُری ہوتی ہے یہ دل کی لگی
مُفت جل کر خاک پروانہ ہوا

خود ہوا بدنام دُنیا میں مجھے رسوا کیا
اے دلِ ناکام کیا سوجھی یہ تو نے کیا کیا

اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کیسی ہو کیا حال ہے
رنج و غم سے چھوٹ گیا دل ہو گئے آزاد ہم

ہجر میں جس بیوفا کی مدتوں تڑپا کیے
قطع الفت آپ نے کر دی بہت اچھا کیا

یوں چھلکتے ہوئے چشمے کو اُبلنے نہ دیا
ضبط نے اشک کو رخسار پہ ڈھلنے نہ دیا

بزم ارباب وفا کا ہے زمانہ دشمن
ان ہواؤں نے کسی شمع کو جلنے نہ دیا

ہمیں تھے رات کو بیدار تیری فرقت میں
وگرنہ خواب مسرت میں اک زمانہ تھا

جب کہا میں نے دل کو چھین لیا
ہنس کے کہنے لگے کہاں کیونکر

آتش حسن روز افزوں ہے
دل جلوں کو ملے اماں کیونکر

پھر گئی آنکھ کھنچ گئے ابرو
دردِ دل اب کروں بیاں کیونکر

جس پہ گذری ہے بس وہی جانے
دل میں لیتے ہیں چٹکیاں کیونکر

ضبط کرنے کے ہم تو عادی ہیں
دل سے اُٹھنے لگا دھواں کیونکر

رخ پہ بکھری ہی جو زلف پرشکن دونوں طرف
کیا لگا ہے چاند میں اب کی گہن دونوں طرف

دل جگر دونوں پھنکے جاتے ہیں سوز عشق سے
ہو رہی ہے میرے پہلو میں جلن دونوں طرف

آثار نشہ کا اچھا نہیں جوانی میں
ابھی نہ تھیں یہ نگاہیں خمار کے قابل

غبار وحشت جنوں اُٹھ کے پردہ پوش ہوا
ہماری لاش ہی کب تھی مزار کے قابل

تمام عمر بسر ہو گئی مگر اے تشنج
ہمیں کوئی نہ ملا اعتبار کے قابل

دفعتہً برہم طبیعت ہو گئی
زلف چھو لینا قیامت ہو گئی

جس پہ دل آیا وہ نکلا بے وفا
کیا بُری اس دل کی قسمت ہو گئی

یہ کبھی دل کو نہیں آتا یقیں
آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی

ہماری مشکلیں آساں ہوں دل کا مدعا نکلے
دم مشکل الٰہی لب سے یا مشکل کشا نکلے

گلے میں غیر کے انگڑائی لیکر ڈال دیں باہیں
ستمگر ظلم بھی کرتا ہے وہ جس میں ادا نکلے

اثر جب کچھ نہیں ہوتا تو ان نالوں سے کیا حاصل
بس اس سے ضبط بہتر ہے جو آہ نارسا نکلے

ص

صابر

صابر:- محمد صدیق صاحب باشندہ کانپور۔ شاگرد اطہر کانپوری۔ انہیں طرز جدید کی ہوا ابھی نہیں لگی۔ خیالات قدیم کو تازہ جامہ پہنا کر محفل ادب میں لا بٹھاتے ہیں:-

قدم جمائے ہوئے موسم بہار رہا
ہمارے سر پہ جنوں مثل جن سوار رہا

بنے ہیں گبر و مسلماں تمہارے پروانے
چراغ دیر و حرم روئے شعلہ بار رہا

اُسی کے سر رہا سہرا بھی جاں نثاری کا
عروس تیغ ستم سے جو ہم کنار رہا

صابر

صابر:- مولوی شیخ محمد اسمٰعیل۔ عمر پچاس سال پیشہ سابق تجارت وحال معلمی ساکن لکھنؤ ڈیوڑھی بادشاہ محل خلف مولوی شیخ محمد عابد علی صاحب پیر اکسر مرحوم۔ کہتے ہیں کہ نانہالی سلسلہ بہادر شاہ ظفر شاہ دہلی تک پہنچا ہے۔ پیشتر جناب نواب باقر علی خاں صاحب مشتاق لکھنوی سے تلمذ تھا۔ فی الحال حضرت خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے تلمذ ہے۔

کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ رنگِ قدیم کے دلدادہ ہیں۔ پرانے مضامین پرانی باتیں دھراتے ہیں ترکیبیں بھی اکثر قدیم ہیں۔ امید ہے آیندہ کلام کا رنگ بدلے۔ رعایت لفظی کا شوق ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو:-

یہ کس سے آتی ہے اس کو غیرت نہیں دکھاتا جو اپنی صورت
فلک پہ دنیا سے اس طرف منہ پھرائے ہے آفتاب کیسا

بنا ہوا ہے نزاکت کا وہ حسیں پتلا
کیا جو زلفوں میں شانہ تو درد شانہ ہوا

برآئی خاک نہ امید قلبِ محزوں کی — موافق اپنے نہ صابر کبھی زمانہ ہُوا

تھم گئے اشک مری چہرہ پہ لائی جو وہ زلف — جھٹ پٹے وقت میں بہتا ہُوا دریا ٹھہرا

اے عشقِ خالِ عارضِ جاناں ادھر نہ آ — تل بھر جگہ نہیں ہے دلِ داغدار میں

پھولوں سے خوب قبر ہماری بسی رہی — اُس گُل کی یاد لے جو گئے تھے مزار میں

چلا جاتا ہوں میں دیوانہ بنکر بزمِ جاناں میں — ملا دیتی ہے مجھ کو بیخودی عشقِ دلبر سے

صابر

صابر:۔ صاحب عالم مرزا محمد قادر بخش گورگانی دہلوی ابن مرزا مکرم بخت آپ کی ولادت ۱۲۲۳ھ میں لال قلعہ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شمیم اقبال خسروی سے ایک عالم کا دماغ معطر ہو رہا تھا۔ ہر طرف عیش و مسرت نے اپنا سکہ جما رکھا تھا آپ نے بھی آنکھ کھول کر یہی دیکھا کہ راجہ سے پرجا تک سب رنگ رلیاں منا رہے ہیں ایک عرصہ تک یہی منظر پیش نظر رہا۔ یکایک شاہانہ دختِ اقبال نے جبڑ چھوڑ دی لال قلعہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اور تخت شاہی پر ایک نئی بساط بچھی۔ وہ بساط جس کو بابر نے ہندوستان کے تخت پہ بچھایا تھا۔ چشم زدن میں اُلٹ گئی۔ مرزا صاحب کے بڑے صاحبزادے مرزا قیصر بخت کا عقد بنارس میں ہُوا تھا۔ مرزا صابر بھی بعد غدر بنارس ہی میں جا رہے مگر وطن کی کشش ایسی نہ تھی کہ ان کو وہاں رہنے دیتی چنانچہ اکثر دہلی آتے رہتے اور اپنے یارانِ طریقت سے مل جُل کر واپس ہو جاتے قُدرت نے ان کو اور خوبیوں کے علاوہ شاعرانہ طبیعت بھی عطا کی تھی۔

جس وقت مرزا صاحب نے شعر کہنا شروع کیا تھا حافظ عبد الرحمٰن خاں احسانؔ سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا امام بخش صہبائی کی طرف رجوع لائے اور پھر آخر تک انھیں کی اُستادی کا دم بھرتے رہے۔ غالبؔ و ذوقؔ و مومن سے معاصرانہ ربط رہا۔ اور اپنی شرکت سے ان کی محفلوں کو ہمیشہ گرماتے رہے خاندان تیموریہ میں شاید شاہ ظفر کے سوا حضرت صابر کا سا کوئی باکمال شاعر نہیں ہُوا

آپ کے کلام میں جو لذّت ہے اس کے مزے سے دل ہی آگاہ ہو سکتا ہے محاورات جس قدر آپ کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ وہ موجودہ زمانے کے فصحا اور شرفاء کی زبان زد ہیں۔ رعایت لفظی کی پابندی اور تشبیہات کی قید سے آپکا شہبازِ خیال آزاد نظر آتا ہے، پاکیزہ تخئیل کے ساتھ زبان کی سلاست اور اندازِ بیان کی دلفریبی جو لطف دیتی ہے اس کا اظہار زبانِ قلم سے کافی نہیں ہو سکتا۔ گلستانِ سخن ایک تذکرۂ شعرا بھی آپ نے لکھا تھا۔ آپ کے تلامذہ میں۔ مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی سحر، شاکر، عاقل وغیرہ باکمالوں کا کلام موجود ہے۔ جن کو آپ کے خرمن سخن سے برسوں گلچینیاں کرنے کا فخر حاصل رہا ہے۔

آپ نے سنہ ۱۳۹۹ھ میں بمقام بنارس ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ آپ کا دیوان ریاضِ صابر کے نام سے موجود ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

رکھوں زاہد کی زباں اسمیں کہ گویا ہو جائے
آج ساقی نے دہانِ خمِ صہبا کھولا

ترقی میں تنزّل واہ ری تقدیر صد رحمت
پڑے صابر میں جسقدر رتبہ ہوا اتنا ہی کم میرا

تجھی سے خوف ہے اور تیرے ہی ملنے کی خواہش ہے
کہ تو ہی مدعی بھی اور تو ہی مدعا اپنا

مشکل ہے چھپ کے دیکھنا اس رشکِ ماہ کا
رخسار پر نشان ہوا ہے نگاہ کا

ہے نگاہ آشنا کو ہر جگہ جلوہ سے ربط
دیر بھی کعبہ تھا جب میں ناصیہ فرسا ہوا

لطف نیش و نوش کو کہوں یا درد کی لذّت کو ہائے
دل کے ایک ایک داغ پر ہے زخم سو سو تیر کا

عمر بھر چھوٹے نہ ہرگز کشمکش کے دام سے
ہم جسے سمجھے تھے ہستی دام تھا تزویر کا

خمار آلودہ کیوں رہتی ہے چشمِ نیم خواب انکی
نگہ ہے آنکھ کے ڈوروں میں الجھا نشّہ صہبا کا

سامنے رندوں کے لے ساقی جھجکتا کیوں نہیں
کیا خمِ صہبا بھی سر ہے زاہدِ مغرور کا

زاہد کا علم بے عملی سے ہوا خراب
کھا جاتا ہے کتاب کو کیڑا کتاب کا

وہ ایذا دوست ہوں گر آئے تو تیغِ ستم لیکر
جیوں سو بار مرنے کو ترے خنجر سے دم لیکر

ہماری ناتوانی میں توانائی کوئی دیکھے — چلے ہیں منزل دنیا سے سر پر کوہ غم لیکر

گر یہی کثرت اعدا ہے تو گھبرا کے کبھی — اپنے در پر تمہیں بیٹھو گے نگہبان ہو کر

شاید نظر چڑھے یہ کسی خود پسند کی — رکھدینگے دل کو آئینہ گر کی دکان پر

قطعہ

بات مطلب کی جو لکھتا ہوں کبھی — تو وہ ہنس کر یہ کہا کرتے ہیں

دے چکا ہے اونھیں اللہ جواب — بے حیائی سے حیا کرتے ہیں

حقدار نہ تھا نقابِ شہادت کا کوئی اور — ایسا نہ ہو اس میں بھی گلا میرا کٹا ہو

صابر گیا تھا کعبہ کو اب تک پھرا نہیں — رستے میں مل گیا کہیں پیر مغاں نہ ہو

اک چھیڑ چلی جائے محبت ہو کہ رنجش — کچھ اس سے نہیں چاہتے ہم اور زیادہ

کہتا ہوں اضطراب میں اک سی حال دل — رسوا کرے گی خلق میں میری زباں مجھے

ہے ہجوم نگہ شوق ترے رخ پہ نقاب — بے حجابی میں بھی اب تک ہے یہ پردا باقی

قطعہ

رات بھر جاگنے سے نیند کا آنکھوں میں خمار — اور کچھ کچھ اثر نشۂ صہبا باقی

بھینی بھینی سی وہ خوشبو وہ پریشاں ترکیب — لب پہ بدرنگ سا کچھ پان کا لاکھا باقی

آنکھوں کے ڈورے کم کم سی وہ سرخی کی نمود — تھوڑا تھوڑا سا اک انداز سے سرمہ باقی

اب نہ وہ شب کا مزہ ہے نہ وہ تسبیح کا لطف — رہ گیا ہے کف افسوس کا ملنا باقی

اندھیری رات میں جو شمع نکلتی ہیں — یہ جانتے نہیں کہ آنکھوں میں دل جلا بیٹھے

زاہد تجھے کرامت رنداں دکھاؤں چل — کہتے ہیں ان کی بزم میں چلتی شراب ہے

کھلتا ہے گاہ شب کی ملاقات تھی یہ بھی نہیں — اور کیا اس کے سوا بات تھی یہ بھی نہیں

صابر

صابر:۔ نصیر الدین خاں ابن غلام حسین خاں جیلانی۔ علم ادب میں بڑے ذی کمال تھے۔ چوّن برس کی عمر ۱۲۶۶ھ میں رامپور میں انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں کوئی علمی مذاق نہ تھا۔ اسلیئے کلام تلف ہوگیا۔ اردو کا صرف ایک شعر تذکرہ انتخاب یادگار میں ملا وہ نذر ناظرین ہے:۔

آنا تو بصد منّت آنا اسے کہتے ہیں	جاتا ہے تو دل لیکر جانا اسی کہتے ہیں

صابر

صابر:۔ مولوی محمد یوسف حسین۔ شاگرد مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ یہ کلام کا نمونہ ہے:۔

جوہر شمشیر قاتل ہنس کے یوں گویا ہُوا	گر نہ زخم دل ترا۔ اچھا ہُوا۔ اچھا ہُوا
بے حاصلی ہے میری ترقی پہ روز و شب	یہ پھل ملا ہے مجکو نیاز قدیم کا
ہم کو شب فراق ہے مثلِ شب وصال	ہے داد سے سوا کہیں بیداد کا مزا
اٹھ اُٹھ کے تیری در پہ جو گرتے ہیں باربار	جا کر انھیں سے پوچھ اس افتاد کا مزا

صابر

صابر:۔ ماسٹر ست دیو راٹھور۔ خلف مسٹر سی۔ ڈی راٹھور ۱۹۰۳ء میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے۔ اُردو میں پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم اور انگریزی میں بی۔ اے پاس کیا ہے۔ شاعری میں منشی پیارے لال صاحب آنند تلمیذ جناب درگا سہائے سرور سے تلمذ ہے۔ جناب صابر کا کلام اکثر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ہر سال بسنت کے موقعہ پر ایک بزم مشاعرہ منعقد کرتے ہیں۔ آٹھ نو سال سے ہائی سکول کھنہ میں معلّم ہیں۔ نہایت خلیق اور ملنسار ہیں۔ تین چار غزلیں روانہ کی ہیں۔ ان کا انتخاب یہ ہے:۔

دردِ دل۔ داغِ جگر۔ سوز دروں۔ رنج و الم	ایک دل دیکر ہمیں کیا کیا ہی حاصل ہوگیا
کشتی امید طوفاں میں خدا پر چھوڑ دی	کیا ہُوا گم اپنی نظروں سے جو ساحل ہوگیا
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں صابر جنکو مدت سے	چھپے بیٹھے ہیں دلمیں میری آنکھوں سے نہاں ہوکر

ہو دل کا راز فاش یہ مدِ نظر نہیں
میں خون رو رہا ہوں مگر آنکھ تر نہیں

درگاہِ بے نیاز میں سجدہ کناں ہوں میں
صابر جھکیگا اور کے آگے یہ سر نہیں

مصیبت میں نہ دیگا ساتھ کوئی
عبث امید ہے اہلِ جہاں سے

بہت رو رو کے برسوں کیں دعائیں
نہ نکلا کام کچھ آہ و فغاں سے

بلائیں بن کے آئی ہیں مجھی پر
دعائیں میری واپس آسماں سے

نہ کوئی بات بنتی ہے نہ کوئی کام ہوتا ہے
تمناؤں کا اپنی خون صبح و شام ہوتا ہے

ستائش سے غرض کیا ہے وطن پر مرنے والونکو
فدایانِ وطن کا موت ہی انعام ہوتا ہے

خدا جانے قفس سے اسقدر دلبستگی کیوں ہے
کہ مرغِ خوش نوا از خود اسیرِ دام ہوتا ہے

مری قسمت میں ناکامی ہے روزِ آفرینش سے
مرے آغاز سے ظاہر مرا انجام ہوتا ہے

مجھے شوقِ شہادت کھینچ تو لایا ہے مقتل میں
شہیدانِ وطن میں دیکھئے کب نام ہوتا ہے

بہارِ حسنِ بتِ گلعذار دیکھیں گے
کمالِ صنعتِ پروردگار دیکھیں گے

قفس سے اپنی رہائی تو غیر ممکن ہے
"بہار دیکھنے والے بہار دیکھیں گے"

کرینگے تھام کے دل ہم کچھ اسطرح نالے
نظر اٹھا کے وہ بے اختیار دیکھیں گے

صابرؔ — لالہ بھولا ناتھ صاحب کنجاہ ضلع گجرات کے باشندہ تھے۔ فنِ شعر میں جناب قدوسی سے تلمذ تھا

چمکا ہے داغ ہو کے نہ چھوٹیگا حشر تک
لایا ہے رنگ خونِ شہیداں نئے نئے

سر کاٹ کر کیا ہے سبک دوش یار نے
کرتا ہے مجھ غریب پہ احسان نئے نئے

محتاجِ وحشت اپنی نہیں ہے بہار کی
ہوتے ہیں روز چاک گریبان نئے نئے

صابرؔ — مسٹر علی احمد باشندہ پٹنہ۔ علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں۔ سادگی اور صفائی زبان پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ اضلاع ورنگل میں مددگار مہتمم بندوبست بھی رہے ہیں۔ کلام یہ ہے :-

دسترس پائی ہے تصویر پہ تیری اس نے
آئینہ گویا نصیبے کا سکندر نکلا

غلبت غیر سے عشق اپنا ہوا اس پہ عیاں
راہزن جس کو سمجھتے تھے وہ رہبر نکلا

خدایا جب مری قسمت میں بیدردوں کی الفت تھی
تو پھر پہلو میں میرے یہ دل درد آشنا کیوں ہے

نقاب الٹو ادھر دیکھو ہمیں بھی پیار کرنے دو
نہیں جب غیر سے پردہ تو پھر مجھ سے حیا کیوں ہے

لگاوٹ ہے نہ چاہت ہے نہ وہ لطف و عنایت ہے
خدا جانے خفا ہم سے بتِ ناآشنا کیوں ہے

نہ چھوٹے ساغرِ مے ہاتھ سے جب روز و شب صابر
تو پھر لوگوں کے بہکانے کو بنتا پارسا کیوں ہے

صابر۔ پنڈت لشمبھر ناتھ صاحب سپرو خلف رائے پنڈت اجودھیا پرشاد صاحب اسسٹنٹ کمشنر صوبۂ اودھ۔ آپ نظم کم کہتے تھے۔ اور جو کچھ کہا وہ ضایع ہو گیا۔ نثر کی تصانیف تزک جرمنی اور سراب حیات وغیرہ ہیں۔ اکثر انگریزی ناول آپ کے ترجمہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ نے اردو میں رامائن لکھنی شروع کی تھی۔ مگر پایہ تکمیل کو نہ پہنچی۔ جو کچھ ہے اکثر جگہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔

جناب صابر مدت تک اضلاع اودھ میں منصرم رہے اور اسی عہدے سے آپ نے پنشن حاصل کی۔ پنڈت تربھون ناتھ صاحب ہجر آپ ہی کے فرزند تھے۔

اب جناب صابر کی رامائن سے کچھ اشعار انتخاب کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں

تقریر سیتا کے چند اشعار

یہ کہتے کیا ہو یہ تقدیر کیا ہے
تمہارے خواب کی تعبیر کیا ہے

نہیں کھلتا ہمیں یہ نالہ زار | تمہارے راز کی تفسیر کیا ہے
کوئی پوچھے جو ہم سے اپنی تدبیر | بتائیں ہم اسے تدبیر کیا ہے
جو ہیں تقدیر پر شاکر وہی لوگ | سمجھتے خوب ہیں تقدیر کیا ہے

رام چندر جی کا سیتا کو خطرات صحرا سے آگاہ کرنا

سن اے سیتا سن اب تو میری پیاری | کہ آئی ہے مرے کہنے کی باری
ہو تیری آرزو اور یہ تمنا | کہ تو مسکن کرے صحرا کو اپنا
یہ بے سُود اور نادانی کی تجویز | یہ نافہمی کی کم سمجھی کی تجویز
ہراس و یاس ہے سامان صحرا | مصیبت کا ہے گھر دامان صحرا
غم و اندوہ سے صحرا بھرا ہے | نہیں صحرا ترے رہنے کی جا ہے
کہاں تو اور کہاں وہ دشت ادبار | کہاں تو اور کہاں دامان کہسار

صابر

صابر:۔ مولوی محمد ایوب صاحب مرحوم خلف مولوی علی محمد وکیل ساکن امروہہ ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔ فارسی عربی۔ اُردو اور انگریزی میں اچھی قابلیت تھی۔ مراد آباد میں اہلمد اسلحہ کلکٹری کی خدمت پر مامور تھے شاعری کا شوق لڑکپن سے تھا۔ قاضی عبدالحی متخلص بہ یقین سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ جو حضرت داغ مرحوم کے شاگرد تھے۔ اچھے مضمون نگار تھے۔ باوجود مشاغل سرکاری مراد آباد کے لوکل اخبارات کو قلمی امداد دیتے تھے۔ مولوی محمد داؤد ان کے بھائی بھی شاعر تھے اُن کا ذکر جلد سوم میں ہے طبیعت رنگ تغزل کی باریکیوں سے واقف تھی۔ انداز بیان دلکش ہے صاف اور سیدھے سادے شعر میں بھی بانکپن کی شان نکلتی ہے۔ معاملہ نگاری میں حضرت نظام رامپوری کے پیرو تھے۔ علم دوست اور یار باش آدمی تھے۔ مراد آباد میں سنبھلی دروازہ کی سرائے کے قریب رہتے تھے۔ ان کی قیام گاہ میں شام سے رات کے ۱۲ بجے تک شعراء اور دوستوں کا مجمع رہتا تھا

۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔ ایک دوست نے جو کلام روانہ کیا تھا۔ اس کا انتخاب یہ ہے:-

ایک دل کمبخت کے جانے سے کیا جاتا رہا
بیٹھنے اُٹھنے کا ہنسنے کا مزا جاتا رہا

مٹ گئیں ساری امیدیں حوصلہ جاتا رہا
دل گیا کیا دردِ اُلفت کا مزا جاتا رہا

حضرت صابر اٹھو ملکِ عدم کی راہ لو
آج کل دُنیا میں رہنے کا مزا جاتا رہا

ادائیں تو ادائیں ہیں بھلا اُن کا تو کیا کہنا
تڑپ جاتا ہے جی ظالم ترے بیساختہ پن پر

تمہاری تیغ نے چوما گلا جس دم تو حسرت سے
ہر اک عضو بدن کو رشک آیا میری گردن پر

ہجوم یاس حسرت اور غم و اندوہ و حرماں سے
لگا رہتا ہے میلہ سا ترے کشتہ کے مدفن پر

چھریرا سا بدن اٹھتی جوانی چمپئی رنگت
بہار حسن ہے جوبن پھٹا پڑتا ہے جوبن پر

ہم بھی چھپائیں گے نہ کسی سے تمہارا حال
تم نے ہماری باتیں رقیبوں سے گر کہیں

شکوہ جور پہ وہ کہتے ہیں
دل کہیں اور لگائے کوئی

پریشاں حال نیند آنکھوں میں اور اُترا ہوا چہرہ
عجب دھج سے گیا کوئی مرے گھر سے سحر ہوتے

پوچھتے ہیں وہ مری چارہ گروں سے پس مرگ
ان کو کیا ہو گیا ایسے تو یہ بیمار نہ تھے

وہ اتنا روئے کہ آنکھوں کو لال کر بیٹھے
عدو کے سوگ میں غیر اپنا حال کر بیٹھے

کسی کا مجھ سے وہ انجان بن کے کہنا ہائے
یہ کیا ہوا تمہیں کیا اپنا حال کر بیٹھے

کلیجہ تھام کے اُٹھے کسی کی محفل سے
کسی کی بزم میں ہم دل سنبھال کر بیٹھے

کوئی خطا کوئی تقصیر کوئی بات بھی ہو
وہ مفت بیٹھے بٹھائے ملال کر بیٹھے

وہ ان کا مجھ سے دمِ واپسیں یہ کہنا ہائے
ابھی سے قطع امید وصال کر بیٹھے

کسی کی یاد کسی کا خیال ہے دل میں
کسی کا تیر نظر دیکھ بھال کر بیٹھے

صابری

صابری :- شاہ محمد ارشاد حسین صاحب ابن حضرت شاہ محمد قطب الدین صاحب۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علی شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ آپکے جدّ امجد

عرب سے گنگوہ تشریف لائے۔ اور اپنے پیر دستگیر حضرت شیخ محبوب الٰہی صاحب گنگوہیؒ کی اجازت سے امبیٹھ پیرزادگاں ضلع سہارنپور میں قیام پذیر ہوئے۔

جناب صابری کی ولادت ۱۷ جولائی ۱۸۹۶ء کو ہوئی۔ مذہبی تعلیم ختم کرنے کے بعد اُردو۔ فارسی کی تکمیل حضرت مولانا مولوی صدیق احمد صاحب انصاری سے کی۔ اس کے بعد دہلی میں انگریزی شروع کی۔ ابھی انٹرنس بھی پاس نہ کیا تھا کہ اپنے اخی معظم شاہ انعام حسین صاحب مرحوم اسسٹنٹ انجینیر کے فرمانے سے امبیٹھ انجینیرنگ سکول کی اوورسیر کلاس میں داخل ہوکر کامیاب ہوئے اور اوورسیر کے عہدہ پر مقرر ہوکر پنجاب۔ بمبئی۔ سندھ۔ اور ایران وغیرہ میں رہے۔

شاعری کا مادّہ آپ کی طبیعت میں فطرتاً موجود تھا۔ لیکن ۱۹۲۴ء سے آپ کی شاعری کی ترقی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ احباب بمبئی کی صحبت شاعرانہ سے متاثر ہوکر ذوق شعر و سخن میں ایک خاص جذبہ پیدا ہوا۔ بمبئی کے متعدد مشاعروں میں شرکت کرکے آپ نے کافی شہرت حاصل کی۔

۱۹۲۵ء میں جناب غریب سہارنپوری سے تلمذ حاصل کیا۔ ان کے انتقال کے بعد اس خیال سے کہ اُستاد سے ہر حالت میں اُستفادہ حاصل کرنا چاہئے۔ جناب افسر صدیقی امروہی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔

آپ کو امیرؔ و غالبؔ کے کلام سے عشق ہے۔ کلام میں بیشتر انہیں حضرات کی تقلید کرتے ہیں آپ کا قول ہے کہ جب تک شاعر فنا فی الشعر نہ ہو جائے شعر گوئی بیکار ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ؎

فنا فی الشعر ہو جاتا ہوں ہمدم مجھے دُنیائے دوں کی کیا خبر ہو

آپ ہندو مسلم مذاہب سے کنارہ کش ہوکر فرمایا کرتے ہیں کہ میرا مذہب اخلاق ہے۔ جو اس مذہب سے نہیں وہ انسان نہیں۔ آپ خوش خلق منکسر المزاج دور اندیش

اور ہنرشناس ہونے کے علاوہ نہایت متواضع واقع ہوئے ہیں۔ آپکی خوش کلامی اور شیریں بیانی ہر شخص کو ایک ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ کرلیتی ہے۔ تخیّل شاعری عام طرز تغزل سے بہت اعلےٰ ہے۔ کہیں کہیں غالبیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسلوب چست اور زبان فصیح ہے۔ باوجود تخئیلی صنّاعی کے تغزّل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہ اوصاف عہد حاضر کے شعرا میں کم پائے جاتے ہیں۔

ضمیمہ رحمت مطبوعہ۔ فروغ بیان۔ زیر طبع خیالات زریں غیر مطبوعہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

جلوہ ریز ناز ہے نقشہ ہر اک تصویر کا
دہر کیا ہے اک مرقع حسن عالمگیر کا

زندہ باد اے سازشِ روح و عناصر زندہ باد
خندہ زن ہر ایک رخنہ ہے مری تعمیر کا

میرے جذبِ شوق نے کھینچی وہ تصویر بہار
خانۂ صیّاد کو رشکِ گلستاں کردیا

پردہ داری دیکھئے حسنِ حجاب آلود کی
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہوگیا

تم تسلی مجھے دیتے تو تسلی ہوتی
تم پریشاں مجھے کرتے تو پریشان ہوتا

تماشا ہوں میں عالم کی نظرہائے پریشاں کا
کہ نقشہ ہوں کسی کے جلوہ ہائے حسنِ پنہاں کا

افق پر کیوں گماں کرتی ہے وحشت چاک داماں کا
شفق بھی ایک ٹکڑا ہے مری رنگیں گریباں کا

میں وہ حسرت کشِ نظارہِ عالم ہوں دنیا میں
جہاں چاہوں میں نقشہ کھینچ دوں صحنِ گلستاں کا

گناہوں پر مری کیوں جوش آئے تیری رحمت کو
یہ خود ہی پکڑ لینگے ترے داماں رحمت کا

قفس میں تُونے جو صیاد دیکھا
وہ اک نقشہ ہے مری بے بسی کا

نہ دے تکلیف اظہارِ حقیقت اے دلِ ناداں
میں جس کا راز ہوں وہ آپ ہی ہے راز داں اپنا

جذبۂ کامل سے قائم تھا نظامِ کائنات
اس کا مٹنا تھا کہ کل عالم ہی مٹ کر رہ گیا

دم کے دم میں کردیا دنیائے دل کا خاتمہ
آفریں صد آفریں اے جنبشِ ابروئے دوست

میرے دلِ خموش نے آخر وہی کیا
جو چاہتے تھے تم ستم ناروا کے بعد

اس درجہ کر دیا ہے سبک عرضِ حال نے
کیا سنائیں تم سے بیدردو کو اپنا حالِ غم
شوق میں ہیں دیدہ و دل بیقرار
فرصت نظارۂ عالم کہاں
کیا سکون کشتئ عالم رہے
موجِ ہوا جو لے چلی کوچۂ یار کیطرف
لذتِ سوزِ خلش ہے سازِ لطفِ زندگی
اور بلند ہو گئے عالم لامکاں سے ہم
سعی لاحاصل بھی قسمت سے مجھے حاصل نہیں
ہوشیار بیخودی کو عقل دیتی ہے سبق
کیا کائناتِ حسن میں تو جلوہ گر نہیں
احساس غم بھی وقفِ خلش ہو کے رہ گیا
یاد وطن کو ساتھ لئے جا رہا ہوں میں

اپنی نگہ سے آپ گرے التجا کے بعد
درد والے ہی سنیں گے داستانِ اہلِ دل
ہو گئی محفل کی محفل بیقرار
اپنے جلووں میں ہے بسمل بیقرار
موج مضطر اور ساحل بیقرار
رشک ہوا بہت مجھے اپنا غبار دیکھکر
کیف آور ہوں نہ کیونکر نغمہ ہائے دردِ دل
اُٹھے تو اسطرح اُٹھے آپکے آستاں سے ہم
والئے بدبختی کہ علم دوری منزل نہیں
واقف معنی نہیں اپنے سے جو غافل نہیں
حاصل ہمیں کمال مذاقِ نظر نہیں
مجھ کو کچھ اب اذیت زخم جگر نہیں
اس کے سوا کوئی بھی مرا ہمسفر نہیں

نہ وہ ولولہ۔ نہ وہ کیفیت۔ نہ مزا ہے سوز و گداز میں
نہ خلش ہے شوقِ نیاز میں۔ نہ کشش ہے حسن مجاز میں
میں سناؤں نغمۂ زندگی کبھی سوز میں کبھی ساز میں
میں کمال ضبط کو ڈھونڈتا ہوں کسی کے قلب گداز میں

نہ تیاتے کس کی خاکِ راہ کا پُرنور ذرہ ہوں
کرشمائے نگاہ حسن فطرت سے یہ پوچھو نگا
پہنچے اس درجہ بیخود کر دیا ہے نا امیدی نے
مٹا کر تم اُٹھا لو اسے رنگیں کی اذیت کو

کہ خورشید فلک ہو کر زمانہ میں چمکتا ہوں
وہ کیا راز حقیقت ہے کہ جس کا میں معمّا ہوں
ہجوم حشر میں اپنے کو میں تنہا سمجھتا ہوں
بہاریں بیشکے آجکل فضائے داغ ہجرانیں

ہر اک ذرہ ہے تصویر بہار گلشن امکاں
جور بیجا کا تسلسل خود دلیل شکوہ ہے
ہے مری نشو و نما وابستۂ ملکِ عدم
الگ لے چل مجھے اے الفتِ وحدت کی نیرنگی
خزاں بر دوش ہو کر جس نے کاٹی زندگی اپنی
ٹھہر جاتے ہیں مجھکو دیکھ کر صحرائے الفت میں
سامنے وہ تھے نہ ان کی چاندنی تصویر تھی
کس طرح تکمیل پاتا خود نمائی کا مذاق
جلوے فریب تر ہیں ترے حسنِ ناز کے
میں تھا، ترا جمال تھا، اور حسنِ التفات
منت کشِ نگاہ ہے ہر پردۂ جمال
دھندلے نقوشِ زیست ہیں اتنے شبِ فراق
کس درجہ محترم ہیں مرے جرم نا روا
ہو چکی پردہ دری اب پردہ داری کیجئے
میری ہستی سے ہی ظاہر ہستیٔ دنیائے دوں
اچھا دیا سکونِ دل مبتلا مجھے
دلبری کیساتھ دلداری بھی لازم ہے تجھے
نظر شاید مری حسن آفریں معلوم ہوتی ہے
ہم ہیں جہاں جمال بھی ہے اور جلال بھی
خود نمائی کے لئے انجمن آرائی ہے
وہ ترا حسن کرم ہو کہ مرا حسنِ نظر

گلستاں ہی گلستاں دیکھتا ہوں میں بیاباں میں
مہر خاموشی میں بھی میں مظہر فریاد ہوں
منزل دنیا میں اک راہ عدم آباد ہوں
نہ محفل میرے قابل ہے نہ میں محفل کے قابل ہوں
وہی اے ہم صفیرو میں بہار گلشن دل ہوں
میں اہل کارواں کیواسطے اک حدِ منزل ہوں
سب مرے حسن نگاہ شوق کی تاثیر تھی
اپنے جلووں میں نہاں خود آپکی تصویر تھی
کچھ دور اور چاہیئے حدِ نظر مجھے
بیگانگی ہوش میں تھی یہ خبر مجھے
کیونکر نہ ہو عزیز یہ تارِ نظر مجھے
ہر ایک کہہ رہا ہے چراغ سحر مجھے
ڈھانکے ہوئے ہے رحمتِ پروردگار بھی
عشق رسوا ہو تو اس کا حسن پر الزام ہے
میں نہ ہوں دنیا میں تو کس شی کا دنیا نام ہے
اے برق حسن اور بھی تڑپا دیا مجھے
اے فریب حسن دنیا بد گماں ہونے کو ہے
سماتی ہے یہ جس شی میں حسیں معلوم ہوتی ہے
پہنچا سکا نہ کوئی وہاں تک خیال بھی
کیا تماشا ہے کہ اک خلق تماشائی ہے
ذرے ذرے میں تری شان نظر آئی ہے

میں سجدے کرتے کرتے جا ہی پہنچونگا سر منزل
ترا نقش قدم منزل بمنزل میرا رہبر ہے

کون ساجد کس کا سجدہ کسکو ہے شوقِ سجود
اپنے جلووں میں نہاں ہے آستاں تیری لئے

دل میں تو جلوہ فگن آنکھوں میں تو جلوہ نما
وقف ہیں دونوں کہ دونوں آستاں تیری لئے

وہ عیش کیا کہ نہو جس میں تلخی کلفت
بہار ہو کے ترستا ہوں میں خزاں کے لئے

وہ دل ہی کیا کہ نہوں جسمیں شورشیں پنہاں
وہ آنکھ کیا جو نہو جلوۂ نہاں کے لئے

تمنائیں تیرے دیدار کی ایسی بڑھیں آخر
نکل آئیں نگاہِ شوق بنکر چشم حیراں سے

پردہ داری کیا اسی کا نام ہے اے حسن دوست
ذرہ ذرہ مدعیِ جلوہ گاہِ ناز ہے

دیکھتے ہیں جب نگاہِ شوق سے اڑتا ہے رنگ
حسن کو نظارۂ عاشق پر پرواز ہے

کیا تعجب ہے اگر بلبل قفس کو لے اڑے
حسرت سیر گلستاں بھی پر پرواز ہے

کچھ بادیہ پیما کی حسرت تو ہوئی پوری
جس سمت نظر کیجیے صحرا نظر آتا ہے

گم گشتۂ منزل ہوں للہ خبر لینا
دل شام غریبی میں کھویا نظر آتا ہے

کر دیا ختم آج ہی قصہ
حشر کا انتظار کون کرے

آپ کیا جانیں وفا میں خوبیاں ہیں کسقدر
آپ کیا جانیں محبت کا مزا کیا چیز ہے

نظارہ جہاں سے حیرت کدہ ہے خلق
کس کس کے حسن دیدہ کو دیکھا کرے کوئی

کیوں نہیں ہوتے ہیں جلوے برق پاش حسن ناز
حسن پردہ پوش ہے یا آنکھ پردہ پوش ہے

مری فکر رسا کا ہے تعلق میری ہستی سے
کوئی سمجھے نہ سمجھے مجھ کو اس سے واسطہ کیا ہے

صاحب: منشی صاحب رائے مورخ کایستھ سریواستو متوطن لکھنؤ۔ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد کے شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ تھا۔ صاحب عہدۂ جلیلہ تھے۔ طبع متین اور فکر سنجیدہ رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہے ہیں۔

ایک دن نواب آصف الدولہ بہادر عیش باغ کے پھاٹک سے جا رہے تھے۔

دیکھا پھاٹک پر جو مٹی کا شیر ہے۔ اس کے منہ میں طوطے نے گھونسلا بنایا ہے۔ نواب صاحب نے صاحب رائے کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے عرض کیا :- ؎

قربان شہ کے صدقے کیا عدل کا نشاں ہے | جو شیر کے دہن میں طوطے کا آشیاں ہے

تذکرہ شوق سے دو اشعار نقل کئے جاتے ہیں ۔

کرچکا مجھ کو نہایت عشق کا آزار زار | سانس بھی لینا ہوا ہے اب مجھے سر بار بار
عشق وہ شے ہے کہ رسوائی سی کرتا ہے فنا | آہ پاوے اس طرح منصور سا سر دار دار

صاحب صاحب :- نواب سید شبیر زماں خاں دہلوی نبیرۂ حافظ عبدالرحمٰن احسان تلمیذ غالب ۲۷ برس کی عمر پاکر ۱۳۱۲ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ شیریں مقال اور روشن خیال شاعر تھے۔

کس کس کو میں بتاؤں کہ بار غم فراق | دل پر نہیں۔ جگر پہ نہیں جاں پر نہیں
ذرا آنکھوں نہیں رکھتا اسکو صاحب | کہیں یہ طفل اشک ابتر نہ ہووے
عقدہ جو تیرے جعد کا رشک قمر کھلے | عشاق کے دلوں کی گرہ سر بسر کھلے
جان ان کی آسمان کو پرواز کر گئی | لیکن کبھی نہ تیری اسیروں کے پر کھلے

صاحب صاحب :- جناب مولوی صاحب عالم۔ سجادہ نشیں مارہرہ۔ ضلع ایٹہ۔ شاگرد میرزا قتیل۔ غالب کے دلی دوست تھے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ فارسی کا ایک دیوان بھی ان سے یادگار ہے۔ اُردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

جب سے پہلو میں ہمارے وہ پریزاد نہیں | دل دیوانہ کسی طرح کبھی شاد نہیں
ضعف سے حال یہ پہنچا ہے اسیروں کا ترے | قوت نالہ نہیں طاقت فریاد نہیں
میر کی طرح دل اپنا بھی ہوا گم صاحب | کسکو دے آئے کہاں بھول گئے یاد نہیں

صاحب صاحب :- جارج فانتوم خلف کپتان برنارڈ فانتوم۔ تذکرۂ انتخاب یادگار مؤلفہ ۱۲۹۰ھ میں جناب امیر احمد صاحب مینائی نے عمر ۲۰ سال لکھی۔ فارسی۔ عربی

اور عروض کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اصل میں فرانسیسی تھے۔ مگر سرکار رام پور سے آبائی توسل تھا۔ غالباً اسی وجہ سے علوم مشرقیہ سے شوق رکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ یہ اُن کا کلام ہے۔

تم کو ہے پاس غیر کا صاحب — تو ہمارا بھی ہے خدا صاحب
میرے آنے سے گر ہوئے ناخوش — تو یہ لو میں ابھی چلا صاحب
رُو نمائی میں نذر کیا کیجے — دل تو گیسو نے لے لیا صاحب
ایسی کیا مجھ سے ہو گئی تقصیر — اس قدر کیوں ہو بدمزا صاحب
ق
ملنا ہر ایک سے نہیں اچھا — اس کو کہتے ہیں سب بُرا صاحب
چال ایسی چلو تو بہتر ہے — کہ کہیں تم کو سب بھلا صاحب
صدقہ اس عقل اور فراست کے — کیوں نہ تم پہ میں ہوں فدا صاحب
آشناؤں کو اپنے سمجھو غیر — اور غیروں کو آشنا صاحب

مہ کیا ہے مہر تجھ سے مقابل کبھو نہو — حیرت سے آئینہ کبھی تیرے روبرو نہو
اُس غنچہ لب سے گل نہو روکش مجھے ہے ڈر — صد برگ کی طرح تو کہیں زرد رو نہ ہو
ناصح نے آکے میرا گریباں سیا تو کیا — جز تار زلف چاک جگر کا رفو نہ ہو
جس کے نہ دل پہ داغ محبت ہو لالہ سان — عشاق گلعذار میں وہ سرخ رو نہو
پروانہ دیکھ پائے اگر تجھ کو شمع رو — تو شمع انجمن کی اُسے آرزو نہو
پھولوں کی سیج بستر آتش ہے بس مجھے — اے غیرت بہار جو پہلو میں تو نہو
دشمن کا کیا قصور ہے عادت کو دخل ہے — کژدم کبھی نہ کاٹے اگر اُس کی خو نہ ہو
ہم کو تو چشم ساقی مدہوش سے کام ہے — مست نگہ کو خواہش جام و سبو نہ ہو
دیکھنے والے قد بالا کے ہیں — کیوں نہ ہم چشموں میں ہو اونچی نگاہ
یہ آرزوئے مست آنے کی تجھ سے اے شوخ — کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

صاحب

صاحب :- امتہ الفاطمہ مشہور صاحب جی۔ تذکروں کی ورق گردانی سے پتہ نہیں چلتا کہ بازاری عورت تھی یا پردہ نشین۔ حکیم محمد فصیح الدین صاحب رنج تذکرہ بہارستانِ ناز میں تحریر فرماتے ہیں کہ" . . . . رونق افزائے خطۂ لطافت بنیاد شاہجہان آباد ہوکر کچھ بیمار ہوئی۔ حکیم مومن خاں مومن نے علاج کیا۔ صحت پاکر ایک سال تک حکیم صاحب مرحوم کے ہم پہلو رہی۔ پھر لکھنؤ کی طرف چلی گئی" مندرجہ بالا سطور سے قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً کوئی بازاری عورت رہی ہوگی۔ "مثنوی قول غمیں حکیم صاحب مغفور نے اُسی دلربا کے خیال میں تصنیف کی ہے۔"

بقول جناب شیفتہ مغفور (مؤلف تذکرہ گلشن بیخار)

"بفیض صحبت شاں (یعنی حکیم مومن خاں) دلش بشعر و شاعری میل کرد"

کلام ملاحظہ ہو:-

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو
گنہ کیا صنم کے نظارہ میں زاہد
کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند
نظر ہے جانب اغیار دیکھئے کیا ہو
جو خطِ جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو
صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا

سماں میرے گھر میں جو آیا تو دیکھو
یہ جلوہ خدا نے دکھایا تو دکھایا
نہ کر رکھے نسیم سے کھد و قبائے گل
پھری ہے کچھ نگہ یار دیکھئے کیا ہو
دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی
یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی

صاحبقران

صاحبقران - امام علی نام باپ کا نام سید غلام حسین رضوی تھا۔ بلگرام ضلع ہردوئی وطن تھا۔ جرأت اور انشا کے معاصر تھے۔ طبیعت ہزل اور فحش گوئی کی طرف رجوع ہوگئی تھی۔ کہیں دو چار شعر اچھے بھی کہہ گئے ہیں۔ جناب مولوی عبدالباری صاحب آسی تحریر فرماتے ہیں "صاحبقران کے یہاں مضامین دلکش کی کمی نہیں مگر خواہشات نے اس طرح ان کے کلام کے حصّوں کو گھیر رکھا ہے جس طرح کہ گلاب کے

پھول کو کانٹے گھیر لیتے ہیں"۔ تاہم جہاں تک تذکروں سے معلوم ہوتا ہے بذاتِ خود مرنجاں و مرنج خوش مزاج تھے۔ اور ان کے کلام سے ان کے کیرکٹر کو کوئی قریبی نسبت نہ تھی۔

ایک غیر مطبوعہ دیوان صاحبقران کا بعض قدیم کتب خانہائے لکھنؤ میں دستیاب ہوتا ہے۔ انتخاب کلام یہ ہے:-

جب کہ جلوہ ہوا محفل میں ترے آنے کا
رات کو شمع سے جی بھر گیا پروانے کا

گرچہ ہر خانہ پر درد میں دم رکتا ہے
پر تری زلف میں یہ دم نہیں گھبرانے کا

جی نکلتا ہے مرا کیا کروں کس سے پوچھوں
کوئی ڈھب یاد نہیں مجھکو تو مر جانے کا

نیم جاں ہو ترے بوسے کی تمنا سے میں
تالب گور ترا عشق نہیں جانے کا

خون دل ٹپکے ہے ان آنکھوں سے پانی کیطرح
اب نظر آتی نہیں کچھ زندگانی کی طرح

اس ستمگر بے وفا کو آہ دونوں یاد ہیں
مہربانی کی طرح نامہربانی کی طرح

دیکھی ہے جب سے ابروئے خمدار کی شبیہ
آنکھوں میں اپنے رہتی ہے تلوار کی شبیہ

ہزل کے شعر

اک فقط روتا ہوں میں اس یار جانی کیلئے
ورنہ سب روتے ہیں خالا اور ممانی کیلئے

جسے تو خوب سمجھے ہے اسی سورا تدان خوش رہ
مرے اس شہر میں صاحبقراں ہی یار کتنے ہیں

صاد۔ حکیم محمد طیب باشندۂ بمبئی برادر میاں عبد اللطیف و شاگرد حضرت داغ مرحوم۔ زیادہ حالات کا پتہ نہ چلا۔ مضمون آفرین و معنی طراز طبیعت ہیں۔ کلام یہ ہے:-

اللہ رے شعلہ ہجر کی شب برق آہ کا
روشن ستارہ ہو گیا بخت سیاہ کا

کسکی چشم شوخ ہے در پردہ پردہ در
چلمن ہجوم ہو گئی تار نگاہ کا

مٹ مٹ کے کوئے یار میں نقش قدم مرے
کچھ دیتے ہیں پتہ دل گم کردہ راہ کا

ہیں قیامت انکی چشم فتنہ زا کی گردشیں
لائے روز حشر بھی کیا انقلاب آنے کو ہے

صادق :- مرزا صادق حسین لکھنوی خلف مرزا تصدق حسین۔ تلمیذ جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرتؔ لکھنوی۔ لکھنؤ میں کٹرہ اعظم بیگ مرزا دبیر کی گلی میں رہتے ہیں۔ جوان عمر ہیں۔ طبیعت شاعری کی طرف مائل ہے۔ فیضان استاد سے امید ہے اچھا کہنے لگینگے۔ گوٹا سازی کے کارخانہ سے تعلق ہے۔ کلام یہ ہے:-

آپ کے تیرِ نظر سے مجھے اندیشہ ہے
محبت کھینچ تو لائی انھیں گورِ غریباں تک
اثر الٹا ہوا ہے اور دونی ہو گئی الفت
جینے کو تو اے خضر جئیں لاکھ برس ہم
ہم آپ ہی چھوڑینگے تو چھوڑینگے مے و جام
کیا غضب ہے ہائے تو نے قطع کی میری زباں
آج اے صادقؔ ہے سرِ مقتل کسی کی آرزو
تابشِ حسن سے کیا دید کے ارمان نکلے
عشقِ مژگاں کا تصور ہے یہ اعجاز نما
فصلِ گل آتے ہی دیوانوں کو یہ جوش ہوا
ہم جنھیں دوست سمجھتے رہے اپنا صادقؔ
کہا یہ شمع نے پروانوں سے سرِ محفل
موجیں ساحل تک قدم بوسی کو آئیں گی ضرور
ان حسینوں نے کمر باندھی ہے کیوں پھر ظلم پر
رہائی جب ہوئی قیدِ قفس سے باغباں میری
بس اب اپنی اسیری کا زمانہ ختم ہوتا ہے
نگاہیں تیر بن کر کلیجے میں اترتی ہیں

آئینہ بھی نہ ہو غربال مرے دل کی طرح
اوداسی آپ کہہ دیگی یہ مجھ بیکس کی میت ہے
یہ سنتے ہی کہ انکو چاہنے والے سے نفرت ہے
لیکن کبھی جینے کا بھروسا نہ کرینگے
زاہد ترے کہنے سے تو ایسا نہ کرینگے
بات کہنے دی نہ ظالم وہ جو میرے دل میں تھی
جوہرِ شمشیر بن کر قبضۂ قاتل میں تھی
بن کے محفل میں وہ خورشیدِ درخشاں نکلے
سینکڑوں قلب میں ڈوبے ہوئے پیکاں نکلے
ٹکڑے دامن کے کئے چاک گریباں نکلے
آج دیکھا تو وہی جان کے خواہاں نکلے
کہ جلنے والے تمہیں کیا جلا نہیں سکتے
جائیں گے جب سوئے دریا وہ نہانے کیلئے
اے فلک تو کم نہ تھا میرے ستانے کیلئے
پروں کو نوچ کر صیاد نے کاٹی زباں میری
رہائی کی صدائیں دے رہی ہیں بیڑیاں میری
قیامت کرتے ہیں معشوق مڑ کر دیکھنے والے

نہیں ہے شاعری پر ناز مجکو لیکن ای صادق
بہت اس بزم میں بیٹھے ہیں جو ہر دیکھنے والے

جو گھر سے سیر گلشن کے لئے وہ دلربا نکلے
چمن سے پیشوائی کے لئے باد صبا نکلے

اگر انصاف کرنے ہم سے بیٹھے ہو غیروں کا
سزا بھی اسکو دینا چاہیے جس کی خطا نکلے

غصہ میں وہ بڑھے تو ہیں تلوار کی طرف
نازک بہت ہیں دیکھئے کیونکر اٹھائینگے

ساقی کی چشم مست کے صادق ہیں شیفتہ
اب ہم تو میکدہ سے نہ بستر اٹھائینگے

صاف ظاہر ہے یہ نگاہوں سے
نا بلد ہیں وفا کی راہوں سے

اس کے دل پر اثر نہیں ہوتا
آسماں ہل گیا ہے آہوں سے

مجکو اٹھوا ییے نہ محفل سے
یوں گراتے نہیں نگاہوں سے

ظلم کرنا بتا دیا کس نے
وہ نہ واقف سے ایسی راہوں سے

صادق :- شیخ صادق علی صاحب اکبرآبادی۔ راجپوتانہ میں کسی مدرسہ میں معلم تھے زیادہ حال معلوم نہیں۔ کلام نا شگفتگی کا حامل ہے نہ تخئیل کی تازگی کا۔ رعایت لفظی کے پیچھے دیوانہ ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ اور چمنستان سخن نام رکھا تھا۔ کلام یہ ہے :-

نہ چھوڑینگے اسے مر کر بھی میری خاک کے ذرے
رہونگا ساتھ اُس یوسف کی گرد کارواں ہو کر

چھپا لیتے ہیں منہ اپنا جو زلفوں میں وہ ای صادق
تو رہ جاتا ہے رخ پر صبح کاذب کا گماں ہو کر

اٹھا کچھ ایسا درد دل بے قرار میں
دل تھام کر میں بیٹھ گیا کوئے یار میں

جانتے بھی وہ نہ تھے آرائشیں زیبائشیں
آئینہ لے کر جو دیکھا چار آنکھیں ہو گئیں

نہیں ہیوجہ سر شام سے کنگھی چوٹی
کھل گیا ہیچ کہ تم غیر کے گھر جاتے ہو

غم و اندوہ کی اک بھیڑ لگی ہے دل میں
راہ ملتی نہیں ارماں نکلنے کے لئے

نسبت ہے دہن آپ کا لقب سے
باتیں تو کرو نہ پھیکی پھیکی

تڑپتے ہیں یہ دونوں روبرو یوں تیغ قاتل کے
نکتے سے مقابل دل کلیجا سامنے دل کے

صادق:- مسٹر محمد فاروق خلف مولوی برہان الدین صدیقی امروہوی۔ مدرس مدرسہ عربیہ امروہہ۔ عربی اردو۔ فارسی کی تعلیم اچھی پائی ہے۔ زمانہ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق اور تحقیق و مضامین نویسی کا ذوق ہے۔ عرصہ تک حضرت افسر صدیقی امروہوی کی خدمت میں رہ کر فنِ شعر کو حاصل کیا ہے۔ طبیعت ہونہار ہے۔ نہایت ذکی و ذہین ہیں۔ اور ۲۳-۲۴ سال کی عمر ہے۔ آج کل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سیکنڈ ایئر ایف۔ اے میں تعلیم پا رہے ہیں۔

جناب شاہد علی صاحب طالب کے فرستادہ کلام کا انتخاب یہ ہے:-

دیر و کعبہ سے غرض کافر و دیندار کو ہو
ہم تو وہ ہیں جنھیں مقصود ہے سجدا کرنا

اس ادا سے دم پرستش مجھ دیکھا اس نے
مجھ سے ممکن نہ ہوا ظلم کا شکوا کرنا

وہ یہ کہتے ہیں کہ تم جان کو قربان کرو
بعد اس کے مرے ملنے کی تمنا کرنا

کسی پہ رنگِ وفا آجکل نہیں چڑھتا
سفید ہو نہ گیا ہو لہو زمانے کا

آسماں کو بھی کوئی جرعۂ مے اے ساقی
دیر سے گھوم رہا ہے تیری میخانے پر

ترا جانا تو اے بادِ صبا ہوتا ہے روزانہ
سُنا دینا جو موقعہ ہو کسی دن داستاں میری

یقین آتا نہیں اُن کو مرے دردِ محبت کا
معاذ اللہ کتنی بے اثر ہے داستاں میری

سُناؤں گا انھیں اب حالِ دل اشعار میں صادقؔ
کرے شاید اثر منظوم ہو کر داستاں میری

ہو کے بیدار ہزاروں کی مٹا دی ہستی
فتنۂ حشر جگایا تری انگڑائی نے

اب ترے ہاتھ ہے پوشیدگیٔ رازِ وفا
مرتے دم تک تو چھپایا ترے شیدائی نے

کچھ اپنے دل کے جانے کا رنج و الم نہیں
وہ دل بھی لے کے خوش نہیں اسکا ملال ہے

صادق:- میاں صادق علیخاں فیلبان سرکار مرزا سلیماں شکوہ بہادر خلف شاہ عالم ان کی دانشمندی و فرزانگی کے حالات مشہور ہیں۔ جوانی میں شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی۔ جب اپنے آقا کے ساتھ لکھنؤ گئے تو وہاں سید انشا کے شاگردوں میں

داخل ہوئے۔ صاحب دیوان ریختہ تھے۔ شیعہ مذہب تھے۔ بہادر شاہ کے عہد میں انتقال کیا۔ اکثر دشوار زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

اس نے کھینچی جو کل نشے میں تیغ
مجھ سے کہنے لگا بگڑ کر یوں
میں نے پوچھا غضب ہے کیا کرتا
کیوں مرے منہ ہے تو لگا کرتا

دے ملا خاک میں جب گردش افلاک ہوس
اس کے ملنے کی نکالے کوئی کیا خاک ہوس

جس نے دیکھا ہے تری جلوہ گری کا نقشہ
اسکو بھاتا ہے کب اے یار پری کا نقشہ

جلد آ جلد دم باز پسیں ہے میرا
نظر آتا ہے چراغ سحری کا نقشہ

دوستی کیونکہ رہے دیکھئے اب یار کیساتھ
دیکھتا ہوں اُسے ہر وقت میں اغیار کیساتھ

پورب میں جز اذیت حاصل ہوا نہ کچھ بھی
صادق چلے چلو تم دکھن لغیر لیے پیچھے

خدا ہی جانے لے کیا ہوا ہے اے صادق
کچھ آپ ہی آپ جو سینے میں جی سلگتا ہے

صادق
صادق:۔ لالہ ہیبت رام صاحب کسی زمانہ میں بریلی کے قانون گو تھے۔ پرانے الفاظ و قدیم محاورات بہت عزیز تھے۔ خط و خال کی شاعری سرمایۂ ناز تھی۔

ہے زلف و رخ کا اُس کے ہر دم مجھے تصور
کس طرح خوش نہ گذرے لیل و نہار میرا

مرے دل حزیں کو تم افگار کر چلے
اے واہ وا میاں یہ بھلا پیار کر چلے

دل کے تئیں تو کہتے ہیں سب خانہ خدا
تم خانۂ خدا کو بھی مسمار کر چلے

صادق
صادق:۔ جناب محمد صدیق صاحب خلف مرزا مچھو بیگ صاحب عاشق "ستم ظریف" لکھنوی طبیعت میں ظرافت اور شوخی ہے۔ ایک عاشقانہ مثنوی آپ کے نام سے شائع ہو چکی ہے جس میں محاورات اور عورتوں کے بول چال کو خوب نظم کیا ہے۔ اپنے والد کی طرح مشہور نہیں۔ رسائل وجرائد میں بھی ان کا نام نظر نہیں آتا۔ مشاعروں میں بھی شریک نہیں ہوتے۔ ادبی مجالس میں نمایاں ہونے کے بجائے گوشۂ تنہائی پسند

[illegible]

جان دینا مجھے آساں ہے خوش خو ہوتا / دم آخر مری بالیں پہ اگر تو ہوتا
کعبہ و دیر سے رندوں کو غرض کیا اے بت / سر جھکاتے یہ اُسی سمت جدھر تو ہوتا
تم نہ آئے نہ سہی موت ہی آتی مری جاں / چین دل کو شب فرقت کبھی پہلو ہوتا
موجیں دریا کی نہ اسطرح سے سر ٹکراتیں / بال بکھرائے ہوئے تو جو لب جو ہوتا
سامنا اُس رُخ روشن کا جو ہوتا صادق / گھٹکے خورشید جہانتاب بھی جگنو ہوتا
ہم سے جلے بھنوں کی نہ لے آہ آسماں / دم میں اُلٹ پلٹ نہ یہ سب کارخانہ ہو
نکلیں جو آہ سرد کے ہمراہ حسرتیں / کیا ٹھنڈے ٹھنڈے قافلۂ دل روانہ ہو
اے جاں صفائے قلب یہی ہے جو عشق میں / دل کا مکاں عجب نہیں آئینہ خانہ ہو

صادق:- صادق علیشاہ تلمیذ شاہ نصیر دہلوی۔ بہت پُر گو اور پاکیزہ خیال شاعر تھے۔ نظم کے مختلف اصناف میں جولانی دکھاتے تھے۔ اپنے معاصرین سے قبولیت کی سند پائی۔ صاحب دیوان تھے۔ ملکہ شاعری خداداد تھا۔ استعارہ اور تشبیہ کے جال سے ان کا طائر خیال آزاد تھا۔ یہ کلام ہے:-

نالہ پُر درد یارب لب پہ اب آنے لگے / ڈر ہے کھلجائے نہ پردہ اُس پر اپنی چاہ کا
رات دن بھرتا تھا آہیں جو گلی میں آپ کی / آج دُنیا سے سُنا ہے وہ جواں جاتا رہا
گو دل کی تپش نے مجھے بیمار تو رکھا / پر گرم ترے حسن کا بازار تو رکھا
پیدا ہو خریدار کوئی یا کہ نہ ہووے / لیجاکے ہیں دل کو سر بازار تو رکھا
پورب کے پریزادوں نے انداز سے اپنے / اس شہر کے ہر کوچہ کو پنجاب بنایا
نہ پڑا اس کا پھر قدم آگے / اس کے جو آستاں سے گذرا
کیا ہی عاشق مزاج تھا صادق / آخرش اپنی جاں سے گذرا
میرے آگے غیر سے کرتے ہو جو تم اختلاط / ناز بیجا مجھ سے یہ کیونکر اُٹھایا جائیگا
نہ کُھل جائے کہیں راز محبت / میں کشتہ ہوں نگاہ شرمگیں کا

دُنیا کو کچھ بھی ہم نے ہرگز نہ مال جانا
ہستی کو اُس کی دائم خواب و خیال جانا

جوشِ جنوں ہی پہ ترے عاشق کو ان دنوں
کہتا ہے آسماں کی جو پوچھو زمیں کی بات

ہوتا ہی بات بات میں چلیں بر جبیں وہ شوخ
چھیڑے بھی کوئی اس سے جو خوبانِ چین کی بات

کئی دن سے نہیں ہے دانۂ تسبیح کی کھٹ پٹ
ہوئی شاید کہیں بنت العنب سے شیخ جی غٹ پٹ

بُتِ ناداں سمجھ کر اس سے ہم نے دل لگایا تھا
ولے پُرفن وہ نکلا اپنے فن میں ایک ہی نٹ کھٹ

پھرے ہے آج دیوانہ سا صادق کچھ نہ کچھ تو ہے
یقیں ہے ہوگئی ہے یار سے آپس میں کچھ کھٹ پٹ

لے چلی بیتابی دل جب بیاباں کیطرف
تب لگا دستِ جنوں جانے گریباں کیطرف

کس نزاکت سے چلا دامن جھٹک کر رات کو
ہاتھ دوڑایا جو میں اس گل کے داماں کیطرف

آہ جس جا پہ مرا رشک چمن رہتا ہے
روز اُس کوچہ میں ہو رہتے ہیں دو چار کے پھول

صادق بتوں کے عشق مجازی کے ہاتھ سے
بکھرے گئے ہیں مفت پشیمانیوں میں ہم

کیوں بارِ گراں پھرنا ہے تو تیغ کا باندھے
ابرو ہی ترے چاہیں جسے مار اُتار یں

غضب جادو ہے ان کا فریب زاد و کیا ہاتھ نہیں
لگائی ان سے جب بازی وہیں دل ہار بیٹھے ہیں

گالیاں دیتا ہے لاکھوں مُنہ پہ میرے دم بدم
جس پہ کہتا ہے ہر اک سے میں تو کچھ کہتا نہیں

طوفاں کہیں بپا نہ کریں خوف ہے مجھکو
اشک آنے لگے دیدۂ پُرنم سے زیادہ

ہوتا ہے ہر از خسم کہن آمد گل میں
لگتا ہے مجھے ڈر اسی موسم سے زیادہ

لگ نہ چل اتنا بھی ایدل یار سے لگتا ہے ڈر
ان بتوں سے خوب ہے صاحب سلامت دور کی

خوب جھڑیاں لگائیں ساون کی
چشم تر واہ تجھ کو رحمت ہے

اسکے بوٹے سے قد کو دیکھو تو
فتنہ ہے قہر ہے قیامت ہے

مطلق کھلا نہ بھید مجالس اس جہان کا
آئے تھے ہم کہاں سے او راب ہم کہاں چلے

خوش آئے کیوں کج ادائی تمہاری
بتو آجکل ہے خدائی تمہاری

جب کبھی چوٹی اس کی یاد مجکو آئے ہے
سانپ سا چھاتی پہ میری اس گھڑی لہرائے ہے

صادق

صادق:- پنڈت دیبی پرشاد عرف بقایا بریلوی خلف پنڈت کشن لال کشمیری الاصل حضرت منیر شکوہ آبادی۔ لالہ مادھورام جوہر اور ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کی صحبتیں اٹھائی تھیں پہلے فخر تخلّص کرتے تھے۔ مگر حضرت منیر کے مشورہ سے صادق تخلّص رکھا اور انھیں سے مشورہ سخن بھی کرتے تھے۔ ۹۷ برس کی عمر میں ۱۹۲۱ئہ میں انتقال فرمایا کلام میں پختگی و متانت ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

خوش طینتی سے ایدل ہوتا ہے نام سب کا	نافہ سے اپنے آہو مشہور ہے ختن میں
کیوں نہ برسات میں ہو سبز دوپٹے کی بہار	رنگ بہتر نہیں کوئی دنیا میں کوئی دھانی سے
جب نہ ہو خرچ تو کیا مال سے حاصل ہے حریص	یوں تو ہر غنچے کی مٹھی میں بھی زر ہوتا ہے
سخت دل سو سے خالی نہیں ہوتے صادق	دیکھ پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

صادق

صادق:- بابو چھجّو سنگھ بی۔ اے وکیل اجابن متوطن بلند شہر عمر تخمیناً ۴۰ سال بطور نمونہ مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں۔

اس نے خنجر جو پئے قتل اٹھانا چاہا	ہم تو ہم غیر نے گردن کو جھکانا چاہا
کیا اعتبار ہستئ ناپائیدار کا	اک کھیل تھا کہ دم میں بنا اور بگڑ گیا
ظالم نے دشمنی سے مجھے یاد جب کیا	ہچکی ہی لیتے لیتے مرا دم اکھڑ گیا
نہ لے ساتھ اپنے گناہوں کا توشہ	عدم کے مسافر سفر کرنے والے

صادق:- ریاست کاشمیر میں ملازم تھے۔ غزل کمتر نظمیں زیادہ لکھتے ہیں۔ اشعار ذیل رسالہ مخزن کی ایک جلد میں نظر سے گذرے وہ ہدیہ ناظرین ہیں:-

شوخ چشمی نے کیا دختر رز کو بدنام	یہ نہ ہو اسمیں تو یہ خانہ خراب اچھی ہے
ہستی بحر حوادث ہے فنا کی تعلیم	زندگی تھوڑی ہی لے طفل حباب اچھی ہے
غیر سے بزم تہی شکوہ سے دل ہو خالی	اس فراغت سے ملے تو ہئی ناب اچھی ہے

صادق:- سید صادق علی رضوی باشندۂ بریلی۔ کچھ زمانہ گذرا بمبئی میں قیام تھا

وہاں کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ زبان اور سادہ گوئی کے دلدادہ ہیں :۔

کوچۂ جاناں میں ہم بستر لگائینگے ضرور ۔۔۔ پاسباں سے اور ہم سے اسمیں جھگڑا کیوں نہ ہو
دستِ نازک سے اُٹھے لیلےٰ کی یہ مشکل ہے قلیں ۔۔۔ پھول سے بھی گو سبک محمل کا پردہ کیوں نہ ہو
نامراد ایسا بھی اُٹھا ہے زمانہ سے کوئی ۔۔۔ حسرتوں کا تربتِ صادق پہ میلا کیوں نہ ہو

صادق

صادق :۔ میرزا صادق خاں حیدرآباد دکن کے قدیم شعرا میں درجہ امتیاز رکھتے نواب آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں بقید حیات تھے۔ دولت آصفیہ کے منصب داروں میں ان کا شمار تھا علمی استعداد اچھی تھی۔ زندہ دل۔ یار باش۔ شوخ طبع تھے۔ زیادہ کلام دستیاب نہوا۔ صرف دو شعر ملے وہی درج کیے جاتے ہیں : ۔

بدقت اشک اب نکلا ہے شاید ۔۔۔ ہوا آنکھوں میں لختِ جگر بند
کہاں نکلے ہے تارِ زلف سے دل ۔۔۔ کرے پرواز کیونکر مرغ پربند

صادق

صادق :۔ شیخ صادق حسین خاں ساکن لکھنؤ متوطن بریلی شاگرد حضرت میر علی اوسط رشک وخلیفہ بشیر فن بدیع اور علم عروض سے واقف تھے۔ مگر شعر میں مزہ نہیں ہے الفاظ کی تحقیقات کا شوق تھا۔ کلام یہ ہے۔

لاکھ چمکے روئے جاناں کا نہ ہوگا شک ذرا ۔۔۔ ہوش میں آئے کسی غافل کو دے جُل آفتاب
شکلِ نخشب جھانک کر عکس رُخِ پُرنور سے ۔۔۔ کیا اُتاروگے میانِ چاہِ بابُل آفتاب
جو ہے فقیر کو حاصل غنا بدولت فقر ۔۔۔ امیر میں نہ تو انگر نہ بادشاہ میں ہے

صادق

صادق :۔ غلام محمد صادق۔ دہلوی۔ رعایت لفظی پر فدا ہیں۔ کلام میں اور کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ یہ دو شعر اُن کے ملاحظہ ہوں۔

بڑا ہے اسقدر رُتبہ سخن گوئی کے دیواں کا ۔۔۔ کہ پایا پایۂ مضموں نے پایہ عرش یزداں کا
سدا ہیں باغ معنی میں گُل مضموں یہ پھول شیدا ۔۔۔ کہ میرا مرغ دل بلبل ہے صادق اُس گلستاں کا

صادق

صادق :۔ مولوی محمد عزیز الدین ولد مولوی اساس الدین تلمیذ اسداللہ خاں غالب اصلی

وطن بدایوں تھا۔ مگر دہلی کو وطن بنالیا تھا۔ استعداد علمی و خلق حد کمال تک فائز تھا سنہ ۱۳۰۳ھ میں پیلی بھیت میں منصف تھے۔ عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔ یہ کلام ہے۔

یہ کس سے اُٹھ سکے ستم اس رشکِ ماہ کا
اوروں پہ لطف مجھ پہ نہ کرنا نگاہ کا

اس میں نا آئے نظر جلوہ خدا کے نور کا
بُت بنانے کے لئے زیبا ہے پتھر طور کا

وہ بہا خونِ جگر میرے دہانِ زخم سے
چادر آبِ رواں پھاہا بنا ناسور کا

نشتر تھا یا کہ تیر نظر کا گذر ہوا
کیا تھا الٰہی سینہ میں جو کارگر ہوا

اللہ ری تیری بے ادبی نالۂ سحر
وہ مستِ ناز خواب سے بیدار ہو گیا

گذر کیونکر ہو ایسے آستاں تک
تصوّر بھی نہیں جاتا جہاں تک

یہی گر آہ و نالہ ہے تو صادق
رہیگا دم نہ تاثیر فغاں تک

سارے انداز ستم ختم نہ کر تو مجھ پر
کچھ تو دشمن کے لئے طرز جفا رہنے دے

ہے یہ تنہائی ہیں مجھ سوختہ جاں کی غمخوار
شمع مرقد کو مری بادِ صبا رہنے دے

دیکھے تیور چڑھے جو قاتل کے
حوصلے پست ہو گئے دل کے

لے گئی دل اک نظر میں اسکی چشم نیم خواب
مست ہم سمجھے تھے اسکو پر بہت ہشیار ہے

صادق

صادق:۔ میر محمد صادق خلف میر سید محمد باشندۂ لکھنؤ مقیم مٹیا برج۔ شاگرد مظفر علی ہنر۔ مضمون آفرینی کے ساتھ زبان کی شیرینی بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔

بھلا دل کوچۂ گیسو میں سرگرداں نہ ہو کیونکر
یہ وہ ہیں ہیں جنہیں خضر بھی اکثر بھٹکتے ہیں

اُدھر بزم میں جام چلتے رہے
اِدھر اشک آنکھوں سے ڈھلتے رہے

صادق

صادق:۔ سید صادق شاہ خلف حسین شاہ رامپوری۔ شاگرد منیر شکوہ آبادی سنہ ۱۸۹۰ء میں عمر پچاس برس کی تھی۔ اور رامپور میں ملازم ریاست تھے۔ طبیعت اچھی پائی تھی۔ یہ کلام ہے:۔

یوں تو تمھیں سب عاشق زمانے کے ملیں گے
پر چاہنے والا کوئی ہمسا نہ ملے گا

میرے پہلو سے جو وہ رشکِ مسیحا اٹھا	تھام کر دل کو کئی بار میں بیٹھا اٹھا
عیش کیا رنج بھی نہیں رہتا	ایک عالم نہیں زمانے کا
صادق زبان و دل تو ہیں قبضے میں یار کے	حیران ہوں کہ وصل کی کیونکر دعا کروں

صادق

صادق:- منشی جلال الدین حیدر۔ باشندۂ جونپور۔ شاگرد حکیم میر مبارک حسین صدق جونپوری۔ زبان صاف ہے۔ اور تخیل پاکیزہ۔ یہ کلام ہے۔

کوبکو خاک اڑاتی ہے پریشاں ہو کر	بیکسی ہو گئی بیکس مرے مر جانے سے
حشر میں یار نے پہچان کے پوچھا مجھ سے	تم وہی ہو جو پھرا کرتے تھے دیوانے سے
دل کے بہلانے کو دو گھر یہ بنا رکھتے ہیں	آئے کعبہ میں جو اٹھے کبھی بتخانے سے
واعظ کی میکشی تو ہے رندوں سے بھی بڑھی	پڑھتا ہے وعظ میں بھی حدیثیں شراب کی

صالح

صالح:- میرزا مصلح الدین دہلوی۔ تخلص میرزا حسین بخش و نبیرۂ بہادر شاہ۔ شاگرد مرزا پیارے رفعت۔ خوش فکر اور موزوں طبع شاعر تھے۔ ایام غدر میں بعمر ۱۲ سال گرفتار ہو کر رنگون بھیجے گئے۔ یہ کلام ہے جو ان کی شوخی طبع اور روشن خیالی پر دال ہے۔

نکلتی سیاں تو کیونکر نکلتی	کہ دل تو یار میں اس کا ہوا تھا
زندگی کی نہیں صورت نظر آتی اب کی	درد دل میں یہ اٹھا ہے کہ خدا خیر کرے

صانع

صانع:- میر نظام الدین احمد بلگرامی۔ میرزا رفیع سودا کے یاران ہمادق سے تھے۔ قدرت نے انھیں درد بھرا دل دیا تھا۔ جہاں کوئی حسرت خیز واقع سنا اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جلوس شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں مرشدآباد اور کلکتہ میں قیام تھا۔ ان کا فارسی دیوان پرانے کتب خانوں میں دستیاب ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ریختہ بھی کہتے۔ انتخاب کلام یہ ہے:-

کیا زخمت سگ لیلی کو دیکھ استخواں اپنا	نہ چھوڑا ہائے کچھ مجنوں نے صحرا میں نشاں اپنا
ہوا ہے شوق موہن کو دھڑی ہونٹوں جلانے کا	نہ جانوں کیا سبب یاقوت کے نیلم بنانے کا

قید میں تیری نپٹ دلگیر ہیں صیاد ہم	خوش گذرتا تھا ہمارا جبکہ تھے آزاد ہم
گل بہ خواب ناز میں اور باغباں نازک دماغ	ہائے کیونکر صحنِ گلشن میں کریں فریاد ہم
جلے بھنے ترے جس وقت آہ کرتے ہیں	تو دودِ دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں
وہی ہوئے ہیں تب و تاب جاں سے آگاہ	جو کوئے دل سے گذر گاہ گاہ کرتے ہیں
نہ کوہ کن سے ہوئی بیستوں میں صانع راہ	بڑے سے وہ مرد ہیں دل میں راہ کرتے ہیں

صائم

صائم: مولوی سید رمضان علی ولد مولوی محسن مرحوم۔ مولوی غلام حسین تخلص حسینؔ کے شاگرد تھے۔ پچاس برس کی عمر میں ۱۲۶۰ھ میں وفات کی ایک شعران کا تذکرہ انتخاب یادگار میں ملاوہ ہدیہ ناظرین ہے۔

یہ مانا حضرتِ دل آپ ہیں بڑے طرار	جو اُن کے سامنے بولیں تو ہم سلام کریں

صبا

صبا۔ میر وزیر علی مرحوم خلف میر بندہ علی لکھنوی و فخر تلامذۂ خواجہ حیدر علی آتش مرحوم لکھنؤ کے متوسط الحال لوگوں میں ان کا شمار تھا۔ ان کے ماموں میر اشرف علی نے ان کو پسر متبنّی قرار دیا تھا۔ اسلئے انھیں کی زیر تربیت صبا نے تعلیم حاصل کی۔ ان کے یار باش اور خلیق ہونے کا تذکرہ اکثر پرانے لوگ کیا کرتے تھے۔ صبح سے شام تک مجمع احباب رہتا تھا۔ حضرت سلطان عالم واجد علیشاہ کی سرکار سے دو سو روپیہ مقرر تھا۔ اور تیس روپیہ نواب محسن الدولہ بہادر نبیرۂ غازی الدین حیدر کے ہاں سے ملتے تھے۔ علاوہ بریں کئی باغ اور کچھ پرامیسری نوٹ بھی ان کی ملک سے تھے۔ جن کا منافع مسٹر جوزف کی معرفت وصول ہوا کرتا تھا۔

تلامذہ آتش میں جتنے شاگرد صبا کے ہیں اتنے کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئے مثلاً شیخ فضل احمد کیف۔ آغا حسن ازل۔ عبد الکریم رضا۔ بقا خلف صبا۔ فروغ۔ فوق شہا۔ وغیرہم میں سے اکثر صاحبِ دیوان اور اُستاد مانے جاتے تھے۔ منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی اور مرزا حاتم علی مہر اُن کے بڑے گہرے دوست تھے۔ ۲۷ رمضان المبارک

۱۲۷۱ھ میں صبا نے گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔ بحر نے یہ تاریخ کہی۔ ؎

بحر ازیں مصرعہ جاں سوز گل سال دمید | چمن ہستی موہوم صبا شد برباد

ایک دیوان (موسوم بہ اسم تاریخی غنچۂ آرزو) اور مثنوی صید (شکارنامہ واجد علیشاہ) یادگار ہیں۔

صبا کی شاعری بحیثیت مجموعی اُس وقت کی غزل گوئی کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ یعنی لطف زبان انداز بیان۔ تلاشِ مضامین۔ رنگینی اور سلاست اُن کے ہاں موجود ہے۔ رعایت لفظی کا نامطبوع استعمال بھی رشک اور امانت سے کم ہے۔ جہاں تشبیہات سے کام لیا ہے۔ وہاں شکوہ الفاظ اور استادانہ زور نے شعر کو پست نہیں ہونے دیا۔ صبا کی بعض بعض غزلیں فصاحت اور متغزلانہ ادا کی روح و رواں ہیں۔ شاید انھیں سے متاثر ہو کر شوق نیموی نے اپنے رسالہ اصلاح میں لکھا ہے کہ "لکھنؤ کے اگلے شعرا میں سے صبا کی شیریں بیانی دلّی والوں سے ملتی جلتی ہے" چھوٹی بحروں میں صبا نے سلاست اور روانی کے دریا بہائے ہیں۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

الفت کعبۂ مقصود نے صورت پکڑی
اے صبا دیکھ کے جلوہ چمن عالم کا

نہایت جوش پر دریا ہی اپنے طبع موزوں کا
ملایا خاک میں گردوں نے کس کس نام آور کو

محو ابرو کے لئے خنجر فولاد آیا
دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے

چشم موسیٰ ہمہ تن بن گیا میں حیرت سے
حلق زاہد کا جو روزے میں بہت خشک ہوا

اے زاہد ریائی دیکھی نماز تیری

تشکل محراب ہوئی دست دعا سے پیدا
حالت وجد ہے ہر موج ہوا سے پیدا

جہاں میں شور ہے طوفان آب دُرِ مضموں کا
نشاں ملتا نہیں ہے قبر جمشید و فریدوں کا

ذبح کرنا بھی نہ تجھکو مرے جلاد آیا
بیٹھے بیٹھے ہیں کیا جانئے کیا یاد آیا

دیکھا اک بت کا وہ عالم کہ خدا یاد آیا
دامن تر مرا لے کے نچوڑا کیا کیا

نیت اگر یہی ہے تو کیا ثواب ہوگا

اُڑا دی قیدِ مذہب ہم نے دل سے
قفس سے طائرِ ادراک نکلا

لے اُڑا تجھ کو ترا حسنِ شباب
اب تو عالم ہی نرالا ہو گیا

جائے عبرت ہے جہانِ بے ثبات
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

جب مجھے اپنی حقیقت کھل گئی
جز سے کل قطرہ سے دریا ہو گیا

گھر سے وحشت میں جو میں چاک گریباں نکلا
کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں نکلا

اُلفت کوچۂ جاناں نے کیا خانہ خراب
برہمن دیر سے کعبہ سے مسلماں نکلا

خوب رویوں سے دل صفا نہ ہُوا
آئنہ صورت آشنا نہ ہُوا

عجب طرح کے حوادث ہیں بحرِ ہستی میں
ہر اک کا حال یہاں مثلِ نقشِ آب رہا

لگندے کے وہیں موج ہو گئی موجود
جہاں ذرا سر اُٹھائے ہوئے حباب رہا

واعظ کے میں ضرور ڈرائے سے ڈر گیا
جامِ شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا

بُلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں
وہ دن گذر گئے وہ زمانہ گذر گیا

مثلِ حباب بحرِ جہاں میں نہ دم لیا
اِک موج تھا کہ میں اِدھر آیا اُدھر گیا

آمد سنی جو باغ میں اس بادہ خوار کی
گُل نے پیالہ سرو نے مینا اُٹھا لیا

روزِ ازل کھلا جو کتب خانۂ بہار
سوسن نے دس ورق کا رسالہ اُٹھا لیا

نزع میں صلح کی باتیں کیسی
ملک الموت سے لڑوائے گا

دل صاف ہُوا آئینہ رو نظر آیا
سب کچھ نظر آیا جو ہمیں تو نظر آیا

جو رو نکی طرف لاکھ ہو زاہد کی توجہ
کھل جائینگی آنکھیں جو کبھی تو نظر آیا

جو بات ہی ہر مذہب و ملت سے جدا ہے
دیکھا جو صبا سب سے الگ تو نظر آیا

اے صبا ان سے ملاقات جو رکھتی تھی تمہیں
حرفِ مطلب کا زباں سے نہ نکلا ہوتا

لبوں تک آہ نہیں فرطِ ضعف سے آتی
بتو خدا سے ڈرو میں کہاں کہاں فریاد

بے تابیِ دل نے زار پا کر
دے دے پٹکا اُٹھا اُٹھا کر

آتے تو دیکھتے لب جاناں کے معجزے
اچھے مسیح جا کے چھپے آسمان پر

ساقی ہے، میکدہ ہے، شب ماہتاب ہے
چھٹکی ہے چاندنی در و دیوار بام پر

کھو چکے قاصد کو خط کر کے انہیں تحریر ہم
رو چکے لکھے کو اپنے خوب اے تقدیر ہم

عشقِ کامل نے دیا ہے حسن کا رتبہ ہمیں
آئینہ میں دیکھتے ہیں یار کی تصویر ہم

فصلِ خزاں چمن میں جو آئی تو اے صبا
روئے لپٹ لپٹ کے بہت باغباں سے ہم

تقریر اختلاف ہیں کیونکر پڑھے نہیں
ہندو پڑھے نہیں کہ مسلمان پڑھے نہیں

اللہ ری گردشِ زمانہ
ہر روز نئی مصیبتیں ہیں

سرمہ ہوا خاک طور جل کر
یہ حسن کی سب شرارتیں ہیں

فکر کونین کی رہتی نہیں میخواروں میں
غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یاروں میں

بہار آئے الٰہی وہی سماں پھر ہو
پھر ایک جا گل و بلبل کو باغباں دیکھیں

شراب سرخ کے ساغر ہوں اور زاہد ہوں
وہ لال اور نشیلی جو انکھڑیاں دیکھیں

قیامت ہے کسی کو پیار کرنا اس زمانے میں
قضا کا سامنا رکھا ہوا ہے دل لگانے میں

اے فلک پتھر پڑیں تجھ پر غضب تو نے کیا
خاک میں کیسی ملا دی کوہکن کی آرزو

صورت کا آشنا ہو معنی کی دید کر
اے خود پسند دیکھ نہ بن بن کے آئینہ

کیونکر نکال کر اسے پہلو سے پھینک دوں
مجبور ہوں میں دل پہ نہیں اختیار کچھ

قضا کی نشانی ہے الفت بتوں کی
وہ جینا ہے جواں پہ مرنا نہیں ہے

صبر بیٹھ رہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے
کوئی کام تجھ سے سنورتا نہیں ہے

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

عقدۂ خاطر ہے لیں اور ناخن تدبیر ہے
عمر گذری ہے اسی گتھی کو سلجھاتے ہوئے

میکشو اب کی تو رنگ ایسا جمایا چاہئے
واعظ آئیں کھیتوں پر بولیاں کاٹتے ہوئے

ہائے اب کیا کہتے سمجھائیں دلِ بیتاب کو
ان سے ہم کہتے رہے کہ جاؤ کچھ جاتے ہوئے

چشمِ پُرآب سے ہے نشو و نما ساون کی
نفسِ سرد نے باندھی ہے ہوا ساون کی

گرمیوں میں جو پریشاں ہوئے ہم بادہ پرست
مانگی سر کھول کے ساقی نے دعا ساون کی

حرم کو اس لئے اُٹھ کر نہ بُت کدے سے گئے
خدا کہے گا کہ جورِ بتاں اُٹھا نہ سکے

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے
جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے

کہیں کہیں گُل و صوتِ ہزار باقی ہے
ہنوز باغ میں کچھ کچھ بہار باقی ہے

پھنسائے گا مجھے دشتِ جنوں کی کانٹو نہیں
یہ ایک آدھ جو دامن کا تار باقی ہے

تپِ فراق سے بچ جائیں گے تو جانینگے
کچھ اور زندگیِ مستعار باقی ہے

ہزار بار قیامت گذر گئی ہم پر
مگر ہنوز شبِ انتظار باقی ہے

کسی کو دیکھ کے قابو میں دل نہیں رہتا
یہ روگ آج تک اے جانِ زار باقی ہے

جہادِ نفس سے ہے اے صبا تمہیں درپیش
بڑا ہی معرکۂ کارزار باقی ہے

اُٹھ اُٹھ کے شبِ وصل میں کہتا ہے وہ پُرفن
کیسی یہ سحر ہے نہ گجر ہے نہ اذاں ہے

آپ اپنی بے وفائی دیکھئے
ہم سے اور ایسی بُرائی دیکھئے

آمد آمد موسمِ گل کی ہوئی
پھر طبیعت گدگدائی دیکھئے

داغ چمکا چلی نسیمِ بہار
یہ ہوا میں چراغ کس کا ہے

خدا کا قہر بتوں کا عتاب رہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں ہیں ایک مُشتِ خاک کے

آدمی دعویٰ انا الحق کا کرے
ولولے دیکھو تو مُشتِ خاک کے

توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو
کھول دے پر طائرِ ادراک کے

جامۂ نیلی فلک پہنے ہوئے
سوگ میں ہے کس گریباں چاک کے

خاکساروں سے نہ کر پہلو تہی
ایک دن جانا ہے نیچے خاک کے

ہو گیا بے چین تو اچھا ہوا
اور سُن نالے دلِ غمگین کے

میخانہ عالم میں غنیمت ہے مرا دم
اتنا بھی کوئی رندمے آشام نہیں ہے

حالِ دل کہئے تو کس طنز سے وہ کہتے ہیں
تم سلامت رہو اُلفت کے جتانیوالے

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانیوالے

دل لگانا عذاب ہوتا ہے
آدمی کیا خراب ہوتا ہے

ہونی ہوتی ہے جب کہ بربادی
عشق خانہ خراب ہوتا ہے

مَے پرستوں کے دن جو پھرتے ہیں
روز دورِ شراب ہوتا ہے

ہائے کیا بھول گئے یار عدم میں جاکر
کیا تماشہ ہے کسی نے نہ کیا یاد مجھے

بات رکھ لی دلِ ناکام نے مرتے مرتے
تالب گور زباں پہ نہ شکایت آئی

آئے نہ آئے دم کا کسے اعتبار ہے
ناپائیدار زندگیٔ مستعار ہے

جو حال دیکھتا ہے وہ کہنا پیام ہے
آئیں نہ آئیں اسکا انہیں اختیار ہے

صبا: جناب منشی تیج بہاری لعل صاحب، کالیستھ ماتھر۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۹۵ء میں تاریخ ولادت ہے۔ ان کے بزرگواروں کا وطن اوّل نارنول اور بعد میں کوٹ پوتلی رہا۔ اب عرصہ سوا سو سال سے مستقل سکونت ریاست جے پور (راجپوتانہ) میں ہے۔ ان کے بزرگ عہد سلطنت مغلیہ میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ شہنشاہ جہانگیر کے نائب وزیر اعظم رائے مکند جی آپ کے بزرگوں میں تھے۔ علاوہ ملازمت شاہی کے ان کے بزرگوں کی قانونگوئی پرگنہ کوٹ پوتلی بھی مدت سے چلی آتی ہے۔ ان کے بزرگوں کے شاہی رسوخ و ملازمت کیوجہ سے مہاراجہ جے پور سے ہمیشہ تعلق رہا۔ مہاراجہ سوائی جے سنگھ جی دوئم کے زمانہ میں جبکہ سلطنت مغلیہ کی حالت زوال پذیر تھی ان کے بزرگ دہلی سے مہاراجہ صاحب موصوف کے ہمراہ جے پور آئے اور کچھ مدت کاروبار ریاست میں شریک ہوکر کوٹ پوتلی چلے گئے مگر مہاراجہ جگت سنگھ جی کے زمانہ میں ضرورت محسوس ہونے پر ان کے بزرگوں کو یاد فرمایا گیا۔ اس وقت سے ان کے خاندان کو مستقل طور پر ریاست سے

وابستگی ہے اور اسکے ممبر ریاست کی معزز ذمہ دارانہ خدمات پر مامور رہے ہیں۔ انکے پردادا منشی نند کشور جی کو معقول جائداد عنایت کیگئی۔ مہاراجہ سوائی مادھو سنگھ جی آنجہانی کے مراحم خسروانہ خاص طور پر ان کے بزرگوں پر مبذول رہی اور اکثر ریاست کے اہم و پیچیدہ معاملات میں ان کا مشورہ کار آمد ثابت ہوا۔ یہ خاندان ہمیشہ سے علم دوست مشہور ہے صبا صاحب کے والد بزرگوار منشی گوبند نرائن صاحب فارسی کے جید عالم تھے اُن کی تصنیف انشاء گوبند نرائن فارسی طبع ہو کر راجپوتانہ میں خاصی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ خود منشی چند بہاری لعل صاحب صبا جس خاندان کے چشم و چراغ ہیں ویسا ہی قدرت سے دل و دماغ بھی لے کر آئے ہیں۔ آپ نہایت حلیم الطبع۔ بیدار مغز روشن خیال۔ خلیق اور متواضع ہیں آپ کی تعلیم و تربیت اس سے بہتر ہوئی۔ جیسی عموماً امیرزادوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آپ اپنی اوقات فرصت میں علمی مشاغل میں مشغول رہ کر اس کمی کو اپنے مشہور زماں اُستاد میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی جیسے ذیعلم بزرگ کی سرپرستی میں پورا کرتے رہے۔ میرزا صاحب مرحوم اپنے شاگردوں میں آپ کو نہایت عزیز سمجھتے تھے اور خاص عنایت توجہ فرماتے تھے۔ ۱۹۲۹ء کے آل انڈیا کایستھ کانفرنس دہلی کے مشاعرہ میں آپ کی غزل سب سے بہتر رہنے کیوجہ میں پہلا انعام طلائی تمغہ آپ نے حاصل کیا۔ بعد وفات میرزا مائل اُن کے جملہ قدیم و جدید تلامذہ نے بالاتفاق منشی صاحب ہی کو میرزا صاحب کی وفات کے آٹھویں روز یعنی ۹ را کتوبر ۱۹۳۱ء کو ایک بزم منعقد کر کے دستار جانشینی میرزا صاحب کے سب سے پرانے شاگرد مولوی منظور احمد صاحب کوثر اور ناظم الملک سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی نے اپنے ہاتھوں سے منشی صاحب کے سر پر باندھ دی۔ یہ جانشینی دہلی میں بھی تسلیم کی گئی۔ اس تقریب پر لکھنؤ سے حضرت ریاض مرحوم نے مبارکباد لکھی مرزا مائل راقم کے مہربان دوستوں میں تھے۔ اور میرے نزدیک وہ اپنے وقت

ہیں پُرانی چال کی غزل کے بہترین شاعر اور اُستاد تھے۔ وُہی رنگ وہی حسن ادا۔ وہی سہل ممتنع کا چسکا۔ وہی فصاحت مضامین کی آمد اور اسلوب کی چستی صبا صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ فصیح الملک داغ کی رحلت کے بعد بہ جانشینی کے قضیے شروع ہوئے۔ جن کی طرف راقم نے کبھی توجہ نہ کی۔ لیکن صبا صاحب کی جانشینی مایل کے فیصلہ سے راقم کو خوشی حاصل ہوئی۔ کیونکہ وہ اس امتیاز کے اہل ہیں۔ اب انتخاب کلام ملاحظہ ہو

جو دم بھر کے لئے جوشِ شباب آیا تو کیا آیا
چھلکتا سامنے جامِ شراب آیا تو کیا آیا

ہوا اُس سے نہ خشک اپنا ذرا سا دامنِ تر بھی
سوا نیزے پہ یارب آفتاب آتا تو کیا آتا

عمر بھر جوش مرے دیدۂ گریاں میں رہا
ہیں تو دریائے محبت کے ہی طوفاں میں رہا

بعد مرنے کے کھلا حال بڑی چیز تھے شیخ
شور ماتم کا بہت جلسۂ رنداں میں رہا

قدرتی ہوگئی اوس کو رگِ گل سے نسبت
فصلِ گل میں جو کوئی تارِ گریباں میں رہا

یہ دیر و حرم کیا جہاں تو رہے گا
جبیں تو وہاں سر جھکانا پڑے گا

یہی ہے جو تنہا نشینی میں لذت
تری یاد کو بھی بھلانا پڑے گا

نہ آئیں وہ دل میں مگر نام بنکر
زباں پہ تو عاشق کی آنا پڑے گا

کام دنیا میں کسی کا بھی نہ چلتے دیکھا
رنگ دُنیا کا کئی بار بدلتے دیکھا

شیخ صاحب تمہیں ایمان سے کہدو تم نے
میکدے سے کوئی ناکام نکلتے دیکھا

سنگ دل ایک نہ دیکھا تو ترا دل ہم نے
ورنہ آہوں سے تو پتھر کو پگھلتے دیکھا

جب بہار آئی ہے واعظ کے مکاں کو ہم نے
پارسائی کے جنازے کو نکلتے دیکھا

نہ رہا کوئی زمانہ کا بدلنے والا
سب کو ہمراہ زمانہ کے بدلتے دیکھا

نہ دیا شیخ کو ساقی نے چھلکتا ساغر
ایک چلو میں ہی جب کام نکلتے دیکھا

نہ کھلا پہ کھلا راز کسی پہ تیرا
ہوش و ادراک کو بس ہاتھ ہی ملتے دیکھا

خدا کی خدائی بھی اس دل پہ قرباں
جو نورِ محبت سے معمور نکلا

وہ ہوں کشتۂ لن ترانی کہ میری
جہاں قبر کھودی وہاں طور نکلا

یہی مے تھی پیتے ہیں جسکو صبا ہم
تنک ظرف بیچارہ منصور نکلا

لذت نہ جور میں ہے نہ بیداد میں مزا
جب سے مشیر آپ کا چرخ کہن ہوا

وہ نگاہیں کیا پھریں ہم سے زمانہ پھر گیا
آہ جیسی چیز کا اُلٹا اثر ہونے لگا

اب وہ پوچھیں یا نہ پوچھیں کچھ گلہ ان سے نہیں
آپ اپنے حال سے میں بے خبر ہونے لگا

پست ہو جاتی ہے ہمت کام پھر بنتا نہیں
نا امیدی کا جہاں دل میں گذر ہونے لگا

اس حجاب آمیز شوخی کی ادا ہی اور تھی
وصل کا اقرار جب منہ پھیر کر ہونے لگا

اس تخلص کے سبب خلق خدا کہنے لگی
اس کے کوچہ میں صبا کا بھی گذر ہونے لگا

ترے عشاق ان لوگوں پہ ہنستے ہیں جو کہتے ہیں
کہ نالہ کھینچنے سے حشر برپا ہو نہیں سکتا

کدورت سے ہی شیخ و برہمن کی سب یہ جھگڑے ہیں
اگر دل صاف ہو پھر کوئی جھگڑا ہو نہیں سکتا

ذرا سا بھی تکبر جس کے دل میں ہو گیا پیدا
کسی فن کو کرے اسمیں وہ پورا ہو نہیں سکتا

جہاں دل ایک ہو جاتے ہیں آنکھیں چار ہوتے ہی
وہاں پردہ کرے کوئی تو پردہ ہو نہیں سکتا

ہمیں تک ہیں ستم آرائیاں ساری ستمگر کی
پھر ایسا کر نہیں سکتا پھر ایسا ہو نہیں سکتا

مگر میری تمنا کی ابھی ہے زندگی باقی
جو وہ کہتے نہیں مجھ سے کہ ایسا ہو نہیں سکتا

لبوں تک آتے آتے ہی جو بے تاثیر ہو جائے
وہ نالہ تو کسی درد آشنا کا ہو نہیں سکتا

لگی رہتی ہیں آنکھیں مصحف رخسار لیلی پر
ترا ای قیس اب مکتب میں پڑھنا ہو نہیں سکتا

چلا آیا دکھانے کو جو جلوہ طور تک اپنا
وہ کیا دل میں ہمارے جلوہ آرا ہو نہیں سکتا

جو میرا ہے وہ انکا ہے جو ان کا ہے وہ میرا ہے
مقام عشق میں اپنا پرایا ہو نہیں سکتا

یہ ایسا راز ہے جسکو فقط عاشق سمجھتے ہیں
جو ان کا ہو نہیں سکتا خدا کا ہو نہیں سکتا

وہ دنیا تھی کہ چلتا تھا زمانہ تیرے کہنے پر
یہ محشر ہے یہاں کوئی کسی کا ہو نہیں سکتا

یقیں کیسا مرا تو اے صبا ایمان ہے اس پر
سخنداں حضرت مایل سا پیدا ہو نہیں سکتا

کچھ نہ کچھ دم سے ترے اے شب ہجراں ہوگا
زندگی کا نہیں تو موت کا ساماں ہوگا

ہم وہ وحشی ہیں کہ جنت میں نہ ٹھہرینگے کبھی
اپنے ڈھب کا نہ اگر کوئی بیاباں ہوگا

گر یہی رنگ تصور کا رہے گا اپنے
دیکھنا خانۂ دل کوچۂ جاناں ہوگا

کچھ تو پڑھئے کہ صبا آئے ہیں سنکر سب لوگ
جانشیں حضرت مایل کا غزلخواں ہوگا

ہم نے کثرت میں بھی وحدت کو تری دیکھ لیا
چشم بینا سے کہاں جا کے تو پنہاں ہوگا

کعبہ کیا شیخ کی مے خانے میں عزت ہوگی
کچھ بھی پاس اسکے جو سرمایۂ ایماں ہوگا

خود ہی پردہ ہے صبا آپ کا شوق دیدار
جب اٹھا دوگے اسے تم وہ نمایاں ہوگا

تری تیغ نگاہ ناز کا بھر وار سلنے قاتل
نگاہ باوفا کو تو نظر آتا ہے احساں سا

اب اس کا ذکر ہی کیا ہے اب اسکا پوچھنا ہی کیا
تمہارا عاشق ناشاد پھرتا ہے پریشاں سا

جناب شیخ کی نسبت صبا نے خوب فرمایا
نہیں انسانیت لیکن نظر آتا ہے انساں سا

نہیں ہوں بوالہوس ڈر جاؤں میں جو ایسی باتوں سے
جفا پہ کر جفا سب امتحاں پر امتحاں میرا

نہ خود تشریف لاتے ہیں نہ مجھکو ہی بلاتے ہیں
در دولت سے ان کے دو قدم پر ہی مکاں میرا

اگر وہ مہرباں ہو تو مجھے پروا نہیں اسکی
مخالف کل کے ہوتے آج ہو جائے جہاں میرا

چھپا کرتی ہے وہ فتنے کہ اک دن جا ہی پہونچیگی
زمیں لوٹے بانان آسماں پر آسماں ہو کر

مزا ملنے کا جب آتا کہ رہتا سے خیال چودن
وہ میرا میہماں ہو کر میں اس کا میزباں ہو کر

[illegible] نیا ہیں تیرا انداز ہو کر
جہت کی بے نشاں ہو کر ہے بھی بے نشاں ہو کر

وہ آئے بھی تو کیا آئے نصیبِ دشمناں ہوکر — بہار آئی مرے گھر میں مگر شکلِ خزاں ہوکر
صبا کہہ دوں تو روحِ حضرتِ منصور شرمائے — بہت دشوار ہے جلنا کسی کا رازداں ہوکر

یہی مقام ہیں دونوں صبا کے ملنے کے
درِ صنم کدہ یا آستانِ بادہ فروش

رہ گیا اب تو زبانوں پہ بیانِ اخلاص — مٹ گیا مٹ گیا دنیا سے نشانِ اخلاص
اگلے لوگوں کی نشانی ہے اسے سینے سے — بے مروت نہ مٹا نام و نشانِ اخلاص
وفائیں نہیں آئیں گی یاد کب تک — یونہیں ہوگی دیکھیں گے بیداد کب تک
بت کیا خدا بھی اُن پہ تو کرتا کرم نہیں — جو لوگ راہِ عشق میں ثابت قدم نہیں
بت خانہ تو بت خانہ ہے اے شیخ سمجھ رکھ — کعبہ کو نہ بُت خانہ کی تصویر سے بدلوں
تجھے کب ہم اے فتنہ گر دیکھتے ہیں — ہم اپنا ہی ذوقِ نظر دیکھتے ہیں
لوگ باقی ہیں ابھی اگلے زمانے والے — کچھ قدیمی ابھی دستور نظر آتے ہیں
اور کس بات میں مختار ہمیں سمجھا ہے — جاں دیتے ہیں جو مجبور نظر آتے ہیں
اپنی وحشت کا جہاں ذکر ملا دیتا ہوں — جان پڑ جاتی ہے کچھ قیس کے افسانہ میں
مثلِ منصور کے کس طرح بہک اٹھوں گا — عکس ساقی کا پڑا ہے مرے پیمانہ میں
ہوش پایا بھی تو پایا ترے دیوانوں میں — عقل دیکھی بھی تو دیکھی ترے مستانوں میں
دخترِ رز کو کبھی منہ نہ لگانے والا — ایک ہی ہوں نگہِ مست کے مستانوں میں
سب ترے حسن کے نیرنگ ہیں کہنے کو کہیں — شمع نے آگ لگا رکھی ہے پروانوں میں
اس سے کیا بحث مدارات ہوئی یا نہ ہوئی — ہم تو اپنے کو سمجھتے رہے مہمانوں میں
دیکھ کر روزِ جزا عفو و کرم کے تیور — تا پشیماں بھی تو آ بیٹھے پشیمانوں میں
گر نہ ہو ہمت تو پھر آسان بھی دشوار ہے — ہو اگر ہمت تو پھر دشوار بھی مشکل نہیں
یوں تو ہر سینے میں دل ہے کوئی بھی بیدل نہیں — اہلِ دل وہ ہے جو اُس کی یاد سے غافل نہیں

رحم کرنا اے خدا ان واعظوں کے حال پہ
شمع بھی میری طرح کیونکر نہ روئے بار بار

واعظ اسی کے پینے سے کرتا ہے منع تو
ہو یا نہ ہو قبول مگر مانگے جائیں گے

منہ سے نکال دوں تو ابھی وہ برس پڑے
ہم حاصل حیات سمجھتے ہیں وہ نفس

تصور میں اُسے کرتے ہیں سجدہ
تجاہل گر نہیں ہے پھر یہ کیا ہے

کہتے ہیں اپنی موت کا جو خواستگار ہو
نسخہ شراب ناب کا لا دیجئے صبا

انسان وہ بلا ہے خدا جانے کیا کرے
جنوں میں بھی مآل اندیشیاں میری ذرا دیکھو

کیونکر وہ بنا لیتے ہیں تیر اپنی نظر کو
ہر روز اٹھاتے ہیں صبوحی کے لئے وہ

پینے والے ہر زمانے کے وہاں جب جمع ہوں
سنتے ہیں واعظوں سے گنہگار اور کچھ

یہ آفت میں آفت بپا ہو گئی
ترا عشق عشقِ خدا ہو گیا

یہ جادو خوب چلتا ہے عمل یہ کام آتا ہے
انہیں دیکھا ہی خط کھاتے ہیں عشق میں تیرے

ادھر اسکو بنا ڈالا ادھر اُس کو مٹا ڈالا
یہ وہ بندے ہیں تری رحمت کے جو قائل نہیں

حیف ہے بزم جہاں میں حضرت مائل نہیں
اک چیز ہے جو پینے کی رنج و ملال میں

اک لطف آ رہا ہے دعائے وصال میں
اک بات ایسی آئی ہے میرے خیال میں

گذرے جو اسکی یاد میں اسکے خیال میں
نمازِ عاشقاں کیونکر قضا ہو

کہ پوچھے وہ مجھی سے تم صبا ہو
کچھ ایسے شخص کا ہمیں کیا اعتبار ہو

پیر مغاں کے تم تو بڑے یار غار ہو
کچھ بھی جو زندگی پہ اُسے اعتبار ہو

خدا کو سونپ آیا ہوں در و دیوارِ زنداں کو
جو شرم سے لیتے ہیں جھکائے ہوئے سر کو

اللہ سلامت رکھے مرغانِ سحر کو
حشر کے بازار میں مے کی دکاں کیونکر نہ ہو

کہتی ہے شانِ رحمتِ غفار اور کچھ
شرارت میں پیدا حیا ہو گئی

تری یاد یادِ خدا ہو گئی
زباں پر میری ہر دم جو تمہارا نام آتا ہے

جنہیں آغاز سے پہلے نظر انجام آتا ہے
تجھے کچھ اور بھی اے گردشِ ایام آتا ہے

پھر پھر کے اپنے آپ ہی قول و قرار سے
توبہ ہزار مرتبہ ٹوٹے گی دیکھنا

وہ خود ہی گر گئے نظرِ اعتبار سے
امیدوار رحمتِ پروردگار سے

پینے نہ پینے کی تو ہمیں کچھ خبر نہیں
آتے تو ہیں صبا بھی نظر بادہ خوار سے

یہ کہہ کے اسکو خاک میں گل چیں ملا گیا
ہم جا کے کوئے یار میں رہتے ہیں اسطرح
یہ اک گنہ شباب میں ہم سے بھی ہو گیا

بلبل کو تا بہ حشر مبارک چمن رہے
جیسے وطن سے دور غریب الوطن رہے
واعظ کے کہنے سننے سے ساغر شکن رہے

یہ التجا ہے ساقیِ کوثر سے اے صبا
میخانۂ سخن میں شرابِ کہن رہے

نظم اور نثر جسکی بنے رہنمائے خلق
وہ آدمی ہے جس کو رہے دردِ قوم کا
ذرا ان سے کوئی پوچھے تمہارا کیا بگاڑا ہے
میخانے میں تو نام بھی لیتا نہیں کوئی
گنتی نہ ہو سکی ستم و جورِ یار کی

دنیا میں یادگار اسی کا سخن رہے
وہ دل ہے جسمیں الفتِ خاکِ وطن رہے
دعائیں کر رہے ہو آہ بے تاثیر ہو جائے
مسجد میں تذکرے ہیں غمِ روزگار کے
اور دن قریب آ گئے روزِ شمار کے

مگر ان میں کسی کو باعمل بھی آپ نے دیکھا
بہت کہتے ہیں یوں تو اے صبا تقریر بہتر دی

یارِ میخانہ ہے یاری سے غرض ہے اوسکی
دل سے نکلی آہ خالی جا نہیں سکتی کبھی
اسکے یہ معنی ہوئے رحمت کے ہم قائل نہیں
اب سمجھ لو کہ گذرتی ہے ہماری کیونکر
کون ہوں اور میں کس واسطے آیا ہوں یہاں

شیخ کے فعل سے مطلب نہ سروکار مجھے
اس کو دنیا مانتی ہے یہ خدائی تیر ہے
واعظو توبہ کا کرنا تو بڑی تقصیر ہے
زندگی موت کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
آدمی کا یہ سمجھ لینا ہی دانائی ہے

ہے امید وفا اس سے دل دیوانہ کو میرے
ملا تا ہے صبا کا رنگ جو خونِ شہیداں سے

شراب ناب کے اک جام پر ایمان دیدیگا
نہ تھی امید اے زاہد یہ تجھ جیسے مسلماں سے

محبت کا مزہ جبتک نہیں ملتا نہیں ملتا
نہو دلبستگی جبتک کسی غارت گر جاں سے

جہاں کا رنگ کیا دیکھوں کہ میں نے دیکھ رکھا ہے
بہت کچھ ملتا جلتا ہے میرے خواب پریشاں سے

بھول جانے کے لئے کم نہیں دونوں عالم
یاد کیوا سطے کافی ہے تیرا نام مجھے

یہ مانا تیر اس کا دشمن جان دشمن دل ہے
مگر پھر بھی کلیجہ سے لگا رکھنے کے قابل ہے

وہی ساماں محفل ہے وہی سب اہل محفل ہیں
مگر آتے ہی تیرے اور ہی کچھ رنگ محفل ہے

صبا۔ منشی سید صابر حسین مرحوم خلف محمد احتشام الدین مرحوم سہسوانی ۱۲۵۳ھ میں پیدا ہوئے بھوپال میں ناظم ضلع مشرق تھے۔ عرصہ تک ریاست میں ان کی سکونت رہی۔ عربی فارسی سے بخوبی ماہر تھے۔ علم عروض اور فن بدائع میں اچھا دخل تھا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مولوی نجف علیخاں اور اردو میں مولوی ایوب علیخاں گلشن اور شیخ علی بخش بیمار سے تلمذ تھا۔ تاریخ گوئی میں بہت ملکہ تھا۔ فارسی کا کلام بھی زبردست تھا۔ نواب کلب علیخاں والی رامپور کی مدح میں ایک مثنوی شوکت خسروی سکندر نامہ کے وزن پر لکھی تھی۔ جس کے صلہ میں خاطر خواہ قدر ہوئی۔ ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی۔ انتخاب کلام اردو ملاحظہ ہو۔

کہیں ہنگامۂ محشر کو نہ کردیں برہم
وہ بکھرے ہوئے گیسوئے دراز آتے ہیں

یہ تو سچ بات ہے تم وعدہ خلافوں میں نہیں
پھر یہ کیوں کہتے ہو ہم جھوٹ سے باز آتے ہیں

شمعیں پروانے کریں شوق سے زینت پہ ہجوم
سیکھنے سے کہیں یہ سوز و گداز آتے ہیں

آپ کیوں تیغ بکف جاتے ہیں مقتل کیطرف
سر ہتھیلی پہ لئے اہل نیاز آتے ہیں

بل کی لیتے نہیں سرکشی بھی تمہارے آگے
جھک کے پابوس کو گیسوئے دراز آتے ہیں

مشکل درد اٹھتے ہیں گر پڑتے ہیں آنسو کیطرح
تیرے کوچہ میں جو ارباب نیاز آتے ہیں

داد خواہی کون محشر میں کرے	ہے مزہ سب کو تری بیداد کا

صبا

صبا۔ لالہ کانجی مل فیروز آباد کے متوطن اور لکھنؤ میں سکونت رکھتے تھے۔ مصحفی کے شاگرد اور شاعر موزوں طبع تھے، جوانی میں انتقال کیا۔ کلام یہ ہے:۔

افسوس وہ آرام عدم میں بھی نہ پایا	جس کے لئے دُنیا سے سفر ہم نے کیا تھا
مجھے آتا ہے تجھ پر رحم اس قاتل کے کوچے میں	لئے جاتا ہے نامہ آج تو اے نامہ بر کس کا
صبا ہم نے تو ہرگز کچھ نہ دیکھا جذب اُلفت میں	غلط یہ بات کہتے ہیں کہ دل کو راہ ہے دل سے

صبا:۔ منشی عبد الرحیم۔ جناب داغ مرحوم کے عزیز شاگرد تھے۔ ریاست رتلام میں ملازم تھے اور وہیں سے عرصہ تک گلدستہ "گلشن داغ" نکالتے رہے جسمیں تلامذۂ داغ کا منتخب کلام شائع ہوتا تھا۔ گلدستہ حسن و عشق کی شاعری کا زبردست آرگن تھا۔ اس رسالہ کا مقصد یہ تھا کہ مالوہ کی سرزمین میں اُردو شاعری کو ترقی ہو۔ اور نقادانِ سخن داغ کی شاعری پر گہری نظر ڈالیں۔ حضرت داغ نے اس کی توسیع اشاعت میں اپنے تمام شاگردوں کو ہدایتیں کی تھیں۔ اس گلدستہ میں اشعار کا انتخاب کیا جاتا اور ذوق سلیم و شاعرانہ جذبات کا لحاظ رہتا۔ مگر چند روز میں ملک کی ناقدردانی سے یہ رسالہ بند ہو گیا۔ عرصہ سے صبا صاحب بھی گمنامی کی حالت میں ہیں۔ رسالوں وغیرہ میں کلام بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔

صبا کے کلام میں راز و نیاز کی تفسیر اور سوز و گداز کی تصویر ہوتی ہے۔ بطور نمونہ کچھ اشعار لکھے جاتے ہیں۔

ہاں بجا نالۂ بسمل کی حقیقت کیا ہے	آج کیوں آپ چلے آئے کھلے سر باہر
دل تو دل مجھ کو بھی اپنا ہی تصور کیجے	آپ دل کیلئے طعنہ مجھے کیا دیتے ہیں
ہائے وہ پوچھ کے اغماض سے حالت دل کی	اور بیمار کو بیمار بنا دیتے ہیں
حسرت و یاس و غم و رنج و الم سے میرے	دل یہ کہتا ہے سنور جائیگی تربت اچھی

صبا:- سردار خدا بخش لکھنوی تلمیذ حضرت خادم زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا۔ صرف دو شعر دستیاب ہوئے وہ نذر ناظرین ہیں۔

ہم نہیں کوچۂ دلدار سے جانے والے
سوئے گل دیکھتے ہیں باغ میں وہ ہنس ہنس کر

حورِ جنّت بھی اگر آئے بلانے کیلئے
بجلیاں برقِ تبسّم سے گرانے کے لئے

صبا:- منشی محمد مظفر حسین خلف مولوی یوسف علی باشندہ گوپامئو ضلع ہردوئی۔ اپنے والد ماجد اور مولوی احسن بلگرامی سے تلمذ رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آدمی ذیعلم اور صاحب استعداد تھے۔ تذکرۂ روز روشن ان کی تالیفات سے ہے۔ ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں آپ کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔ مرحوم وکیل تھے اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کے بھائی مولوی عبدالواسع عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر ہیں۔ جناب صبا کی طبیعت میں روانی تھی۔ شستہ اور صاف شعر کہتے تھے۔ یہ کلام ہے۔

آنکھ کی شوخی بھی چھپتی ہے چھپائے سے کہیں
تنہائی بھی ہے رات بھی ہے آؤ مل بھی جاؤ
کیا غمزے کر رہے ہیں شبِ وصل وہ صبا
سرشار ہوئے اس کے تصوّر سے دو عالم
شرابِ ناب بھی ہے یار مہ لقا بھی ہے
بیان حوروں کا کرتا ہے شیخ مسجد میں
عجب صفائی مشرب ہے واہ کیا کہنا
دل و قرار و سکوں نذر کر چکے پہلے
پڑے ہیں باغ میں کچھ آشیانِ مرغ چمن

تاڑ لیتے ہیں صبا چتوں کے انداز آشنا
کس کی ادا کہاں کے کرشمے کدھر کے ناز
کر لینگے جیسے آج ہی تو عمر بھر کے ناز
کیا نشہ ہے اس کی نگہ ہوش ربا میں
کہو تو شیخ کہ جنّت میں یہ مزہ بھی ہے
حریص کچھ ادب خانۂ خدا بھی ہے
کہ رند بھی ہے صبا اور پارسا بھی ہے
اب اور کیا نگہِ ناز یار باقی ہے
بچا کھچا سا نشانِ بہار باقی ہے

صبا:- راجہ شنکر ناتھ بہادر خلف مرزا راجہ رام ناتھ بہادر دہلوی معاصر سیّد یار خاں رنگین

کے شاگرد تھے۔ سررشتۂ نظارت دہلی میں پیشکار تھے۔ اکثر اپنے مکان پر مشاعرہ منعقد فرماتے تھے نمونہ کلام یہ ہے:۔

کیا پوچھتے ہو جور و ستم مجھ سے یار کا	دیکھو نہ حال میرے دل بیقرار کا
دل جب اسکی نگہ مست کا مخمور ہؤا	سرخوش کیفیت بادۂ انگور ہؤا
ہوں میں صدقے ترے بہانے کے	روز ڈھب یاد ہیں نہ آنے کے

صبا

صبا:۔ حکیم شکر اللہ صاحب ساکن بڑا گاؤں۔ بمبئی کے مشاعروں میں کچھ عرصہ قبل شریک ہؤا کرتے تھے۔ سادگی اور زبان کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مضمون آفرینی کی طرف طبیعت مائل ہے۔ یہ کلام ہے:۔

ضبط ہو نالہ نہ جس سے اور نہ آنسو تھم سکے	عاشقوں میں وہ صبا بدنام رسوا کیوں نہ ہو
آج ارمان نہ نکلے تو بڑی مشکل ہے	ہم کبھی ہیں یار بھی ہے گوشۂ تنہائی بھی

صبا:۔ محمود علیخاں۔ عمر تخمیناً چوبیس پچیس سال ہے۔ جناب شاد عظیم آبادی سے تلمذ۔ طبیعت شاعری کیطرف مائل ہے۔ گلشن حیات میں جو اشعار ملے وہ ہدیۂ ناظرین ہیں۔

بینا ہے بزم میں نہ کوئی ہوشیار ہے	کس سے حجاب پھر تجھے اے چشم یار ہے
دامن میں دھجیاں نہ گریباں میں تار ہے	جوش جنوں ہے آمد فصل بہار ہے
لڑکوں کا کھیل ہے کہ بنا اور بگڑ گیا	کیا بے ثبات ہستی ناپائدار ہے
فرقت میں دیکھتا ہوں جو دیوار و در کی سمت	ہر ہر جگہ کھچی ہوئی تصویر یار ہے

صبا

صبا:۔ منشی گوبند لال پسر منشی گوکل چند لکھنؤ کے متوطن تھے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں عمر ۶۰ سال تھی۔ سرکار رامپور میں ملازم تھے۔ اردو فارسی اور عربی کے ماہر تھے۔ اور بقول امیر احمد مینائی مرحوم معانی۔ بیان۔ عروض قافیہ۔ معما حساب۔ جبر و مقابلہ جغرافیہ۔ تواریخ مساحت۔ فلاحت میں دستگاہ۔ نقاشی مصوری و خط نستعلیق و ناگری و انگریزی سے آگاہ۔ فارسی۔ عربی۔ اردو ہر سہ زبان میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام زیادہ ہے۔

تذکرہ انتخاب یادگار سے دو شعر انتخاب کر کے نذر ناظرین ہیں۔

گرمیاں وہ کر کے غیروں سی جلاتے ہیں مجھی	ہیں مسلماں جلتے جی ہندو کا مردہ ہو گیا
ذکر خال و خط کبھی رسوئے صاف جاناں میں نہیں	زاغ و طوطی کی حکایت اس گلستاں میں نہیں

صبا:۔ مہتہ عجب چند شرما ولد مہتہ سوداگر مل ۳۔۱۹۰ئہ میں پیدا ہوئے۔ وطن دھرابی ضلع جہلم پنجاب ہے۔ ذات کے موہیال برہمن، بچپن کا زمانہ بلوچستان میں گذرا جہاں آپ کے والد گرداور قانونگو تھے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اسکے بعد مشن ہائی سکول ڈوال ضلع جہلم میں داخل ہوئے۔ ابھی درجہ ششم ہی میں تھے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماموں کفیل ہوئے۔ آپ نے انٹرنس پاس کیا۔ اس کے بعد بہ تلاش روزگار ریجا پہنچے۔ ٹیچرز ٹریننگ امتحان پاس کیا اور کئی اسکولوں میں معلمی کا کام کرتے رہے۔ اب بھی اے۔ وی مسلم اسکول مانڈلے میں ٹیچر ہیں۔

شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ پنجاب میں مشق کا موقع نہ مل سکا جب برہما گئے تو جناب عیش امروہوی سے تلمذ اختیار کیا اور باقاعدہ مشق کرنے لگے علاوہ نظم کے نثر بھی لکھتے ہیں۔ آپ کے مضامین مختلف رسائل میں زیادہ تر نیرنگستان دہلی شائع ہوتے ہیں۔ کلام فراہم شدہ کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

ایک دل تھا وہ بھی کیا جانے کہاں جاتا رہا	ماجرائے ہجر کا افسانہ خواں جاتا رہا
لذت آزار غم سے جب میں واقف ہو گیا	سوزِ دل سے وہ جو اٹھتا تھا دھواں جاتا رہا
مصلحت نے درس خاموشی دیا ایسا ہمیں	تھا زبانِ حال میں بھی جو بیاں جاتا رہا
موسم گل اور خزاں دونوں برابر ہیں صبا	لٹ گیا میرا گلستاں آشیاں جاتا رہا
اس طرف ہو جو گذر شمع جلاتے جانا	ٹوٹی تربت پہ مری آپ کا احساں ہو گا
تجھے اے شمع رو ہم حاصل محفل سمجھتے ہیں	ترے نقش قدم کو کائنات دل سمجھتے ہیں
مری غفلت پہ قرباں اہل غفلت کی ہوشیاری	میں ہوں محو خیال یار وہ غافل سمجھتے ہیں

گلوں کو دیکھ کر افزونی وحشت ہوئی کیا کیا
بہت کچھ پھوٹ کر روتے ہیں مجھ پر پاؤں کے چھالے
خون کا پیاسا سا نظر آتا ہے وہ تیر نظر
آہ کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
لاکھ ارماں ہیں اپنے پہلو میں
آئینہ لے کے آج بیٹھے ہیں
نہیں ہے یاد کہ تھا آشیاں کہاں اپنا
کسقدر میدانِ ہستی جلد ہو جاتا ہے طے
کیا ملے گا آشیاں برباد کر کے اے صبا

مرے دل نے تسلی بخش سمجھا تھا گلستاں کو
لگا کر دشت میں سینے سے ہر خار بیاباں کو
کاش ہو جاتا وہ اک دریا جو قطرہ دل میں ہے
دردِ دل دردِ سر نہ ہو جائے
زندگی مختصر نہ ہو جائے
ان کو اپنی خبر نہ ہو جائے
زمانہ ہو گیا نکلے ہوئے چمن سے مجھے
توسن عمر رواں کو ہر نفس مہمیز ہے
چار تنکوں کے لئے کیوں برق طوفاں خیز ہے

صبح

صبح - منشی شنکر پرشاد کایستھ سریواستو ساکن قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی شاگرد جناب قدر بلگرامی ۱۸۷۲ء میں اردو مڈل اسکول سانڈی میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ علمی استعداد اچھی تھی۔ منشی حفیظ اللہ خاں حفیظ آپ کے تلمیذ رشید ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

تجھے دیکھ لے جو کہیں ذرا ہے یہ آدمی کی مجال کیا
مرے مرنے کی جو خبر سنی تو یہ کہنے آئے جنازہ پر
ہونے دو شور و فغاں ہونے دو

تری بارگاہ میں ای خدا نہیں دخل کچھ بھی گمان کا
کہ صبح کیا ہی جوان تھا مجھے غم ہے ایسے جوان کا
رازِ پوشیدہ عیاں ہونے دو

صبر

صبر - منشی محمد رضا شاگرد شیخ عبدالرؤف شعور (شاگرد مصحفی) والد کا نام منشی محمد حسین تھا۔ وطن کاکوری تھا۔ حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر کے مرید تھے۔ اپنے وقت میں اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں سیتاپور میں انتقال کیا۔

کلام میں سادگی اور رنگین بیانی دونوں اپنی اپنی جگہ موزوں ہیں۔ کہیں کہیں شوخی کی جھلک بھی ہے۔ خال خال تشبیہ و استعارات ہیں۔ نازک اور عام فہم استعارات طبع کو گراں نہیں گذرتے۔

تلامذہ بہت تھے۔ چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ منشی مقبول احمد محو۔ ۲۔ منشی ناظم حسین منتظم ۳۔ منشی کاظم حسین غنی۔ ۴۔ منشی صفدر حسین بسمل۔ ۵۔ منشی مقصود احمد نطق۔ ۶۔ حافظ علی عسکری بیدل ۷۔ منشی نورالدین کیفی ۸۔ خان بہادر منشی تاج الدین جذب وغیرہم۔ تین دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے مطبوعہ دیوان کا انتخاب حضرت نطق نے کیا تھا۔ اور باغ صبر اس کا تاریخی نام رکھا تھا۔ کلام ملاحظہ ہو۔

عہد شباب میں یہ تمہارا خرام ناز — ہے موسم بہار میں چلنا نسیم کا
لو نام اپنی آہ کا یا اُس کے ناز کا — غمّاز تیسرا انھیں راز و نیاز کا
نازک دماغیاں وہی دیوانہ پن میں ہیں — سر پر پڑا جو سایہ تو سنگ گراں گرا
زخمی تیغ جو ہوتا تو مقرّر جیتا — خنجر ناز کا مارا ہوا کیونکر جیتا
شکستہ خاطری میں آشناؤں سی کنارہ ہے — میں وہ کشتی ہوں جو ٹوٹی پڑی رہتی ہے ساحل پر
ان کا ممنونِ عنایت دل سے ہوں — گو اجل کے ساتھ آئے آئے تو
بادہ خواری ہے جو برسات میں چاہی توبہ — بادل اس زور سے کڑکا کہ الٰہی توبہ
سانس لینی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی — جیسی اب ہے تپش دل کبھی ایسی تو نہ تھی
دن چڑھے تک سونے کی پوچھی جو وجہ — چونک اُٹھے پہلے وہ پھر شرما گئے
دل دیا تھا انھیں دلدار سمجھ کر میں نے — یہ نہ جانا تھا کہ وہ جان کے خواہاں ہونگے
رات بھر کا یہ بکھیڑا ہے ہمارا تیرا — صبح تو ہوگی نہ ہم اے شبِ ہجراں ہونگے
صبر کو ڈھونڈھنے آئے ہو یہاں صبر کہاں — جاؤ دیکھو اسی کوچہ میں غزلخواں ہونگے
خیر ہو کس سے خفا ہو آج کیسا ہے مزاج — زلف کیوں بگڑی ہے کیوں بگڑے ہیں تیور بولئے
شکل پر مردنی برستی ہے — زندگی تجھ کو موت ہنستی ہے
صبر کیوں مر رہے ہو جینے پر — کیا ہو تم۔ کیا تمہاری ہستی ہے

صبر: میر اسد مرحوم شاگرد شیخ امام بخش ناسخ۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاق شاعر تھے

خط و کاکل کے مضامین پر ذہن خوب دوڑتا تھا۔ پرانے خیالات کو نئی بندش میں صاف کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

آفتوں پر آفتیں آئیں یہاں بالائے سر
یار نے باندھا اگر جوڑا وہاں بالائے سر
فرقتِ دلدار میں ہم سے اٹھا جاتا نہیں
بارِ غم ہے یا کوئی کوہِ گراں بالائے سر
عالمِ مستی میں لاؤں اپنے گھر تک شوق سے
خم کے خم رکھدے اگر پیرِ مغاں بالائے سر
آج کر لو منعمو تم جتنی چاہو سرکشی
پاؤں رکھ کر کل چلے گا اک جہاں بالائے سر

صبر۔ حافظ امام الدین صاحب خوش نویسی میں طاق اور سپہ گری سے ماہر تھے فنِ سخن میں نواب عبد العزیز خاں عزیزؔ بریلوی سے تلمذ تھا۔ عربی فارسی میں قابل تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے اودھ اخبار مطبوعہ ۱۸۷۹ء میں کلام ان کا شائع ہوا تھا۔ اس کا انتخاب یہ ہے :۔

وہ نظروں میں ایسے سمائے ہوئے ہیں
جدھر دیکھو جلوہ دکھائے ہوئے ہیں
نہیں رُخ پہ گیسو یہ آئے ہوئے ہیں
یہ کالے ہیں جو من پہ چھپائے ہوئے ہیں
نکیرین سونے دو ہم کو لحد میں
شبِ ہجر کے ہم جگائے اٹھے ہیں
لکھیں مژدہ وصل وہ خط میں کیونکر
رقیبوں کی پٹی پڑھائے ہوئے ہیں
کروں ترکِ اُلفت کو اے صبر کیسے
ستم ہے وہ دل میں سمائے ہوئے ہیں

اے دل نہ کر تو عشق کبھی زلف و خال سے
کالا کر ان کا منہ گذر ان کے خیال سے
بے کھٹکے اب تو ملتے ہیں ہر لحظہ ہم سے وہ
جب سے رسائی ہو گئی اُن کے خیال سے
اے دل عبث یقیں ہے تجھے انکے عہد پر
خالی نہیں ہے بات کوئی ان کی چال سے
جو آشنائے بحرِ حقیقت ہیں ان سے پوچھ
ساحل کو آگہی نہ ہو دریا کے حال سے

اٹکا ہے دل ضرور تمہارا کسی سے صبر
دو چار دن سے پھرتے ہو آشفتہ حال سے

تلامذہ بہت تھے۔ چند کے نام یہ ہیں۔
۱۔ منشی مقبول احمد محو۔ ۲۔ منشی ناظم حسین منتظم ۳۔ منشی کاظم حسین غنی۔ ۴۔ منشی صفدر حسین بسمل۔ ۵۔ منشی مقصود احمد نطق۔ ۶۔ حافظ علی عسکری بیدل ۷۔ منشی نور الدین کیفی ۸۔ خان بہادر منشی تاج الدین جذب وغیرہم۔ تین دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے مطبوعہ دیوان کا انتخاب حضرت نطق نے کیا تھا۔ اور باغ صبر اس کا تاریخی نام رکھا تھا۔ کلام ملاحظہ ہو۔

عہد شباب میں یہ تمہارا خرام ناز ہے موسم بہار میں چلنا نسیم کا
لوں نام اپنی آہ کا یا اُس کے ناز کا غمّاز تیسرا انھیں راز و نیاز کا

نازک دماغیاں وہی دیوانہ پن میں ہیں سر پر پڑا جو سایہ تو سنگ گراں گرا

زخمی تیغ جو ہوتا تو مقرّر جیتا خنجر ناز کا مارا ہوا کیونکر جیتا

شکستہ خاطری میں آشناؤں سے کنارہ ہے میں وہ کشتی ہوں جو ٹوٹی پڑی رہتی ہے ساحل پر

ان کا ممنونِ عنایت دل سے ہوں گو اجل کے ساتھ آئے آئے تو

بادہ خواری ہے جو برسات میں چاہی توبہ بادل اس زور سے کڑکا کہ الٰہی توبہ

سانس لینی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب ہے تپش دل کبھی ایسی تو نہ تھی

دن چڑھے تک سونے کی پوچھی جو وجہ چونک اُٹھے پہلے وہ پھر شرما گئے

دل دیا تھا انھیں دلدار سمجھ کر میں نے یہ نہ جانا تھا کہ وہ جان کے خواہاں ہونگے

رات بھر کا یہ بکھیڑا ہے ہمارا تیرا صبح تو ہوگی نہ ہم اے شب ہجراں ہونگے

صبر کو ڈھونڈھنے آئے ہو یہاں صبر کہاں جاؤ دیکھو اسی کوچہ میں غزلخواں ہونگے

خیر ہو کس سے خفا ہو آج کیسا ہے مزاج زلف کیوں بگڑی ہے کیوں بگڑے ہیں تیور بولئے

شکل پر مردنی برستی ہے زندگی تجھ کو موت ہنستی ہے
صبر کیوں مر رہے ہو جینے پر کیا ہو تم۔ کیا تمہاری ہستی ہے

صبر، میر اسد مرحوم شاگرد شیخ امام بخش ناسخ۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاق شاعر تھے

خط و کاکل کے مضامین پر ذہن خوب دوڑتا تھا۔ پرانے خیالات کو نئی بندش میں صاف کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

آفتوں پر آفتیں آئیں یہاں بالائے سر
یار نے باندھا اگر جوڑا وہاں بالائے سر

فرقت دلدار میں ہم سے اٹھا جاتا نہیں
بار غم ہے یا کوئی کوہِ گراں بالائے سر

عالمِ مستی میں لاؤں اپنے گھر تک شوق سے
خم کے خم رکھدے اگر پیرِ مغاں بالائے سر

آج کر او منعموں تم جتنی چاہو سرکشی
پاؤں رکھ کر کل چلے گا اک جہاں بالائے سر

صبر۔ حافظ امام الدین صاحب خوش نویسی میں طاق اور سپہ گری سے ماہر تھے فن سخن میں نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی سے تلمذ تھا۔ عربی فارسی میں قابل تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے اودھ اخبار مطبوعہ ۱۸۷۹ء میں کلام ان کا شائع ہوا تھا۔ اس کا انتخاب یہ ہے:۔

وہ نظروں میں ایسے سمائے ہوئے ہیں
جدھر دیکھو جلوہ دکھائے ہوئے ہیں

نہیں رخ پہ گیسو یہ آئے ہوئے ہیں
یہ کالے ہیں جو من پہ چھپائے ہوئے ہیں

نکیرین سونے دو ہم کو لحد میں
شب ہجر کے ہم جگائے ہوئے ہیں

لکھیں مژدہ وصل وہ خط میں کیونکر
رقیبوں کی پٹی پڑھائے ہوئے ہیں

کروں ترک الفت کو اے صبر کیسے
ستم ہے وہ دل میں سمائے ہوئے ہیں

اے دل نہ کر تو عشق کبھی زلف و خال سے
کالا کر ان کا منہ گذر ان کے خیال سے

بے کھٹکے اب تو رہتے ہیں ہر لحظہ ہم سے وہ
جب سے رسائی ہو گئی اُن کے خیال سے

اے دل عبث یقیں ہے تجھے انکے عہد پر
خالی نہیں ہے بات کوئی ان کی چال سے

جو آشنائے بحر حقیقت ہیں ان سے پوچھ
ساحل کو آگہی نہ ہو دریا کے حال سے

اٹکا ہے دل ضرور تمہارا کسی سے صبر
دو چار دن سے پھرتے ہو آشفتہ حال سے

صبر:- اجودھیا پرشاد کایستھ دہلوی منشی بسنت سنگھ نشاط، شاہ نصیر و حکیم مومن خاں مومن سے تلمذ تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

زیست کم حسرت بہت کس کس کا شکوہ کیجئے	طالع خوابیدہ کا یا دیدۂ بیدار کا
ہمیں گماں کہ وہ آئے ہمارے قابو میں	انہیں یقین کہ مرے ہاتھ اک شکار آیا
دل لگانے کو بتاتا ہے تو مشکل ناصح	تیرے نزدیک چھڑانا مگر آساں ہوگا
بدنامیاں ہیں باعث نام آوری یہاں	ہم جانتے تھے عشق میں کچھ عزّ و شاں نہیں

صبر:- جناب سید رضی بلگرامی۔ خیالات میں نفاست اور زبان میں سلاست ہے شوخ طبع شاعر ہیں۔ انتخاب یہ ہے:-

کیا لطف اس کو بادہ اطہر کا آئے گا	اے شیخ جی شراب کبھی جس نے پی نہو
غلماں و حور کے لئے جنت میں کون جائے	اس گھر میں لطف کیا ہے جہاں آدمی نہو
ہنستا ہے سر جھکائے ہوئے کس ادا کیسا تھ	ظالم کی شوخیاں بھی ہیں شرم و حیا کیساتھ
جاتے ہیں آج کوچۂ قاتل میں سر بکف	اب ہے ہمارے ساتھ قضا ہم قضا کیساتھ

صبر:- سیتا رام شاگرد جناب امیر اللہ تسلیم نواب مرزا محمد تقی خاں بہادر متخلص افسر کے دیوان تھے مولد و مسکن لکھنؤ تھا۔ رعایت لفظی کے دلدادہ تھے اپنے وقت کے مذاق کے مطابق شعر اچھا کہتے تھے:-

دست رنگیں سے جو سلجھاتے ہیں اکثر گیسو	خون عشاق کا کرتے ہیں سراسر گیسو
کی تری زلف کی تقلید بہت سُنبل نے	پر بنائے نہ بنے بال برابر گیسو
ایک دل لینے کو دونوں نے کمر باندھی ہے	ضد پہ گر کاکل پیچاں ہیں تو ہٹ پر گیسو

صبر:- پنڈت کشن ناتھ صاحب عرف ہنڈو لکھنوی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ہمعصر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مگر فارسی کلام اردو سے زیادہ ہے۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے پنڈت

رتن ناتھ صاحب جناب صبر کے ایک فارسی قطعہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔
"بارک اللہ سچ کہئیگا خاص فصحائے خطۂ پاک شیراز کا کلام معلوم ہوتا ہے یا نہیں" ۔
چند اشعار اردو ہدیہ ناظرین ہیں۔

گل میں اس عارض گلرنگ کی ہے بو پیدا
چشم نرگس میں ہے اس آنکھ کا جادو پیدا

وہ مرغ نالہ کش ہوں کہ جب میں ہوا اسیر
صیاد بازوؤں کی صدا پر پھڑک گیا

مژگاں کی نیزہ بازیاں دم خنجر سے کم نہیں
ابروئے یار تیغ دو پیکر سے کم نہیں

دل خون ہو چکا ہے زیادہ نہ چھیڑیئے
ایک ایک بات آپکی نشتر سے کم نہیں

صبوحی: لطف علی صاحب تلمیذ حضرت میکش تھانوی۔ زبان کے لذت چشش ہیں سیدھے سادے شعر کہتے ہیں۔

سنتے ہی دل سے مٹے برسوں کے شکوے اور گلے
ہائے کیا جادو بھرا تھا یار کی تقریر میں

راز دل ظاہر کسی صورت سے ہم نے کر دیا
دل کا مطلب کہدیا بہکی ہوئی تقریر میں

صبور: کنور گوپال سہائے ولد راجہ جیالال صاحب گلشن کایستھ سریواستو متوطن لکھنؤ سال ولادت ۱۸۶۱ء شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔ عہد شاہی میں بخشی فوج تھے انگریزی عملداری میں نائب تحصیلدار تھے، آخر عمر میں ریاست گوپال پور کے نائب مقرر ہوئے۔ فارسی کے اچھے نثار تھے ۱۹۱۰ء میں رحلت فرمائی نمونہ کلام اردو ملاحظہ ہو۔

جب نہ اثبات دہن ٹھہرا یہی ثابت ہوا
بات جو ہے یار کی وہ غیر کی آواز ہے

مال دنیائے دنی کی میں نہیں رکھتا ہوس
بندیاں روز ازل سے باب حرص آز ہے

رازق مطلق کو عسرت میں نہ بھولے آدمی
بند ہے گر ایک در تو دوسرا در باز ہے

صبور: منشی عبدالجلیل خاں صاحب۔ پہلے جلال تخلص کرتے تھے۔ کلام صاف ہوتا ہے

مولوی بھی ہوئے صوفی بھی بنے پھر بھی صبور
دید بازی نہ گئی دید کا لپکا نہ گیا

طور سینا ہے یہی عرش معلی ہے یہی
آ چلا آ مرے دل میں کہ نری جا ہے یہی

جب ذرا ہوش ہُوا کہہ اُٹھے یا حق یا حق
اب دُعا سے بھی ہُوں مجبور کہ وہ کہتے ہیں

بادہ خواراں حقیقت کا طریقہ ہے یہی
ہونٹ ملتے ہوئے پائے تو شکایت ہوگی

ہم تصوّر سے ہی بہلائیں گے دل
ہاں تغافل تری عادت ہی سہی

ہنس کے قاتل کا یہ کہنا ہی لئے دیتا ہے قتل
کھیلتے ہیں جاں پر جانبار کیونکر دیکھئے

کفن کہتے ہیں جسکو خلعت دربار قاتل ہے
شہید ناز ہوں کنج لحد آرام منزل ہے

توبۂ مے رند مے آشام سے
حسرت دیدار باقی ہی رہی

باز آ ناصح خیال خام سے
سوئیں گے کیا قبر میں آرام سے

صبیح:۔ مرزا وارث علی لکھنوی تلمیذ حضرت عشق مرحوم۔ رنگین طبع و خوش گفتار تھے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہوسکا۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کے ہیں:۔

سبب منظور جو ہے میرے تڑپنے کی انہیں
پوچھتے ہیں دل بیتاب تمہارا ٹھہرا

جفا و ظلم سے حاصل ہُوا کیا
غریبوں کے ستانے سے ملا کیا

محبّت میری اپنے جی سے پوچھو
اٹھائے ہیں تمہارے ظلم کیا کیا

گذرنی تھی جو کچھ گذری وہ دل پر
بھلا کہنے سے اسکے فائدہ کیا

غش آیا بھرتے بھرتے سرد آہیں
ہمیں نیند آ گئی ٹھنڈی ہوا میں

آپ تشریف لئے جاتے ہیں گھر بسم اللہ
ہم بھی دنیا سے کوئی دم میں سفر کرتے ہیں

صبیح:۔ مولوی حکیم سید فخر الدین احمد صاحب سندیلوی شاگرد جناب وسیم حکیم انوار حسین صاحب خیر آبادی کے برادر عمزاد ہیں۔ عالی خیال اور شیریں مقال ہیں:۔

صیاد گو اسیر ہے کنج قفس میں یہ
بلبل کا دل پھنسا ہے رگ گل کی جال میں

کمبخت ایک گھونٹ کبھی پی کے دیکھ تو
زاہد بڑا مزہ ہے مے پرتگال میں

نہ دشمنوں کا بُرا حال ہو کہیں سُنکر
خدا کے واسطے سنئے نہ داستاں میری

کام کیا شیخ کا کچھ رات رہے مسجد میں
ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آئے ہیں میخانے سے

حالِ دل اس سے سنایا نہیں تجھکو ظالم
نیند اُڑ جائے گی تیری مرے افسانے سے

اِک آگ سی لگی ہے گلستاں میں کیا یہ پھول
سینچے گئے ہیں خونِ دلِ عندلیب سے

کِس کِس کا کوئی خون کرے کچھ شمار ہے
دل ہیں کہاں سے آکے یہ ارماں بھر گئے

دلِ مضطر ہی پہ بیٹھے ہیں آ کے
ترے تیرِ نظر بھی ہیں بلا کے

ہم اُٹھے بھی تو یوں محفل سے اُٹھے
انہیں لے آئے آنکھوں میں بٹھا کے

صحرائی

صحرائی:۔ لالہ بلدیو سہائے متوطن کوئٹہ بلوچستان۔ عمر تخمیناً ۳۰ سال کئی رسالوں کے مدیر اعزازی رہ چکے ہیں۔ خود ایک رسالہ نوشیرواں کوئٹہ سے نکالا تھا۔ جو اب بند ہو گیا۔ نئے طرز کے شعرا میں ان کا شمار ہے۔ کلام میں زور ہے اور توجہ سے کہتے ہیں:۔

چرخ پر پھیلا ہوا ہے ایک عالم نور کا
ہے گماں ہر ایک تارے پر چراغِ طور کا

لیلیٔ شب نے بکھیرے ہیں زلف میں موتی نثر
ہر خمِ نظارہ بن جاتا ہے گھونگھٹ حور کا

عکسِ سیاروں کے آئینہ ہیں موجیں بحر کی
قطرہ قطرہ پر ہے دھوکا ساغرِ بلور کا

جب چُنی تاروں کی افشاں لعبتاں چرخ نے
اور ہی کچھ ہو گیا تھا رُخ شبِ دیجور کا

کی مدارتِ نظر شمعیں جلا دیں دور تک
یا سمیں کی چرخ پر سیجیں بچھا دیں دور تک

ستارہ صبح

ستارۂ صبح دامنِ صبح میں پڑا جھلملا رہا ہے
اسے فلک پر کوئی فرشتہ پیامِ رخصت سنا رہا ہے

بکھیر جس کو کہکشاں نے تجلیٔ شب بنا دیا تھا
ستارۂ صبح میں سمٹ کر وہ رنگِ محفل سجا رہا ہے

فلک کا وہ برق وشِ مغنّی جسے نموز اکیف کہئیے
کھڑا ہوا مرکزِ سکوں پہ سحر کے کچھ گیت گا رہا ہے

صدر

صدر:۔ منشی لچھمن پرشاد صاحب ولد منشی نوبت رائے متخلص بہ مناسب۔ کایستھ سکسینہ تھے اور بازار کھالہ شہر لکھنؤ میں سکونت تھی۔ مورثِ اعلےٰ راجہ مہانند والیٔ ریاست سورکھ ضلع فرخ آباد تھے جو اب صرف ایک بڑا قصبہ ہے اسی سے جناب صدر کا

خاندانی لقب سورکھ وال ہے۔ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور فطری ذہانت کی وجہ سے اُردو اور فارسی میں بہت جلد مہارت پیدا کر لی۔ علوم ریاضی کی بھی باقاعدہ تحصیل کی۔ عربی میں مُلّا جامی تک استعداد بہم پہنچائی۔

صدر صاحب کے نانا منشی دُرگا پرشاد زمانہ شاہی میں نامی نثار تھے۔ ان کے والد ماجد منشی لال چند صاحب تخلص اُنس صاحب دیوان فارسی اور ایک انشا کے مصنف تھے۔ صدر صاحب کو اُردو میں جناب خیراتی لال صاحب شگفتہ لکھنوی سے تلمذ تھا اور فارسی میں حضرت سنجر ایرانی مرحوم سے۔ ان کے انتقال کے بعد خواجہ عزیز الدین عزیز سے مشورہ کرتے رہے۔ عرصۂ دراز تک خود اپنے مکان پر مشاعرے کرتے رہے جن میں نامی اساتذہ شریک ہوتے تھے۔

پیرانہ سالی میں ایک جوان صاحبزادے کی موت نے کمر توڑ دی۔ بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے تھے۔ ایک مختصر رسالہ بھی اپنے بیٹے کی یادگار کے طور پر تصنیف کیا تھا کچھ عرصہ کے لئے بجائے لکھنؤ کے دہلی میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہاں آپ کو شعر و سخن کی دو چار صحبتوں میں شرکت کا بھی اتفاق ہوا۔ اور آپ کے فارسی کلام پر بالخصوص بہت داد ملی۔ آپ ایک باوضع خوش اخلاق اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ فنِ تاریخ گوئی میں ایسا ملکہ تھا کہ قریب قریب برجستہ گوئی کی نوبت تھی۔ آپ کی کئی نظمیں ایسی ہیں جنہیں ہر مصرعہ میں تاریخ ہے۔ آپ نے دربار دہلی میں ایک قصیدہ بھیجا تھا۔ جس کے صلے میں ایک تمغہ اور سند عطا ہوئی۔

آپ صاحب تصانیف کثیرہ تھے جن میں سے دیوان غزلیات اُردو فارسی و مجموعۂ مسدسات و مخمسات اور قطعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ تصنیفات مذکورہ صدر کے آپ نے ایک رسالہ منظوم صنعت مہملہ میں تصنیف فرمایا تھا۔ اس کا موضوع سُداما ہے۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے۔ شروع میں چند شعر فارسی کے

ہیں باقی اشعار اُردو۔ افسوس ہے کہ ناموافقت زمانہ کیوجہ سے آپ کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ ہی رہا۔ آخر کار ۱۹۳۲ئہ میں دسمبر کے مہینے میں راہی ملک بقا ہوئے۔ کلام ان کے داماد جناب بشیر پرشاد صاحب منور لکھنوی نے روانہ فرمایا ہے۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے:۔

از رسالہ سداما

سداما اسم اک مرد دل آگاہ
ہوا دور سوم کا کامل آگاہ

دل آرام گروہِ اوّل دہر
ملک کردار صالح اکمل دہر

ملا اک دہر کا دردِ دل اس کو
سرورِ مہر کامل حاصل اس کو

دل اس کا لاطمع گو اک گدا وہ
مگر دردِ دل اس کا لا دوا وہ

کہ ہمسر کا سوال دام و درہم
ہوا اس کو دم صمصام ہر دم

عدو وہ ہر طرح حرص و ہوا کا
رہا معکوس کاسہ اس گدا کا

سوال مدعا اک عار اس کو
سدا ہر کا کرم درکار اس کو

مآل کار ہمسر کا کڑھا دل
کہا دکھ دور ہوں او مرد کامل

اگر سرگرم راہ دوار کا ہو
کہ حاصل دل کا سارا مدعا ہو

اگر ہو مرحلہ اس راہ کا سر
سرور روح حاصل ہو سراسر

گدا اسکو صلاح کار ہو کر
کلام آرا ہوا اس طرح رو کر

کہ سردار دو عالم وہ گدا ہم
ملک کا ہو گدا کس طرح ہمدم

انتخاب غزلیات

میخانۂ جہاں میں پیں وہ بادہ نوش تھا
زیر لحد بھی نشۂ صہبا کا جوش تھا

گلکاریاں تھیں وزدِ حنا کی نظر فریب
دستِ صنم تھا یا سبد گلفروش تھا

وہ رہ‌روِ خلق تھا میں جہاں میں کہ بعد مرگ
احباب کو جنازہ مرا بار دوش تھا

باتوں پہ کان روئے منور پہ تھی نظر
میں ان کی بزم میں ہمہ تن چشم و گوش تھا

بہار آئی تو آئے ہمصفیر و مجھ کو کیا مژدہ
قفس سے میں اگر نکلا بھی تو بے بال و پر نکلا

عدم سے آئے جائینگے عدم کو
ہماری ابتدا و انتہا کیا

ہمیں اپنے مقدر سے ہے شکوہ
تمہاری بے وفائی کا گلہ کیا

بہار آئی گلستاں میں تو آئے
اسیرانِ قفس کو اے صبا کیا

ثباتِ دہر ہماری نظر میں خاک نہیں
کہ اس مکان کے دیوار و در میں خاک نہیں

ازل سے حصے میں ہیں خاک و باد و آتش و آب
کچھ اور ان کے سوا میرے گھر میں خاک نہیں

کسی کے شعر کو اچھا برا کہیں کیا ہم
کہ امتیاز ہی عیب و ہنر میں خاک نہیں

ہمارا بے خودی ہے ہمدرد بے کسی ہے
غربت میں بھی وہی ہے جو رنگ ہے وطن میں

نقصان فکر اس سے کچھ اے ہمنفس نہیں
قائل مری سخن کی اگر سو میں دس نہیں

باغ جہاں میں طائر بے بال و پر ہوں میں
صید زبوں ستم کش دام و قفس نہیں

ہر گھڑی وردِ زباں جس کو ترا نام نہیں
نام لینے کے بھی قابل وہ بد انجام نہیں

طرفہ ہے جلوہ گہ یار کا عالم۔ کہ جہاں
دل نہ ہو تو راحت نہیں صبح نہیں شام نہیں

دل کے خوش کرنے کو میں کچھ کبھی کہہ لیتا ہوں
صدر اس فن سے مجھے کچھ ہوس نام نہیں

جہاں گردش میں جام بادۂ گلفام آتا ہے
ہمیں جمشید کا عبرت سے یاد انجام آتا ہے

جو کچھ چاہے خلش پیدا کرے تیر نظر تیرا
ہمیں بھی دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام آتا ہے

قطعہ سراپا تاریخ ولادت فرزند بخانۂ منشی بشن نرائن خلف منشی پراگ نرائن صاحب رائے بہادر مالک اودھ اخبار لکھنؤ :-

سنہ ۱۹۷۲
بشاشتِ دل منشی پراگ نارائن
یہ مژدۂ غیب کا ہے سر بسر مبارک ہو سنہ ۱۹۱۵

صدر

صدر - نواب صدر محل صاحبہ صدؔر - جانِ عالم واجد علی شاہ والئے اودھ کی بیگمات سے تھیں۔ ۱۲۸۸ھ میں ان کا ایک دیوان "بادشاہ نامہ" کے نام سے شائع ہوا جس کی ہر غزل میں بادشاہ کی محبت کا بیان ہے۔ اور ان سے تعشق کا اظہار کیا ہے شیریں زبان۔ خوش بیان اور اپنے شوہر کی فریفتہ شیفتہ تھیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے

نکیلی چتونیں بانکی ادائیں قتل کرتی ہیں
کلام گل فشاں سنکر عنادل بول اُٹھتے ہیں
سرمہ بنا کے رکھتی ہیں پریاں وہاں کی خاک
جمال و حسن پر شاہد ہے تسخیر سلیمانی
مشاطہ ناز کرتی ہے ان کے بناؤ پر
پھیلی ہوئی ہے روشنی حسن دور دور
بزمِ عالم میں ہے گھر گھر شہ دوراں کا فروغ
حسرت و آرزوئے وصل اور مصیبت فراق
نسیم صبح ہنگامہ نہ کر نا خندۂ گل کا

زمانہ سے نرالا بانکپن ہے جانِ عالم کا
خدا رکھے عجب رنگیں سخن ہے جانِ عالم کا
پڑتا ہے جس جگہ پہ قدم بادشاہ کا
نظر آتا ہے پر یوں پر بھی قابو میرے اختر کا
زیبائشِ عروس ہے یا بادشا کی زیب
روشن چراغِ محفلِ خوباں ہے شہریار
مہر و مہ کی ہے برابر شہ دوراں کا فروغ
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ
رگِ گل سے بھی نازک ہے طبیعت میرے اختر کی

صدر

صدر :- نواب میر صدر دین حسین خاں۔ رئیس بڑودہ ملک گجرات۔ قدیم وطن مراد آباد ہے۔ آپ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نواب وجہ الدین حسین بڑودہ کے رئیس جاگیردار تھے۔ ان کے بزرگ بانیِ ریاست بڑودہ کے لشکر میں شجاعت اور دلاوری کے باعث نامور تھے، آپ نے مذہب اسلام کے متعلق جو رسالے لکھے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں کی معلومات کا ذریعہ ہیں۔ گجراتی اور انگریزی زبانوں میں آپ کی کئی تصنیفات کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ نے ۱۹۰۱ء سے ایک کتب خانہ قائم کیا ہے، جس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں جمع کی ہیں۔ جن سب کی زبان اُردو ہے، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اس کتب خانے کی بابت یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے، "آپ کا کتب خانہ دیکھکر معلوم ہوا

کہ اردو زبان میں اسقدر علوم و فنون کی کتابیں ہیں"۔

آپ ایک نہایت پاکیزہ خیال۔ شریف طینت انسان ہیں۔ اشعار میں اخلاقی مضامین کو خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ حسن و عشق کے خیالات سے دور رہتے ہیں۔

شکر ہے فکر دو عالم سے رہائی بخشی
پیچ قسمت کا خیال خم گیسو نہ ہوا

پہنچائے گی فنا سوئے دار البقا مجھے
چھوڑوں گا گر خودی تو ملے گا خدا مجھے

کون آتا ہے کہ گلشن میں ہر اک گل شاد ہے
بلبلوں میں کس کے آنے کی مبارکباد ہے

چاند دو ٹکڑے برابر اک اشارہ سے ہوا
یہ تری معجز نما انگشت کا ایجاد ہے

صدیق

صدیق - منشی محمد صدیق حسن دہلوی۔ تاریخ ولادت ۶ فروری ۱۸۹۲ء سکونت دہلی بازار لعلچاہ گلی میر جملہ کچھ عرصہ تک عربک ہائی کالج دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا عبدالغنی صاحب مرحوم سابق صدر مدرس مسجد فتحپوری سے فارسی پڑھی۔ اب آپ ایک فرم میں محاسب ہیں۔ اوائل عمر سے شاعری کا جنون سر پر سوار تھا۔ اسی کے زیر اثر تعلیم ناتمام رہی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب راسخ مرحوم کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آپ اب قومی نظمیں کہتے ہیں جو ملکی جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ آپ کا نسب حضرت سعد بن وقاص رحمتہ اللہ علیہ (جن کا شمار عشرہ مبشرات میں ہے) سے ہے۔ آپ کے پردادا شیخ رحیم اللہ اور دادا شیخ کریم اللہ عہد مغلیہ میں شہزادوں کو فن تیر اندازی کی مشق کرایا کرتے تھے۔ آپ کے والد منشی محمد ابراہیم صاحب طبابت کرتے تھے۔ اور نقاشی میں بھی خوب دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں نواب سلطان دولہا مرحوم کے عہد بھوپال میں ممتاز تھے۔ ابھی تقرر کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ کہ نواب صاحب موصوف دنیا کو خیرباد کہہ گئے۔ اور ایک کثیر جماعت کے ساتھ آپ کا نام بھی فہرست برخاست میں آ گیا۔ ان کی طبیعت کو شعر گوئی سے مناسبت ضرور ہے۔ لیکن طبیعت پر زور ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ قدامت پرستی اور رسم پدری مزاج پر حاوی معلوم ہوتی ہے۔ زبان

صاف اور بیان پر قدرت ہے۔ بول چال اور زبان کا چسکا بھی موجود ہے۔ صرف غزلیں دفتر میں پہنچیں جن کا انتخاب ہدیہ قارئین کرام ہے۔

نرالے گل کھلائے ہیں جنوں نے جوشِ وحشت میں
تماشہ کوئی دیکھے تو ہمارے چاکِ داماں کا

کیا کس سنگدل نے قید مجھ وحشی کو زنداں میں
بنا طوقِ گلو ہر حلقۂ زنجیر پتھر کا

تیری صورت پہ مر مٹا دیکھا
جان سے اپنی میں گیا دیکھا

تیغِ ابرو کا لے لیا بوسہ
میرا دل میرا حوصلہ دیکھا

لے کے دل پہلو سے رخصت ان کا پیکاں ہوگیا
ہائے دم بھر میں بھرا گھر میرا ویراں ہوگیا

زاہد شراب پی کہ ہے موسم بہار کا
سایہ ہے سر پہ رحمتِ پروردگار کا

کسی کی مست آنکھیں دیکھکر سرشار ہو جانا
ہمیں آتا ہے زاہد بے پیئے میخوار ہو جانا

موت کے پردے میں پنہاں تھے رموزِ بیخودی
جان لے کر مجکو محوِ حسنِ جاناں کردیا

میں خمارِ بےخودی سے مست عرفاں ہوگیا
اِک نظر میں تُو نے کیا اے چشمِ جاناں کردیا

گوہرِ مضمون سے اے صدیق پائی آبرو
فیضِ راسخ نے مجھے اتنا سخنداں کردیا

ہاتھوں اُچھل گیا مرے سینہ میں دل مرا
جب عرضِ مُدعا پہ کوئی مسکرا دیا

اہلِ تقویٰ بھی ہیں محشر میں گنہگار بھی ہیں
دیکھنا یہ ہے کہ کس پر ترا احسان ہوگا

چھپ نہیں سکتا چھپائے سے کبھی داغِ جگر
یہ وہ شعلہ ہے دبائے سے نمایاں ہوگیا

متاعِ زندگی تھے چند قطرے خونِ بسمل کے
یقیں اس کو جب آیا اس نے جب دل چیر کر دیکھا

سرِ مقتل اُدھر خنجر ہتھیلی پہ ادھر سر تھا
نیاز و نازِ حسن و عشق کا پلہ برابر تھا

اگلتی تھی زمیں بھی گنجِ قاروں موسمِ گل میں
کہ جس غنچہ کو دیکھا اپنی مٹھی میں لئے زر تھا

بولے وہ سن کے قصۂ یوسف کو ناز سے
وہ ہی تھا جس کا مصر میں نیلام ہوگیا

کیا رخصت شبابِ زندگی کا دورِ پیری نے
چھلکنے کے لئے اب عمر کا پیمانہ آپہنچا

جس طرف دیکھئے ہوتا ہے نظارہ ان کا
بُت کدہ ان کا حرم ان کا کلیسا اُن کا

دل حسینانِ جہاں پر جب مرا مائل نہ تھا
مجھکو آزارِ محبّت کا مزہ حاصل نہ تھا

مَیں نے مانا اس کا ملنا تھا مجھے دشوار تر
لیکن اپنی جان کھو دینا تو کچھ مشکل نہ تھا

جس سے کچھ تسکین ہوتی تشنہ کامِ عشق کو
اتنا پانی بھی ترے خنجر میں کیا قاتل نہ تھا

اک بلبلے ہوئے یوں بے چھری وہ ذبح کرتے ہیں
کھنچے رہتے ہیں ہم سی بزم میں تلوار کی صورت

ہم بھی دل کھول کے کچھ خاطرِ مہماں کر لیں
پار سینہ کے ذرا تیرِ نظر جانے دو

اِک در جو ہُوا بند تو وا ہو گئے سَو در
روزی مری کرتا نہیں وہ رزق رساں بند

توڑے ہیں یہ گِن گِن کے ستم ہائے فلک نے
چن چن کے ستمگر نے کئے آج جواں بند

ہر لمحہ ہے صیاد اسیروں پہ نیا ظلم
اور اس پہ یہ تاکید رہے شور و فغاں بند

بار آور ہو الٰہی اب نہالِ اتحاد
دیکھ لیں ہم اپنی آنکھوں سے کمالِ اتحاد

ہندو و مسلم کا مثلِ آئینہ ہو صاف دل
خواب و بیداری میں بھی رکھیں خیالِ اتحاد

ذرّہ ذرّہ سرزمینِ ہند کا ہو مُستنیر
نور افشاں ہو جہاں میں وہ جمالِ اتحاد

جلتا ہوں تابِ حسنِ رُخِ یار دیکھ کر
مشتعل بنا ہوں جلوۂ دیدار دیکھ کر

قفس میں ہوں نہیں معلوم گذری کیا نشیمن پر
سُنا ہے کوند کر بجلی گری ہے صحنِ گلشن پر

ظلم اتنا تو ذرا بانیٔ بیداد نہ کر
بند فریاد سے پہلے لبِ فریاد نہ کر

نہیں منظور رہائی نہ رہا کر لیکن
بے پر و بال قفس میں مجھے صیاد نہ کر

کوئی اُٹھا بھی ہے بیمار تمہارا ہو کر
جاؤ بھی نام ڈبویا ہے مسیحا ہو کر

اُمنگیں لے اُڑینگی اِک نہ اِکدن خود بخود ان کو
دبیگا شرم سے اٹھتی جوانی کا اثر کب تک

اب گلے کس سے ملیں سوختہ تن عید کے دن
آج ہیں ہم سے جدا اہلِ وطن عید کے دن

گھر وہ صحرا ہے کہ جس گھر میں تو آباد نہیں
دل وہ پتھر ہے کہ جس دل میں تری یاد نہیں

مجھ سے گنوا نہ گناہوں کو مرے اے واعظ
وسعتِ دامنِ رحمت تجھے کیا یاد نہیں

تارِ زنار میں تسبیح پروئی میں نے
تفرقہ شیخ و برہمن کا یہ منظور نہیں

گم ہو کے میں تو آپ سے دم بھر میں مل گیا
دِلّی میں لوٹ زاہد حسن بہار جنّت
کس شان سے کیا ہے ساقی نے خیر مقدم
تسخیر کر لئے دل محفل میں اہلِ فن کے
یہ رنگ لائی شہیدوں کی خاک بعد فنا
عدو ہے میں بھی ہوں صدیق بزم میں اسکی
نہیں ہیں پیشِ نظر اب وہ حسن کے جلوے

سناؤں تمہیں دل کا میں مدعا کیا
ستم کی ادا میں ہو شانِ کرم بھی

انداز ہیں نرالے اُس شوخ کی نظر میں
کیوں ناوکِ بیداد نے منہ پھیر لیا ہے

اللہ اللہ عجب شان ہے شانِ اُردو
دبکے رہتی ہے کسی سے نہ رہیگی ہرگز

میری فطرت نے دیا ہے مجکو پیغامِ حیات
نگاہِ ناز تو نے اے بتِ بے پیر کیا بدلی
مجھے کیا انقلابِ آسماں کا اعتبار آئے
اے قضا تجھ کو تو آنا ہی ہے لیکن شبِ غم
مری آنکھوں میں رہکر یار کیصورت بدل جائے
باتوں باتوں میں لگا لاؤں گا اپنے ہمراہ

کچھ اس طرح شباب کی دنیا گذر گئی

زمانہ سے نہیں مطلب ہمیں تو تم سے مطلب ہے

اے خضر آپ کھوئے رہے عمر بھر کہاں
حوروں سی بھی حسین تر پریاں میں چھوڑی ہیں
چھڑکاؤ کر دیا ہے مئے کا گلی گلی میں
لطف سخن یہ دیکھا صدیق دہلوی میں
زباں سے بنکے اُڑی ہے گلال ہولی میں
گلے گی دیکھئے اب کس کی دال ہولی میں
کہاں ہے پہلی سی اب وہ بہار ہولی میں

کہوں کیا میں تم سے کہ کیا چاہتا ہوں
جفا کرنے والے وفا چاہتا ہوں

آنکھوں سے آکے اتری برچھی مرے جگر میں
باقی ابھی کچھ خون کے قطرے ہیں جگر میں

ہے زبانوں میں زباں ایک زبانِ اُردو
ہاتھ بھر کی ہے خدا رکھے زبانِ اُردو

ہر رگِ تن دے رہی ہے درس آزادی مجھے
زمانہ پھر گیا مجھ سے زمانہ کی ہوا بدلی
نہ میں بدلا نہ وہ بدلے نہ کچھ طرزِ جفا بدلی
اگر آجائے تو مشکل مری آساں ہو جائے
یہ پتلی بن کے گویا نور کے سانچے میں ڈھل جائے
راستے میں جو کہیں مل گئے آتے جاتے

معلوم ہی نہیں کدھر آئی کدھر گئی

اگر برگشتہ ہوتا ہو تو ہو سارا جہاں ہم سے

دخترِ رز نے تجھے زاہد کبھی چھونے نہ دیا
اس سے بڑھکر بھی کوئی صاحب عصمت دیکھی

لگائے عیب اوروں کو بہت کچھ عمر بھر میں نے
گناہوں پر کبھی اپنے نہ کی ہر گز نظر میں نے

کشاکش دو طرف ہے دیکھئے کیسے بنے ان سے
وہ کہتی ہیں یہ پیکاں ہے میں کہتا ہوں مرا دل ہے

مَے سے توبہ کریں ہم یہ کبھی ممکن ہی نہیں
ہم سے اسے زاہد ناداں رہا جاتا ہے

اِک نظر ابرو چڑھاکر جانب نخچیر بھی
تیر بھی چلتے رہیں پھرتی رہے شمشیر بھی

کھولدیں جوشِ جوانی نے اُتر کر آنکھیں
عہد پیری سے ملی خواب کی تعبیر مجھے

صدیق

صدیق ۔ منشی محمد صدیق حسن دہلوی خلف شیخ محمد ابراہیم دہلوی۔ شاگرد حضرت راسخ دہلوی۔ ان کے پردادا شیخ رحیم اللہ صاحب اکبر شاہ ثانی کے ہاں تیر اندازوں کے زمرے میں ملازم تھے، ان کے دادا کریم اللہ آرزو بھی عمدہ قدر انداز تھے، اور شاہزادوں کو اس فن کی تعلیم دیتے تھے، شاعر بھی تھے۔ اور اس فن میں شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا۔ مومنؔ ذوقؔ۔ غالبؔ کے مشاعروں میں شرکت کر چکے تھے۔

صدیق صاحب چھ سات سال کی عمر سے موزوں طبع واقع ہوئے ہیں۔ معمولی تعلیم کے بعد صدر بازار دہلی میں کسی سوداگر کی ملازمت میں رہے، انہیں دنوں میں مولانا راسخ دہلوی کے سرچشمۂ سخن سے سیراب ہوکر تلمذ اختیار کیا۔ ذہین اور رطباع آدمی ہیں۔ چند ہی روز میں مشاق ہو گئے۔ زبان اور مضمون دونوں میں طبیعت کی جولانی دکھاتے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

دکھایا معجزہ یہ سخت جانی نے دمِ کشتن
بنا میرا تن لاغر تہِ شمشیر پتھر کا

شرارت ہے نہ شوخی ہے نہ اندازِ تکلم ہے
مرے گھر بن کے آیا ہے بت بے پیر پتھر کا

سوال وصل پر تقدیر سے چپ لگ گئی ایسی
بنا بیٹھا رہا وہ بت دم تقریر پتھر کا

وہ تر دامن ہوں میں ناصح کہ جب دامن نچوڑوں گا
کریں گے زاہدانِ خشک آ آ کر وضو برسوں

وہ بیٹھے ہیں پس پردہ مگر شوخی سے کہتے ہیں
کسی کی حسرتِ دل ہوں کسی کی میں تمنا ہوں

مجھے آنکھیں دکھائیں پہلے پھر ابرو پہ بل ڈالا	لگا کر زیر یاد آیا انہیں شمشیر کا پہلو
نیا محشر اٹھا لائی نئے فتنے جگا لائی	تری رفتار کیا آئی کہ پیغامِ قضا لائی
بس اب گلشن سے میرا آب و دانہ اٹھ گیا یارب	قفس میں کھینچ لائے ہیں مجھے صیاد کے کھٹکے

صدیقی

صدیقی:۔ مولوی منظور احمد صاحب خلف شیخ شمس الدین خلف مولوی رحیم بخش صدیقی امروہوی ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور منظور حسن تاریخی نام رکھا گیا۔ دس سال تک اپنے شہر کے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی خدمات انجام دیکر ۱۹۲۷ء ۱۳۴۶ھ میں کراچی چلے گئے۔ اس وقت سے اسکول بورڈ کراچی میں ملازم ہیں۔ آپ غزلیات میں افسر اور نظمیات میں صدیقی تخلص کرتے ہیں۔ حضرت مضطر خیر آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ ثانیاً منشی احمد علی صاحب شوق کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی تصنیفات میں دیوانِ دوم برق تجلیات۔ مجموعۂ رباعیات۔ مجموعہ کلام ۱۹۲۴ء لغایت ۱۹۲۹ء اور چند درسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

دیوان اول نوشتہ بے مثال۔ مجموعہ نظمیات تذکرہ شعرائے امروہہ اور متعدد رسائل متعلقہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی بھی ان کی تالیف سے بتائی جاتی ہیں۔ آجکل ایک تذکرہ جس کا تاریخی نام فروغِ وطن ہے۔ ترتیب دے رہے ہیں۔ اس تذکرہ میں صرف ان حضرات کا ذکر ہے جنہوں نے بلا واسطہ یا بالواسطہ شیخ مصحفی مرحوم سے فیض پایا ہے یا ان کے سلسلے میں ہیں۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد پچاس کے قریب ہے جن میں سے کئی صاحب دیوان ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ دو نظمیں نذر ناظرین ہیں۔

خیالِ یار

اے خیالِ یار میری زندگانی تجھ سے ہے	دل کو حاصل چارۂ دردِ نہانی تجھ سے ہے

منتفق ہے تُو تو عیش و کامرانی ہے مجھے
منحرف ہے تو تو لطف جاودانی ہے مجھے

ہے عنایت پر تری دار و مدار زندگی
تیرے دم سے چل رہا ہے کاروبار زندگی

کر دیا بے فکر ایسا خدشۂ ایام سے
مل گئی فرصت زمانے کے غم و آلام سے

بوالہوس ہونگے غم فرقت سے رنجور و حزیں
مجھ کو اپنی بے کسی و بے لبسی کا غم نہیں

چاہئے کیا اور اے تسکین جانِ مبتلا
آ گیا تو مہرباں ہو کر تو سب کچھ مل گیا

ہجر صدیقی کو مثل وصل عشرت خیز ہے
دور رہ کر بھی سرورِ جام الفت تیز ہے

شمع

مجھ کو اے شمع فروزاں فکر ہے اس بات کی
واقعہ کیا ہے کہ سر سے پاؤں تک تو آگ ہے

دیکھتا ہوں جب تجھے تاریکیوں میں رات کی
میں سمجھتا ہوں کہ تجھکو بھی کسی سے لاگ ہے

جاگ کر کاٹی ہیں تو نے سینکڑوں شبہائے تار
کی ہے اک انداز پر اختر شماری عمر بھر

میں نے دیکھا ہے ہمیشہ بے سکون و بیقرار
گریۂ بے فاصلہ رکھا ہے جاری عمر بھر

تشنۂ تشریح کامل ہے یہ مضمونِ ادق
واقعات خاص کا حامل ہے افسانہ تیرا

اس سکوت بر محل میں ہیں نہاں لاکھوں سبق
جذب رکھتا ہے بہت اندازِ مستانہ تیرا

دیکھ کر حسن عمل اے پیکر فانی ترا
جی میں آتا ہے کہ پروانے کی صورت جان دوں

مشعلِ راہ فنا ہے جسم نورانی ترا
کاش میں بھی سوز پنہاں کی بدولت جان دوں

مرحبا یہ قوتِ صبر و تحمل مرحبا۔
تو نہ مجبور جفائے عالمِ فانی ہوئی

جوش ٹھنڈا کر سکا کس دن ستم گلگیر کا
جس قدر کاٹا تجھے تو اور نورانی ہوئی

صریر

صریرؔ۔ مولوی منشی محمد احمد صاحب خلف اکبر حضرت امیر مینائی مرحوم پہلے تخلص قمر تھا۔ پھر محو ہوا۔ اب صریر تخلص کرتے ہیں۔ عرصہ تک ریاست رامپور میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ کئی برس سے ہز ہائینس نواب صاحب والی رامپور کی حضوری

میں ہیں۔ اور فنِ سخن گوئی میں نواب صاحب موصوف کے اُستاد ہیں۔ عربی۔ فارسی اور اُردو کی استعداد معقول ہے۔ علمِ عروض و معانی و بیان سے واقف ہیں۔ لوگ اُستادزادہ ہونے کی حیثیت سے ان کا ادب و لحاظ کرتے ہیں۔ اور یہ رامپور کی ہر جماعت میں ہر دلعزیز ہیں۔ طبیعت عالی۔ خیالات برتر۔ بندش زوردار ہوتی ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

لب گلرنگ پہ اک لطف دکھاتی ہے مسی
فیضِ کامل سے ہو گیا جوہر ناقابل کو

غیر کی ضد سے ملا آپ وہ کافر مجھ سے
بتکدے میں بھی کئے ہم نے خدا کو سجدے

رک گیا ہاتھ دمِ ذبح مرے قاتل کا
غضب آیا جو گریبانِ سحر چاک ہوا

اپنے حیراں سے نہ منہ پھیر کہ سایہ کی طرح
میں وہ بیکس ہوں کہ فرقت میں مری پاس اجل

صورت پرست وہ ہے میں معنی پرست ہوں
سکندر رہتے تقدیر کا آئینہ بھی

سایہ میں اس بلند قامت کے

یہ دھواں آگ سے اُٹھ اُٹھ کے پریشاں نہ ہوا
عکس انساں سے کبھی آئینہ انساں نہ ہوا

شکر صد شکر کہ تدبیر کا احساں نہ ہوا
لطف یہ ہے کہ جدا کفر میں ایماں نہ ہوا

رحم بھی بن کے مری جان کو جلاد آیا
چھٹ گیا ہاتھ سے دامن شبِ تنہائی کا

آئینہ ہے قدِ آدم تری یکتائی کا
آئی ہے اوڑھ کے برقع شبِ تنہائی کا

بلبل کو رنگ مجھکو ہے پھولوں کی بو پسند
ہوئے جس سے وہ بے حجاب اوّل اوّل

سو رہے فتنے سب قیامت کے

صریر:۔ پنڈت گنگا رام خلف اصغر پنڈت دیبی سنگھ۔ کنج پورہ ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۹۸؁ھ میں ۳۱ برس کی عمر تھی۔ رہ پڑ میں اپیل نویسی کرتے تھے۔ مرزا یوسف علی خاں عزیز مرحوم سے تلمذ تھا۔ بعض قدیمی بیاضوں میں ان کا نام گنگا بشن نظر سے گذرا ہے، بلند پایہ شاعر تھے۔ شعر میں ہمیشہ کوئی بات پیدا کرتے تھے یہ کلام ہے

پچھتاتے ہیں وہ کرکے مجھے قتل کس لئے
اوّل نتیجہ سوچ نہ انجام کار کا

کر اب تو چاک چاک گریباں مرا جنوں
لوں گا حساب روزِ جزا تار تار کا

ایک دل غمخوار تھا سو اس کو سودا ہو گیا
حیف ناداں عاشقِ زلفِ چلیپا ہو گیا

تُو نے چھیڑا مجھے بُرا ہی کیا
خیر جو کچھ کیا بھلا ہی کیا

شب عدو بزم میں جلا ہی کیا
یار ساغر ہمیں دیا ہی کیا

صریر

صریر:- محمد عبدالکریم صاحب شاگرد جناب کلیم بنگلوری۔ طبیعت موزوں اور شعر کے مناسب ہے۔ کلام یہ ہے: ؎

ہمیشہ آئینہ رہتا ہے ان کے پیشِ نظر
مجھے نہ رشک ہو کیوں طالعِ سکندر پر

ہُوا نہ وصل میسّر کبھی بتوں کا مجھے
یہ کیسے پڑ گئے پتھر مرے مقدّر پر

صریر آپ کی توبہ کا اعتبار کسے
ضرور ٹوٹے گی اکدن یہ حوضِ کوثر پر

صغیر

صغیر:- میاں چھوٹے خاں عرف چھٹّن خلف محمود خاں لکھنوی۔ مقیم رامپور۔ سید افضل علی افضلؔ خلف کوچک منشی مظفر علی صاحب اسیرؔ سے شعر میں تلّمذ تھا۔ شاعری کے علاوہ فنِ نقاشی میں ابتدا ہی سے خاص شوق تھا۔ جناب امیر احمد صاحب امیرؔ اپنے تذکرہ انتخاب یادگار میں تحریر فرماتے ہیں۔ "ذہن ایسا مناسب ہے کہ کسی سے تلّمذ نہیں اور تصویر ایسی کھینچتا ہے، کہ نقاش آفریں کہتے ہیں"۔

مندرجہ ذیل اشعار ابتدائی زمانہ کے ہیں۔ جو عمر کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔

ترا جلوہ کہاں ہم نے نہ اے رشکِ قمر پایا
یہاں دیکھا وہاں دیکھا اُدھر پایا اِدھر پایا

کبھی برچھی کا پھل پایا کبھی تلوار کا ہم نے
محبت کا شجر بو کر یہ قاتل سے ثمر پایا

بزم میں اللہ ری دُزدیدہ نگاہی یار کی
جس کو دیکھو کہہ رہا ہے وہ مرا دل لیا ہُوا

پیشتر رہتے تھے کعبہ میں کبھی اصنام اے صغیرؔ
اس صنم کا ہے اگر مسکن مرا دل کیا ہُوا

جو وہ چاہے تو ہوں دشمن گواہ اسکی خدائی کے
کہے واعظ حرم پر وعظ ہر تصویر پتھر کی

صغیر

صغیر:- شاہ نجم الدین دہلوی پسر شاہ نصیر الدین نصیرؔ۔ سجادہ نشین درگاہ صدر جہاں

دہلی۔ غدر تک دیہاتِ درگاہ پر قابض رہے۔ بعد غدر بعوض جاگیر سرکار نے ایک ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ پھر ۱۸۶۵ء میں صرف ایک موضع جاگیر میں مقرر ہوا۔ پہلے اپنے والد ماجد کے ہمراہ بہت سے شہروں مثل حیدرآباد۔ لکھنؤ عظیم آباد کی سیر کی۔ بعد اُن کی وفات کے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ فنِ شعر سے شوق نہ تھا۔ اپنے والد کے شاگردِ رشید قطب الدین مشیر کے اصرار سے کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ اور اُس میں اصلاح بھی انہیں سے لیتے تھے۔ مگر جو کچھ کہتے شگفتگی اور تازگی لئے ہوتا۔ اندازِ بیان دلکش اور اسلوب چست ہوتا۔ ۷۵ برس کی عمر پا کر ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔ مجموعہ کلام جو نظر سے گذرا اُس میں سے اشعار ذیل منتخب ہوئے۔

تصور جب سے دن رات گیسوئے پریشاں کا
ہے وحشت کی یہ حالت اور کوہ کی وہ صورت
فرقت کو میں کیا سمجھوں اور وصل کو کیا جانوں
آنکھوں نگاہ میں ہے جلوہ اس پردہ نشیں کا ہے
صغیر اُس بُت کو دل دنیا سمجھ کر
خورشید قیامت غمِ جاناں میں قمر ہے
دوں اسمیں جگہ کیوں نہ صغیر اپنے بتوں کو
طلسماتِ جہاں میں خود نما کا کار خانہ ہے

گماں صبح وطن پر کیوں نہ ہو شام غریباں کا
کہتا ہے جنوں رستے مشکل مرے دونوں ہیں
میں بحرِ محبت ہوں ساحل مرے دونوں ہیں
معمورہ یہ یک لیلے محمل مرے دونوں ہیں
کرو گے کیا اگر اس نے دغا کی
شام شبِ فرقت مجھے محشر کی سحر ہے
کچھ اسمیں اجارہ نہیں اللہ کا گھر ہے
خدائی کر رہے ہیں بُت خدا کا کارخانہ ہے

صغیر

صغیر:۔ شاہ غلام حیدر صاحب مرحوم لکھنوی ابن شیخ وحسومن صدیقی شاگرد میر علی اوسط رشک مرحوم۔ ۱۳۰۳ء میں ستر برس کی عمر تھی۔ اور دھار دپور ضلع پرتاب گڈھ میں قیام تھا۔ ان کی تصنیفات سے ایک دیوان اور آملۂ اختر موجود ہے۔ مذاق سخن میں اپنے اُستاد کے قدم بقدم ہیں۔ رعایت لفظی اور تشبیہات استعارہ بالکنایہ اور محاورات کو ان کی شاعری کا خاص معیار سمجھنا چاہئے۔ تخیل میں بھی

ان کا طائر خیال اپنے اُستاد کے برابر پرواز کرتا ہے۔ علاوہ غزل کے مرثیے بھی کہے ہیں۔ اس سے زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے۔ یہ کلام ہے۔

نہ ہوتا کبھی چاک سینہ گلوں کا — جو باغوں میں شور عنادل نہ ہوتا

شب وصل شرمائے وہ اس قدر — پسینے سے چاہِ ذقن بھر گیا

لکھوں خط اُس پری کو تو دو چیزیں چاہئیں — پر کا قلم ہو اور ہو کاغذ پتنگ کا

بعد مردن بھی نہ چھوڑا گردشِ گردوں نے ساتھ — چاک بنتا ہے زمانے میں ہماری خاک کا

کیا فیض سینہ قلب کو ہوا ہے صفا سے — ظلمت کدہ آئینہ سے روشن نہیں ہوتا

قالب بے روح کو وہ بے قراری اب نہیں — جان شاید اُس پری رو پر فدا تھی میں نہ تھا

بیوفائی کا گلہ سن سن کے کہتا ہے وہ شوخ — جب ازل کے روز تقسیم وفا تھی میں نہ تھا

اے صغیر اُن کے جو پہلو سے کبھی اٹھتا ہوں — تو انگوٹھے سے دبا لیتے ہیں دامن میرا

صبح امید نہ آئی نہ گئی شامِ الم — وصل کا روز نصیب اے شبِ ہجراں نہ ہوا

سرکشی صحبت ہم جنس میں کب پائی گئی — جھک گیا شیشہ بھی سامنے جب جام آیا

اسیرِ کنجِ قفس آج تک نہیں چھوٹے — خزاں چمن سے گئی موسم بہار آیا

عاشق ہوئے خراب ہوئے غم نے کھو دیا — بیٹھے بٹھائے ہاتھ سے دل ہم نے کھو دیا

کب تک رہینگی تفرقہ پردازیاں تری — اے چرخ دو دلوں کو ملانا ضرور تھا

چکھائے ہیں مزے دریا کو اشک گرم نے کیا کیا — حبابوں کی جگہ ہیں آبلے لبہائے ساحل پر

طوقِ وحشت مری گردن میں اسی سال پڑا — جس برس یار نے منت کی بڑھائی زنجیر

وہ چوپٹ کھولکے جھانکنے تو لٹک آئی زلف — اپنے دروازہ میں اک اور لگائی زنجیر

بھوک میں زخم جگر کی اشتہا — پیاس میں ہے آب خنجر کی ہوس

مر گیا ہوں گورے گورے رنگ پر — قبر میں ہے سنگِ مرمر کی ہوس

دل دیچکے تھے آپکو اب مرکے جان دی — وہ ابتدائے عشق تھی یہ انتہائے عشق

ذبح کر ڈالئے یا کیجئے تدبیرِ وصال
مجھ کو تڑپایئے گا صورتِ بسمل کب تک

جب یہ کہتا ہوں غمِ ہجر سے مر جاؤں گا
پوچھتا ہے وہ بتِ حور شمائل کب تک

میرے ساقی نے پیالے سب کو بھر بھر کر دئے
میں نے جب مانگا تو بولا ہاتھ ابھی خالی نہیں

سانچے کی صورت ہیں چھلے اور گوری انگلیاں
شمعیں ہیں پر آدمی کی ہاتھ کی ڈھالی نہیں

گھلایا ہے غمِ فرقت نے ایسا ناتوانی میں
کہ بہرِ غرق ہم قطرے کو بھی دریا سمجھتے ہیں

بالائے بام زلف جو دیکھی غضب ہوا
سر پہ بلا فلک سے ہو نازل تو کیا کروں

بے سبب منظور لاشے کو نہیں گز بھر زمیں
دل میں ہے ملکِ عدم کی جا کے پیمائش کریں

سناتے وہ نہیں چھپا گل کی بھی صدا آ کر
ہزار تشنۂ دیدار پیاس پیاس کریں

زخمی تیغِ نظر مجروح خنجر کے نہیں
گھاؤ ہیں سینے کے اندر جسم پر چرکے نہیں

چکنے چکنے گورے گورے جسم ہیں دل سخت ہیں
کون کہتا ہے کہ یہ بت سنگِ مرمر کے نہیں

ایسی دیکھی نہ سنی صحبتِ مستانہ کہیں
شیشہ ہی کہیں ساقی کہیں پیمانہ کہیں

میرے مذہب کا نہ پوچھو حال کچھ اے زاہدو
مسجدوں میں پارسا ہوں رند میخانوں میں ہوں

لختِ دل پر صفتِ حسنِ رخِ یار لکھوں
چاہئے سورۂ یوسف اسی سیپارے میں

دل میں غم سینے میں ارمان رہا کرتے ہیں
ان رفیقوں میں ہم اے جان رہا کرتے ہیں

کوئی بھولے سے نہ ہو کوچۂ گیسو میں مقیم
کیا کہیں کیسے پریشان رہا کرتے ہیں

کام آتے نہیں وحشت میں حواسِ خمسہ
ہم جماعت میں پریشان رہا کرتے ہیں۔

کسی سے کام نہیں تم سے کام رکھتے ہیں
بلا سے لوگ اگر ہم کو نام رکھتے ہیں

وہ مشتِ پر ہوں کہ صیاد و باغباں مجھ سے
دلوں میں اپنے گرہ مثلِ دام رکھتے ہیں

ضعف میں طاقتِ رفتار کہاں
ہم کہاں کوچۂ دلدار کہاں

محرم سے ہاتھ اٹھا کے یہ سمجھاتی ہیں مجھے
ہوتا ہے دستِ موج سے خطرہ حباب کو

تم ایک بوسے کے لئے انکار کر گئے
ہم سے جو مانگو جان تو صاحب نہیں نہ ہو

زندگی بھر نہیں اس کوچہ سے جانے والے
عاشق سوختہ جاں دور کھڑا جلتا ہے
کون کہتا ہے کہ جلتا ہے فقط پروانہ
تواضع جو کرے تعظیم اُس کی چاہئے کرنی
زندگی دشت نوردی سے ہی مانند حباب
دیکھ لینے سے بھی محروم پھرے جاتے ہیں
سرد آہیں۔ نہ دم سرد۔ نہ چشم نمناک
فصل بہار توبہ شکن سر پہ آگئی
صبح فراق بادہ پرستی میں شام ہو
قاضی اگر ہیں آپ تو ہم ہیں شراب خوار
کرلیں گے توبہ پیتے ہیں شعبان میں شراب
قاضی و محتسب و شیخ بھی متوالے ہیں

جھک کے بیٹھے ہیں ترے ناز اٹھانیوالے
پاس بیٹھے ہیں وہاں آگ لگانیوالے
آپ بھی جلتے ہیں عاشق کے جلانیوالے
صراحی جھک کے ملتی ہے تو اُٹھ کر جام ملتا ہے
ہمہ تن آبلے ہیں پاؤں میں چھالے کیسے
وہ توجہ وہ تواضع وہ مدارات گئی
اب وہ جاڑے گئے گرمی گئی برسات گئی
تقویٰ کو نذر پیر خرابات کیجئے
دن کو سیاہ کاریوں سے رات کیجئے
جو جی میں آئے قبلہ حاجات کیجئے
کیا ہوش میں ہیں مہ رمضاں تک نہ آئیں گے
آج کیا پیر خرابات کی بن آئی ہے

صفت اسپ

دُلدُل ہے سر سے پاؤں تک اسپ سی شیم
نقش ہلال نعل سے ظاہر ہے یک قلم
فیروزہ عکس رنگ سے ہر شے ہے زرین پہ
اس باد پا کے وصف ہیں بیحد و بے حساب
نظروں میں مثل نور ہے آنکھوں میں مثل خواب

رفتار میں ہے کبک تو آہو میان رم
ماہی ہے پشت روئے زمیں سے قدم قدم
جمتا ہے اسکی سایہ سے سبزۂ زمین پہ
طاؤس ہے جمال میں اڑنے میں ہے عقاب
گا ہے ہلال نعل ہوا اور گہہ رکاب

شاہانہ دبدبہ ہے نمودار آپ سے
ڈنکے کی چوٹ گردہی گھوڑے کی ٹاپ سے

صفتِ تیغ

تر تو ضیائے تیغ کا نزدیک و دور تھا
دشتِ ستم میں وادیِ ایمن کا نور تھا
سایہ زمیں پہ لوٹتا تھا اس کی شان پر
بجلی تھی ذوالفقار صفِ کارزار میں
گاہے جو سو میں تھی تو کبھی تھی ہزار میں
ترکش سے تنگ تنگ دہن تھا میان کا
جب خود پر پڑی تو گلے تک اُتر گئی
دو کر چلی کمر کو تو وہ زین پر گئی
نکلی زمین سے تو یہ غل بر محل ہوا

وہ تھی چمک کہ کوہ ہر اک کوہ طور تھا
ارض و سما میں قبضۂ تیغ حضور تھا
ضو تھی برنگِ قوسِ قزح آسمان پر
کشتوں کے ڈھیر کرتی تھی ایک ایک وار میں
ہل چل سی پڑ گئی سپہ نابکار کی
چھپنے کو ڈھونڈتے تھے وہ گوشہ کمان کا
گردن سے تا بہ سینہ گئی تا کمر گئی
وہ زین سے زمین پہ بالشت بھر گئی
گاوِ زمیں کی شاخ سے پیدا یہ پھل ہوا

صفتِ گیسو

آئی جو رن میں نکہت گیسوئے پر شکن
سب وصف طول زلف میں کوتاہ ہے سخن
یا بین ہر دو زلف نہاں روئے شاہ ہے

میدانِ کار زار ہوا وادیِ ختن
سنبل جو ہے یہ زلف تو چہرہ ہے یہ چمن
پھیلے ہیں ہاتھ شب کے ہم آغوش ماہ ہے

صغیر۔ منشی محمد اصغر حسین گورکھپوری۔ خیال بند ہیں۔ مضمون آفرین ہیں۔ مگر ادائے بیان سادہ ہے۔ زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا :-

ہم پر ستم ہوا تو عدو پر کرم ہوا
جز شوق کون عشق کی منزل میں تھا رفیق
ہم چھوٹتے چلے سوئے میخانہ اے صغیر

اد بانیِ ستم پہ ستم پر ستم ہوا
جز مرگ کون رہبرِ راہِ عدم ہوا
ظاہر جو آسمان پر ابر کرم ہوا

روئیں گے کبھی یہ زخمِ دل بھی
ہنس لیں یہ مجھے رُلا رُلا کر

ہم دیکھ چکے جو دیکھنا تھا
چھپتے ہیں عبث وہ منہ دکھا کر

مٹاتے ہو تو کیوں داغِ دل کو
یہی شاید چراغِ آرزو ہو

کیا جانیں خضر چاشنیِ موت کی لذّت
مرنے کا مزہ عشق میں پوچھے کوئی ہم سے

بدنام رہے دہر میں سب چاہنے والے
کچھ عشق و محبّت کا ہوُا نام تو ہم سے

قدم جب دبستاں میں مجنوں نے رکھا
کہا عشق نے پہلی منزل یہی ہے

چھپے لاکھ محشر کے مجمع میں کوئی
لہو خود پکارے گا قاتل یہی ہے

جہاں صورتِ شمع جلتے ہیں عاشق
خبردار اے دل وہ محفل یہی ہے

بنکے زاہد وہی سجدے میں پڑے رہتے ہیں
جو نکالے گئے ساقی ترے میخانے سے

صغیر - پنڈت شیام منوہر ناتھ صاحب کول خلف پنڈت بیجناتھ صاحب کول لکھنوی آپ شروع ہی سے نہایت ذہین و بردبار ہیں۔ ابتدائی تعلیم سینٹنل سکول لکھنؤ میں پائی ۱۸۹۵ء میں بعمر ۱۵ سال انٹرنس پاس کیا۔ اور تمام الہ آباد یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ۱۹۰۱ء میں انگلش لٹریچر میں ایم۔ اے اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ لکھنؤ میں انگلش لٹریچر کے پروفیسر رہے۔ جولائی ۱۹۰۴ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ وکالت کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں منصف ہوئے۔ آج کل (۱۹۳۰ء) ایڈیشنل سشن جج ضلع اناؤ ہیں۔

شعر گوئی کا شوق ۱۳ برس کی عمر سے ہوُا۔ اُردو۔ فارسی کے دیوان بکثرت زیر مطالعہ رہے ہیں۔ خواجہ وزیر لکھنوی کا رنگ خاص طور پر مرغوب طبع ہوُا۔ حالانکہ شعر گوئی کو کبھی مایہ ناز نہیں سمجھا۔ مگر کلام میں جذبات کی فراوانی اور حسنِ ادا موجود ہے انتخاب کلام ملاحظہ ہو:-

نہیں یارا مرے غم کے رقم کا
کلیجہ چاک ہوتا ہے قلم کا

تغافل بھی ہے ظالم کا قیامت
صغیر خستہ جاں سے پوچھئے حال

یہ دل مشتاق ہے مشقِ ستم کا
شروع عشق میں ضبطِ الم کا

رُک گیا نالۂ شب آہِ سحر بند ہوئی
سوگیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

عکس صورت کا تری خوب اُتارا لیکن
آئینہ دل میں ہے قائل تری یکتائی کا

راز زخموں سے کھلا مشقِ ستم کا ان کی
لب خاموش پہ الزام ہے گویائی کا

زخمی تیغ ادا سے پوچھئے اسکے مزے
جو خلش کرتی ہے پیدا جنبش ابروئے دست

مجھے پیارا ہے پیری میں بھی دل گو اب ہے ویرانہ
یہ وہ گھر ہے رہی جسمیں کسی کی آرزو برسوں

اسی کا سجدہ کچھ مقبول ہے محرابِ ابرو میں
کری پہلے جو آب تیغ قاتل سے وضو برسوں

نہ چھوٹا جامۂ ہستی سے داغِ معصیت اپنا
بہت اشک ندامت ذ عبث کی شست و شو برسوں

دلیل بےخبر مغزی ہے یہ سودائے پری رو میں
کہ تصویر خیالی سے رہی ہے گفتگو برسوں

جنوں میں خود فراموشی سی پایا تھی طلب جسکی
تھکائے عقل نے کیا کیا نہ پائی جستجو برسوں

قیامت ایک ہنگامہ ہے اسکو اس سے کیا نسبت
کہ برپا سینکڑوں فتنے تری محفل میں بیٹھے ہیں

ہلوئے فکر کا اُڑنے سا دیکھئے اعجاز
کہ آسمان پہ پہنچا دیا زمینوں کو

لڑی جو آنکھ دل زار ہو پہ چور ہوا
ذرا سی ٹھیس قیامت ہے آبگینوں کو

نگاہ و شوخ کا ہے شکوۂ ستم پہ جواب
یہی رہی ہے رہیگی یہی ادا میری

تھپیڑو نہیں ہوائے آرزو کے جسم خاکی ہے
خدا جانے کہاں یہ کشتی بحر فنا ٹھہرے

قدم رکھتے ہی گلشن میں شگوفے کھل گئے صدہا
خدا جانے لگائے آگ کیا کیا گر صبا ٹھہرے

شب و روز

پچھلا پہر ہے رات کا ہے خوشنما سماں
ہونے لگے ہیں صبح کے آثار کچھ عیاں

آتی ہے تن میں تازہ نسیم سحر سے جاں
تڑکے کی چاندنی کی لطافت ہو کیا بیاں

یوں سقفِ آسماں میں ہیں تارے جڑے ہوئے	موتی ہیں جیسے فرش پہ بکھرے پڑے ہوئے
زرّیں ہے پرتوِ شہِ خاور سے روئے شرق	وہ تاب ہے کہ ابر میں جا کے چھپی ہے برق
موجوں میں بحرِ نور کی عالم ہوا ہے غرق	رکھا ادب سے زیرِ قدم آسماں نے فرق
پھر خلق خوابِ مرگ سے آئی حیات میں	پھونکی گئی ہے روح نئی کائنات میں

صفا

صفا۔ سید ذوالفقار علی خاں شرفائے لکھنؤ میں تھے، فنِ سخن میں حضرت میر تقی میر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ زمانہ کی گردش نے لکھنؤ سے بنگالہ پہنچایا۔ وہاں کی شاعرانہ صحبتوں میں اپنا رنگ خوب جمایا۔ امراء و رؤسا کی مدح میں قصائد پڑھے اور موردِ انعام ہوئے۔ بنگالہ سے چینا پٹن میں آئے وہاں بھی لوگوں کے دلوں پر اپنی قابلیت کے نقش بٹھائے۔ میر ابوالقاسم میر عالم مدارالمہام کے زمانے میں حیدرآباد پہنچے۔ جب اربابِ دکن پر ان کے فضل و کمال کا حال روشن ہوا۔ تو سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مہاراجہ چندو لال کی سرکار میں بڑی قدر ہوئی۔ پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ مرتے دم تک مہاراجہ کی رفاقت میں بسر کی۔ اردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، کلیات میں چند مثنویات بھی شامل ہیں جنمیں مثنوی چھومنتر خاص طور پر قابلِ دید ہے۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

پیر نابالغ اگر ہو کے جیا مرد تو کیا	اُس کو یکساں ہے جوانمرد کہ بڈھا ہونا
رُتبۂ فکر تو اب عقل سے گذرا ہے صفاؔ	ایک زنجیر کا باقی ہے بکھیڑا ہونا
میں جا کے کیا کروں گلزار جی نہیں لگتا	بغیر تیرے کہیں یار جی نہیں لگتا
خدا کے واسطے منہ بند رکھیو اے ہمدم	ہمارا ذکر کچھ اس کے حضور مت کیجو
سنبھل کے ٹانکیو ٹک زخمِ دل کو او جراح	یہ حکم ہے کہ رفو دور۔ دور مت کیجو
صفاؔ جو چاہیو کیجو معاف ہے لیکن	گلہ کسی کا کسی کے حضور مت کیجو
آہ کس سے کہوں ان آنکھوں کی نادانی کو	گھر کتنیں آگ لگا دوڑتے ہیں پانی کو

حسنِ گفتار نے طوطی کو قفس میں ڈالا
بھاڑ میں ڈالئے کیا ایسی زباں دانی کو

کھینچا اک نالہ ہیں صیاد کو سوئے گلشن
مرحبا مرغ چمن تیری غزل خوانی کو

ہنسی آتی ہے صفا روئے کس کس غم کو
دل کی نادانی کو یا غم کی فراوانی کو

غنچہ و گل سے غرض کیا مرغ حسرت زاد کو
آنکھ جو کھولی تو دیکھا صورتِ صیاد کو

ایک نالہ کر دکھاؤں چرخ کج بنیاد کو
کیا کروں یاری نہیں دیتا جگر فریاد کو

خال سیہ نہیں ہے اس ابرو کے خم تلے
سید سے ہلال بنتے ہیں طاق حرم تلے

صفا۔ پیران شاہ صفا دہلوی خلف رتن شاہ مرحوم شاگرد حضرت خاقانی ہند ذوق مغفور۔ مہاراجہ شیو دان سنگھ والیِ الور کے پاس ملازم رہے، اسکے بعد جے پور میں نواب احمد علی خاں رونق خلف نواب ٹونک کے پاس ملازم رہے۔ بڑے پر گو تھے بہت حاضر طبیعت پائی تھی۔ ستر ستر، اسی اسی شعر کی غزلیں کہتے۔ دہلی میں آکر ۱۸۹۰ء سے قبل انتقال کیا۔ کلام یہ ہے:۔

خیال مہ لقا ہے اور میں ہوں
دل حسرت زدہ ہے اور میں ہوں

نہ لائی بوئے زلف اسکی یہانتک
صبا دامن تزا ہے اور میں ہوں

مؤا جس دامن صحرا میں مجنوں
وہی دشت بلا ہے اور میں ہوں

صفا واں دیکھئے پہنچوں گا کیونکر
یہ بخت نارسا ہے اور میں ہوں

میں نے بوسہ طلب کیا تو کہا
یہ خرابی ہے منہ لگانے میں

چپ رہئے خدا کے لئے اے حضرت ناصح
اس وقت خدا جانے مرا دھیان کدھر ہے

رنج و غم گھٹ جائیں گو دو چار دن کی بات ہے
یہ بھی دن کٹ جائینگے دو چار دن کی بات ہے

مرا دل ہی جس پہ شیفتہ تھی جس کی حسرت دید ہے
بت مہ لقا ہے وہ خوش ادا کہ نہ دید ہے نہ شنید ہے

صفا۔ رائے منولال ولد رائے پورنچند کایستھ سکسینہ۔ لکھنؤ وطن تھا اور وہیں اخبار نویس شاہی۔ اور مہاراجہ جھاؤ لال (نائب نواب آصف الدولہ بہادر) کے

داماد تھے بعض تذکرہ نویس انہیں منشی منڈولال زادہ اور بعض مصحفی کا شاگرد لکھتے ہیں مگر بیشتر اس بات پر متفق ہیں کہ انہیں میر تقی میر سے تلمذ تھا۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر ان کا ضرب المثل ہو گیا ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

سامنے تیرے جو ہو حور و پری کا منہ کیا	کیا چلے آگے ترے کبک دری کا منہ کیا
کیا ہنسی آتی ہے مجھکو حضرت انسان پہ	فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پہ

صفا:۔ مولوی عبدالحی مرحوم بدایونی وکیل بلاری ضلع مراد آباد۔ آپ شیخ عبداللہ مکّی کی اولاد سے تھے۔ یہ خاندان سنہ ۱۱۰۰ھ سے بدایوں میں آباد ہے۔ صفا مرحوم کو فن شعر میں حضرت مولانا دلدار علی مذاق بدایونی شاگرد حضرت ذوق مرحوم سے تلمذ تھا۔ شعر کے حسن و قبح پر کھنے میں خداداد قابلیت پائی تھی۔ اخبار نویسی کے ابتدائی دور میں اردو اخبار سید الاخبار دہلی۔ لارنس گزٹ میرٹھ کے واقعہ نگار تھے، زبان اردو کی ترقی کے بارے میں بھی زبردست مضامین لکھے کئی کتابیں آپ کی تصنیف سے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک تذکرہ "شمیم سخن" بھی ہے۔ اس کے پہلے حصّہ میں شعرائے ذکور اور دوسرے حصّے میں شاعرہ عورات کا حال درج ہے، کلام میں اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں:۔

نہ لگی آنکھ صبح تک میری	کس کے آنے کا انتظار رہا
کیا قیامت زا تری رفتار ہے	جب چلا تو حشر برپا ہو گیا
ذبح ہو کر پائی عمر جاوداں	مجھ کو قاتل بھی مسیحا ہو گیا
روئے جاناں کی چمک گر دیکھ پائے آفتاب	حشر تک پھر منہ نہ دنیا میں دکھائے آفتاب
رفتار تیری دیکھی ہے گلشن میں صبحدم	چلتی ہے اس ادا سے نسیم سحر کہاں
صورت وہ پیاری پیاری ادائیں وہ دلربا	اس شکل اور ادا کے ہیں شمس و قمر کہاں

ہم وہ بیہوش ہیں پی جائیں ابھی خم کے خم
دیکھ لیں کچھ بھی جو ساقی کا اشارا ہوتے

کیا صاف دل سے حرفِ محبت مٹا دیا
کورا ورق جو بھیجا ہے بدلے جواب کے

پہلی شبِ وصال ہے نیچی نگاہ ہے
پردے چھپے ہوئے ہیں حیا و حجاب کے

صفا

صفا:- مولوی محمد عبدالواسع صاحب تلمیذ حضرت امیر مینائی لکھنوی- سیدھے سادے شعر کہتے ہیں:-

مئے بیکے بیحجاب جو وہ ہوں تو میں کہوں
اب کیا ہوئی وہ شرم وہ انکار کیا ہوا

یہ مشکل کیجئے آسان ابرو کے اشارے سے
ہمارے قتل کو کیوں آپ خنجر مول لیتے ہیں

ترے دیوانوں کا سودا بھی کیا پُر لطف سودا ہے
جسے وہ شوق سے سر اپنا دیکر مول لیتے ہیں

دکھا کر چشمِ میگوں ساقیا ہوش و خرد لیلے
نہ ہم ہیں جام کے گاہک نہ ساغر مول لیتے ہیں

خوشی سے مرنے والے جاکے سو رہتے ہیں مرقد میں
عجب گھر ہے یہ جس کو جان دیکر مول لیتے ہیں

کبھی شہرہ تھا بازار جنوں میں قیس و وامق کا
پر اب وہ بھی یہ سودا مجھ سے آکر مول لیتے ہیں

صفا

صفا:- مولوی عبدالحق صاحب رامپوری- شاگرد حضرت جلال لکھنوی مرید شہید مرحوم کہنہ مشق پختہ مغز شاعر تھے- داغ- امیر- جلال کے مشاعرے دیکھے تھے- رامپور کی گذشتہ شاعرانہ صحبتوں میں شریک رہے، روزمرہ زیادہ لکھتے مگر کہیں کہیں نازک خیالی کی بھی مثالیں نظر آتی ہیں- عرصہ دراز تک سماعت سے محروم رہکر کچھ عرصہ ہوا اسّی برس سے زیادہ عمر پاکر انتقال کیا- نعتیہ اشعار خوب کہتے تھے- کہا جاتا ہے کہ سات بیاضوں میں کلام کو جمع کیا ہے- انتخاب ملاحظہ ہو:-

اِن بتوں سے فیض ہم اے برہمن پائینگے کیا
خود نہیں ملتے خدا سے پھر یہ ملوائینگے کیا

اپنے کشتے سے یہ کہتا ہے وہ سفاک جہاں
تیر کیوں دل میں ٹھہرتے جو پرارماں ہوتا

شاید یہی اک دیکھنے والوں میں ہے تیرے
آئینہ نے کیا دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

مچھلی جو اس کے کان کے بالے کی آئی یاد
تڑپا کیا میں ماہیِ بے آب کی طرح

سر بکف مجمع عشاق ہے حاضر در پر	یہ تماشا بھی ذرا گھر سے نکل کر دیکھو
بھیج دو کاٹ کے سر بھی اسے دل کہتا ہے	عشق میں کام یہ مشکل ہے مگر کر دیکھو
دکھاتے ہیں دل کو دوا کرنے والے	بناتے ہیں باتیں دعا کرنے والے
سناتے ہیں جو طور پر لن ترانی	وہی چشم و دل میں ہیں جا کرنیوالے
تھی انانیت حجاب جلوۂ دیدار دوست	پردہ یہ اٹھنا تو موسیٰ روئے جاناں دیکھتے
یارب نگہ شوق میں اتنا اثر آئے	وہ پردہ نشیں پردہ سے باہر اگر آئے
نہ کراے دردِ فرقت الٰہی بیدردی سے خون اسکا	کہ دلمیں وصل کی حسرت بڑے نازونکی پالی ہے
خاطرِ بلبل ناشاد نہ توڑ او گلچیں	چار دن پھولوں کو شاخوں میں لگا رہنے دے
خیر کعبہ میں صنم رہنے نہ پائے نہ سہی	میرے دل میں تو کسی بت کو خدا رہنے دے

صفا

صفا :- میرزا سعید الدین دہلوی عرف میرزا ننھے شاگرد و برادر میرزا رحیم الدین وجیہہ نوجوان شاعر ہیں۔ محاورہ بندی اور لطف زبان کے مالک ہیں۔ افسوس کہ زیادہ اشعار دستیاب نہ ہوئے:-

پوچھتے ہیں کہ کہاں رہنے ہو اور جانتے ہیں	کہ بجز دشت ٹھکانا نہیں دیوانوں کا
گھر میں بیٹھے ہیں اور اتنا نہیں کہتے منہ سے	کون ٹکراتا ہے دیوار سے سر دیکھو تو
اے صفا تو اسے غنیمت جان	جو گھڑی لٹ گئی مصیبت کی
مانا کہ وہ بے رنج ہے اور راحت جاں ہے	کچھ ہو یہ صفا جی کا لگانا ہی زیاں ہے

صفدر

صفدر :- سید فرزند حیدر خلف میر امیر حیدر فرخ آبادی تلمیذ میر علی اوسط رشک و اسمٰعیل حسین منیر۔ بڑے عاشق مزاج شوخ طبع ذہین شعر گوئی میں منہمک۔ اور سرکار نواب کلب علیخاں میں بزمرۂ شعرا منسلک تھے۔ بہت مشاق اور عالی خیال سخنور تھے زبان پیاری لکھتے تھے، روزمرہ صاف اور شستہ تھا۔ انتخاب کلام نذر ناظرین ہے:-

کہیں کیا ہجر میں صدمے جو اے صفدر گذرتے ہیں	اجل کا سامنا ہے نزع کا عالم ہے مرتے ہیں

یہ مُدعا ہے نہ ہو کوئی مدعا یا رب
یہ آرزو ہے۔ نہ ہو کوئی آرزو مجکو
مُنہ دیکھے کی اے جان محبت نہیں اچھی
رہنے دو تم اپنی یہ عنایت نہیں اچھی
وُہ دیکھ کے کہتے ہیں خرابہ مرے دل کا
اُجڑی ہوئی بستی میں سکونت نہیں اچھی
دل کیلئے جوہر ہے بڑا دل کی صفائی
آئینہ خاطر میں کدورت نہیں اچھی

صفدر :۔ عالیجناب نواب صفدر علیخاں بہادر۔ خلف الرّشید نواب محمد سعید خاں بہادر مغفور والی ریاست رامپور۔ تربیت یافتہ ظلّ عاطفہ برادر خود نواب یوسف علیخاں بہادر ناظم مبرور۔ عالم شباب میں شعر و سخن کا شوق ہوا۔ حضرت امیر مینائی سے استفادہ کیا تھوڑے سے ہی عرصہ میں مرتبۂ کمال حاصل کر لیا۔ عاشقانہ کلام نہایت پاکیزہ پُر لطف اور شیریں ہے خصوصًا معاملہ بندی کے اشعار قابل قدر اور نمکین ہیں۔ آپ نے فنِّ مصوّری نقاشی میں بھی اچھی مہارت حاصل کی تھی۔ فنِّ معمّا میں آپ کی ایک کتاب "اڈرنگ صفدر" شائع ہو چکی ہے، نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد کئی سال تک کونسل ریجنسی رامپور کے پریزیڈنٹ رہے ہیں۔ کلیات میں ہر صنف نظم موجود ہے، نعتیہ قصائد بھی خوب خوب لکھے ہیں آپ کا کوئی شعر لطف سے خالی نہیں ہوتا۔ نہایت شوخ اور چلبلی طبیعت پائی تھی کثرت مشق کا یہ عالم تھا۔ کہ معمولی مضامین کو بھی آسمان پر پہونچا دیا ہے۔ آپ کا کلام تغزّلانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

کسی سے نہ جیب تنگ سروکار تھا
بڑے چین سے یہ دل زار تھا
گرہ کھلتے ہی زلف پر پیچ کی
جو آزاد تھا وہ گرفتار تھا
ہو گیا دل بھی انہیں کی جانب
یہ بھی کمبخت ہمارا نہ ہوا
کلیجہ پکڑ کر ابھی بیٹھ جاتے
سُنا ہی نہیں تم نے نالہ کسی کا

قصد تو روز قیامت تھا بہت فریاد کا
پیار لیکن آگیا مُنہ دیکھ کر جلّاد کا
ایک میرے قتل نے دو بوجھ رکھے دو طرف
تیرے سر پر خوں میرے سر پر احسان رہ گیا

ہلال و بدر دونوں ہیں تری تصویر کی خاکے

آپ ہی بسمل کیا تیغ نگاہ ناز سے

اُمنگ پر آکے محوِ زینت کبھی جو وہ گلعذار ہوگا

نہ کھینچ تلوار کیا ہے حاجت ہمارا دل ہے شہید ابرو

پڑا چھپا کر کبھی جو پی لی تو فائدہ کیا ہے اس سے قاضی

یہی ہیں چالیں اگر تمہاری تو دیکھنا مٹ چکیں گے ہم بھی

یہ رات بھر کو ہیں ساری جلسے جہاں ہوئی صبح پھر تو صفدر

سفر میں آکر کبھی ان آنکھوں نے رُوئے اہلِ وطن نہ دیکھا

چل اے تیغ گردن پہ دم لے کے میری

عزیز احباب سب روتے ہیں صفدر میری بالیں پر

ہمیں نے کہا جو اُن سے کہ شب کو پاس رہو

حوصلے سے حوصلے تھے ولولے سے ولولے

آنکھ جب بسملوں کی اونچی ہوئی

اور اِک تیر تاک کر مارا

صفدر بتوں کی چاہ سے مانع نہیں کوئی

کبھی بوسہ مانگا دہن کا تو بولے

جی بھر کے کریں گے دل کا ماتم

نسرین میں تم ہو بیلے میں تم یاسمن میں تم

مسجد میں میکدے میں کلیسا میں دیر میں

کسی کی یاد نے بخشا ہے ایسا ذوق خاموشی

بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن

یہ صورت ہے لڑکپن کی وہ نقشہ ہے جوانی کا

آپ ہی کہتا ہے وہ یہ کیا ہوا کیونکر ہوا

پسینگے مہندی پہ دل گلوں کی چمن میں خونِ بہار ہوگا

یہ آپ ہو جائیگا تصدق یہ آپ تم پر نثار ہوگا

نہ میکدے میں جگہ ملیگی نہ میکشوں میں شمار ہوگا

جہاں پڑیگا قدم تمہارا وہیں ہمارا مزار ہوگا

نہ شیشہ ہوگا نہ جام ہوگا نہ شمع ہوگی نہ یار ہوگا

قفس میں ایسے ہوئے مقید کہ خواب میں بھی چمن نہ دیکھا

ذرا دیکھ لینے دے قاتل کی صورت

بدن سے روح جاتی ہے کہ ہوتی ہے دلھن رخصت

آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر

آج وہ سب مٹ گئے گورِ غریباں دیکھکر

سر گرے کٹ کٹ کے پائے قاتل پر

رحم آیا انہیں جو بسمل پر

دل دو۔ مگر کسی کے ذرا دل کو دیکھ کر

چلو تم نہیں منہ لگانے کے قابل

چھوٹی سی لحد بنائیں گے ہم

حقا بہ رنگ بو ہو ہر اک پیرہن میں تم

دیکھا تو تھے چراغ ہر اک انجمن میں تم

کہ بت بنکر رہے ہیں ہم خدا کے روبرو برسوں

کوئی دوست دردآشنا چاہتا ہوں

ہے صبح شب وصل بھی کس لطف کی صحبت
ہم چھیڑ پہ آمادہ وہ شرمائے ہوئے ہیں

پھر ہاتھ نہ آئے گا جو لینا ہے تو لے لو
ابتک دل بیتاب کو ٹھہرائے ہوئے ہیں

نہیں آرام اس کو ایکدم مثل دل عاشق
نگاہ ناز بھی کیا ہے تمہارے بیقرار و نمیں

چھپکا یا مئے سے اک عالم کو ساقی تو نے محفل میں
ادھر بھی ایک ساغر ہم بھی ہیں امیدوارو نمیں

جاتا ہے کوئی سوئے حرم کوئی سوئے دیر
پھرتے ہیں ڈھونڈتی تجھے انساں کہاں کہاں

اُٹھ اُٹھ کے درد دل ہی نجھی چھیڑنے سے کام
کیا جانے تو کہ بیٹھے ہیں ہم کس خیال میں

میں نے کہا کہ تم نے مری غیر کو دی تھی کس طرح
اس نے منگا کے جام زہر مجھ کو پلا دیا کہ یوں

کمسن ہیں آئینہ ابھی پیش نظر نہیں
کیا لیں مری خبر انہیں اپنی خبر نہیں

شرم آنکھ میں ہی آنکھ ہے پنہاں نقاب میں
رہتا ہے اب حجاب بھی اُن کا حجاب میں

کہلائیں مست توبہ بھی ہم رند اگر کریں
قاضی پیئیں شراب تو ان پر گماں نہ ہو

ہیں آوارہ وہ سودائی ہیں سرگرداں وہ دیوانہ
نہ کچھ دل کی خبر مجھ کو نہ کچھ میری خبر دل کو

صفدر زباں سے راز محبت عیاں نہ ہو
دل آشنائے درد ہو لب پر فغاں نہ ہو

شکوؤں کا کچھ جواب نہ جب ان سے بن پڑا
گردن میں میری ڈال دئے مسکرا کے ہاتھ

وہ تیغ ناز ہو یارب رواں آہستہ آہستہ
مزے لے لے کے تڑپے نیمجاں آہستہ آہستہ

جگہ ہی اسکی دلمیں جان من اور دلمیں حسرت ہے
نکالو میرے پہلو سے سناں آہستہ آہستہ

وہ میرے پہلو سے گھر سدھارے ادھر کی دنیا ادھر ہوئی ہے
قیامت آئی ہی یا الٰہی یہ آج کیسی سحر ہوئی ہے

گذر گئی جب شب جوانی تو کیا رہا لطف نغمہ خوانی
زباں ہے اپنی بند صفدر خموش شمع سحر ہوئی ہے

چمن میں بلبل چہک رہی ہیں شگوفہ و گل مہک رہے ہیں
سرور میں ہم بہک رہے ہیں نہ ہاتھ تم سے جدا کرینگے

بہت سی کی ہم نے سیر عالم بس اب ارادہ ہے یہ مصمم
گلی میں اُس بت کی بیٹھ کر ہم ہمیشہ یاد خدا کرینگے

دل ہمارا مست عشق نرگس مستانہ ہے
کیا غرض ساقی سے ہی کیا حاجت پیمانہ ہے

دل تو پہلو میں وقت خواب نہ تھا
پھر تڑپ کر جگا دیا کس نے

ہر چمن میں پھرے بر نگ نسیم / لالہ رویوں کی جستجو نہ گئی

جو ہم سے دلکو لیا ہے تم نے تو اسکو رہنے دو پاس اپنے / غریب اچھا ہے یا برا ہے مطیع فرماں تو آپ کا ہے

عضب کی چیز ہے یہ حسن۔ انسان لاکھ بچتا ہے / مگر دل کھینچ ہی جاتا ہے طبیعت آ ہی جاتی ہے

یہ سو سو بار اٹھتا کیوں ہے صفدر ماجرا کیا ہے / خفا ہے دلربا کی طرح شاید درد بھی دل سے

یہی راہ و روش اپنی ہی رہی وحشت کے عالم میں / بیاباں میں کبھی پہنچے کبھی گلزار میں آئے

نہیں پروا ہمارا سر جو کٹ جائے تو کٹ جائے / تھکے بازو نہ قاتل کا نہ بل تلوار میں آئے

جو بعد مدت کے آ گئے ہو نہ جاؤ جلدی ذرا تو ٹھہرو / ابھی تو نظروں سے دیکھ لینے کی آرزو بھی نہیں گئی ہے

یوں زیر قدم نہ دل کو پیسو / پس جائے نہ آرزو تمہاری

قطعہ

تب لطف زندگی ہو جب ابر ہو چمن ہو / پیش نظر ہو ساقی۔ پہلو میں گلبدن ہو

لبریز بادہ شیشے۔ دور شراب گلگوں / معشوق نوجواں ہو۔ جام مے کہن ہو

مجمع مصاحبوں کا یاران بے تکلف / جن سے کہ ربط باطن مانند روح و تن ہو

مذکور حسن لیلے۔ تصویر ناز شیریں / گہہ داستان مجنوں گہہ ذکر کوہکن ہو

بزم طرب مہیا جلسہ پری رخوں کا / آغوش میں وہ دلبر جو جان انجمن ہو

گہہ رخ ہو اسکے رخ پر گہہ لب ہوں اسکے لب پر / آب بقا نصیب کام و لب و دہن ہو

طوق کمر کسی دم یہ دست شوق اپنا / طوق گلو کسی دم وہ زلف پرشکن ہو

ہنگام وصل جاناں ایسا ہو ربط باہم / وہ روح میں بدن ہوں میں روح وہ بدن ہو

صفدر یہ عیش مجھکو ہر روز ہو میسر / کیونکر ادائے شکر الطاف ذوالمنن ہو

صفدر

صفدر:۔ منشی صفدر بیگ۔ ساکن کرنال۔ مقیم شاہجہان آباد۔ شاعر ذی استعداد تذکرۂ گلستان سخن کی ترتیب کے وقت دہلی میں رہتے تھے۔ کلام میں درد ہے۔

مضامین غم سے لگاؤ ہے :۔

پلاتے مے نہ عدو کو نہ مجھکو رشک آتا
جگر نہ سینہ میں جلتا نہ دل تپاں ہوتا

یہ دل کی آگ دکھائیگی رنگ کیا صفدر
کہ میرے سینے کے باہر نہیں دھواں ہوتا

اس طرح سمجھا مجھے ناصح کہ دل سمجھے مرا
پند کرنا اور ہے اور سر پھرانا اور ہے

صفدر :۔ سید صفدر نواب مرحوم۔ خلف سید مہدی نواب و نختر زادۂ نواب سید لطف علی خاں مرحوم سی۔ آئی۔ ای۔ محلہ گذری عظیم آباد میں رہتے تھے، حضرت شاد عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ خلیق و منکسر المزاج تھے۔ بعض پریشانیوں اور افکار سے تنگ آکر حالت اضطرار میں ایک کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے اوپر ایک طپنچہ سر کر لیا اور فوراً جان بحق تسلیم ہوئے۔ چند شعر اور مندرجہ بالا حالات گلشن حیات سے اخذ کر کے ہدیہ ناظرین کئے گئے ہیں :۔

تجھے لازم ہے میرا ساتھ دے اے بیخودی میری
کسی پہ راز کھل جائے نہ راز دل چھپانے کا

ستانے میں کوئی حسرت نہ رہ جائے مٹانے کی
مٹانے میں کوئی پہلو نہ رہ جائے ستانے کا

کچھ ایسی بیخودی اب ہے کہ آپ اپنے کو بھولا ہوں
مٹانا سا مٹانا ہے ٹھکانا ہے مٹانے کا

جزائے خیر دے اللہ تجھ کو میری تنہائی
سرا تو نے چھپا رکھا شب غم کے فسانے کا

صفدری :۔ میر صادق علی خلف میر قمر الدین سونی پتی۔ شاگرد میر نظام الدین ممنونؔ خاندانی شاعر تھے، غدر سے پہلے مقتول ہوئے۔ یہ اشعار نذر ناظرین ہیں :۔

ہاتھ مت رکھ دل پر آتش ور تسکین پر
نہ پھپھولے کہیں پڑ جائیں کف سیمیں پر

شاید نسیم مصر کا آتا ہے قافلہ
خوشبو کی اک لپٹ سی ہے بیت الحزن کے پاس

نہیں معلوم دلمیں صفدری کے درد کیسا ہے
کہ ہر دم ہاتھ سینے پر وہ بیتابانہ رکھتے ہیں

آنکھ اپنی یہ کس کے در دنداں پہ پڑی ہے
جو اشک مسلسل ہے وہ موتی کی لڑی ہے

صفی :۔ میر مومن حسین امروہہ ضلع مراد آباد تلمیذ ذکی مراد آبادی۔ زباں کا چسکا تھا، اوسط درجہ

کی لفظی صنّاعی سے کلام کو سجاتے تھے۔ کبھی مضمون آفرینی کی طرف بھی مائل ہوتے تھے
ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔ انتخاب یہ ہے:۔

جلتا ہوں میں تصوّرِ دندانِ یار میں
موتی پرو دئے ہیں رگِ جاں کے تار میں

مرتا ہے کون کون سا دیوانہ دیکھئے
کس کس کے پھول ہوتے ہیں اکی بہار میں

کروگے ستم مہرباں کیسے کیسے
سُنیں تو ذرا ہم بھی ہاں کیسے کیسے

نمک جب چھڑکتا ہے زخموں پہ قاتل
مزے لیتے ہیں نیم جاں کیسے کیسے

بچاتا ہے جو سب کو دختِ رز سے
ضرور آنکھ اس پہ قاضی کی پڑی ہے

رہیئے آنکھوں میں اگر ایسا ہی پردا ہم سے ہے
سات پردوں میں نہ کیوں چھپئے جو چھپنا ہم سے ہے

پیو رند و ادب کیا شیخ جی کا
کبھی اُن کی بھی کیفیت کبھی تھی

یہ کیا تم نے کہا صاحب کہاں میں دل کہاں تیرا
جہاں دل ہو وہیں تم ہو جہاں تم ہو وہیں دل ہے

یہ کیا ہے لال لال ان آنسوؤں میں
کہیں ٹکڑے نہ ہوں میرے جگر کے

تلخ کامی مری دنیا کو مزہ دیتی ہے
موت بھی تو مجھے جلنے کی دعا دیتی ہے

مٹھی گرم اچھی طرح دزدِ حنائی کرلی
اب کسے حسن کی سرکار سزا دیتی ہے

صفی:۔ منشی کوڑے سنگھ خلف لالہ مہر سنگھ زمیندار موضع رسولپور ضلع میرٹھ
تلمیذ ذکی دہلوی و شوکت میرٹھی۔ ذوقِ شاعری کے ساتھ ہی طبیعت تصوّف کیطرف
مائل تھی۔ اور صوفی شاہ نجم الدین سے عقیدت رکھتے تھے۔ جیسا کہ ایک مقطع سے ظاہر ہے

بفیضِ حضرتِ مرشد کہ کہئے نجم دین انکو
صفی طینت میں تیری پارسائی ہوتی جاتی ہے

دیوان ان کی وفات کے بعد چھپا۔

مندرجۂ بالا حالات اور مندرجہ ذیل اشعار تذکرۂ ہندو شعرا مصنفہ خواجہ عشرت لکھنوی
سے اخذ کرکے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

طلسم جلوۂ کن آئینہ ہے خود نمائی کا
تصوّر دل میں غیر از ذات لائیں ہم کہاں اپنا

عدم آغاز عالم ہے فنا انجام دوراں ہے
مثال خواب حائل ہے یہ قصّہ درمیاں اپنا

چمن کے رنگ تغیر کا ہے نظر سے خطاب
وہ گُل ہے کونسا جس کو غم خزاں نہوا

عبرت پذیر گردش دوراں سے ہو صفی
جائے بہار صاف نمود خزاں ہے اب

اگر چشم حق بیں سے ہم دیکھتے ہیں
تو دل ہی میں دیر و حرم دیکھتے ہیں

صفی

صفی:۔ سید علی نقی نام۔ پدر بزرگوار کا نام مولانا سید فضل حسین صاحب جو آخری تاجدار اودھ کے بھائی شاہزادہ سلیمان قدر بہادر مرحوم کے معتمد تھے۔ وطن مبارک لکھنؤ۔ زیدی سادات سے ہیں۔ مورث کے مختصر حالات خود جناب صفی کی اس نظم سے ظاہر ہونگے:۔

عیسیٰ بن زید حضرت شہزادہ حسین
ہیں دونوں زید ابن علی کے یہ نورعین

شہزادہ حسین کا ذوالدمعہ ہے لقب
منسوب انہیں سے غزنویوں کا ہے نسب

غزنی سے آئے شاہ مبارک جو سوئے ہند
خاک قدم سے اُنکے بڑھی آبروئے ہند

دہلی میں اُنکا نام و نشاں برقرار ہے
بالائے حوض شمسی ابھی تک مزار ہے

پنگوڑیوں کے مورث اعلیٰ بڑے ولی
اولاد میں انہیں کے ہیں سید جلال بھی

شاخیں جدا جدا ہیں مگر ایک ہے چمن
اجداد کا ہمارے بھی پنگوڑ تھا وطن

جاٹوں کی تیغ ظلم سے جب خوں میں نہائے
چھوڑا وطن بزرگ جو آئے اودھ میں آئے

دل سے قریب گو کہ بظاہر بعید ہیں
ہم بھی چراغ مشہد زید الشہید ہیں

حضرت صفی کی ولادت ۳ جنوری ۱۸۶۲ء مطابق یکم رجب ۱۲۷۸ھ کو لکھنؤ میں ہوئی پانچویں سال مکتب نشینی ہوئی۔ مولوی نجم الدین کاکوروی سے فارسی اور شیخ حافظ علی بلہردی اور سید علی میاں صاحب کامل کے والد ماجد مولوی احمد علی صاحب محمد آبادی سے درسیات فارسی و عربی کی تکمیل کی۔ اور اپنے عزیز حکیم سید باقر حسین مرحوم سے فن طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد امین آباد نائٹ سکول اور کیننگ کالجیئٹ سکول

طب

لکھنؤ میں انٹرنس تک انگریزی پڑھی۔ اور لال سکول اور برانچ سکول متعلقہ کیننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ پھر اودھ کے محکمہ دیوانی میں مستقل ملازمت کا سلسلہ جون ۱۸۸۳ء سے شروع ہوا۔ اور سلطان پور۔ رائے بریلی اور لکھنؤ میں مختلف عہدوں پر رہ کر عدالت خفیفہ کی پیشکاری تک پہنچکر ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت سے پنشن حاصل کی۔

آپ فطرتی شاعر اور موزوں طبع ہیں۔ لڑکپن ہی سے آپ کے کھیل میں بھی شاعری کی جھلک نظر آتی تھی چنانچہ پہلا شعر جو آپ نے سات آٹھ سال کی عمر میں کہا آپ کے قادر الکلام شاعر ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ وہ یہ ہے:۔

خواب میں صورت دکھانا کیا ضرور
سوتی قسمت یوں جگانا کیا ضرور

بارہ سال کی عمر کا ایک شعر یہ ہے:۔

زہے خوش قسمتی اپنی کہاں میں اس کے قابل تھا
وہ آ کر اپنے ہاتھوں سے کریں سامان مٹی کا

اوّل اوّل یہ کرتے کہ اپنے سکول کے طلبہ کو غزلیں دیکر مشاعروں میں بھیجتے اور تاکید سے ہدایت کرتے کہ بتانا۔ مشاعرے میں کس کس شعر پر داد ملی۔ اس سے اپنے اشعار کی حیثیت کا موازنہ کر کے دوسری دفعہ بہتر کہنے کوشش کرتے۔ اس طرح خود اپنی طبع سخن سنج کو اپنا استاد بنا کر فائدہ اٹھاتے۔ آپ نے شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔

سب سے پہلے شاہزادہ سلیمان قدر کے داروغہ اچھے صاحب کے ہاں مشاعرے میں شریک ہو کر آپ نے غزل پڑھی جس کی خوب دھوم ہوئی۔ پھر لکھنؤ کے محلہ پاٹانالہ میں اپنے عزیز حکیم باقر حسین کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے رہے۔ جہاں

جناب خضر شاگرد مسیحا مرحوم بھی شرکت کرتے اور داد سخن دیتے تھے۔ ملازمت کی وجہ سے اکثر لکھنؤ سے باہر رہنا ہوتا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں جب آپ رائے بریلی آئے تو شاہزادہ باسدیو سنگھ صاحب کے ہاں مشاعروں میں اکثر غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ اسی ایک موقعہ کا آپ کا یہ شعر بہت مشہور ہے:۔

بزم ساقی میں ذرا ہشیار بیٹھیں آج مست کل یہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل اٹھ گیا

۱۸۸۹ء میں آپ لمبی چھٹی لے کر لکھنؤ آئے اس زمانے میں محلہ نرہی کے نواب سید اصغر حسین فاخر مرحوم کے ہاں اعلے پیمانے پر مشاعرہ ہوا کرتا تھا حضرات مشتاق۔ ماہر۔ شبیر علیخاں رسا۔ جلال مرحوم۔ کامل۔ لڈن صاحب۔ خورشید زندہ تھے اور شریک مشاعرہ ہوا کرتے تھے۔ صفی صاحب نے ان صحبتوں میں خوب خوب غزلیں پڑھیں۔ مولانا صفی علاوہ خوش گوار اور نغز گفتار شاعر ہونے کے فن عروض میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ ہر صنف میں آپ کا کلام پایا جاتا ہے خصوصیت کے ساتھ قومی نظم میں آپ کے شاعرانہ تخیل۔ حسن ترتیب اور تزئین جذبات کی نظیریں اور کہیں کم پائی جاتی ہیں۔

مولانا صفی ہمیشہ سے ایک آزاد مسلک۔ نیکمزاج۔ خلیق۔ گوشہ نشین اور منصف مزاج ہیں۔ ملی تعصب اور تنگ نظری سے آپ کی طبیعت کو دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خودسری اور بلند آہنگی کے دور میں ہر خوش مذاق ہندو ہو یا مسلمان۔ شیعہ ہو یا سُنی آپ کی شخصیت کی عزت اور آپ کے کلام کی قدر کرتا ہے۔ آپکی مثنوی تنظیم الحیات پر یو۔ پی کی ہندوستانی اکاڈمی نے بہ حیثیت اعلے نمونۂ شاعری کے پانچسو روپیہ کی رقم بطور صلہ کے مرحمت کی۔ قومی نظموں کے اعتراف میں پبلک نے لسان القوم

کا لقب اور کئی بار طلائی تمغے پیش کئے۔ لکھنؤ کی مشہور انجمن بہار ادب کے آپ صدر ہیں۔ آپ کے احباب اور مداحوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مؤلف تذکرہ ہذا سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ راقم کے ساتھ بھی مشفقانہ برتاؤ ہے۔ اخلاص اور منکسر المزاجی آپ کے شعار کا جوہر ہے۔ باوجود کہنہ سالی کے آپ کی آواز میں ایک خاص کشش اور قوت ہے۔ مشاعروں میں پڑھنے کا ڈھنگ خاص ہے۔ ایک خاص لحن میں پڑھتے ہیں۔ جو ترنم اور تحت اللفظ کے بَین بَین ہے۔ آجکل غزل کیطرف کم توجہ ہے۔

صاحب شعر الہند لکھتے ہیں: "بالآخر لکھنؤ بھی اسی رنگ سے متاثر ہوا اور وہاں کے شعرا میں چند لوگوں نے اس رنگ میں سخن گستری شروع کی چنانچہ عزیز لکھنوی جو اس گروہ کے پیشرو ہیں کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس طرز پر عزیز کچھ لوگ اور شہر میں ہیں اِک ہمیں نہیں

لیکن ان لوگوں میں عام طور پر عزیز لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اور ان کا کلام اوّل سے آخر تک دلّی کے رنگ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔"

"فٹ نوٹ:۔ غالباً ثاقب۔ صفی اور محشر کی طرف اشارہ ہے"[ع۱]۔ ادبی تحقیق میں مولانا عبدالسلام مؤلف شعر الہند کو بہت سے دھوکے ہوئے ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ غالباً رسالہ معیار سے ان کو یہ دھوکا ہوا۔ راقم کی تحقیق میں طرز مذکورہ صدر اور نئے طرز میں لکھنؤ کا جہاں تک تعلق ہے حضرت صفی کے سر اجتہاد کا سہرا ہے۔ پہل ان کی طبع وقاد سے ہوئی۔ عزیز مرحوم پہلے انہی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ پھر الگ ہوگئے اور یہ صفی صاحب کی صلح پسندی اور ادبی رواداری ہے۔ کہ ان کی زبان اور قلم سے کبھی ایک لفظ نہیں نکلا جو اس برگشتگی کی طرف اشارہ کرتا۔ مختصر یہ کہ دہلی کے رنگ یا نئے طرز سخن کا

ع۱؎ شعر الہند جلد ۱۔ صفحہ ۳۸۴۔

تعارف لکھنؤ سے انہیں کی ذات مبارک سے ہُوا۔ عزیز نظم بہت کم کہتے تھے۔ استاد متروک کے طرز میں ان کی غزلیں بلاشک ہیں۔ اور خوب ہیں۔ اگر صفی صاحب ابتدا نہ کرتے جو سرور جہاں آبادی نادر کاکوروی اور چکبست لکھنوی کی رنگ آمیزیوں کے لئے اُردو شاعری کو جانے کب تک انتظار کرنا پڑتا۔

آپ کا یہ احسان کہ آپ نے نئی شاعری کو جو ایک طبقہ شعراء کے ہاتھوں ملیّات کے طوفان میں ڈوبی جا رہی تھی۔ بچا لیا اور اسے ایک نیا یعنی قومی رنگ بخشا۔ جو ہر طرح سے مستحسن ہے۔ آپ مذاقِ حال کے موافق شاعرانہ تخیل اور جذبات کو طرزِ جدید میں نظم کرنے میں ممتاز ملکہ رکھتے ہیں۔

صفی صاحب کی قومی نظموں میں لختِ جگر جیسی معرکتہ الآرا قومی نظم سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے مثل اور شعرا کے محض قوم کا مرثیہ اور عروج و زوال اور پند و نصائح یا اسی قسم کی باتوں سے نظم کو مرتب نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس میں بھی ایک نئی بات کی ہے کہ مقامی جغرافیہ اور تاریخ کو بقدرِ ضرورت اس طرح شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر نقشہ کھینچنا خیال کی وسعت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ واقعات کو شاعرانہ انداز کا جامہ پہنا کر دل پسند بنانے کی صنعت گری کا جوہر آپ کی قومی نظموں کے خصوصیات سے ہے۔ آپ کی نظموں میں جدید الفاظ اور ترکیبیں بھی ملتی ہیں۔ محاورات اور ضرب المثل کا استعمال تشبیہ و استعارہ کی ندرت اور مسائل علمیہ زمانۂ حاضر کے تاریخی واقعات اور رسم و رواج کا بجا بجا موزوں اور برمحل تصرف کلام کی زینت اور لطف شاعری کو دوبالا کرتا ہے۔ یوں تو مولانا صفی کے بیشمار معتقد اور شاگرد ہیں لیکن چند تلامذہ ایسے گذرے ہیں۔ جن کا پایہ اُردو شاعری میں مسلّم ہے۔ چنانچہ مرزا مولوی محمد ہادی عزیز مرحوم جو اُردو فارسی میں آپ سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ سید صغیر حسین صغیر لکھنوی مرحوم۔ بالو جوالا پرشاد بی۔ اے برق مرحوم جج خفیف لکھنؤ۔ مرزا علی محمد ارحم مرحوم۔ سید جعفر حسین

بہار مرحوم۔ ذکی جالیسی مرحوم (زیادہ تر فارسی ہیں) وغیرہ اور حضرات امیر۔ لطیف وحشی۔ کاشفی۔ نواب نادر صاحب۔ منجھلے حضور رئیس مرشد آباد آپ کے چشمۂ علم سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ یہ ذکر مرحوم تلامذہ کا تھا۔ موجودہ تلامذہ میں مولانا کے چھوٹے بھائی سید مقبول حسین ظریف۔ وصی خلف مولانا صفی۔ مائل۔ رسا۔ قتیل۔ اسد۔ اعظم صدق جالیسی۔ تاج۔ رضی۔ فائز۔ نادر۔ تحسین۔ ندیم۔ حیدر۔ بسمل۔ ناصر۔ طپش۔ وفا۔ سخی۔ سرشار۔ واقف۔ بیخود۔ سوز۔ نشاط۔ نکہت شیروانیہ۔ وغیرہم کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

قریبًا تمام اصناف سخن میں آپ کا کلام موجود ہے۔ فارسی کلام کا مجموعہ بھی خاصا ضخیم ہے۔ آپ کی نظمیں بیس کے قریب متفرق طور پر چھپ چکی ہیں۔ مثنوی تنظیم حیات جس کا ذکر آگے آچکا ہے۔ اور جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ ان کے علاوہ ہے۔ مکمل دیوان کی ترتیب ہو رہی ہے۔

آپ ان بزرگانِ اردو میں سے ہیں جنکی تعداد روز بہ روز گھٹ رہی ہے آپ کا دم نہ صرف لکھنؤ کے حلقۂ علم و ادب بلکہ عالمِ اردو میں مغتنمات سے ہے۔ آپ کا کلام اگرچہ کُل ہی انتخاب ہے۔ اس کا نمونہ قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے :-

غزلیات

دورِ اوّل سنہ ۱۸۸۰ء تک

سرِ طور آج بھی برق جمالِ یار ہو پیدا
اگر اُس منزلت کا طالبِ دیدار ہو پیدا

صفی زنداں میں ٹکرانے ہوئے سر مدتیں گذریں
الٰہی اب تو کوئی رخنۂ دیوار ہو پیدا

وہ چاہے سازِ مطرب یا دلِ ناسازِ عاشق ہو
جسے پایا تری محفل میں سرگرم فغاں پایا

دورِ دوم ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۰ء تک

آہیں نہ کرے سوختہ جاں ہو نہیں سکتا
اسپند نہ دے جل کے دھواں ہو نہیں سکتا

ہے چشمِ تصوّر میں ترے حُسن کی تصویر
تو میری نگاہوں سے نہاں ہو نہیں سکتا

توبہ شکنی کا مجھے الزام گوارا
خاطر شکنِ پیرِ مغاں ہو نہیں سکتا

پیری کی روش اور جوانی کی ادا اور
خم تیر یہ اندازِ کماں ہو نہیں سکتا

سیماب کشتہ میں نہیں رہتی تپش صفی
جب سوزِ غم سے خاک ہوا دل ٹھہر گیا

یہ کسی کو کیا غرض تھی کہ وہ غمگسار ہوتا
ہمیں دل پہ جبر کرتے اگر اختیار ہوتا

تپِ غم کی گرمیوں سے رگِ سنگ برق بنتی
میرے خونِ دل کا قطرہ جو کہیں شرار ہوتا

کہیں روزِ حشر آتا کہ یہ سیر دیکھ لیتے
کوئی داد خواہ ہوتا کوئی شرمسار ہوتا

مری نعش کے سرہانے وہ صفی یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

دورِ سوم ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک

ذرا اے بیخودی رسوا نہ کرنا بزمِ ساقی میں
کہ تھرّاتے ہوئے ہاتھوں سے ساغر اٹھ نہیں سکتا

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

دل تہ و بالا جو تھا سودائیانِ زلف کا
گہ زمیں دیکھا کئے گہ آسماں دیکھا کئے

ہم تھے اک آئینۂ عبرت کسی کی بزم میں
مہرباں دیکھا کئے نامہرباں دیکھا کئے

پھوڑے ہیں پھپھولے دلِ شیدا کے کسی نے
توڑے ہیں ثمر نخلِ تمنّا کے کسی نے

ثابت نہ ہوئی جب کوئی تقصیر تو آخر
بے جرم سزا دی مجھے جھنجلا کے کسی نے

تعظیم کو بھی اُٹھ نہ سکا وائے ندامت
شرمندہ کیا وقتِ اخیر آ کے کسی نے

آئے سبھی قاصد بھی نسیمِ سحری بھی
پیغام کسی کا نہ دیا لا کے کسی نے

بس داد مجھے مل گئی اے داورِ محشر
منہ پھیر لیا حشر میں شرما کے کسی نے

تا دفن احبا نے دیا ساتھ ہمارا — پھر بات بھی پوچھی نہ صفی آکے کسی نے

دور چہارم ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک

غیر کی بزم میں درکار ہیں ساغر کے لئے — گردشیں کم نہ پڑیں میرے مقدر کیلئے

رہنے دے اے دل سوزاں کہ لگا رکھی ہیں — خون کی چند یہ بوندیں مژہ تر کے لئے

زندگانی میں جہاں اور بلائیں ہیں صفی — اک بلا فکر سخن بھی ہے مرے سر کیلئے

سحر کو جب چمن سے نکہت برباد آتی ہے — مناتے ہیں اسیران قفس خیر آشیانے کی

نظر آیا چمن میں جب کوئی کھلتا ہوا غنچہ — ادا یاد آگئی ہم کو کسی کے مسکرانے کی

چراغ نام روشن کر کے رہتے تو کہاں رہتے — صفی ہم سے ہوا ہی ناموافق تھی زمانے کی

بن پڑی چرخ فتنہ جو تیری — چال چلتے ہیں خوب رو تیری

سنتے ہیں طور جل کے خاک ہوا — حد کی تھی گرم گفتگو تیری

کلک قدرت نے نقش دل کھینچا — رکھ کے تصویر روبرو تیری

سچے موتی سے کم نہیں ہے صفی — یہ خدا داد آبرو تیری

دور پنجم ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک

یہ حالت ہے زباں کی شدت بیتابی دل سے — سمجھتے ہیں مرے احباب میری بات مشکل سے

نگاہیں جذب کر لیتی ہیں انداز محبت کو — یہ بجلی دل پہ گرتی ہے جہاں نکلی کسی دل سے

پلٹ کر عمر رفتہ کو صفی آواز دیتا ہوں — نکل آیا ہوں اپنی رو میں اتنی دور منزل سے

ملتفت بھی ہیں تو عرض مدعا کیونکر کریں — سوچتے ہیں دل میں آخر ابتدا کیونکر کریں

دست و بازو مضمحل ہیں خشک ہے کام و زباں — ہاتھ اٹھا کر کوئی بتلا دو دعا کیونکر کریں

دشمنی اصلاح سے نفرت تجھے تدبیر سے — اے دل بیمار پھر تیری دوا کیونکر کریں

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

مرے سر پہ ہے دامن گل کا سایہ — کسی کو نہ چھپا اسکی ہمراز دینا

دبیل گرانباری سنگِ غم ہے　　صفیؔ ٹوٹ کر دل کا آواز دینا

دورِ ششم ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک

رہا نغموں سے خالی صحن کس دن اس گلستاں کا　　قیامت ڈھا گیا ہر غول مرغانِ خوش الحاں کا

کہیں بہتے ہوئے دریا کا رُخ پیچھے پلٹتا ہے　　دلِ شوریدہ کیوں مشتاق ہے عمرِ گریزاں کا

ہنسی آتی ہے حسن و عشق دونوں کی شکایت پہ　　گلہ یوسف کو دامن کا زلیخا کو گریباں کا

یہ پامالی ہے گویا سرفرازی کا مجھے خلعت　　صفیؔ وہ سبزۂ خوابیدہ ہوں گورِ غریباں کا

دل سے دل تک نزع میں کچھ نامہ و پیغام تھا　　آمد و رفتِ نفس کا ورنہ پھر کیا کام تھا

کعبے کا سوز ریائی دیر کا سازِ خلوص　　سُن کے سمجھے کفر کیا تھا اور کیا اسلام تھا

دیکھ لوں دُور سے تصویرِ شبابِ رفتہ　　رُخ اِدھر بھی کبھی اے عمرِ گریزاں کرنا

زندگی نام اسی کا ہے اگر غور کریں　　مشکلیں پیش جو آئیں انہیں آساں کرنا

گھر میں بیٹھے ہوئے لکھ بھیجنے ہو اک نسخہ　　خوب آتا ہے علاجِ تپِ ہجراں کا

دمِ تعمیر صد افسوس نہ سمجھے یہ صفیؔ　　گھر کا آباد ہی کرنا تو ہے ویراں کا

دورِ ہفتم من ابتدائے ۱۹۳۱ء

تو پاؤں جب سے زاہد رکھتا نہیں زمیں پر　　تیرا نشانِ سجدہ اک داغ ہے جبیں پر

روزِ ازل سے اب تک دلکش حسین مرقع　　زیرِ زمیں ہیں جتنے اُتنے نہیں زمیں پر

بنائے ہستی ہے نیستی پر مگر نہیں کچھ خبر نہیں ہے　　یہ گلشن رنگ و بو ہے کیا شئے اگر فریبِ نظر نہیں ہے

ہے کہنہ مہمان سرا ہستی مسافرانِ عدم کی بستی　　ہزار چاہیں کہ جم کے بیٹھیں اجازت اسکی مگر نہیں ہے

خموش رہنے دو غمزدوں کو کرید کر حالِ دل نہ پوچھو　　تمہاری ہی سب عنایتیں ہیں مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے

انہیں کی چوکھٹ سہی یہ مانا روا نہیں ہے بلائے جانا
فقیرِ عزلت گزیں صفیؔ ہے گدائے دریوزہ گر نہیں ہے

وجہِ جمعیتِ خاطر سر و ساماں نہ ہوا　　دل ہُوا اور پریشاں جو پریشاں نہ ہوا

زیب تن جامۂ صد چاک تو ہو وحشی کے
ہرج ہی کیا نہ ہوا ایک گریباں نہ ہوا

فصل گل پھول چڑھانے سر تربت آئی
وہ چمن ہوں جو اجڑنے پہ بھی ویران نہ ہوا

ہو ستم سے کوئی نادم تو شکایت بھی سہی
اور بالفرض وہ ظالم جو پشیماں نہ ہوا

سرد مہری کا زمانے کی وہ کشتہ ہوں صفی
ٹوٹ کر سنگ لحد بھی شرر افشاں نہ ہوا

انتخاب از قصائد

نغمۂ توحید

جستجو میں تری اے قید تعین سے بری
مہر تاباں ہے گرفتار پریشاں نظری

اس فضا میں کہ جو ہے سرحد امکان و وجوب
ہم سے پوچھے کوئی ذرات کی آشفتہ سری

کس کی یہ بزم دل افروز ہے یارب کہ جہاں
ماہ و انجم متحیر ہیں بہ این دیدہ وری

دونوں یہ حلقۂ بیرون در خلوت ہیں۔
دور شمسی ہو زمانے میں کہ دور قمری

خاک سے پاک کیا نسل بنی آدم کو
ابن مریم کو دیا معجزۂ بے پدری

ایک جلوے سے ہوئے موسیٰ عمران بیہوش
جب سر طور کسی شوخ نے کی عشوہ گری

موجزن ہو کے کسی زہر محبت کا اثر
سنگریزوں کو بناتا ہے عقیق شجری

محمل روح رواں ہے دل نازک بخدا
کس نے حکمت سے اتاری ہے یہ شیشے میں پری

پردۂ خاک سے گل چاک گریباں نکلا
حسن کو کس نے سکھائی روش جامہ دری

خواب راحت میں جو ہے سبزۂ گلشن اس کا
صبح چلتی ہے دبے پاؤں نسیم سحری

مست آئینہ بکف دیکھ کے اس محفل میں
ماہ کامل پہ ہوا قہقہہ زن کبک دری

کر دیا کس کی کشش نے شب اسرے ثابت
قاب قوسین ہے سر حد عروج بشری

معتدل ہے وہ کسی گلشن وحدت کی بہار
جس میں گرمی ہے نہ سردی ہے نہ خشکی نہ تری

ہے فضا پائے دو عالم کا نتیجہ توحید
دیدۂ دل میں مگر چاہیئے بالغ نظری

چھوڑ دو حال پہ اپنے اُسے اے مستفتو!
رند ہے رند صفی مست مئے بیخبری

منقبت میں اکثر مبسوط قصیدے ہیں انہیں سے ایک قصیدے کی تشبیب نمونے کے طور پر یہاں درج ہے

مطلع

پیچ در پیچ ہے شیرازۂ اسباب و علل
رازِ ہستی ہے عجب عقدۂ لاینحل

روح بے جسم کے ناقابلِ ادراکِ عقول
جسم بے روح کے ہم معنی لفظِ مہمل

لاکھ سمجھائیں تناسخ کے عقائد والے
کچھ سمجھ میں مگر آتی نہیں یہ پھیر بدل

ہے تغیر کا اثر مادّہ و صورت تک
کیونکہ اک حال ہے اور ایک ہے انہیں سے محل

روح کیا چیز ہے اس سے نہیں واقف کوئی
نفس کے علم سے بے بہری طرزِ عمل

دیکھئے ساحت افلاک سے تا مرکزِ خاک
تہ بہ تہ پردۂ اسرار ہیں مانند بصل

متحرک نظر آتا ہے اگر غور کریں
ذرّہ ذرّہ زسمک تا بہ سماک اعزل

مختلف وضع کے ہیں نامتناہی پُرزے
جن سے چلتی ہے یہ کُل عالمِ ایجاد کی کل

رشتۂ عقل میں ڈالی ہے تحیّر نے گرہ
دہنِ یار کا ہر نکتہ ہے ماقل و دل

کُن میں گنجائشِ کونین خدا کی قدرت
یہ معمّا نہ ہُوا ہے نہ کبھی ہوگا حل

جس طرح آئے تھے دنیا سے یونہیں جائینگے
حالِ ماضی ہے ہمیں آئینۂ مستقبل

یہ فضا کامِ نہنگ و دہنِ اژدر ہے
فلکِ اعلےٰ ہے فلک ارض ہی فلکِ اسفل

پستے ہیں سختیٔ دوران سے دلِ اہلِ جہاں
خشک و تر لقمۂ تر تیز ہیں دندانِ اجل

نشہ اُترا تو بڑھی نزع کی اعضا شکنی
جو سمجھتے تھے کہ میخانہ ہے یہ رنگ محل

رباعیات

تا حدِّ نظر جلوہ گہِ یار ہے سب
اک پرتوِ آئینۂ رخسار ہے سب

جو کچھ ہے سوا اُس کے دکھائی دیتا
صورت گری وہم غلط کار ہے سب

بے زر کے مذاقِ کامرانی ہے تلخ
پیری ہے تلخ نوجوانی ہے تلخ

سنتے ہیں کہ زندگی ہے قائم بہ امید
یہ بھی جو نہ ہو تو زندگانی ہے تلخ

طفلی بھی ہوئی آہ جوانی بھی تمام
پیری کا بھی ہونا ہے یہی کچھ انجام
مائل سو خاک ہے جو قدِ پُر خم
اب ڈھونڈھ رہا ہے اپنی راحت کا مقام

بہتر کوئی شے اس سے زمانے میں نہیں
مثل اس کا خدا کے کارخانے میں نہیں
کیونکر نہ ہو بے نیاز کو عجز پسند
یہ جنسِ نفیس اُس کے خزانے میں نہیں

تقریرِ شباب و عمرِ فانی کیا تھی
یہ بھی نہیں یاد وہ کہانی کیا تھی
غفلت سے کھلی آنکھ تو معلوم ہوا
اک نیند کا جھونکا تھا جوانی کیا تھی

لو سوئے چراغ صبحگاہی نہ لگا
دل جز طرفِ یادِ الٰہی نہ لگا
پیری کو ندے خضاب سے رنگ شباب
اے شیخ سفیدی میں سیاہی نہ لگا

تحصیل علم کی ضرورت پر بحث اسطرح کی ہے

غور سے سنئے اب یہ میری عرض
علم کا سیکھنا ہے سب پر فرض
سن طفلی سے عہد پیری تک
اس کی تحصیل چاہئیے بے شک
پہ نہ اسواسطے کہ پڑھ کے فضول
نوکری چاکری میں ہوں مشغول
یا وکالت کا امتحاں دے کر
کریں لوگوں سے اخذ دولت و زر
یا بہ طمع حصولِ نذر و نیاز
مولوی بن کے ہم پڑھائیں نماز
یا فنِ شاعری میں نام کریں
صلہ لینے کو مدحِ عام کریں
جو نہ دے کچھ عوض قصیدے کا
ہجو کہکر اُسے کریں رسوا
بلکہ تحصیل علم کا مقصد
یہ سمجھتے ہیں جملہ اہل خرد
کہ بڑھے نور معرفت دل میں
کر سکیں فرق حق و باطل میں
جو ہیں جاہل انہیں بھی علم سکھائیں
بے غرض سب کو راہ راست دکھائیں
فکر آزادگی رہے ہر دم
دل میں آمادگی رہے ہر دم

عاقبت جو بنا ہے یہ ہے وہ شئے
ہے بلاشک وہ قابلِ تسلیم
کھیت میں ایک مرد دہقانی
غرض اُسکی یہ ہے کہ غلّہ ہو
اُسی سودے کا سب یہ گھاتا ہے
اَب رہی فکر اِک معیشت کی
مثلاً پیشۂ تجارت سے

دنیوی منفعت بھی ضمناً ہے
کہہ گیا جو بزرجمہر حکیم
جبکہ کرتا ہے تخم افشانی
نیر بھوسا بھی جو ملے اُس کو
اصل کے ساتھ سود پاتا ہے
پس وُہ ہے سو طرح سے ہوسکتی
دستکاری سے یا زراعت سے

انتخاب از قند آب

یہ مثنوی ۱۸۹۳ء میں نظم ہوئی تھی۔ اس میں شراب اور چائے کا مناظرہ ہے۔

کہاں ہے تو اے ساقیٔ شوخ و شنگ
ذرا چاہیے پشتِ گرمی تجھے
دل افسردگی سے بہت خستہ ہے
مناسب ہے اب تجکو فکرِ علاج
دوا دے کہ بیمار ہوں تندرست
مبارک رہے تجکو مے ساقیا
وہ جو ہمرنگِ یاقوت ہے
وہ شربت پلا مجکو اے رشکِ حور
دکھا جلوۂ لعبتِ چین مجھے
نگارِ پری وش ہے جو شعلہ خو

کہ سردی نے اپنا جمایا ہے رنگ
کہ جاڑے سے پالا پڑا ہے مجھے
لہو ہر رگ و پے میں یخ بستہ ہے
پلا جرعۂ آبِ آتش مزاج
طبیعت ہو پی کر جسے چاق و چست
مجھے چاہیے اور شئے ساقیا
لطافت میں ہمسنگ یاقوت ہے
جو ہے پاک مثلِ شرابِ طہور
سونگھا نکہتِ زلفِ مشکیں مجھے
اُسے دے کے دم لا مرے پاس تو

ارے کم پلا یا زیادہ پلا
مجھے اس گھڑی چائے سادہ پلا

سنی اور شیعہ میں باہمی اتحاد لکھنؤ ۱۹۱۰ئہ

سنی اور شیعہ میں باہم اتحاد قائم کرنے کے لئے لکھنؤ میں ۲۰ مارچ ۱۹۱۰ئہ کو دونوں فرقوں کے باثر اور معزز رہبران قوم نے ایک انجمن اتحاد قائم کی تھی جس کی طرف سے محفل میلاد کی پہلی صحبت بمقام امام باڑہ نواب آصف الدولہ مرحوم ۱۷ اپریل کو اور دوسری صحبت میں بتاریخ ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ئہ مجلس منعقد ہوئی۔ دونوں صحبتوں میں ذیل کی نظمیں پڑھی گئیں۔ جس کا انتخاب یہاں درج ہے۔

وہ موّاج قلزم وہ دریائے اعظم
زباں زد ہیں جسکے فتوحات پیہم
کہ دونوں کنارے ہیں جس کے دو عالم
ہے اسلام ہی بس کریں غور اگر ہم

تشیّع تسنّن ہیں لہریں اُسی کی
سمجھئے انہیں آپ نہریں اُسی کی

انہیں دونوں چشموں سے نکلے ہیں اکثر
ہے ان دونوں صبغوں کا اسلام مصدر
وہ شعبے جو ہیں سب ملا کر بہتّر
ہیں در اصل یہ دونوں شاخیں برابر

کوئی تیغ ان میں ہے کوئی قلم ہے
نشان ہے کوئی اور کوئی علم ہے

خدا ایک ہے جانتے ہیں یہ دونوں
جو کچھ کعبہ ہے مانتے ہیں یہ دونوں
رسول اپنا پہچانتے ہیں یہ دونوں
اُسے قبلہ گرد انتے ہیں یہ دونوں

عمل دونوں کا ہے کلام خدا پر
فدا دونوں ہیں عزت مصطفےٰ پر

اصولوں میں جب متحد ہیں یقینی
رہیں مل کے باہم سب اخوانِ دینی
عبث پھر فروعات پر نکتہ چینی
مضےٰ ما مضےٰ چاہیئے پیش بینی

چلیں گے یہ فرسودہ راہیں کہاں تک
پس پشت آخر نگاہیں کہاں تک

انتخاب از مرقع صبر

دل کے اندر جب اُٹھے جوشِ ہوا کا طوفان
قوت صبر ہی ہے بس اے فلسفہ دان
اور ثابت قدم اُسمیں رہے نفسِ انسان
صبر دنیا میں ہے اک سلسلۂ کوہ گران

دل وہی دل ہے کہ ہو صبر کی قوت جسمیں
صبر ہی نفس کا لنگر ہے نہیں شک اسمیں

قوتیں جتنی ہیں اُن سب میں یہ قوت ہے قوی
روک دیتا ہے یہی نفس کی مستانہ روی
اسکے پنجے میں قوائے غضبی وشہوی
خون کو باز نہ رکھے جو دمِ تیز روی

اضطراری حرکات ایسے ہوں پیدا دل سے
کہ سنبھالیں بھی تو سنبھلے وہ ذرا مشکل سے

صبر ہی کی تو یہ تعلیم ہے جاں بازوں کو
مل سکے تاکہ نہ موقع کوئی غمازوں کو
خو گر ضبط کریں درد کی آوازوں کو
لب شیون نہ کرے فاش دلی رازوں کو

تشنۂ لذتِ آبِ دمِ شمشیر رہے
جان بے حسن تو یہ عشق کی تقریر رہے

انتخاب از آغوش مادر

دل وہ پتھر ہے جسے ماں کی محبت نہ ہوئی
جب تک اس پردے میں تحریکِ مشیت نہ ہوئی
خاک دنیا پہ جو دنیا میں یہ نعمت نہ ہوئی
پیکر خاکی انساں تری خلقت نہ ہوئی

کس نے اے خاک کے پتلے یہ سب احسان کئے
دکھ سہے تیرے لئے درد سہے تیرے لئے

جب خبر لی کہ تجھے اپنی خبر بھی تو نہ تھی
قائم اک مرکز بینش پہ نظر بھی تو نہ تھی

دوش کو تاب گرانباری سر بھی تو نہ تھی
مثل گردن ترے قابو میں کمر بھی تو نہ تھی

پاؤں کہنے میں کوئی تھا نہ ترا ہاتھ اُسوقت
یہ تو بتلا کہ دیا کس نے ترا ساتھ اُسوقت

دو برس خون چھپا کر تجھے پالا کس نے
مہد سے گرنے لگا جب تو سنبھالا کس نے
مدتوں پیار سے ہاتھوں پہ اُچھالا کس نے
پرورش کی تری جھیلا یہ کسالا کس نے

جب کہ چھوتے بھی نہ تھے اپنے پرائے تجکو
کون پھرتا تھا کلیجے سے لگائے تجکو

تیری اُنگلی جو دُکھی ہو گئی بیتاب وہ ماں
شیر لب پر ترے تلخ اُسکو شکر خواب وہ ماں
مامتا آگ تو دل جوہر سیماب وہ ماں
ہمہ تن تیرے لئے عالم اسباب وہ ماں

دیکھ کر گود میں صورت تری پیاری پیاری
دودھ کی جنت آغوش میں نہریں جاری

علم ہو عقل ہو یا حسن ہو دولت ہو کہ سن
سر پہ ماں باپ کا سایہ ہے وہ نعمت لیکن
رشک ان باتوں میں اولاد پہ ہو کیا ممکن
اپنی اولاد پہ رشک آتا ہے خود ہو کے مُسن

کہ وہ دو مہر و محبت کے فرشتے نہ رہے
حرز و بازو تجھے جو اب تک وہ نوشتے نہ رہے

انتخاب از چراغ دیر

یہ گھٹائیں اُٹھی ہیں شیام برن
آنسوؤں کا محال ہے تھمنا
پتلیاں رہ گئی ہیں پتھرا کے
عشق میں تج دیا ہے سب تن من
اُف یہ برسات کی اندھیری رات

اب اُٹھوں ساقیا ترے درشن
یہاں گنگا یہاں پہ ہے جمنا
جیسے ٹھاکر دوارے تھے اُسکے
دل ویران بنا ہے بندرابن
قبر کی نیند کی ہے جس سے مات

ہیں ستارے کنول کے پھول تمام
زلف ساقی کے رخ پہ لہرائی
ہیں شب قدر کے رسوم کہیں
لب دریا کہیں پہ ہے سانجھی
مندروں میں چھڑے ہوئے ہیں ساز
ہیں سبھی اپنے رنگ میں مست
توڑ کر قید سبحہ و زنّارہ
وہ چمن ہے جو ایک مطلع نور
گارڈن پارٹی ہے آج وہاں
رند توبہ شکن ڈٹے ہیں کہیں

پاٹ جمنا کا چرخ نیلی فام
آئی بھادوں کی اشٹمی آئی
اور جنم اشٹمی کی دھوم کہیں
کشتیاں سج کے لائے ہیں مانجھی
مسجدوں میں نماز پڑھے نماز
آو اے سرخوشان بادہ پرست
ہم بھی لیں راہ گلشن بے خار
منزل چندر چور چندا پور
جمع عیش و نشاط کے سامان
روزہ داروں کے جمگھٹے ہیں کہیں

انتخاب از بسنت مالنی

ساقی تجھے بسنت کی بھی کچھ خبر نہیں
پیکش ہیں آفتاب لب بام ساقیا
دے جام زرنگار کو گردش ترے نثار
تیرے مریض غم یرقان میں ہیں مبتلا
معجون کہربا مے گلنار چاہیے
جام عقیق زرد کو لبریز کرکے دے
بیجا یہ امتیاز ہے اپنے میں غیر میں
تو دیدہ بھی طبیب بھی پھر کیا ہے ساقیا

محنت کشوں کی زردی رخ پر نظر نہیں
للہ اس طرف بھی کوئی جام ساقیا
سرسوں جما رہی ہے ہتھیلی پہ جان زار
پکھراج کے کھرل میں ذرا حل تو کر طلا
ہاں بدرقے میں شربت دینار چاہیے
کیا دے رہا ہے دیکھ ذرا اور بھر کے دے
خست تجھے پسند نہیں کار خیر میں
بدلی جو رت مزاج اب اچھا ہے ساقیا

نسخہ یہ دو ہی جز کا مگر ہے بڑا مفید
ملکر اسی بسنت میں ہم تم منائیں عید

سہرا

حُسن اِمستانہ اداؤں کا ترے سر سہرا — زلف دلکش ہے مگر زلف سے بڑھ کر سہرا

بھینی بھینی وہ مہک وہ اثر عطرِ عروس — اُس پہ طرّہ رخِ نوشہ پہ معطّر سہرا

دیکھنا سیر کو دامن پہ بچھا جاتا ہے — نگہ ناز کو ہے پھولوں کا بستر سہرا

رکھ لیا ہنس کے جو نوشاہ نے منہ پر رومال — کہہ گیا کان میں کیا چہرے سے ہٹکر سہرا

چشم بد دُور جوانی ہے بڑے نسوں پہ — اور سنبھالے ہوئے اس نور کا لشکر سہرا

رخ سے اُٹھتا نہیں گو آرسی مصحف کا ہی وقت — اللہ اللہ یہ مغرور یہ خود سر سہرا

مہرِ انور کی شعاعوں سے الجھ پڑتا ہے — زور پر جلوۂ رخسار کے پُر زر سہرا

باندھے شوق سے اے خان بہادر ہادی — آج فرزند جواں سال کے سر پر سہرا

تازہ گلہائے مضامیں سے جو گوندھا ہی صفی — رنگ اخلاص میں ڈوبا ہے سراسر سہرا

سنہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس امروہہ میں یہ نظم پڑھی گئی

ساقیا دامِ محبّت کے اسیر آپہونچے — تیرے ہاتھوں کی لکیروں کے فقیر آپہونچے

لیکے امروہے ہیں اِک جمّ غفیر آپہونچے — دیکھ مستانِ مئے خمِّ غدیر آپہونچے

ڈورے ڈالے نگہ مست نے میخواروں پر
بیلیں چڑھنے لگیں میخانے کی دیواروں پر

نشۂ دوڑا جو رگ و پے میں ہمارے ساقی — نظر آنے لگے وہ عرش کے تارے ساقی

یہ ادائیں یہ محبّت کے اشارے ساقی — میرے پیارے مرے اللہ کے پیارے ساقی

دور دورِ نگہ میکدہ آشام رہے
جبتک آوازۂ کوثر ہے ترا نام رہے

عید ہے عید ادھر آنا ادھر آنا ساقی — ہم فقیروں سے بھی اب ہاتھ ملانا ساقی

تشنہ کاموں کو ذرا خوب چھکانا ساقی — بلکہ کوثر ہی کو پیمانہ بنانا ساقی

ہے اُسی میکدے میں اپنا گذارہ ساقی
کہ جہاں پیرِ مغاں ایک ہو بارہ ساقی

تین دن تک ترے مہماں رہینگے میخوار
وہ جنوں خیز ترے ساغرِ گلگوں کی بہار
میزباں دیکھ رہے ہے تیری نگاہِ سرشار
ارے تو بہ وہ مرا توبہ شکن جوشِ خمار

زلف اُدھر عارضِ گلرنگ پہ لہرانے لگی
ادھر انگڑائی پہ انگڑائی مجھے آنے لگی

قبلہ رُخ دیکھ وہ گھنگھور گھٹا اٹھی ہے
مَے کے قلزم سے شرابور گھٹا اٹھی ہے
باندھ کر آج بڑا زور گھٹا اٹھی ہے
باغ میں ناچتے ہیں مور گھٹا اٹھی ہے

کالی کالی یہ سیہ مست گھٹا متوالی
اودی اودی یہ زبردست گھٹا متوالی

بنارس کی شیعہ کانفرنس (۱۹۱۱ء) کی نظم میں سے

سُن کانفرنس ایک تجھے بات بتائیں
وہ سرورِ ذیجاہ تری قوم کا محسن
وہ منعمِ ذی جود کہ احسان کا جس کے
جان آگئی اس قوم کے افسردہ جسد میں
یہ شیعوں کا اک لختِ جگر پانچ برس کا
دے اپنے مہاراجہ بنارس کو دعائیں
جب آئے تو لازم ہے سر آنکھوں پہ بٹھائیں
تفصیل سے کچھ ذکر کریں وقت جو پائیں
گویا دمِ عیسیٰ تھیں بنارس کی ہوائیں
مچلا تھا کہ سرکار مجھے دیکھنے آئیں

یہ نظم ۱۹۱۲ء کے اجلاس شیعہ کانفرنس میں بمقام پٹنہ پڑھی گئی

قوم کچھ تجھ کو زمانے کی خبر ہے کہ نہیں
دردمندانِ محبت کی نہیں کچھ پروا
ہم نے مانا ترا آغاز بہت اچھا تھا
مضمحل قوت احساس ہوئی جاتی ہے
دل بے حس پہ ترے کوئی اثر ہے کہ نہیں
پاس دل ہے کہ نہیں تیرے جگر ہے کہ نہیں
لیکن انجام پہ بھی اپنے نظر ہے کہ نہیں
چارہ گر کوئی دوا نہ دوا اثر ہے کہ نہیں

ساری دنیا کی ترقی کا ہے غیرت پہ مدار
ہم میں قلت اسی عنصر کی ہے مگر کہ نہیں
نیک و بد ہم کو سجھاتا ہے زمانہ لیکن
کچھ نہیں سوجھتا یہ ضعف بصر ہے کہ نہیں
قوم اے پیکر بے حس ترے پتھر دل میں
قطرۂ خون نہ سہی کوئی شرر ہے کہ نہیں

ہفتخوان اُردو

خوانِ اوّل

بار آور قلمی نخل کی ڈالی اُردو
مادرِ ہند کے آغوش کی پالی اُردو
اُردوِ شاہجہانی میں ہوئی تو پیدا
نام اسی سے تو ہے اردوئے معلّٰے تیرا
مشترک ہندو و مسلم کا ہے تو سرمایہ
ہند کی کوئی زباں تیری نہیں ہمپایہ
رہرووں کے لئے اک مسلکِ ہموار ہے تو
فطرتاً صلح پسند اور ملنسار ہے تو
بڑھ کے تو غیر زبانکو اپنے میں ملا لیتی ہے
وسعتِ خلق سے پہلو میں جگہ دیتی ہے
جو ملا تجھ سے گیا بھول وہ گھر کا رستہ
واقعہ ہے یہ کوئی راز نہیں سربستہ
شیوۂ خاص ہے یہ عام پسندی تیری
ہمہ گیری نری یہ حوصلہ مندی تیری
ریختۂ السنۂ مختلفہ کا تو ہے
برج بھاشا کا سا انداز وہی خوبو ہے
گردشِ چرخ مبارک وہ گھڑی لائی تھی
مادرِ ہند کے جب پیٹ میں تو آئی تھی
غالباً عہد تھا سلطان شہاب الدین کا
ہند میں آئے جب ایران سے اکثر شعرا
اس قلمرو میں جو رائج تھی زبان بھاشا
عجمی کھینچتے رہتے تھے کمان بھاشا
اور اسی طرح سے اکثر شعرا لئے وطنی
کرتے تھے فارسی الفاظ میں شکر شکنی
مثلاً چند کہ شاعر وہ اسی دیس کا تھا
اُسکی نظموں میں جھلکتا ہے یہی رنگِ ادا
فارسی لفظوں کا ہندی میں ہے اس طرح ورود
دودھ میں جیسے کہ ہوں قند کے ٹکڑے موجود
یہ تھا وہ عہد کہ جب دے کے پتھورا کو شکست
شاہ غوری نے کیا ہند میں خود بند و بست
بعد ازاں دورِ حکومت میں غیاث الدین کے
ہندیت فارسیت دونوں میں یہ پینگ بڑھے

کہ اسی تازہ زباں یعنی اسی سیکھتے میں
گیت کی ٹھمریوں کی ہونے لگیں تصنیفیں
رفتہ رفتہ یہ ترقی ہوئی حیرت انگیز
طوطی ہند نے کی پہلے پہل اسمیں ریز
وہ تغزل تھا یہ انداز دو گونہ دیکھو
دیکھو اُس سیکھتے کا ہی یہ نمونہ دیکھو

صبح بنارس

ہے لبِ دریائے گنگ ایک بہار آئی ہوئی
کوثر آشاموں کی ہر سو چھاونی چھائی ہوئی
ہر طبیعت حسن کے منظر پہ لہرائی ہوئی
لب پہ اک موج تبسم آنکھ شرمائی ہوئی

ڈوب کر کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے جس پر کاشی خوشنما تعمیر ہے
خطِ قوسی میں سر جدول یہی تحریر ہے
پل ہلالِ عید گنگا صاف جوئے شیر ہے
یا بتوں کے ابروِ پیوستہ کی تصویر ہے

آسماں تھا فتنہ باری میں جو مشہورِ جہاں
سرزمین حسن نے کھینچی ہے غمزے کی کماں

ہے حصارِ عافیت کی پشتیاں اس پل کی نیو
سینہ تانے یا ہے مستِ خوابِ راحت کوئی دیو
پیکرِ گنگا پہ ہے کیا خوشنما آڑا جنیو
ہے کہیں ہر ہر لبِ ساحل کہیں پر شیو شیو

سنیاسی سانڈھ رانڈیں گھاٹ پر کی سیڑھیاں
آفت جان دشمن دین ہیں یہی سب الاماں

ہے ہلالی خط میں آبادی بنارس کی تمام
گھاٹ مندر سب لبِ دریا بحسن انتظام
ناؤ پر چڑھ کر انہیں دیکھو جو نامی ہیں مقام
ماہرویوں کا ملے گا ہر جگہ پر ازدحام

صدقے اتنی گل زمیں پر سو گلستانوں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار

چشمِ بد دور اُف بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے
ہر ادا مہوش حسینوں کی یہاں کے قہر ہے

غیرت کشمیر ہے یہ انتخاب دہر سے
ہر گلی کوچے میں جاری حسن کی اک نہر ہے

صاف ہیں شفاف ہیں کتنے یہاں کے تنکدے
رہتے ہیں ہر دم دولہن کی طرح پھولوں میں لدے

وہ ڈھونڈ لکا صبح کا وہ دور تک گنگا کا پاٹ
وہ کگاروں سے نمایاں جابجا پانی کی کاٹ
وہ پرندوں کے جمگھٹے پرستاں راج گھاٹ
دل بہل جائے جو انساں کی طبیعت ہو اچاٹ

اتریں پانی میں گجر دم روز کا معمول ہے
ہر حسین نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھ لو آب رواں میں حسن دلکش کی بہار
صاف سینوں سے جوانی کی امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلف تابدار
بال کا باندھا چلا آتا ہے جس میں خود شکار

جھوم کر اٹھی جہاں گھنگھور متوالی گھٹا
دیکھنا برسائے گی موتی یہی کالی گھٹا

حسن کا شیوہ اسی پردے میں ٹھنڈی سسکیاں
کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
ضوفشاں سورج سے لیکن ہٹ گیا بادل جہاں
خود کہیگی طاقت نظارہ دے کر امتحاں

جامہ زیبی سے دوبالا شان محبوبی ہوئی
ساریاں قوس قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

زعفرانی ہے کسی ماتھے پہ ٹیکا صندلی
دل سے نازک تر لئے ہاتھوں میں اک گنگا جلی
لب پہ یوں موج تبسم جیسے کھلتی ہو کلی
دل جہاں پھسلا لب توبہ سے نکلا یا علی

جب اٹھیں باہم نگاہیں کافر و دیندار کی
کان میں آئی صدا ناقوس استغفار کی

تاج الکلام

سبزہ زار آگرہ اے خطۂ مینو سواد
ہر عمارت ہے تری اک جنت ذات العماد

خاصکر وہ تاج فی الواقع جو ہے تاج البلاد … جنّتِ شدّاد بھی جس کی کنیزِ خانہ زاد

دیکھ کر سیر اسکی دنیا سے گزرنا سہل ہے
مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

وہ صفائے بام و در جس پر پھسلتی ہے نظر … وہ لطافت گرد جس کے سامنے آب گہر
وہ صباحت زرد جس سے عارض شمس و قمر … شیشۂ دل میں سما جائے نزاکت اسقدر

موم پتھر بن گیا اللہ رے گلکاریاں
پھول ہیں نازک رگیں پتی میں نازک دھاریاں

اے زہے صناعی صناعِ صنعت آفریں … تاج یا ترشا ہوا مُہرِ سلیماں کا نگیں
منفعل رو کار سے تحریر چشمِ سرمہ گیں … سنگِ موسیٰ کے حروف اور سنگِ مرمر کی زمیں

نور و ظلمت میں بہم جب خوب گاڑہی چھن گئی
آنکھ کی پُتلی سفیدی میں سیاہی بن گئی

روئے گیتی کیلئے یہ تاج ہے تاجِ شرف … ماہِ کامل میں کلف ہر برج اس کا بے کلف
جوش زن موجِ بہار لالہ و گل ہر طرف … گل بھی غنچے بھی صراحی در بغل ساغر بکف

مستیوں کے نشہ میں ہشیاریاں بھولی ہوئی
نرگس شہلا کی آنکھوں میں شفق پھولی ہوئی

جو بھی ہوں معمار اسکے کسقدر تھے تازہ کار … کر دیا پتھر کو موتی سے زیادہ آبدار
دونوں جانب جالیوں میں مختلف نقش و نگار … پھر وہ بل کھائی ہوئی بیلوں میں اک جوشِ بہار

مُنہ بندھی کوئی کلی کوئی کلی کھلتی ہوئی
پھول کی ہر پنکھڑی سے پنکھڑی ملتی ہوئی

عروس البلاد بمبئی

بمبئی تو کشور ہندوستاں کی ناک ہے … آبروئے مصر تیرے سامنے کیا خاک ہے

سرزمین تیری مقام سجدۂ افلاک ہے ۔۔۔ دامنِ ساحل تمام آلائشوں سے پاک ہے

پُر فضا تیری خلیج آئینۂ بین الیدین
اپنے ساغر میں لئے جوشِ بہار نشاتین

ہر دو جانب کوہساروں کا تسلسل تا بہ دُور ۔۔۔ اور اُن کے بیچ میں تو صورت بین السطور
اپنے سنگین بازوؤں پر تجھکو زیبا ہے غرور ۔۔۔ روک دیتے ہیں جو طوفانی تموّج کا عبور

دل ہے لبریزِ محبت آگیا جب جوش میں
لے لیا بحرِ عرب کو حلقۂ آغوش میں

بمبئی ہندوستان کا صدر دروازہ ہے تو ۔۔۔ بلکہ رخسارِ عروسِ ہند کا غازہ ہے تو
اپنی آب و تاب سے ہر دم تر و تازہ ہے تو ۔۔۔ ایک رنگارنگ مجموعے کا شیرازہ ہے تو

آکے صحبت میں جو بیٹھا کام کا جی ہو گیا
تیری چوکھٹ جس نے چھو لی نصف حاجی ہو گیا

ہمنشیں جن کو نہیں کچھ خشک و تر میں امتیاز ۔۔۔ سیر بندرگاہ کر لیں چڑھ کے بالائے جہاز
ہو گا اک نظارۂ جاہ و جلالِ بے نیاز ۔۔۔ خود بخود ہونے لگیں گے منکشف قدرت کے راز

بحر میں موجوں کا اُٹھ اُٹھ کے کہیں ڈنٹر پیلنا
سینہ زوری سے جہازوں کو پھر اُن کا ریلنا

دامنِ ساحل پہ صد ہا رنگ کے نقش و نگار ۔۔۔ کوٹھیاں کچھ کچھ تلے اوپر منازل خانہ وار
جنکی پستی اور بلندی یوں دکھاتی ہے بہار ۔۔۔ جیسے زینوں پر لگا دیں سج کے گملوں کی بہار

خیر مقدم کو مسرت بڑھتی ہے دل کیطرف
اک نظر ڈالو سمندر سے جو ساحل کیطرف

ماء الحیات

ہنستی ہے ساری دنیا رنگت ہے زعفرانی ۔۔۔ پامال اور کیچے اٹھتی ہوئی جوانی

چہرے پہ مُردنی سی چھائی ہوئی ہے دیکھو
ہے زیست کی علامت یا موت کی نشانی

وہ ہتھکنڈے تمہارے تمہید خودکشی تھے
سرمایۂ بقا کی تم نے نہ قدر جانی

کھودی ہے مدتوں تک ہاتھوں سے قبر اپنی
ہو کیوں نہ آشکارا آخر غمِ نہانی

تمیز نیک و بد بھی جاتی رہی تھی بالکل
کرتا تھا نفس سرکش اس طرح حکمرانی

برعکس وضع فطرت کیں اختیار راہیں
اسلاف کی نصیحت افسوس ہے نہ مانی

حیواں بھی جو نہ کرتے وہ تم نے حرکتیں کیں
خمیازہ ہے انہیں کا یہ ضعف و ناتوانی

تخم عمل سے اپنے کھیتوں میں زہر بویا
کی مزبلوں پہ اکثر جا جا کے قلبہ رانی

چل نکلے ایسے قوت آتے ہی ساق پا میں
جب ہوش کچھ سنبھالا گلیوں کی خاک چھانی

طفلانہ کوڑیوں میں سیماب ریزیاں کیں
بد اصل سیپیوں میں کی مشقِ دُر فشانی

نادانیوں کی حد ہے بھر بھر کے چلّوؤں میں
ہاتھوں سے اپنے اُلچا خود آبِ زندگانی

افسردگی کا ساماں پیدا ہوا اُنہیں سے
تم جانتے تھے جنکو اسبابِ شادمانی

جذبۂ اسلام

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دینگے
مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دینگے

دھارے ہیں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہے
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دینگے

ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ
شعلے بھڑک اُٹھینگے جھونکے جو ہوا دینگے

ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آئے پھر تم کو بتا دینگے

فاران پہ گرجے تھے برسے ہیں جہاں بھر میں
گھر کر جو کہیں کڑکے پھر ہوش اُڑا دینگے

دنیا کے سمندر میں ہم جزر کبھی ہیں مد کبھی
دیکھو جو ہمیں رو کا طوفان اُٹھا دینگے

مرجھائی ہوئی کھیتی اب ہم ہیں تو کیا ڈر ہے
چھینٹے ہمیں رحمت کے پھر نشو و نما دینگے

جڑ ہم نے پکڑ لی ہے کلّے نئے پھوٹینگے
گر خاک میں بھی ہم کو اک بار ملا دینگے

ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو مٹا دیکھیں
کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دینگے

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دینگے

گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صورِ جہاں پھونکا مردوں کو جلا دینگے

اے جذبۂ اسلامی جس دل میں نہ تو ہوگا
یہ نظم صفی پڑھ کر ہم اُس کو سُنا دینگے

ضمیمہ لختِ جگر
نظم کانفرنس دہلی ۱۹۳۳ء

دہلی اے دہلیز شاہانِ جلالت دستگاہ
اے زمینِ مرتفع اے آسمانِ عزّ و جاہ

ابتدا سے یہ ہوئی گے بار آباد و تباہ
کشورِ ہندوستاں کی آج تک ہے تختگاہ

دفترِ عبرت ہے ایک اِک ذرّہ تیری خاک کا
شاہدِ عینی جفائے گردشِ افلاک کا

سُنتے ہیں بدلا ہے تو نے اپنا چولا سات بار
بیش و کم شکلِ ہلال و بدر حسنِ مستعار

ہر زمانے کے تری تحویل میں نقش و نگار
تیرے آثار الصنّادید انتخابِ روزگار

ہمسرِ کعبہ تجھے سمجھیں اسی قابل ہے تو
نام ہے دِلّی ترا ہندوستان کا دل ہے تو

ہستنا پور اولاً تھا نام اور اندر پرست
پانڈوؤں کی تھی عملداری انھیں کا بندوبست

کوروں کو دی مہابھارت میں اِن سب نے شکست
بھیم و ارجن کے مقابل حوصلے اُنکے تھے پست

عہدِ نامعلوم کے لیکن ہیں سب یہ واقعات
درج ہیں تاریخ میں جو سنئے اب وہ واقعات

تین صدیاں قبلِ میلادِ مسیحِ خوش سیر
تابعِ قنّوج تھا یہ خطۂ نزہت اثر

دہلو اِک راجہ وہاں گذرا ہے باصد کرّ و فر
نام رکھا اُس نے اس بستی کا اپنے نام پر

تھا جو اندر پت وہ دہلو ہو گیا مشہورِ عام

بن گیا دہلو سے پھر دہلی تغیر پا کے نام

خاص دیواں آہ وہ گل ہو گیا جس کا چراغ   خشک ساون خشک بھادوں خشک ہے مہتاب باغ
ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا مکینوں کا سراغ   دل میں ہنگام نظارہ کیوں نہ پھر پڑجائیں داغ
رنگ محلوں کی عمارت کا نہیں وہ رنگ اب
دور ہے نزہت چمن سے سینکڑوں فرسنگ اب

ہو کا عالم ہے جہاں تسبیح خانہ تھا کبھی   قصر پر موتی محل کے اوس گویا پڑ گئی
غیر حالت بیٹھکوں کی اور مثمن برج کی   چھائی ہے کیسی اداسی جس طرف دیکھو صفی
آبشاروں میں نہ فواروں میں ویسا جوش ہے
جس کا طوطی بولتا تھا وہ چمن خاموش ہے

سترہ سو سات سے دہلی پر آیا اک زوال   جو قمر تھا رفتہ رفتہ ہو گیا گھٹ کر ہلال
مرگِ عالمگیر نے پیدا کیا وہ اختلال   ضعف آیا سلطنت میں مٹ گیا جاہ و جلال
ہندوؤں کے سرغنہ سردار سکھ اور مرہٹے
بے تحاشا آ کے میدانِ بغاوت میں ڈٹے

عہد میں فرخ سیر کے سیدوں کا زور تھا   بادشاہ آخر انھیں کے ہاتھ سے مارا گیا
تخت دہلی کا انھوں نے روشن اختر کو دیا   روشن اختر نے لقب پایا محمد شاہ کا
یہ بہادر شاہ کا پوتا بڑا نااہل تھا
غافل و ناعاقبت بیں تھا سراپا جہل تھا

دو وزیر اس کے جو تھے بیحد مدبر ہوشیار   ایک اودھ کا دوسرا ملکِ دکن کا صوبہ دار
شاہ کا برتاؤ ان دونوں سے تھا ناخوشگوار   اسلئے تنگ آ کے آخر خودسری کی اختیار
بادشاہِ وقت تھا اس درجہ بے مغز و خرف
ہو گئے یہ خیر خواہ سلطنت بھی منحرف

قید میں نواب نے نادر سے یہ طے کر لیا
دو کروڑ اُس کو اگر مل جائیں واپس جائیگا
شاہ کی نادانیوں کا یہ مگر انجام تھا
خود بھی ہمراہ نظام الملک اردب میں پھنسا

بادشاہی فوج کو کرنال پر دے کر شکست
داخلِ دہلی ہوا نادر بقصدِ بندوبست

دہلیِ نو کے علاوہ دیکھنے جائیں جو ہم
ایک سو چوّن ہیں آثار قدیمہ کم سے کم
کچھ مساجد، کچھ مقابر، اور کچھ بیت الصّنم
بیشتر گذرے ہوؤں کے سب ہیں یہ نقشِ قدم

گرد میں بدلا کرے گا یوں ہی دورِ آسماں
رات دن بنتے بگڑتے ہی رہینگے یہ نشاں

شہرِ دہلی! اے شہنشاہِ بلادِ انڈیا
طرفہ تر ہے تیری تاریخ اور ترا جغرافیا
رنگ چہرے کا ترے ہر سال بدلا ہی کیا
ہر زمانے میں نظر آیا ترا نقشہ نیا

مرکزیّت کا تری ہر چند وہ عالم نہیں
مولدِ اُردو زباں ہے یہ شرف کچھ کم نہیں

شہجہانی دور کا سکّہ ہے اُردو کی زباں
کس جگہ رائج نہیں دُنیا میں یہ نقدِ رواں
تھی یہی ٹکسال اِن سکّوں کی واقف ہے جہاں
فیض پہنچا ہے اسی در سے سبھوں کو بیگماں

اوّلیت جسکو حاصل ہے یہی ہے وہ دیار
خوانِ نعمت کا یہیں کے لکھنؤ ہے زلّہ خوار

وہ یہیں کے نخلِ اُردو کی فقط اک شاخ تھی
سرزمینِ لکھنؤ پر جا کے جو پھولی پھلی
دل لگا کر لکھنؤ والوں نے اسکی داشت کی
نقشِ اوّل کو فضیلت ثانویّت کی ملی

ذائقے میں اسکی شیرینی کو پایا جب دو چند
آیا پیوندی ثمر خود اہلِ دہلی کو پسند

صفیر

صفیر۔ شیخ شرف الدّین صدّیقی۔ بن شیخ معین الدّین۔ آپ کو پندرہ سولہ برس کی عمر سے فنِ شاعری کا شوق ہوا۔ اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے حضرت مولانا شاہ صفیر صاحب لکھنوی کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ آپ کا دیوان موجود ہے۔ جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعر عالی خیال تھے۔ مضمون شگفتہ اور طرزِ بیان اچھا ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بہت کام لیتے ہیں۔ انتخاب کلام درج ذیل کیا جاتا ہے۔۔۔

کل جنہیں دہر میں دعوائے مسیحائی تھا
آج اُن پر ملک الموت کا قبضہ دیکھا

گرم گر یُوں ہی رہا بازار قتل عاشقاں
مشک سے کافور کا سوداگراں ہو جائیگا

ابتدائے عشق ہے مضطر نہ ہونا اے صفیر
جذب دل ایسا نہیں جو رائیگاں ہو جائیگا

دعوئی آئینہ سے اے یار خود آرائی کا
ڈر ہے کھلجائے نہ پردہ تیری یکتائی کا

ہم یہ سمجھے ہوئی کافور سے فلفل پیدا
یار کے عارض پر نور پہ جب تل نکلا

سودائے زلفِ یار تو رگ رگ میں ہے مرے
فصّاد تو لگائے گا نشتر کہاں کہاں

کروں بیان میں دل کی حکائتیں کس سے
دبائے رہتا ہوں غم کی کتاب پہلو میں

اے جنوں تیرے سبب ہے یہ بزرگی ورنہ
پائے پابوسی نہ مری خار بیاباں کرتے

وہ زلفِ رسا تو بہت بڑھ چلی تھی
مگر رہ گئی تا کمر جاتے جاتے

ذرا اپنے چہرے سے آنچل اٹھاؤ
اِدھر دیکھ لو اک نظر جاتے جاتے

سب دلوں میں ہے آرزو تیری
ہر زباں پر ہے گفتگو تیری

بے خطا روٹھ جانا عاشق سے
اے پری یہ بُری ہے خو تیری

جتنا چاہے ستالے جی بھر کے
در سے تیرے اُٹھینگے ہم مر کے

نہیں بھرنے کے زخم دل یہ کبھی
تیغ ابرو کے ہیں لگے چر کے

صفیر

صفیر۔ منشی میاں جان دہلوی تلمیذ مومن بعد غدر مہاراجہ پٹیالہ کی سرکار میں بذمرۂ شعرا

ملازم ہوئے۔ ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا۔ شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ کلام میں درد اور اثر ہے۔ زبان شستہ اور صاف ہے۔ یہ اُن کے کلام کا نمونہ ہے۔

کیا خبر تھی کہ اُسی در پہ پڑے گا جا کر
بد دعا دیتے نہ گھر غیر کا ویران ہوتا

نہ تم سے ترکِ جفا اور نہ ہم سے ترکِ وفا
نہ اختیار تمہارا نہ اختیار اپنا

چڑھتے ہیں ہزاروں گل تربت پہ صفیر اپنے
مرنا مرا بلبل کی قسمت میں لکھا ہوتا

مر کر بھی جستجو نہیں جاتی ہے یار کی
مٹی خراب ہے مرے مشتِ غبار کی

ہُوا ہو سہو تو پھر خوب یاد کر لیجے
کہ رہ نہ جائے کوئی جور امتحاں کیلئے

صفیر۔ منشی نور خاں باشندۂ میرٹھ مقیم دہلی میر حسین تسکین اور مولی بخش قلق شاگردان مومن کے فیضِ تلمذ سے بہرہ یاب تھے۔ عاشقانہ طبیعت اور مسلک آزادانہ رکھتے تھے۔ کلام اچھا ہوتا تھا۔ یہ چار شعر دستیاب ہوئے جو درج ذیل ہیں۔

تیری چالوں سے فتنۂ عالم
روز رہتا ہے روزِ محشر کا

اپنا خنجر ذرا بچائے گا
دھیان سودائی کو نہیں سر کا

سرگشتہ روز و شب نہ رہے کس طرح مدام
اپنا بھی دود آہ ہے یہ آسماں نہیں

کچھ صبحِ ہجر صبحِ قیامت سے کم نہیں
کم صور کی فغاں سے صدائے اذاں نہیں

صفیر۔ شیخ امداد حسین صفیر ابن شیخ واحد بخش رئیس فرخ آباد۔ شاگرد امداد علی بحر لکھنوی۔ خوش فکر اور شیریں گفتار ہیں۔ زبان میں صفائی اور بیان میں متانت ہے۔

ہے اُسی میخانے کی در کار اے ساقی شراب
پیتے تھے جس میکدے کی ذوق و صہبائی شراب

رسوا جو اے صفیر ہوئے انتہا کے ہم
چھوڑا بتوں کو ہو گئے بندے خدا کے ہم

بیخود ہیں کیا اطاعت اہلِ وفا کریں
کچھ ہوں تو کام آئیں کسی آشنا کے ہم

الفت کا نام لینگے نہ پھر حشر تک صفیر
اب کی جو بچ رہینگے مصیبت اُٹھا کے ہم

رکھ دیا ہم نے مرقع میں جو نقشا یار کا
آنکھ ہر تصویر کی چشمِ تماشائی ہوئی

کیوں نہ چمکیں میکدے میں موج مے کی بجلیاں	رحمت ساقی کی رہتی ہے گھٹا چھائی ہوئی

صفیر:- جناب منشی سید فرزند احمد صاحب۔ بزرگوں کا وطن بلگرام تھا۔ مگر یہ خود اپنے ننہال میں بمقام مارہرہ پیدا ہوئے۔ میر سید احمد آحمد مغفور کے فرزند اور حضرت سجادہ نشین مارہرہ کے نواسے تھے۔ پندرہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا شوق دامنگیر ہوا۔ لکھنؤ جاکر امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ بعد غدر مرزا دبیر کے ہمراہ پٹنہ گئے اور ایک عرصہ تک ان کے ساتھ رہکر مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کی مشق کی۔ فارسی میں حضرت غالب دہلوی سے تلمذ تھا۔ عرصہ دراز تک شاہ آباد آرہ میں سکونت گزیں رہے۔ کثیر التصانیف تھے۔ شعر گوئی کا بہت شوق تھا۔ تین دیوان اُردو واسوخت بیس مثنویاں مراثی و سلام۔ قصّہ روح افزا۔ ترجمۂ بوستان خیال۔ تذکرہ حسب وطن اور تذکرہ جلوۂ اختران سے یادگار ہیں۔ اول الذکر میں شعرائے بلگرام کا کلام اور آخر الذکر میں زیادہ تر اپنا اور اپنے اقربا اور احباب کا کلام مندرج کیا تھا۔ ان کے کلام میں سحر کا رنگ اکثر جگہ موجود ہے۔ مگر رعایت لفظی کی قید ان کے ہاں کم ہے۔ زبان اور الفاظ کی تراش خراش وہی ہے۔ جو امان علی سحر کا رنگ ہے۔ جناب صفیر قدر بلگرامی کے رشتہ دار اور بڑے عزیز دوست تھے۔ اودھ اور بہار میں ان کے شاگرد بکثرت تھے۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں انتقال کیا۔

پاس اُس کی نزاکت نے کیا خوب ہمارا	چھٹتا نہیں اُس شوخ سے مکتوب ہمارا
مزرع فکر ہو پامال نہ کیونکر اے شوخ	تیری رفتار کا مضمون ہے چلتا پھرتا
زاہد نہیں ہے رند کو یاں احتیاج حور	سب کچھ بتوں کے پاس ہے اللہ کا دیا
شوخی تو دیکھو فاتحہ پڑھکر مزار پر	کہتے ہیں کس نے خاک میں تجھ کو ملا دیا
دشت و چمن میں مقام اپنا ہو گردوں سے بلند	ہر بگولا ایک زینہ ہے ہمارے بام کا
لکھنؤ لٹ گیا۔ دلی ہوئی برباد صفیر	اب بھلا مجمعِ ارباب ہنر کیا ہوگا

وابستگی میں ضبط بہت ناگوار تھا
کیوں اے ستم ظریف یہی ہے وفا کا طور
میں اور تمہیں خلق میں بدنام کروں حیف
شباب پر بھی اجل کو نہیں ہے رحم آتا
نخم تھم کے خلش کرتا ہے مژگاں کا تصوّر
راز خلوت کا بیاں کس نے کیا کیا جانیں
قید زنداں میں جو کرتا ہے نہ نکلوں گا کبھی
بھلا تم تو بھلے ہو میں بُرا ہوں
ہماری اُن کی محبت کا کچھ نہ پوچھئے حال
صفیر اس نے رقیبوں سے باتیں سنوائیں
سب دیکھتے ہیں اور کہیں جاتے نہیں ہم
قابو میں دل نہیں ہے بھلا آپ کس لئے
کیا یاد آگیا انہیں صبح شب وصال
ہم تو سر بھی ہوئے اور نہوا خاک نصیب
تعزیر میں میری نہ کمی کر ستم ایجاد
دیدو اک بوسہ خوشی سے اپنی
آئے وہ میرے گھر تو رقیبوں کو لے کے ساتھ
اب تو مجھے ہٹا نہ سکیں آسمان بھی
ہر دم صدا یہی ہے ترے داد خواہ کی
دریائے رحم حشر میں امڈا تو دیکھنا
بہار میں گل و بلبل سے کیا ہے سرگوشی

اچھا ہوا جو سینے میں ٹکڑے جگر ہوا
عاشق بنا کے پھر نہ کسی دن خبر ہوا
یوں تم پہ کھلے میری زباں ہو نہیں سکتا
پری وشوں کو پہنتے ہوئے کفن دیکھا
رہ رہ کے اُبلتا ہے لہو قلب و جگر کا
ایک میں ایک ہو تم بس کوئی آیا نہ گیا
چارہ گر لکھ دے قبالہ خانۂ زنجیر کا
محبت جھوٹ میرا چاہنا جھوٹ
رہے یقین کی طرح آئے تھے گماں کیطرح
یہ بات دل میں لگی تیر جانستاں کیطرح
ہیں مردم دیدہ کی طرح خانہ نشیں ہم
تسکین دیتے ہیں مجھے سمجھائے جاتے ہیں
منہ میرا دیکھ دیکھ کے شرمائے جاتے ہیں
کِس طرح غیر تری آنکھوں میں گھر کرتے ہیں
وہ آج ہی ہو جائے جو کچھ روز جزا ہو
اچھا تم میری خوشی جانے دو
یارب قبول یوں بھی کسی کی دعا نہ ہو
بیٹھا ہوں میں زمیں پہ ترے نقشِ پا کیساتھ
مارا نظر نے رہ گئی حسرت نگاہ کی
کاغذ کی ناویں بن گئیں فردیں گناہ کی
یہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کیلئے	آج بیٹھے ہیں اٹھانے کے لئے
ہیں اسکی روز کی بیداریوں سے تنگ آیا	ملے تو مول لوں خواب اُنکے پاسباں کیلئے

صفیر

صفیر:۔ سید قبول عالم شاگرد مقصود عالم صاحب رضوی پھلانوی زیادہ کلام دستیاب نہ ہوا اپنے استاد کی ایک غزل کو تضمین کیا ہے۔ جس کے چند بند درج ذیل ہیں کلام اوسط درجہ کا معلوم ہوتا ہے:۔

گو بظاہر نہ ہو پردے سے ہے دلبس شریک	موج و گرداب سدا رہتے ہیں ساحل میں شریک
ہر رگِ تن کا لہو خنجر قاتل ہیں شریک۔	دوست وہ ہے کہ رہے دوست کا مشکل میں شریک

مجھ سا فرقت میں نہ ہو اے دلِ ناشاد الگ

حق بجانب تھا رہا دار پہ منصور کا دخل	ظلمتِ شام پہ ہر صبح رہا نور کا دخل
کشور چیں میں رہا کہتے ہیں فغفور کا دخل	آب و گِل کا نہ یہاں کام نہ مزدور کا دخل

اے جنوں خانۂ وحشی کی ہے بنیاد الگ

گو ہر اک ملک کے ہوتے ہیں سخنور اچھے	قول سب ہیں مرے استاد کے سچے سچے
اے صفیر آپ کو بھولیں نہ یہ دعوے میرے	کشور ہند میں مقصود ہر اک شاعر سے

میرے استاد میں ہیں وصف خداداد الگ

صمد

صمد:۔ مولوی محمد عبد الصمد خلف مولوی صدیق نواح غازی پور کے رہنے والے تھے۔ مگر خاص غازی پور میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں وکالت کرتے تھے آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ مولانا آسی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ خوش اطوار بزرگ تھے۔

منہ سے کچھ کہنے نہیں دیتی ہے بیتابی دل	کیا بتائیں کہ جو پاتے تمہیں ہم کیا کرتے
آجتک اُن کے سوا کچھ نہیں دیکھا پھر بھی	خواہش آنکھوں کی یہی ہے انہیں دیکھا کرتے
وہی انصاف کریں اپنے ستم کا دل میں	اے صمد ہم کو تو شرم آتی ہے شکوہ کرتے

صمیم

صمیم: منشی سید علی حسین صاحب۔ خلف سید خادم حسین ساکن بلند شہر شاگرد سید محمد مرتضیٰ بیان ویزدانی۔ ذی استعداد ہیں۔ عربی و فارسی میں اچھی قابلیت ہے پہلے ریاست مالیر کوٹلہ میں بحیثیت شاعر دربار ملازم تھے، پھر رامپور چلے گئے۔ نازک مزاجی اور شعرا کی باہمی نوک جھونک نے کہیں نہ رہنے دیا۔ آخر اپنے وطن میں آ گئے ہر صنفِ سخن میں شعر کہتے ہیں۔ علم عروض میں اچھا دخل ہے۔ وصل، عیش و نشاط کے مضامین زیادہ لکھتے ہیں۔ کہیں کہیں درد اور سوز و گداز بھی ہوتا ہے۔ حسن و عشق کے چونچلوں کو نئے طرز سے ادا کرتے ہیں۔ حضرت یزدانی کی یادگار ہیں۔ اور ان کے شاگردوں میں درجۂ ممتاز رکھتے ہیں۔ صمیم صاحب کا دیوان مطبع منشی ہرشاد میں بمقام بلند شہر ۱۳۲۶ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ کلام کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

چھپ کر کہاں رہیں فلکِ کینہ جو سے ہم
برابر سے حسینوں کے نکلنا تو قیامت ہے
ہرا سینہ ہے روشن جلوۂ داغِ محبت سے
بے ملے غیر سے آخر نہ رہے دیکھ لیا
دم بدم ہے جو یہی ضبط محبت کا گلہ
وہ دل جو لے چلا ہے میرا ہی ہے کلیجہ
ہیں اور یہ دل تمہیں دوں کیا بات ہی تمہاری
چار سو دشت میں ہیں تا سر زانو کانٹے
نیک صحبت کا اثر کچھ نہ بروں پر ہوگا
لب ساحل ہوں میں شوریدہ سر تقدیر ہنستی ہے
الٰہی آبرو رہ جائے مرے ہاتھ اُٹھانے کی
صمیم اس تنگ کی دنیا مجھی کو داد کیا دیگی

ملجائیں خاک ہی میں کہیں آبرو سے ہم
جھپٹ لیتے ہیں یوں بھی دل جو بچ کر ہو جاتا ہو
لحد میں ساتھ لیکر میں چراغ سوز جاتا ہوں
کیا ہوا شرط جو باندھی بھی قسم کھائی بھی
ایک دن ہو کے رہے گی مری رسوائی بھی
آنکھوں سے دیکھتا ہوں ہاتھ سے جا رہا ہے
لے دیکھئے اک یہی تو درد آشنا رہا ہے
اب بدلنے نہیں دیتے مجھے پہلو کانٹے
سو برس پھول کے پہلو میں نہ دیں تو کانٹے
حباب آبجو پر موج کی زنجیر ہنستی ہے
دعا میں مانگتا ہوں روکے میں تقدیر ہنستی ہے
وہ سن سن کر کلام مصحفی و میر ہنستی ہے

صلاح

صلاح :۔ مولوی محمد صلاح نبیرہ محمد افضل الہ آبادی۔ مزیدار اور شوخ طبیعت تھی افسوس ہے کہ زیادہ کلام نہ بہم پہنچ سکا۔ صرف دو شعر قدرت اللہ شوق کے تذکرے سے نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے ان کی جدت طرازی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کیا صلاحِ وقت ہے جا میرزا مظہر سے پوچھ مرے اس درد دل کہنے کے صدقے	ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار ترے سُن سُن کے چپ رہنے کے صدقے

صنعت

صنعت :۔ شیخ کریم الدین مرحوم مراد آبادی۔ شاگرد قدرت اللہ شوق و جرأت فن سیاق میں کمال رکھتے تھے۔ علاوہ دیوانِ مخمسات و غزلیات وغیرہ ایک رسالہ ان کا سیاق میں بھی ہے جو نہایت مفید ہے۔ نواب فیض اللہ خاں والیٔ رامپور کے جلیس تھے۔ ۷۰ برس کی عمر پاکر ۱۲۶۳ھ میں وفات پائی۔ یہ بات عجائبات سے ہے کہ وفات سے دو ایک روز قبل منشی انوار حسین صاحب تسلیم سے اپنی وفات کی تاریخ کی فرمائش کی اور انہوں نے دو قطعہ تاریخ فی البدیہہ کہکر پیش کئے پھر دو روز کے بعد انتقال فرمایا۔ انوار حسین تسلیم نے ان کی تاریخ وفات میں مصرعۂ ذیل نکالا تھا۔

کہا۔ استاد خمسہ کا موا ہائے

خمسے خوب کہتے تھے۔ معاملہ نگار۔ ادا بند شاعر تھے۔ حسن و عشق کے جذبات کے ادا کرنے میں اپنے اُستاد جرأت کی پیروی کرتے۔ راز و نیاز کی مصوری میں خداداد ملکہ تھا۔ کہیں کہیں صنائع بدائع کی جھلک بھی ان کے ہاں ہے۔ مگر کسی موقعے پر بھی لطف زبان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ اور زبان ایسی شستہ اور فصیح پائی تھی کہ چند متروکات سے قطع نظر آجکل کی زبان سے ملا لیجئے۔

دیر و کعبہ میں ہے جلوہ اُسی ہرجائی کا مجھے یہ سوچ ہے کیونکر اُسے چھوڑوں چھوڑوں جان تولی ہے پر ابھی تم کو	تو نہ دیکھے تو یہ نقصان ہے بینائی کا کہ دیکھنے ہی سے بس جس کا رنگ ہو میلا دل کے لینے کا ڈھب نہیں آتا

دم تو کب کا نکل گیا ہوتا — ضعف سے تا لب نہیں آتا
کچھ تو بتایئے کہ یہ اسرار کیا ہوا — اگلے کرم کدھر گئے وہ پیار کیا ہوا
کل اس طرف وہ ایسی پھبن سے نکل گیا — دیکھے سے اسکو جی مرا سن سے نکل گیا
مجھ سے کیا اُس بت بے پیر نے مُنہ پھیر لیا — میری آہوں سے بھی تاثیر نے مُنہ پھیر لیا
ہے ایک وہ دمباز یہی طور ہے اس کا — ہے قصد کہیں اور تو پیغام کہیں اور
ہم اشک سے دن رات جھڑی کیوں نہ لگائیں — نم کا ٹو جو برسات کے ایام کہیں اور
کیونکہ اُس کے ہجر میں جیتے بچینگے غم سے ہم — دم خفا ہم سے ہوا ہے اور خفا ہیں وہ سے ہم
مدام شیش محل میں رہے ہے دختر رز — سمجھ نہ رند بھری ہے شراب شیشے میں
حیراں ہوں اشک پوچھو نہیں کاہے سے ای جنوں — دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں
لے لیا دل اب تو اُس نے آشنائی ہو چکی — ہو گیا سودا وہ پختہ جس کی سائی ہو چکی
خط نکلنے پر لکھی خط میں اُسے میں نے یہ بات — بھیجئے اس کا جواب اب تو صفائی ہو چکی
ہر اک کو سیدھی سناتا ہے وہ بت کج فہم — اگر کسی نے بھی بات اُس کی اک ذرا الٹی

خمسہ بر قطعہ حضرت اختر

کاندھے پہ شال ہاتھ میں سبحہ رومال تھا — مندیل سر پہ گول تھی پکڑے ہوئے عصا
پاؤں تلک تھے پہنے ہوئے جبّہ ریا — کل شیخ بن کے مجتہد عصر سا قیا
دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا

دیکھا مجھے تو کتنے کنایہ کئے بہ طنز — پھر آپ کو بھی پردہ میں کچھ کہہ اٹھے بہ طنز
سمجھا میں یعنی کہتے ہیں عاصی مجھے بہ طنز — کہنے لگے زراہ تبختر دلے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

سنکر یہ بات شیخ کی میخوار جو کہ تھے — نادم سے ہوکے دل میں وہ حیران ہو گئے
کچھ بن نہ آئی بات تو خاموش سب ہوئے — میں نے کہا کہ ہم بھی ہیں یہ خوب جانتے

پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

ہر آن کام ہوتا ہے اس عمر میں زبوں | اس واسطے کہ ان دنوں شیطان کے بس میں ہوں
افعالِ بد سے اپنے ہوں ہر چند سرنگوں | گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں

لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا

نوّے برس ہیں فہم تمہارا ہوا درست | کہنا زباں سے آپ کا ہے سب بجا درست
پر اب بھی جانیں آپ کو ہم پارسا درست | تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست

اور تب یقیں آپ کے ہو اجتناب کا

بارش ہو اور ابر بھی چھایا ہو چار سو | پھولا تمام باغ ہو جاری ہو آب جو
کرتا ہو اختلاط کی وہ تم سے گفتگو | مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ رو

اور کوئی واں مخل نہ ہو باعث حجاب کا

اُسوقت اُس نے جام صراحی سے ہو بھرا | پینے سے اُسکے آنکھ نہیں آیا ہو جب نشا
مستانہ اختلاط کرے تم سے برملا | گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حیا

یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا

کھا کر گزک وہ اور سنگھا کر کے اپنا مُنہ | چتون بدل کے ناز دکھا کر کے اپنا مُنہ
مستانہ شوخ و شنگ بنا کر کے اپنا مُنہ | کھینچ[1] اسکو اور مُنہ سے ملا کر کے اپنا مُنہ

دے ذائقہ زباں سے دہن کو لعاب کا

اور یہ کہے کہ میں ترا تابع ہوں بن دئیے | بخشش پہ اسکی ہم نے ہیں لاکھوں گنہ کئے
اب چھوٹنے کا تو نہیں بے جام مے پیئے | منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے

گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

---

[1] یہ مصرع اصل قطعہ میں یوں تھا۔ ع کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ مُنہ سے مُنہ
اسکو اپنی سہولت کے لئے بدلا ہے۔ جس کا ان کو ہرگز حق نہ تھا۔

ممکن نہیں کہ آپ کو عقبے کا دھیان ہو
اسوقت خاطر اسکی سے جو کچھ کہے کرو
بس یہ کہے بن آئے کہ حاضر ہیں جو کہو
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر خوف آپ کیجئے روز حساب کا

اسباب عیش جسکو میسر ہوں یہ تمام
ایسی جگہ میں باز رہے جو کہ نیک نام
تاثیر ہم پہ کرتا ہے اس شخص کا کلام
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

خمسہ بر قطعہ قدرت

مال و زر تھا پاس اپنے جس قدر کہ چاہیئے
تھی میسر تندرستی چین ہر صورت کی تھے
موت کو دل سے بھلا شیطان کے استمداد سے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا ہے ملک روم کیا ہی سرزمیں روس ہے

فوج رکھکر اس طرف کو کیجئے لشکر کشی
لطف ہے مردانگی اور زندگانی کا یہی
تا قیامت نام ہوگا جان بھی گر اس میں دی
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجے زندگی
اک طرف آواز طبل اک سو صدائے کوس ہے

جو کہ ہو اپنی رعیت اسکی ہو ہر طرح غور
سرکشوں کو قتل کیجے تا کسی پہ ہو نہ جور
جب کہ ہو ان سے فراغت تب یہ ہو محفل کا طور
صبح سے لے شام تک کیجے مے گلگوں کا دور
شب کے تئیں پھر ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

بس یہی ٹھہری کہ ہوجے شاہ روم و روس کے
رکھئے فوج بے قیاس اب قصد واں کا کیجئے
گفتگو آپس میں بیہودہ یہ ہم کرتے جو تھے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے

اور لگی کہنے کہ کچھ معلوم ہوتا ہے تجھے
ہیں یہاں شاہ و گدا مدفون اک ہی طور سے
ٹوٹے پھوٹے کتنے پڑے تعویذ بھی ہر قبر کے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے

یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

زندگانی میں یہ ہفت اقلیم کا کرتے تھے راج
تھا مشرف تخت انکے پاؤں سے اور سر سے تاج

جو زمیں بوس انکے تھے تھا عرش پر ان کا مزاج
پوچھ نواب ان سے جا کے حشمت دنیا سے آج

کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

صنعت

صنعت:۔ جناب مغل خاں۔ عہد قدیم کے سخن سنج تھے۔ صرف مندرجۂ ذیل دو شعر تذکرۂ چمنستان شعرا سے نقل کئے جاتے ہیں۔

سینے میں آہ، دل میں طپش، اشک چشم میں
شہرہ یہ عاشقی کا مرا گھر بہ گھر ہوا

غمزے سے مارتا ہے جلاتا ہے ناز سے
کیا ملک حسن کا صنما تو خدا ہوا

صوفی

صوفی:۔ سید شاہ فرزند علی۔ ان کا اصل نام ابو محمد جلیل الدین ہے۔ مرزا غالب سے تلمذ تھا۔ ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۶ھ میں انتقال کیا۔ صاحب تصانیف کثیر تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔

غرض ہے شمع سے پروانے کو کسی جا ہو
جو دور ہے رہ کعبہ کنشت ہی میں سہی

ہو الغفور ہے سرنامہ پر تو کیا غم ہے
گناہ اپنے خط سرنوشت ہی میں سہی

پائے انفاس سے جاتی ہے عمر
جادۂ راہ عدم تاک میں ہے

تنکے چنواتی ہے طفلی تیری
نیم کی کیل ستم ناک میں ہے

تقوے کی رت بدل گئی رندی کے دن پھرے
شیشہ بغل میں ہاتھ میں اب جام چاہیئے

ہر اک کو ہے بہار میں اک شوخ کی تلاش
بلبل کو گل مجھے بت گلفام چاہیئے

کل ہم کرینگے عرض کہ رحمت کی نذر کو
ہدیہ گناہ لائے ہیں۔ انعام چاہیئے

حاصل ہے میرے اشک کا حرماں کہیں جسے
سایہ ہے وہ مرا شب ہجراں کہیں جسے

خوگر ہوں مشکلوں کا امید وصال میں
دشوار مجھ پہ ہے وہی آساں کہیں جسے

ہر اک اشارہ ہے سبب انقلاب دہر
گردش ہی چشم یار کی دوراں کہیں جسے

صوفی بتائے منزل جاناں کی راہ کون	اب چپ ہے وہ جرس دل نالاں کہیں جسے

صوفی

صوفی:- منشی چنی لال خلف لالہ بلاس رائے کایستھ سکسینہ متوطن قصبہ بلاس پور علاقہ ریاست رامپور۔ تلمیذ مولوی یوسف خاں یوسف۔ آپ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر سے شاعری کا شوق تھا۔ فارسی عربی جانتے ہیں۔ عرصہ دراز سے کچھ حالات معلوم نہیں اور نہ کلام ہی کہیں طبع ہوتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

لکھا ہے یک قلم جو وصف روشن روئے جاناں کا	بجا ہے نام دیوانِ تجلّی میرے دیواں کا
طبیعت رات بھر اس فکر میں الجھی رہی لیکن	نہ بندش میں مری مضموں آیا زلف پیچاں کا
حسن کیونکر نہ جوانی میں بھلا ہووے دو چند	وقت پر باغ میں آتی ہے بہار آپ سے آپ

صوفی

صوفی:- ابوالمظہر حاجی شرف الدین احمد صدیقی باشندۂ میرٹھ ہندوستان کے مشہور تاجر کتب منشی علاؤ الدین کے فرزند ارجمند ہیں۔ ۹؍اپریل ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی سے واقف ہیں۔ اوائل عمر سے شعر و سخن کا ذوق ہے۔ شعر گوئی میں حضرت نوح ناروی سے تلمذ ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بارہ دری بنالیا زنداں کو اس طرح	ٹکرایا سر کو جس جگہ وحشی نے در ہوا
وہیں رندوں نے اک دنیا بسادی	جہاں ساقی نے میخانہ بنایا
کچھ سو چکر چراغ لحد بھی خموش تھا	داغوں میں دل کے بعد فنا بھی یہ جوش تھا
کہتا تھا پردہ پردہ میں اک سے راز عشق	اس انجمن میں دیکھنے کو جو خموش تھا
گرتا تھا اٹھکے نشہ میں ساقی کے پاؤں پر	بے ہوش تھا مگر مجھے پھر بھی یہ ہوش تھا
نکلی شراب ناب کی بوتل چھپی ہوئی	زاہد کی مصلحت تھی جو وہ خرقہ پوش تھا

صوفی

صوفی:- شیخ محمد عبدالخالق ولد شیخ خدا بخش۔ دہلی وطن آبائی تھا۔ مگر پابندی ملازمت کے باعث رامپور کی سکونت اختیار کی۔ داغ کی شاگردی کا دم بھرتے تھے سنہ ۱۲۹۰ھ میں ۲۵ برس کی عمر تھی۔ زبان صاف ہے۔

کیوں غیر کو مقتل میں کیا آپ نے بسمل	کیا ہم کو تڑپنا تہِ خنجر نہیں آتا
نہ وہ کرتے ہیں جاں بخشی نہ ہمکو ذبح کرتے ہیں	الٰہی کیا مصیبت ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
سمجھ کر شکر کو شکوہ ہوئے ہیں جان کے دشمن	ستائش جب گلہ ٹھہرے گلہ کیجئے تو کیا ٹھہرے

صوفی

صوفی:۔ منشی احمد خاں خلف محمد زمان خاں۔ مالک مطبع مفید عام آگرہ تھے۔ مولوی غلام امام شہید سے تلمذ تھا۔ عالم شباب میں گوالیار جا کر مہاراجہ سندھیا کے ملازم ہوئے۔ غدر کے کئی سال بعد آگرہ آئے اور مطبع مفید عام جاری کیا۔ ۱۲۹۶ھ ۷۴ سال کی عمر تھی۔ عرصہ ہوا انتقال فرمایا۔ اردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور پیرانہ سالی میں بھی زندہ دلی کا دم بھرتے۔ بلقیس۔ فریادِ دل۔ خلجان فیوضِ مائل۔ نامی مثنویاں ان کی تصنیف سے ہیں۔ مولوی نیاز علی صاحب۔ پریشان بندیلوی مؤلف تذکرہ شعر و سخن کے ایک مشاعرہ کی غزل انتخاب ہو کر درج تذکرہ کی جاتی ہے

برنگ سبزہ جو اُٹھے وہ پامال فنا ٹھہرے	کوئی کیا خاک اس عالم میں آئے اور کیا ٹھہرے
ہمارے جرم و عصیاں ہیں نجوم چرخ سے افزوں	تری رحمت کے گر ہم مستحق ٹھہرے بجا ٹھہرے
گلستان جہاں سے داغ حسرت لیچلے دل پہ	برنگ بوئے گل اک دم یہاں ٹھہرے تو کیا ٹھہرے
خدا کے واسطے صوفی غرور زہد کم کیجے	بتوں سے دل لگا کر تم تو حضرت پارسا ٹھہرے

صوفی

صوفی:۔ مفتی محمد اسلام اللہ صاحب صدیقی خلف مفتی محمد اکرام اللہ صاحب گوپاموی ثم اکبر آبادی۔ آپ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمت اللہ علیہ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے اجداد زمانۂ شاہی میں بہت معزز عہدوں پر ممتاز رہے۔ شیخ وجیہ الدین گوپاموی آپ کے مورثوں میں تھے۔ آپ کے والد مختاری کرتے تھے۔ صوفی صاحب کی ولادت ۱۳۱۱ھ ہجری میں ہوئی۔ فارسی۔ اردو۔ اچھی جانتے تھے۔ ۱۳۳۶ھ ہجری میں مرض طاعون کا نشانہ بن کر انتقال کیا۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ہے وضو کا ایک عالم کو کہ یہ خونِ شہیداں ہے	شفق بن کر فلک پر رنگ لائی ہے قضا اچھا
وہی چشموں کے سوتوں سے رہا جاری لہو برسوں	جسے دل میں چھپا رکھا تھا مثلِ آرزو برسوں
فراقِ دلربا میں مدتوں رویا کیا ہوں میں	بہایا ہے انہیں آنکھوں نے خونِ آرزو برسوں
نہ کر برباد ابھی سے دل مرا اے ناشکیبائی	رہیگی میہماں اس میں کسی کی آرزو برسوں
بس اتنی جان لے میری شکستہ خاطری ساقی	جو ٹوٹا گر کے نظروں سے تری وہ شیشۂ دل ہوں
مرا بننا بگڑنا پوچھئے تو اک تماشا ہے	مٹوں تو خاک میخانہ بنوں تو ساغرِ گل ہوں
اس حسنِ چند روزہ پہ اتنا نہ ناز کر	آئینۂ حباب میں صورت فنا کی ہے

صوفی

صوفی:۔ جناب محمد حیدر صاحب عرف منو نواب منصب دار سرکار نظام تلمیذ جناب میکش۔ صاف اور سادہ کلام ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

دیکھنے کیسا تھ ہی دل میں اُتر آتی ہے یہ	بات دنیا سے نرالی ہے تری تصویر میں
دیکھتا ہوں جب اُدھر پتھرا کے رہجاتی ہے آنکھ	ہائے کیا تاثیر ہے اُس چاند سی تصویر میں

صوفی

صوفی:۔ منشی محمد امتیاز علیخاں لکھنوی ابن منشی فیاض علی ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے شاعری میں مولانا غلام امام شہید سے تلمذ تھا۔ پہلے جمیل تخلص کرتے تھے۔ پھر صوفی تخلص اختیار کیا۔ کلام بیشتر فارسی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں بھوپال میں انتقال کیا۔ جہاں آپ وزارت کی خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کی خیرات کے قصے لکھنؤ اور گردو نواح میں مشہور ہیں آپ کا اردو کلام سوا مندرجہ ذیل دو اشعار کے نہ مل سکا۔

ہمارے درد نے کیا کیا وفا کی	اگر پہلو سے اُٹھا دل میں حیا کی
پری کے دست پرورنے وفا کی	وہ دیکھو اُٹھ چلی سُرخی حنا کی

صولت

صولت:۔ جناب حافظ شبیر علی تلمیذ رحمت بنارسی۔ طبیعت شوخ اور چلبلی معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ حالات نہ معلوم ہو سکے صرف دو اشعار ملے جو ہدیہ ناظرین ہیں۔

کبھوں نہ ملتا ہمیں تھم تھم کے شہادت کا مزا	تُو نے رُک رُک کے جو تلوار لگائی ہوتی

شوخیاں ہائے کہاں وصل کی شب جا کے چھپیں	یہ حیا آج تو آنکھوں میں نہ آئی ہوتی

صولت

صولت۔ منشی پیارے لال ولد منشی مہاراج بہادر صاحب کایستھ سریواستو۔ ۲ نومبر ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تحصیل اپنے بزرگوں سے کی۔ انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقف ہیں۔ آپ کے بھائی منشی رام نرائن صاحب شجرؔ تخلص کرتے تھے، اور قدر بلگرامی سے تلمذ تھا۔ ۱۹۱۲ء سے صولتؔ صاحب کو بھی شاعری کا شوق ہوا شروع میں اپنا کلام جناب عبداللہ خانصاحب عظمتؔ کو دکھلایا۔ اس کے بعد جناب سید فرزند حسین صاحب ذاخر سے تلمذ اختیار کیا جن کا ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا ہے۔

جناب صولتؔ کو ادب اردو سے بڑی دلچسپی ہے۔ مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے رہتے ہیں۔ رسالہ نظارہ لکھنؤ میں نائب مدیر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ کو اپنے استاد مرحوم مولانا ذاخرؔ سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ انہیں کے انداز کلام یعنی قدیم رنگ تغزل کے دلدادہ ہیں۔ بندش چست اور زبان صاف ہوتی ہے۔ جو مختصر کلام درج تذکرہ ہونے کے لئے روانہ کیا ہے۔ اسی کا انتخاب حاضر ہے۔

یہ عالم ہے فنا میں دل کے اجزائے پریشاں کا	بگولے ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہر ذرہ بیاباں کا
حدود قید میں بھی اے جنوں حاصل ہے آزادی	سمٹ آیا ہے آنکھوں میں مری نقشہ بیاباں کا
اثر کیسا زمیں پر پڑ رہا ہے شام کا یا رب	بھیانک ہوتا جاتا ہے سماں گور غریباں کا
اندھیرا دیکھ کر مر جائیں گے گھٹ گھٹ کے دیوانے	مناسب ہو تو دروازہ کھلا رہنے دو زنداں کا
جنوں کا جوش ہے زنداں میں وحشی تھم نہیں سکتا	نگاہیں کھینچے لاتی ہیں دم وحشت بیاباں کو
صرف زینت اب تو ہیں ان کے لئے شام و سحر	ہاتھ میں شب بھر ہے شانہ اور دن بھر آئینہ
نور خالق دے تو قد پر منحصر رتبہ نہیں	گھٹ کے آئینہ ہو گو ہر بڑھ کے گوہر آئینہ
کسقدر پہنچی ہے صولتؔ ضعف دل کی انتہا	شکل تو دیکھو ذرا اپنی اٹھا کر آئینہ
الجھن سوا نہ کیوں ہو مرے قلب زار کی	ٹھنڈی ہوا چلی ہے چمن سے بہار کی

مضطر ہوں آرزو سے دل بے قرار کی
اے بیخودی یہ راہ نہیں کوئے یار کی

پنہاں کسی کی زلف میں تارا سحر کا ہے
ہوتی نہیں جو صبح شب انتظار کی

پھولوں کی تھی ہوس تو اسیر قفس ہوا
اب دیکھوں کیا دکھائے تمنّا بہار کی

تم آئے مرمٹوں کا ستارہ چمک گیا
دامن تک آکے بڑھ گئی عزّت غبار کی

تم نے نقاب الٹ کے سر قبر کیا کیا
لو پھیکی پڑگئی ہے چراغ مزار کی

صولت

صولت :۔ مالک الدولہ مصاحب حضرت واجد علی شاہ والی اودھ تلمیذ جناب ہنر استعارات اور تشبیہات سے کام لیتے تھے۔ مگر کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :۔

آبرو میں فرق آیا۔ جان دی رسوا ہوئے
صولت اس سے دل لگا کر تم کو حاصل کیا ہوا

بزم پُر نور رکھے آٹھ پہر جام شراب
دن کو خورشید بنے شب کو قمر جام شراب

وہ مجھے تصویر اپنی دے کے یوں سمجھا گئے
ہم نہ آویں جب تلک تم اس سے بہلانا مزاج

ہمیں نے آپ کو انداز معشوقانہ سکھلائے
نہ ترچھی چتون آگے تھی نہ یہ بانکی ادا پہلے

خدا کی شان ہے کہتے ہیں وہ صورت نہ دکھلائے
سحر کو جس کا منہ ہوتا تھا آئینے کی جا پہلے

صہبا

صہبا :۔ چودھری عبدالاحد صاحب سندیلوی مرحوم چودھری واجد علی مرحوم رئیس سندیلہ کے پوتے تھے۔ عین زمانۂ شباب میں بعارضۂ ہیضہ ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ طبیعت بہت شوخ واقع ہوئی تھی۔ اگر زندہ رہتے تو ضرور مشقِ سخن سے شہرت حاصل کرتے۔ جناب ہاشمی مرحوم سندیلوی کے مشاعرے میں جو غزل پڑھی تھی۔ اس کا انتخاب درج ذیل ہے :۔

خرام ناز سے دل کا یہ حال ہوتا ہے۔
کہ جیسے پھول کوئی پامال ہوتا ہے

خود اس کے حال پہ روتی ہے بیکسی اُسکی
مریض ہجر کا جب غیر حال ہوتا ہے

زمانہ یاد کر اپنے شباب کا واعظ
کب امتیاز حرام و حلال ہوتا ہے

ہم اپنی حالت دل ان سے کیا کہیں صہبا	ذرا سی بات پر اُن کو ملال ہوتا ہے

صہبا

صہبا۔ مکند سہائے خلف اکبر منشی چُنّی لال متوطن صاحب گنج گیا۔ فارسی میں ذی استعداد تھے۔ عربی بھی پڑھی تھی۔ مولوی حکیم سید منیر الدین احمد کیفی مرحوم اور مولوی کاہنش جونپوری سے تلمذ تھا۔ عرصہ ہُوا کہ انتقال کر گئے یہ نمونۂ کلام ہے۔

رخ پہ ہلتی ہے تری زلفِ دوتا کیسی کچھ	شام سے سر پہ ہے نازل یہ بلا کیسی کچھ
پان کھاتے تو وہ کچھ اور ہی ساماں کرتے	پانی پانی جگرِ لعلِ بدخشاں کرتے

صہبا

صہبا۔ علی حسن صاحب مرادآبادی شاگرد حضرت مقتول مرحوم۔ زیادہ حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ ایک غزل کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیال کے شاعر ہیں۔

نئی یہ چھیڑ ہے ہنس ہنس کے مجھ سے کہتے ہیں	ترے ملال سے ہم کو ملال ہوتا ہے
سر غرور ہی افتادہ راہ میں ہے تری	کہ آسماں بھی یہاں پائمال ہوتا ہے
سناتا ہے جو کوئی اپنے درد کا قصّہ	وہ حرف حرف مرے حسبِ حال ہوتا ہے
جو گرم ہوتی ہے غیروں سے اُنکی بزم نشاط	یہاں بھی ورد سے غیر اپنا حال ہوتا ہے

صہبائی

صہبائی:۔ خواجہ عبدالسمیع پال۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ خلف مولوی احمد دین صاحب ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں پائی جس کی تکمیل لاہور میں ہوئی۔ فارسی اردو کی بہت اچھی قابلیت بہم پہنچائی انگریزی میں فلسفہ کی ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ شغل وکالت ہے۔ اپنے وطن سیالکوٹ میں اور کبھی ریاست جموں و کشمیر میں وکالت کرتے ہیں۔ اگر قصبہ سیالکوٹ کا تاج افتخار ڈاکٹر سر محمد اقبال ہیں تو اس کا طرّہ امتیاز عبدالسمیع پال ہیں۔ اور یہ عجیب حسن اتفاق کہ دونوں کشمیری الاصل ہیں۔ صہبائی کی جبلّت میں شاعری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کبھی اثر کبھی صہبائی تخلص کرتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں اثر صہبائی کے مشترک نام سے

مشہور ہیں۔ راقم کے مخلص احباب میں ہیں۔ اور کبھی کبھی مشورۂ سخن بھی راقم سے کرتے ہیں۔ رباعیات کا ایک مجموعہ جام صہبائی کے نام سے اور غزلیات اور نظموں کا دیوان خمستان کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتابیں مینجر آزاد بک ڈپو شہر سیالکوٹ سے مل سکتی ہیں۔ آپ حضرت ابن حزین کے چھوٹے بھائی ہیں جن کا کلام منظوم اکثر رسالوں میں امتیازی جگہ پاتا ہے۔ اثر صہبائی نے طبیعت بہت صالح اور معصوم مگر نہایت ہی درد آشنا پائی ہے۔ تعلّی و تبختر ان سے کوسوں دور ہیں۔ چونکہ مزاج میں سوز درد اور خلوص زہد ہے۔ طلبیات اور ہر قسم کے جھگڑوں سے دُور رہتے ہیں۔ وہ محض شاعر اور اصلی شاعر ہیں جو اس زمانے میں بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ وکالت میں دل نہیں لگتا۔ مگر کرنی پڑتی ہے۔

اثر صہبائی ہندوستان میں نئی تانتی کے بہترین شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے ہاں شوکت الفاظ کا جادو بہت کم ملے گا۔ بیاں کی برجستگی۔ ادا کی موزونیت۔ تخیل کی علوئیت۔ اسلوب کی چستی۔ جذبات کی معصوم چہل پہل اور تزکیہ احساسات ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ ان کے کلام میں آمد کا زور ہے۔ آورد اور لفاظی کا نام نہیں۔ زبان ایسی پیاری اور ستھری پائی ہے۔ کہ سبحان اللہ۔ کلام رواں دواں اور سوز و گداز سے بھرا ہوا ہے۔ اکثر شعروں میں ہی نہیں۔ غزلوں میں انداز میر کی چھاؤں پڑتی ہے جذباتی نظمیں شگفتگی اور دقیقہ رسی کی روح رواں ہیں۔ اور اردو کے اکثر رسالے آپ کے کلام سے زینت پاتے ہیں۔ جب سے ان کی رفیقۂ حیات نے دائمی جدائی کا داغ دیا۔ ان کا جی بجھ گیا۔ لامحالہ یہ بخار کلام میں پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے اور ایسے شاعر نہ ہوتے جیسے کہ ہیں تو عجب نہیں کہ یہ کیفیت مرض کی شکل اختیار کر لیتی۔ خمستان کا وہ حصّہ جس کا عنوان راختکدہ ہے۔ اس کیفیت قلب کی تمثال ہے۔ اسے توفیق ایزدی کہئے کہ اس دل کی ٹھیس نے زمزمۂ میری کو پھر تازہ کر دیا۔ یہ کیفیت خصوصی طور پر غزلوں

کی ہے۔ رباعیوں میں ایک غیر معمولی خوبی یہ ہے۔ کہ شبابیات کے علاوہ فلسفہ کے ایسے باریک اور دقیق نکتے حل کر جاتے ہیں۔ جو قاری کو ذرا گراں نہیں معلوم ہوتے۔ اسلوب کی شگفتگی وہی رہتی ہیں۔ نظموں میں سوز و گداز غزلوں سے کم نہیں۔ ولولہ انگیزی بھی خوب ہے۔ دعا ہے کہ اس عزیز کو عمر و صحت اور فارغ البالی نصیب ہو۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

آمد فصلِ بہاری تو نے یہ کیا کر دیا
پھر نگاہِ شوق جو پائے تماشا ہو گئی
چومتا پھرتا ہے کیوں اِک اِک کلی کو اے اثر
سرمستیاں عجیب ہیں صہبائے عشق کی
خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
دیکھ جی بھر کے مگر توڑ نہ مجھ کو گلچیں۔
کس قدر نظر پہ پردہ ہے ریاض ہستی بھی
بارہا ہوا دھوکا مجھ کو اپنی ہستی پہ
اللہ رے صہبائی مے نوش کی مستی
کعبہ میں ہو یا ہو بتکدے میں
گو کوئی کہیں نظر نہ آیا
گو تاروں پہ ٹکٹکی بندھی ہے
چوم لیتا ہے بتوں کو بھی کہ صہبائی ہے
حرم و دیر میں ہے گونج مرے نغمے کی
کعبہ و دیر چھان مارا ہے
کانپ اٹھتا ہے فلک دیکھ کے یہ زندہ دلی
عالم تمام میکدہ حسن بن گیا

پھر کسی کی یاد نے اِک حشر برپا کر دیا
دل کو پھر ذوقِ تمنا سے شناسا کر دیا
آمد فصلِ بہاری نے تجھے کیا کر دیا
پہلو میں دل ہے یا کوئی ساغر بھرا ہوا
ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا
ہاتھ بھی تو نے لگایا تو بکھر جاؤں گا
اک نگار خانہ ہے نقشہائے زیبا کا
نقش غیر فانی کا مظہر تجلے کا
کرتا ہے ہر اک گھونٹ پر سو شکر خدا کا
ہر سنگ ہے آستاں کسی کا
ہر ذرّے پہ ہے گماں کسی کا
دل کو ہے مگر گماں کسی کا
اس کو ہر شے میں نظر آتا ہے جلوا تیرا
کعبہ اپنا ہے۔ صنم اپنا۔ برہمن اپنا
کوئی اہلِ نظر نہیں ملتا
مسکراتا ہے اثر پھونک کے خرمن اپنا
رخ بے نقاب دیکھ کے صبحِ بہار کا

نگاہ شوق کی تھیں بدحواسیاں ورنہ
عجیب لطف سے معمور تھی وہ خاموشی

نغموں کو سن کے روح مری کیوں اداس ہے
جن کی نظر مثال ثریا بلند ہے

ہم کو فقط ہے ذوق نظر سے غرض اثر
رنگ ہو حقیقت کا یا بتاں زیبا کا

آندھیاں جوانی کی خوب رنگ لائی ہیں
کس قدر نظر پرور ہے ریاض ہستی بھی

اک جام بلانوش کو اندھیر ہے اندھیر
ہر چند نغمہ ریز رہا ساز ہست و بود

اے حسن کیا اسی سے یہ غفلت شعاریاں
حسن اور حسن بھی ہے فروغ شباب کا

احساس ہو رہا ہے گناہ و ثواب کا
ہر چند وقف دید رہا ہوں تمام عمر

وہ ذوق دید کیا جو نہ سرشار کر سکے
اک رند کم سواد ہے مست ازل نہیں

سرحد عقل سے پرے رفعت عرش سے بلند
جس حسن کی نقاب ہے رنگینئ مجاز

کیا خوب دو جہاں پہ مجھے اختیار رہے
کھل گیا راز بے خودی میرا

اب کچھ تو فیصلہ ہو حیات و ممات کا

ہزار بار وہ محفل میں بے نقاب آیا
مری زبان رکی اور انہیں حجاب آیا

ڈوبا ہوا ہے سوز میں مطرب کا ساز کیا
ان کے لئے تمیز نشیب و فراز کیا

کیا جانیں کیا ہے حسن ازل اور مجاز کیا
میں تو اک پجاری ہوں جلوہ ہائے رعنا کا

کیا بھڑک اٹھا شعلہ آتش تمنا کا
اک نگارخانہ ہے نقش ہائے زیبا کا

جاتا رہا بہکنے سے کبھی خوف خدا کا
لیکن کھلا نہ راز نواہائے ساز کا

ہر سانس جس کا تیر افسانہ طراز تھا
گویا چھلک رہا ہے پیالہ شراب کا

شاید اتر رہا ہے وہ نشہ شباب کا
لیکن بقدر شوق تماشا نہ ہو سکا

وہ حسن کیا جو قلزم صہبا نہ ہو سکا
جو بے نیاز ساغر و مینا نہ ہو سکا

جانے کہاں نکل گیا میں تجھے ڈھونڈتا ہوا
اب کیا کہیں وہ جلوۂ رنگیں ادا ہے کیا

میں سوچتا ہوں دل پہ بھی ہے اختیار کیا
اس کی آنکھوں میں ہے حجاب کا رنگ

تنگ آ گئے ہیں روز کے اس امتحاں سے ہم

سجدے کے داغ سے نہ ہوئی آشنا جبیں
یہ خواب ہے کہ حقیقت نہ ہو سکا معلوم

بیگانہ وار گزرے ہر اک آستاں سے ہم
رہی یہ بات کہ کچھ ہے سو وہ بھی کیا معلوم

جلوہ ہے کس کے حسن کا چشمِ خیال میں
ڈوب گیا ہے سازِ دل نغمۂ دل گداز میں

عالم تمام ڈوب رہا ہے جمال میں
موجِ مے سرور تھی خندہ جاں نواز میں

چاہے جسے عطا کرے اسکی ہیں سرفرازیاں
جوشِ نمود دیکھئے شوقِ شہود دیکھئے

ہیں کئی آسماں مری گردِ رہِ نیاز میں
حُسن نگاہ بن گیا چشمِ نظارہ باز میں

کیا فسوں ہے تری تمنا میں
مری ہر سانس کو سب نغمۂ محفل سمجھتے ہیں

داغِ حسرت کو بھول جاتا ہوں
مگر اہلِ دل آوازِ شکستِ دل سمجھتے ہیں

اب کہاں ابتدائے عشق کے لطف
آؤ آؤ کہ پھر ملیں نہ ملیں

اب وہ گلہائے نوبہار کہاں
زندگانی کا اعتبار کہاں

ہے اسی کو فقط ثبات یہاں
تو نے اسے متاعِ گرامی بنا دیا

ہم جسے انقلاب کہتے ہیں
رکھا ہی کیا تھا زندگیٔ مستعار میں

لطفِ گناہ میں ملا اور نہ مزا ثواب میں
تیرے شباب نے کیا مجھ کو جنوں سے آشنا

عمر تمام کٹ گئی کاوشِ احتساب میں
میرے جنوں نے بھر دئے رنگ ترے شباب میں

آہ یہ دن کہ جانگداز جوششِ اضطراب ہے
جنگل کی چاندنی میں یہ پھول جھومتے ہیں

ہائے وہ دور جب کبھی لطف تھا اضطراب میں
یا رقص ہو رہا ہے پریوں کا انجمن میں

ہنگامہ ہائے رونقِ دنیا کو کیا کروں
ہیں آبدیدہ رنگ تماشا کو کیا کروں

آپ سرکارِ ناز ہی ٹھہرے
میری ہستی بھی اک معما ہے

دل مرا خوگرِ نیاز نہیں
راز ہوں آشنائے راز نہیں

وہ کارواں نازؔ تو کوسوں نکل گیا
ہر چند جانتا ہوں فریبِ نگاہ ہے

گم شیخ و برہمن ہیں مگر گردِ راہ میں
میں پھر بھی مبتلا ہوں فریبِ نگاہ میں

بوئے گیسو جو کبھی حسن کی غمّاز نہ ہو — وادیٔ عشق میں یوں لطف تگ و تاز نہ ہو

روح کیوں مائل پرواز ہے ہنگام سماع — ساز مطرب میں کہیں تیری ہی آواز نہ ہو

زندگی ایک فسانہ ہے سو وہ بھی ایسا — جس کا انجام نہ ہو۔ جس کا کچھ آغاز نہ ہو

رگ رگ میں اک سرور ہے سوز و گداز سے — نغمے نکل رہے ہیں مرے دل کے ساز سے

کیا جانے کیا خزانہ ملا ہے کہ اہلِ درد — دونوں جہاں سے ہو گئے کچھ بے نیاز سے

نورِ سحر اسی میں ہے ظلمت شب اسی میں ہے — گردش چشم ہی تری گردش روزگار ہے

وہ رشک صد بہار آئے نہ آئے
یہیں ہے انتظار آئے نہ آئے
لپٹ کر چوم لے پھولوں کو بلبل
چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے

سیلاب تبسم ہے ساقی کی نگاہوں میں
ساغر مرا ساغر ہے صہبا مری صہبا ہے
بیگانۂ وحدت ہے تیری ہی نظر ورنہ
کعبے میں ہے بتخانہ۔ بتخانے میں کعبہ ہے

ہر گام پہ جھک جھک کے کی میں نے جبیں سائی — ہر نقش میں مجھ کو اک تصویر نظر آئی

چمن میں رقص نسیم بہار ہی رباب ہے ٹھنوہ نغمۂ مطرب — عبث ہیں یہ کاوشیں تری دل میں کھول کیا نہیں بہار کیا ہے

بے نیازی سے رہے وقف جہنم لیکن — جھک کے توبہ کی ندامت کو گوارا نہ کرے

سر وہی سر ہے نہ ہو جس میں خمار غم دوش — دل وہی دل ہے جو اندیشۂ فردا نہ کرے

جھک جھک کے دیکھتا ہوں میں طوبیٰ کو عرش کو — کچھ اس قدر بلند ملی ہے نظر مجھے

پرواز شوق کی نہ رکیگی نہ رک سکی — گو آسماں نے کر دیا بے بال و پر مجھے

طوفِ حرم نہ سجدۂ بُت خانہ چاہیئے — آزادہ رَو کو مسلک رندانہ چاہیئے

بر آسکے نہ یاس ہی اسکو مٹا سکے
ایسی بھی جانگداز تمنّا نہ چاہیئے۔
واعظ کی حد سے بڑھ گئیں ہرزہ سرائیاں
اے مے پرست نعرۂ مستانہ چاہیئے

تری باتوں سے تو اے شیخ ایسا جی نہیں جلتا — خدا غارت کرے اسکو جو پی پی کر پشیماں ہے

دنیا میں ہزاروں خوش شب ہیں یہ دنیا عشرت خانہ ہے — انس ہم میں لیکن میرا ہی اِک درد بھرا افسانہ ہے

تیرے جانے سے عجب رنگ ہے اے جان بہار
اب گلستاں بھی بیاباں نظر آتا ہے مجھے

موج طوفان خیز میں ہے اضطراب زندگی
اور سکون مرگ ہم آغوشئے ساحل میں ہے

اپنی ہستی ہے مرکز عالم
دیدۂ دل بھی وا کرے کوئی

موقوف آرزو پہ ہے ہنگامۂ حیات
مرجائیے پہ ترک تمنا نہ کیجئے

جب حسن کائنات ہوا ایسا سرور خیز
کیوں آرزوئے ساغر و مینا کرے کوئی

ہر شے سے پھوٹ پھوٹ کے نکلے شعاعِ حسن
لیکن نگاہِ شوق بھی پیدا کرے کوئی

کچھ شغل زندگی کے لئے بھی تو چاہئے
تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

آستانے نگاہ سے گذرے
نائل بندگی جبیں نہ ہوئی

لاکھ جلوے رہے نگاہوں میں
کوئی تصویر دلنشیں نہ ہوئی

کعبہ و دَیر و میکدہ میں رہے
دل کی تسکین مگر کہیں نہ ہوئی

اچھا ہے میں اسیر فریبِ بہار ہوں
بے رنگ و بو فریب سہی رنگ و بو تو ہے

سب کی سب باتیں سنیں منہ سے نہ کچھ بولا اثر
دیر تک احباب صہبائی کو سمجھائے رہے

رباعیات

تیری ہستی کا کچھ یقیں بھی نہیں
میرے لب پر مگر نہیں بھی نہیں
دیکھتا ہوں تو ہر جگہ موجود
سوچتا ہوں تو پھر کہیں بھی نہیں

ممتاز ہے شان ارجمندی میری
ہے روکش عرش سربلندی میری
سجدہ بھی کیا تو تیرے در پر یارب
نازاں ہے بہت نیازمندی میری

بیگانۂ ہوش ہوں کہ ہشیار رہوں میں
ہوں عالم خواب میں کہ بیدار رہوں میں
فطرت کی ستم ظریفیاں تو دیکھو
مجبور کو وہم ہے کہ مختار رہوں میں

غوغائے سکوت ہوں کہ تقریر کروں
ممکن نہیں سرنامۂ تقدیر کروں
تدبیر بھی کرنے پہ ہوں مجبور اثر
تقدیر میں لکھا ہے کہ تدبیر کروں

نظمیں۔ صبح و شام

سب دشت و جبل حسن سے معمور ہوئے ہیں
ذرّاتِ چمن غیرت صد طور ہوئے ہیں
پردے رخ محبوب سے کیا دور ہوئے ہیں
اشجار مے نور سے مخمور ہوئے ہیں
قدرت کی صراحی مے وحدت سے بھری ہے

جو نیلے سے آکاش پہ روشن ہیں ستارے
کس حسن کے جلوے ہیں یہ بے سوز شرارے
مہتاب کی کرنیں ہیں کہ ہیں نور کے دھارے
اندوہ ربا۔ روح فزا ہیں یہ نظارے
کس شاہد محبوب کی یہ جلوہ گری ہے

دل نامراد

صحن چمن کا برگ برگ
صفحۂ زرنگار ہے
خامۂ مانیٔ ازل۔
باغ کا خار خار ہے
رنگ ریاض کائنات
غیرت صد بہار ہے
اے دل نامراد تو آج بھی بیقرار ہے

ناکام محبت

او تغافل کیش اگر یوں ہی رہیں بے مہریاں
ایک دن خاموش پھر میری زباں ہو جائیگی
یہ مری ہستی کہ ہے اک شعلہ زار آرزو
ظلمت شہر خموشاں میں نہاں ہو جائیگی
گو مرا پیکر فنا ہو جائے گا لیکن مری
سادگی الفت کی زیب داستاں ہو جائیگی

محفل ہستی سے محروم تمنا جاؤں گا
نقش صدق عشق کا لیکن بٹھاتا جاؤں گا

شام کو دنیا کے ہنگاموں سے جب گھبرا کے تو
باغ میں پھولوں سے اپنی روح کو بہلائیگی
جب نہ پائیگی کہیں بوئے محبت کا نشاں
جب گلستاں کی کلی ہر ایک مرجھا جائیگی

آہ پھر اس وقت اے مست مے پندار حسن | یاد آ آ کے مری تجھ کو بہت تڑپائے گی
روح جنت کے لئے پھر پرفشاں ہو جائیگی
عارضی ہستی تری بھی جاوداں ہو جائیگی

ہونگے پھر فردوس کی پھولوں میں دونوں ہمکنار | خوگر فتنہ نہیں جس سرزمیں کا آسماں
جسکی ہر آواز میں ہے ربط الفت کی گونج | جسکی ہر وادی میں ہیں چشمے محبت کے رواں
پھر وہاں ہونگے ترے لبہائے لعلیں کے ایاغ | جنکی مستی میں ہے تاثیر سرور جاوداں
بے نیاز لطف و جور آسماں ہو جاؤں گا
چند جرعے پی کے کیف جاوداں ہو جاؤں گا

راحتکدہ میں سے

اک نالۂ جانستاں نہیں ہے | کب لب پہ مرے فغاں نہیں ہے
ہے دود سیاہ آہ ہستی | سر پر مرے آسماں نہیں ہے
اب کس سے کہیں فسانۂ غم | جب کوئی بھی رازداں نہیں ہے
معمورۂ غم ہے بزم امکاں | کوئی بھی تو شادماں نہیں ہے
وہ دل کہ تھا ایک قصر رنگیں | اب اس کا کہیں نشاں نہیں ہے
آواز شکست دل ہے ہمدم | اب نغمۂ شادماں نہیں ہے
اب خون جگر ہے اور میں ہوں | شوق مے ارغواں نہیں ہے
روداد اثر ہے اک حقیقت
افسانہ و داستاں نہیں ہے

حریم ناز میں میری نماز ہو جائے | جبیں شوق سراپا نیاز ہو جائے
ہر ایک شے میں درخشاں ہو جلوہ معصوم | مری نگاہ اگر پاک باز ہو جائے
پھر آرزوؤں سے معمور ہو گیا اے حسن | دیار دل پہ پھر اک ترکتاز ہو جائے

یہ میری زیست کا حاصل ہے آپ کا کیا ہے
اگر نگاہ محبّت نواز ہو جائے

کچھ ایسا نغمۂ بیتاب چھیڑ اے مطرب
کہ بیقرار مرے دل کا ساز ہو جائے

وہی ہے رند حقیقت شناس نظروں میں
کہ پیر میکدہ سے بے نیاز ہو جائے

تلاش خویش میں گم ہوں یہ کیا قیامت ہے
کہ راز آپ ہی جویائے راز ہو جائے

نہ کٹ سکیگی شب تار زندگانی کی
یہ داستان محبّت دراز ہو جائے

بہشت زیست ہے سوز و گداز عشق اثر
خوشا وہ دل کہ سراپا گداز ہو جائے

ض

ضابط

ضابط:۔ چودھری محمد اصغر علی صدیقی رئیس کبھرہ بزرگ۔ بدایوں۔ آپ کے بزرگ شاہی زمانہ میں سرفراز اور دربار میں ممتاز تھے۔ چودھری صاحب ظریف الطبع۔ خوش مزاج۔ اور رؤسائے عصر میں نامور تھے۔ ضلع بدایوں میں خاندان "بارہ گاؤں کے چودھری" صاحبان میں منقسم ہے۔ جس کا بڑا حصّہ موضع تال گاؤں میں آباد ہے آپکے مورث غزنی سے سلطان محمود کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔

علوم درسیہ کی تحصیل کے ساتھ ساتھ آپ نے علماء و فضلا کی صحبت اٹھائی تھی۔ اخلاق و تہذیب کے سایہ میں تربیت پائی تھی۔ عالی ہمّت اور باحوصلہ رئیس تھے۔ آپ کو ابتدائے عمر ہی سے شعر و سخن کا شوق تھا۔ فکر رسا اور زبان شستہ تھی۔ آپ کے مکان پر جو مشاعرے منعقد ہوتے ان کا انتظام وسیع پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ حضرت اسیر لکھنوی۔ اور منشی اسمٰعیل حسین منیر وغیرہ بھی بدایوں تشریف لیجاتے اپنی دلبستگی ادب کے خیال سے وطن مالوفہ کو چھوڑ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی

۱۸۹۱ء میں بمقام لکھنؤ آپ کا انتقال ہوا اور جنازہ لکھنؤ سے بدایوں لایا گیا۔ دیوان مطبوعہ وکٹوریہ پریس بدایوں آپ کی یادگار ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

بھلا ہو چارہ گر تیرا چھڑک دی ایک دو چٹکی
مرا زخم جگر تکتا ہے منہ کب سے نمکداں کا

ادائیں سبھی آفتِ جاں ہیں لیکن
مٹاتا ہے بے ساختہ پن کسی کا

لے گیا سو بار بزم غیر میں
شوق نے کیا کیا مجھے رسوا کیا

آگیا فقروں میں اک عیار کے
ضابط ناداں یہ تو نے کیا کیا

مجھے وہ دیکھتے ہی منہ پہ زلفیں کھول دیتے ہیں
نئے انداز کا پردہ نکالا ہے یہ چلمن کا

جذب دکھلائیگا کچھ اپنا اثر آپ سے آپ
کھینچ لیگا ترے پیکاں کو جگر آپ سے آپ

خط کا آغاز ہے کیوں آتشیں رخساروں پر
سبزہ اُگتے کبھی دیکھا نہیں انگاروں پر

رنگ لائے سر مژگاں مرے اشک خونیں
پھول کھلتے ہوئے دیکھے ہیں انہیں خاروں پر

دل تڑپتا ہے کسی کی ملگجی پوشاک پر
سادگی کا نوجوانی میں یہ عالم دیکھکر

مست کی طرح اُٹھا جھوم کے کالا بادل
میکشو مژدہ کہ وہ جھوم کے آیا بادل

مجبور ہو گئے دل خانہ خراب سے
کیا جانتے نہ تھے انہیں کچھ پیشتر سے ہم

ٹھنڈا کیا نہ دل نفس سرد نے کبھی
جل جل گئے ہیں سوزش زخم جگر سے ہم

زاہد سیاہ کاروں پہ ہنسنا روا نہیں
دھو ڈالیں گے کتاب عمل چشم تر سے ہم

قصہ ہستی کا ہوا ختم کہ پیری آئی
رات بھر کی یہ کہانی ہے سحر کچھ بھی نہیں

مشتعل ہوتی گئیں سینے سے روکا جس قدر
میری آہیں بھی چراغ زیر داماں ہو گئیں

عشق وہ عشق ہے باقی نہ رہے ننگ کا نام
شوق وہ شوق کہ چھوڑے بھی نہ تار دامن

حسرت و یاس کبھی ہے کبھی امید و رجا
مشغلے اپنے ہیں کیا کیا شب تنہائی میں

بہاریں زرد پھولوں کی کھبی جاتی ہیں نظروں میں
جنوں کیونکر نہ پلکوں سے چنوں خار مغیلاں کے

اٹھاؤں نہ کیونکر جفائیں تمہاری
کہ دل میں کھبی ہیں ادائیں تمہاری

زباں پر نہ آیا کبھی حرفِ مطلب	وہ کیا جانیں کیا آرزو تھی کسی کی
کچھ بھی ہو مگر کوچۂ جاناں میں رہینگے	ہم قیس نہیں ہیں جو بیاباں میں رہینگے
واعظ کبھی ڈرائے نہ شور نشور سے	اس پر حقیقت شب فرقت اگر کھلے

ضابط

ضابط۔ مہر علی دہلوی۔ تیزِ فکر، خوش وضع جوان تھے۔ صرف و نحو عربی سے خوب واقف تھے۔ تذکرۂ گلستانِ سخن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۲۷۱ھ میں زندہ تھے۔ اور اپنے والد کے ساتھ دہلی میں قیام تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

حشر میں خاک سے سب لوگ تو نکلے لیکن	قبرِ عاشق سے جو دیکھا تو دھواں سا نکلا
نام کی تو شرم کر ضابط خدا کے واسطے	یہ ترا گریہ تجھے آخر بہالے جائیگا
یوں تو ہر ایک سے وہ خلق سے پیش آتا ہے	ایک ہم ہیں کہ کبھی ہم سے نہ کی پیار کی بات

ضاحک

ضاحک: میر غلام حسین ولد میر عزیز اللہ دہلوی۔ میر حسن صاحب مثنوی بدر منیر کے والد تھے۔ دہلی کی سکونت ترک کر کے فیض آباد میں سکونت اختیار کی۔ بقول صاحب تذکرہ گلزار ابراہیمی ۱۱۹۶ھ میں فیض آباد میں حیات تھے۔ اور وارستگی سے بسر کرتے تھے۔ مرزا رفیع سودا نے ان کی ہجو میں کچھ شعر کہے تھے۔ انہوں نے بھی مرزا سودا کی ہجو کہی۔ جس میں سے کچھ اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

	ہجو	
سودا کی لغویات کو ضاحک نہ دیکھ رہ		جلدی جلادے اسکی یہ ابیات کر کے تہ
پوچھے اگر وہ کیا مری تقصیر تو یہ کہہ		ایں زادہ زیاد نہ کر دست ہیچ گہہ

نمرود ایں عمل کہ تو شداد کردۂ

موزوں خورد سالی میں تیں شعر جو کیا	جا کر فشونِ شاہ میں اصلاح کو دیا
واں جس مغل نے بات کا مضمون پالیا	چشمک زد آں خشونی وگفتہ بیا بیا

من ہم بہ بینمش کہ چہ ارشاد کردۂ

شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی	وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی

گوناگوں شعر کہنے پہ تیری زباں کھلی	ہرگز کسے نہ گویدت آقا علی قلی

زیں گفت گوعبث دل خود شاد کردۂ

کیا دیجئے اصلاح خدائی کو وگرنہ	کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

ضامن

ضامن۔ حکیم محمد ضامن اکبرآبادی۔ راجہ چندولعل دیوان حیدرآباد کی سرکار میں بزمرۂ شعرا ملازم تھے۔ طب میں بھی دخل رکھتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

ہے آج ہر نفس نفسِ واپسیں مجھے	گر قتل کر کے جائیں تو احسان آپ کا
کون اُٹھ کر گیا کہ ضامن تو	آپ میں اب تلک نہیں آتا
شیوۂ ظلم سے مشہور ہوا عالم میں	قتل سے میرے تجھے اور ہُوا کیا حاصل

ضامن

ضامن:۔ سید ضامن علی ضامن چشتی صابری پانی پت۔ ضلع دہلی کے رہنے والے اور باکمال فقیر تھے۔ کلام پاکیزہ اور معرفت سے پُر ہے۔ ۷۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۶ھ میں جلال آباد میں انتقال کیا۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ ان کی صدہا غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔

چشم حق بیں سے غور کر دیکھا	یار آیا نظر جدھر دیکھا
کعبہ و دیر و میکدہ مسجد	اُس سے خالی نہ کوئی گھر دیکھا
راز مخفی کو جب کیا ظاہر	سر منصور دار پر دیکھا
اتنا تو روز ظلم نہ کر مجھ فقیر پہ	بندے خدا کے ہم بھی تو بندے خدا کے ہیں
کون کہتا ہے کہ عاشق مر چلے	قید سے چھوٹے وہ اپنے گھر چلے
خفتگانِ خاک کے مرقد پہ تم	اے صنم کیا حشر برپا کر چلے

ضامن

ضامن:۔ ضامن علی شاگرد مضطر خیرآبادی کچھ زمانہ ہُوا کہ اُدیپور میواڑ میں ملازم تھے۔ مذاق شاعری پُرانے رنگ کا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کیا کروں اپنے ہی دل پر نہیں قابو اپنا	ورنہ ممکن ہی کہاں ہے کہ شوخ نہ ہو تو اپنا

جب کہ ہو جلوۂ دیدار ہر اک جا ضامن	ہے یہ مشکل کہ نہ ہو تذکرہ ہر سو اپنا

ضامن ۱۰۵ صفحہ

ضامن:۔ لفٹننٹ سید ضامن علی صاحب ایم۔اے صدر شعبہ اُردو الہ آباد یونیورسٹی آپ راقم کے مہربان ہیں۔ کئی دفعہ الہ آباد میں ملاقات ہوئی۔ تذکرہ کے لئے ہر دفعہ زبانی عرض کیا اور عریضے بھی بھیجے۔ لیکن آپ نے اپنے حالات نہ کلام سے ممنون فرمایا۔ آپ کا مذاق سخن اعلےٰ ہے۔ ویسے خوش خلقی سے ملتے ہیں۔ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں مگر نہ معلوم اس بے اعتنائی کی کیا وجہ ہوئی۔ ایک غزل گلدستہ ریاض سخن میں دیکھی گئی اس میں سے چند اشعار انتخاب کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔

جذب کی تاثیر قابل دیکھنے کے ہے حضور	دل ہے یا ہے آپ کے ناوک کا پیکاں دیکھئے
چشم حق بیں ہو تو کوہ طور کی حاجت ہے کیا	ذرّہ ذرّہ میں جمال روئے جاناں دیکھئے
ہم نے مانا شکوۂ بیداد سے بدلے گی خو	کس کی آنکھوں سے مگر ان کو پشیماں دیکھئے
انبساط دل کا باغ دہر میں کیا اعتبار	پھول ہوتے ہی ہوا غنچہ پریشاں دیکھئے
کھپ گئی نظروں میں اے ضامن بہار حسن یار	اب تو کچھ دن تک گلستاں ہی گلستاں دیکھئے

ضبط

ضبط:۔ جناب منشی رام سروپ صاحب خلف چودھری بابو رام صاحب شیدا کائستھ سرپو استو۔ آپ کی عمر اس وقت تخمیناً ۳۸ سال کی ہے۔ اور خزانہ صدر کلکٹری سیتاپور میں ملازم ہیں۔ انگریزی میں انٹرنس پاس کیا ہے اور فارسی کی تعلیم بقدر ضرورت حاصل کی ہے۔ آپ نے اپنا مختصر سا کلام درج تذکرہ ہونے کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

وصل سے خوش نہ ہوا ہجر سے نالاں نہ ہوا	میں وہ انساں ہوں کہ مجھ سا کوئی انساں نہ ہوا
آنکھ وہ آنکھ نہیں جس میں نہ ہو دید کا شوق	دل وہ کیا دل ہے کہ جس دل میں تو مہماں نہ ہوا
تیغ کی آنکھ لڑ گئی جلوہ گہ مجاز میں	بت سے لگا چکے ہیں دل کیا لگے جی نماز میں
قاتل سنگ دل نے منہ پھیر لیا جو بعد قتل	حسرت دید رہ گئی چشم شہید ناز میں

حسرت و رنج و درد و غم میرے قدیم مہرباں
آ کے ہوئے شریک غم میری شب دراز میں

عشق بتاں میں مر مٹا راہ خدا بھی پا گیا
راز حقیقت آشنا ضبط کھلا مجاز میں

مخمس

پھولی نہیں سمائی خوشی سے ہزار اب
ہے نغمہ زن کہ آئی ہے فصل بہار اب

غنچے چٹک کے کہتے ہیں یہ بار بار اب
فیض بہار سے گل رنگیں ہیں خار اب

دامان کوہ و دشت بھی ہیں لالہ زار اب

باہر ہے نامیہ بھی حد اختیار سے
گل کھل رہے ہیں بید کی بھی شاخسار سے

پیہم صدا یہ ہے لب شاخ چنار سے
محروم کوئی شے نہیں فیض بہار سے

خاک چمن بھی بن گئی مشک تتار اب

باد صبا کو چین کہاں بے قرار ہے
بلبل کے چہچہے ہیں سریلی ملار ہے

فصل بہار دوش صبا پر سوار ہے
گلہائے خرمی کا کھلا لالہ زار ہے

درد و الم ہیں سب مرے دل سے فرار اب

ضبط:- شیخ محمد بخش اجمیری کلرک آڈٹ آفس ریلوے تلمیذ نواب عبداللہ خاں مطلب۔ شعر شاعری کا مذاق قدیمانہ اچھا ہے۔ الفاظ چست۔ بندشیں درست ہوتی ہیں مضمون آفرینی کے لئے جد و جہد نہیں کرتے۔ یہ آپ کے اشعار ہیں۔

بے بلائے وہ کسی روز مرے گھر آتے
جب تو اے آہ رسا ہیں ترا قائل ہوتا

کس پر آیا ہے۔ کہاں یہ دل شیدا آیا
جو مجھے ڈر تھا وہی سامنے دیکھا آیا

وہ دل ہدف ناوک بیداد فلک ٹھٹے
جس دل میں ترے وصل کا ارمان رہا ہو

بزم محبوب میں اے حضرت دل چپ سے رہنا
شکر بھی تم جو کرو گے تو شکایت ہوگی

تم نے محشر میں اگر آنکھ اٹھا کر دیکھا
کس کو اللہ سے فریاد کی طاقت ہوگی

کہہ رہے ہیں خواب میں بوسے لئے
یہ نرالے ڈھنگ ہیں الزام کے

اُسی کا ذکر لب پر ہر گھڑی ہے	ترا منہ چوم لوں ناصح ادھر آ

ضبط

ضبط :۔ سید حسین شاہ مرحوم شاگرد شیخ قلندر بخش جرأت مرحوم۔ طبع موزوں اور ذہن خداداد تھا۔ "مرات حیدری" انہیں کی تصنیف سے ہے۔ کئی رسالے جن میں رمل اور جفر کے قواعد کو نظم کیا۔ آپ کی زور فکر کا نمونہ ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

پھلنسے گی دل پہنچ کے یہ بے پیر دوش پر	چھوٹی سی زلف دیکھ کے کہتے ہیں شانہ میں
پاؤں کے بدلے چاہئے زنجیر دوش پر	عشق اس کی زلف کا سر کا ندھے پہ ہی سوار
ہے ابر اور برق کی تصویر دوش پر	افشاں چھڑک کے زلف جو کھولی ہے آپ نے

ضبط

ضبط :۔ حاجی سید سلطان احمد لکھنوی شاگرد حضرت جلال مرحوم۔ شیریں کلام و خوش بیاں ہیں۔ لکھنؤ کے روزمرہ سے واقف اور زباں داں ہیں۔ فکر رسا کو نئے مضامین کی تلاش رہتی ہے۔ اشعار کی ترکیب دل آویز ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

ایک مذہب ہو گیا ہے کافر و دیندار کا	سب تجھی کو جانتے ہیں اے صنم اپنا خدا
جا چکا درد وہ جس درد کا درماں نہ رہا	دل مضطر میں ترے تیر کا پیکاں نہ رہا
دل کے ہاتھوں ہے ابھی دیکھئے کیا کیا ہونا	در بدر خاک بسر خلق میں رسوا ہونا
بگڑے نہ بات لاکھ بنے اپنی جان پر	اے درد عشق اُف بھی نہ آئے زبان پر
چلے آئے تھے بت خانہ سمجھ کر	ہم اور آتے ترے کعبہ میں اے شیخ
چلو رفتار مستانہ سمجھ کر	پڑے ہیں راہ میں کچھ شیشۂ دل
اے دل کدھر چلا ہے ذرا ہوشیار رہو	کوچہ سے اس کے کوئی سلامت پھرا نہیں
اپنی صورت دیکھ لو پہلے اُٹھا کر آئینہ	پوچھنا تم بعد مجھ سے میری حیرت کا سبب
دل ہی بیتاب مرا شوخ طبیعت اُن کی	کیوں نہ اُنس ان کو ہو مجھ سے مجھے الفت انکی
جور کے پردہ میں مجھ پر ہے عنایت اُن کی	آئے ہیں ساتھ رقیبوں کے عیادت کو مری
نہ نکلی پھانس اس پر بھی جگر کی	محبت ترک کی اُس فتنہ گر کی

مال کیا مال ہے دل دیکے نہیں جان بھی دی ... دل بہت کر گئے تھوڑی سی بضاعت والے

نہ آؤ بھیجدو تصویر ہی تسلّی کو ... کوئی تو دل کے بہلنے کا مشغلہ ہو جائے

ضبط:۔ سید آغا جان ولد سید روشن علی خاں برادر نواب معتمد الدولہ بہادر لکھنوی آپ کانپور میں پیدا ہوئے۔ مگر لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اور آخر عمر تک وہیں رہے فنِ شاعری میں میر ہادی علی بیخود لکھنوی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۶۹ھ میں زندہ تھے۔ رعایت لفظی کو حسن سخن جانتے تھے۔ نمونہ کلام پیشِ ناظرین ہے:۔

اس گھر میں جز ملال نہ عشرت ہوئی مقیم ... وہ کون سی گھڑی تھی ہوئی جب بنائے دل

تجھ کو ہے شغل عشق یہاں دم پہ بن گئی ... ہم ایسے مشغلے سے ترے باز آئے دل

عاشق ہوا تو ہجر میں تڑپائے اسے ... تجویز خوب آپ نے کی ہے سزائے دل

یاد آجاتی ہے ساقی تری چشم مخمور ... دیکھتی ہیں جو کبھی ساغر و صہبا آنکھیں

تو سراپا چمن حسن ہے اے رشکِ بہار ... رخ ہے گل سرو ہے قد نرگس شہلا آنکھیں

ضبط:۔ لالہ بہاری سنگھ شاگرد کریم بخش فرقت شاہجہانپوری۔ تیز طبیعت جوان فکر معلوم ہوتے ہیں۔ دو شعر دستیاب ہوئے۔ جو درج کئے جاتے ہیں۔

بھرے ہیں دید کے ارمان دل میں مدت سے ... ادھر بھی ایک نظر اے صنم خدا کے لئے

جو دیکھا دم میں ہزاروں کے دم فنا کرتے ... قدم قضا نے ستمگر تری ادا کے لئے

ضبط:۔ صاحبزادہ حبیب اللہ خاں۔ آپ ریاست ٹونک کے خوش طبع با وضع رئیس زادوں سے ہیں۔ علم رسمیہ سے واقف اور فارسی علمِ ادب۔ علم بدیع و عروض میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ فنِ شعر گوئی میں نواب سلیمان خاں صاحب اسد لکھنوی سے تلمذ تھا۔ سید اصغر علی آبرو اور صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق ٹونکی کے ہم مشاعرہ ہیں۔ آپ کا دیوان "تحفۂ ضبط" المعروف بہ "خونابۂ خیال" جو ۱۳۰۵ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں طبع ہو چکا ہے۔ اپنے رنگ میں جذبات عشق کا مرقع اور معاملات

حسن کا دفتر ہے۔ بندش کی شستگی و صفائی زبان دانی کی آئینہ دار ہے۔ کہیں کہیں رعایت لفظی کے جلوے اپنا کرشمہ دکھا جاتے ہیں مگر وہ بیان کی بے تکلفی میں سدِّ راہ نہیں ہوتے خال خال تشبیہات ہیں جن کی آرائش طبع کو ناگوار نہیں معلوم ہوتی۔ نعت بھی خوب کہتے ہیں۔ نعتیہ دیوان موسوم بہ مرقعِ فیض، زیور طبع سے آراستہ ہوچکا ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

کچھ اور تھی نہ خلقت کونین سے غرض / منظور حق کو تیرا ظہور جمال تھا

آنے لگے ہیں لختِ جگر آنسوؤں کے ساتھ / اب رنگ دیکھنا مژۂ اشکبار کا

دل میکشوں کے کھینچتا ہے سوئے میکدہ / آنا یہ جھوم جھوم کے ابرِ بہار کا

کچھ کچھ تسلیاں بھی مری جان دیجیئے / تھم تھم کے حال سنئے دلِ بیقرار کا

ثابت ہوا یہ عہد شکستہ نہیں ترا / ٹوٹا ہوا ہے دل کسی امیدوار کا

چارسو عکس فگن ہے رخِ تاباں کس کا / صورت آئینہ خورشید ہے حیران کس کا

زلف و روئے یار سے عالم میں کیا نیرنگ ہے / کوئی کافر ہو گیا کوئی مسلماں ہو گیا

واہ رے جذب محبت کہ نہ چھوڑا دل نے / مرکے بھی سینۂ بسمل سے نہ پیکاں نکلا

سب جھوٹ ہے اغیار کی باتوں پہ نہ جاؤ / میں اور گلہ آپ کی بیدادگری کا

میں ہوں دیوانۂ الفت تم اپنی فصد لے ناصح / رگِ دل پر نہ ہوگا کارگر نشترِ نصیحت کا

چال ایسی چلا وہ محشر میں / داورِ حشر بھی ادھر نہ ہوا

بیکسی تجھ پہ رحم آتا ہے / کون پوچھے گا میں اگر نہ ہوا

یاس منہ دیکھتی ہے قاتل کا / آب خنجر سے حلق تر نہ ہوا

میں نے کہا کہ یاد ہے وعدہ بھی وصل کا / بولے کہ اس خیال کو دل سے بھلائیں آپ

شباب آتے ہی پامال دردِ عشق ہوا / بہار آئی چمن میں مرے خزاں کی طرح

پھر کے دل میں ہے جو اس بانیِ بیداد کی یاد / ہے تسلی کی تسلی مجھے اور یاد کی یاد

ہُوں وہ بُلبل کہ رہا ہو کے بھی پابند رہا
آ گئے اس دیدۂ گریاں کے شبِ فرقت میں
پسِ مُردن خزاں میں بھی نہ چھوٹا باغ بلبل سے
کمال حُسن پر پھولیں نہ یہ گُلرو کہ ضبط اکدن
جان جانی ہے شبِ غم اے فلک کس پاس سے
رسوا کیا ہے اب تو اس عشق نے یہانتک
سرمجنوں کی دیتا ہوں قسم دستِ جنوں تجھکو
اُٹھو رندو۔ چلو ابر بہاری جھوم کر آیا
دل مضطر کو سنبھالوں کہ جگر کو تھاموں
اثر الفت کے اب کچھ کچھ نمایاں ہوتے جاتے ہیں
چلے وہ ہو کے رخصت تو مرے ہوش و خرد لے لے
دل میں ڈھونڈا نہ اُسے دیر و حرم کو دوڑے
آؤ مل جاؤ تم اغیار کی باتوں پہ نہ جاؤ
ہاتھ اک اور بھی بسمل کے لگاتے جاؤ
ہیں وہ مجذوب مسیح بھی اُس کو لگاتے ہاتھ
اے اضطرابِ دل ترا خانہ خراب ہو
دامن تر سے مرے آتشِ دوزخ ہوئی سرد
طرفہ عالم ہے محبت کے پریشانوں کا
کون آیا کہ گئے ہوش ترے اے ساقی
برہم ہوئے تو حسن کی خوبی سوا ہوئی
ناتوانی سی ناتوانی ہے

دل سے اک دم نہ گئی خانۂ صیاد کی یاد
ہم بھی دیکھیں کہ برستی ہیں گھٹائیں کیونکر
ہوائے شوق میں اُڑتے ہیں برگِ خزاں ہو کر
اُڑے گا شعلۂ حسنِ رُخ رنگیں دھواں ہو کر
دیکھتی ہیں حسرتیں بیمار ہجراں کی طرف
اُٹھنے لگی ہیں ہم پر غیروں کی اُنگلیاں تک
کفن کا بھی نہ رکھنا تار تک باقی گریباں میں
گلابی پھول سے بھر کر بیٹھیں صحنِ گلستاں میں
چاہیں دم بھر کسی پہلو شبِ ہجراں میں نہیں
کہ اپنے جور سے وہ خود پشیماں ہوتے جاتے ہیں
ٹھہرو جانے والے ہم بھی تیرے ساتھ چلتے ہیں
کچھ سمجھ بوجھ مگر شیخ و برہمن میں نہیں
دیکھو جو صلح میں ہے بات وہ اَن بن میں نہیں
زیست اور موت میں جھگڑا ہے چکاتے جاؤ
تیرے مریض غم کی شفا ہے خدا کے ہاتھ
گھبرا گئے وہ سینے کو میرے لگا کے ہاتھ
زاہد خشک نہ کام آئی عبادت تیری
جمع دو چار جہاں ہو گئے محفل ہے وُہی
ہاتھ سے جام گرا پاؤں سے بوتل ٹوٹی
شوخی سے ناز۔ ناز سے پیدا ادا ہوئی
بات بھی اب تو کی نہیں جاتی

نمک پاشی جو ہو حسنِ ملیح روئے قاتل سے
اٹھے شورِ قیامت ہر دہانِ زخمِ بسمل سے

نظر ڈالی یہ کس مستِ ادا نے بزمِ رنداں پر
کہ بیہوشی ہوئی جاتی ہے پہلے دورِ ساغر سے

ضحا

ضحا۔ غلام رسول نام کلام میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے نمونہ کلام یہ ہے

بس یہی امید ہے اس طالبِ دیدار کی
ہو ہمیشہ سامنے آنکھوں کے صورت یار کی

غیرتِ مہر وہ عارض جو نمایاں ہو جائے
داغِ دل اپنا یقیں ہے مہِ تاباں ہو جائے

ہم کو ہرگز نہ رہے دیر و حرم سے کچھ کام
اپنا مسکن جو کبھی کوچۂ جاناں ہو جائے

ضرغام

ضرغام۔ ابوضیا سید عبدالغفور ولد مولوی نجات علی منصبدار علاقہ جاگیر مالی گاؤں متعلقہ مومن آباد ضلع بیڑ سرکار نظام۔ ۱۳۲۰ھ میں عمر ۴۲ سال تھی۔ عربی فارسی۔ مرہٹی زبانیں بقدر ضرورت جانتے ہیں۔ مولوی یعقوب علی اشہر۔ میر عبدالرؤف شوق کے ہم بزموں میں ہیں۔ پنج آہنگ ضرغام۔ ضرغام اللغات۔ دولت خانۂ اردو۔ نوائے ضرغام ان کی تصانیف غیر مطبوعہ بتلائی جاتی ہیں۔ فارسی میں مدح کے میدان میں ذہن خوب لڑتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

تری فرقت نے سودائی بنا رکھا ہزاروں کو
ترے عدل نے جانیں پھونک دیں امید کے تن میں

شہِ ملکِ دکن کے دستِ گوہر بار سے ابدل
نہ دریا میں رہے موتی نہ باقی لعل معدن میں

خوشامد کو تری بلبل مبارکباد کہتی ہے
تری تعظیم کو سیدھے کھڑے ہیں سرو گلشن میں

ترا نخلِ تمنا بار ور ہو دائماً شاہا
دُرِ مقصود ہوں یارب ہمیشہ تیرے دامن میں

ضرغام

ضرغام۔ مرزا بہادر بیگ دہلوی۔ فنِ پہلوانی میں چاق چوبند تھے۔ دنگل کی طرح میدان سخن میں بھی ہاتھ پاؤں نکالتے۔ مگر کم مشقی کی وجہ سے رستمانِ معانی کے آگے زور نہ چلتا تذکرہ گلستانِ سخن سے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

کیا پوچھتا ہے ہمدم حالِ شکستگاں کو
جاتے ہیں ہم وہیں کو اٹھتا ہے منہ جہاں کو

خاکِ ضرغام کا کوسوں نہیں لگتا ہے پتہ
تیری شوخی نے کیا کیا اسے برباد نہ پوچھ

ضمیر۔ شیخ۔ مداری۔ اکبرآبادی شاہ نظیر اکبرآبادی سے تلمذ تھا اپنے استاد کی طرح سادہ زبانی اور شوخ محاورات عزیز تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

جب تک کہ تو جلوہ گر نہ ہووے / میری شبِ غم سحر نہ ہووے
افسوس کہ جی سے ہم گذر جائیں / اور تیرا اِدھر گذر نہ ہووے
مر جائیں ہم آہ آہ کرتے / پر دِل میں ترے اثر نہ ہووے
عاشق ترا اپنی جان کھووے / پر حیف تجھے خبر نہ ہووے
صد حیف ضمیر ہم تو روویں / تیری کبھی چشم تر نہ ہووے
وہ ابھی ہی نو گلِ آرزو۔ وہ ہنوز تازہ بہار ہے / نہ کچھ آئینہ کی خبر اُسے نہ حیا سے کچھ سروکار ہے

ضمیر۔ سید ضمیر قاسم رئیس موضع رکسوارہ ضلع الہ آباد و شاگرد سید محمد متین صاحب متین الہ آبادی۔ شاعر طبیعت دار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن رنگ جو انہوں نے اختیار کیا ہے نہ عہد حاضر کے مذاق کا آئینہ بردار ہے نہ پہلے کبھی اچھا سمجھا جاتا تھا۔ مراعاتِ لفظی سے شعر میں نوک پلک نکالنا چاہتے ہیں۔ ابھی ماشاء اللہ جوان ہیں امید ہے تخیل سیدھے راستہ پر لے آئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

جینا بغیر آپ کے دشوار ہو گیا / پیغام مرگ ہجر کا آزار ہو گیا
نظّارۂ جمال سے عمرِ ابد ملی / آبِ حیات شربتِ دیدار ہو گیا
پہلو سے گر ہٹے تو مری جان پر بنی / کھنچنا تمہارا پاس سے تلوار ہو گیا
اللہ رے تلوّنِ تیرِ نگاہِ یار / نشتر کبھی بنا کبھی تلوار ہو گیا
یاں مہر و التفات سے جانبر نہ ہو سکا / ملنا بھی جھک کے آپکا تلوار ہو گیا
ہمنشیں مٹ گئیں سب حسرتیں رفتہ رفتہ / ہائے افسوس یہ دل بھی نہ رہا دل اپنا
گماں برقِ تجلّی کا ہے عکسِ روئے روشن پر / ہے دھوکا صبحِ محشر کا بیاضِ صبح گردن پر
جو ہیں نا اہل ان سے نفع کی امید بیجا ہے / گُل و سبزہ کبھی اُگتا نہیں دیوارِ آہن پر

سوزش لکھوں جو خط میں دلِ داغدار کی
نکلیں زبانِ خامہ سے موجیں شرار کی
کی ہے خیالِ ابروئے خمدار میں سحر
خنجر سے ہیں نے کاٹی ہے شبِ انتظار کی
مے گلرنگ کے پینے میں عذرِ پارسائی ہے
ہماری مفلسی بھی فصلِ گل میں رنگ لائی ہے

ضمیر:۔ محمد مسعود احمد خلف اصغر حضرت امیر احمد امیر مینائی مغفور۔ کلام میں لطافت ہے۔ لطفِ زبان سے کوئی شعر خالی نہیں ہوتا۔ نتائج افکار کو قدیم تلازمہ و ابہام سے محفوظ رکھتے ہیں۔ مضامین میں لذت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اپنے والد مرحوم کے شاگرد ہیں۔ استادزادہ ہونے کے علاوہ خود بھی ذی استعداد ہیں۔ سخن گوئی کی اٹھان بتا رہی تھی کہ دنیائے شاعری میں ان کا بول بالا ہوگا۔ مگر ملازمت کے بکھیڑوں نے انہیں مشقِ سخن بڑھانے کا موقعہ نہ دیا۔ اور آخرکار شاعری سے دست بردار ہو گئے۔ گذشتہ زمانہ میں جو کچھ کہا ہے۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کھنچکے جان آنکھوں میں آئی دل گیا
دیکھنے کا اُن کے ثمرہ مل گیا
ہم اس چاٹ پر بیٹھے ہیں زخم کھولے
چھڑک دے نمک مسکرانا کسی کا
نہ سرمہ نہ مسّی فقط سادگی تھی
مجھے یاد ہے وہ زمانہ کسی کا
تصوّر کہاں ڈھونڈنے جائے آخر
کہیں ہو بھی اے دل ٹھکانہ کسی کا
ہزاروں کی جانوں کو رونا پڑے گا
ہنسی سمجھے ہو تم رُلانا کسی کا
ہزاروں بتّیں باتیں مگر میرے دل کو
رہا یاد اک بھول جانا کسی کا
یہ کہتے ہوئے جان ہونٹوں پہ آئی
غضب ہے کسی پر دل آنا کسی کا
ضمیر آپ انسان اپنا ہے دشمن
مخالف نہیں ہے زمانہ کسی کا
سمند ناز بھرتا ہے تزارے
اداؤں میں ہرن کی چوکڑی ہے
پیئے دو گھونٹ جس نے پھر نہ سنبھلا
شرابِ عشق بھی کتنی کڑی ہے
چمن میں فصلِ بہار آئی اور گذری بھی
جگہ ہی ڈھونڈ رہے ہیں ہم آشیاں کیلئے

ضمیر۔ پنڈت گنگا داس کشمیری دہلوی شاگرد شاہ نصیر فصاحت و بلاغت میں اپنی آپ نظیر تھے۔ علم رمل کے ماہر تھے۔ خوش گفتار شاعر تھے۔ زبان اپنے زمانہ کے لحاظ سے شستہ تھی۔ طرزِ بیان میں شگفتگی تھی۔ چند شعر اور ایک قطعہ جس میں ہولی کی دھوم دھام بیان کی ہے درج کئے جاتے ہیں بادی النظر میں یہ گمان ہوتا ہے کہ بسنت کی محفل ہے۔ مگر اس زمانے میں ولائتی رنگوں کا رواج نہ تھا۔ اور ٹیسو کے پھولوں کے رنگ سے ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک قطعہ بغیر انتخاب درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ واضح ہو کہ اُس زمانہ میں ہندوستانی تہذیب کا رنگ کیا تھا۔

میں بتاتا ہوں ضمیر اب کچھ تجھے بھی ہے خیال
چشمِ خواب آلودہ اُس کی فتنہ بیدار ہے

جس کو دیکھا کانپتا ہے وہ شرارت سے تری
برق کو بھی ابر میں ہم تو طپاں دیکھا کئے

لو بگڑ بیٹھے ذرا سی بات پر
تھی نہ یہ امید ہم کو آپ سے

قطعہ

شب کو گیا میں ہولی کی محفل میں اے ضمیر
دلچسپ کیا ہی خوب تھا ہر اک مکان زرد

اس انجمن کی تجھ سے میں تعریف کیا کروں
پہنے لباس بیٹھے تھے سب مہربان زرد

روشن کئے تھے جھاڑ نشیمن کے گرد کل
تھیں زعفرانی سب چھتیں اور سائبان زرد

حوریں نژاد رنڈیاں بیٹھی تھیں صف بہ صف
ہولی کے کنٹھے پہنے ہوئے نوجوان زرد

پشواز چست انکی مرے دل میں کھب گئی
تھا حاشیہ کناری کا اور درمیان زرد

ڈالے سبھی تھے ہار گلوں کے گلوں کے بیچ
سرخوش تھے اپنے حسن میں سب گلرخان زرد

پچکاریوں کی لہروں کی تھی مار ایک سمت
کیسر کے رنگ سے تھے زمین آسمان زرد

رنگوں سے قمقموں کی تھی آپس میں مار دھاڑ
تھا سرخ گر کبھی تو کبھی تھا مکان زرد

اُن سب کے درمیان تھا مسند پہ دلربا
سونے کا آگے رکھے ہوئے پاندان زرد

القصہ اپنے حسن میں ہر ایک شاہِ وقت
یہ دیکھ اُس کو ہو گئے سب بدگمان زرد

اس شب سے میری آنکھوں میں یرقان ہو گیا	یاں تک کہ میرے ہو گئے سب استخوان زرد

ضمیر

ضمیر۔ مرثیہ گو نامور میر مظفر حسین ولد میر قادر علی۔ میر خلق کے ہم عصر تھے۔ اور غزل گوئی میں مصحفی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۷۲ھ میں انتقال کیا۔ مرثیہ خوب کہتے تھے۔ غزل کی طرف کم توجہ تھی۔ مجموعہ مراثی شائع ہو چکا ہے۔ جو قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ حضرت دبیر مرثیہ گو آپ کے فخر تلامذہ تھے۔ میر ضمیر کا یادگار کارنامہ صنفِ مرثیہ کی اصلاح اور ترقی ہے۔ اگرچہ مرزا رفیع السودا نے مرثیہ کو مربع سے مسدس کر دیا تھا۔ لیکن اس کا ارتقا اور رواج میر ضمیر کی طبع وقاد کا شاہکار رہے۔ انہوں نے مرثیہ میں یہ جدتیں پیدا کیں۔ رزمیہ لکھا۔ سراپا ایجاد کیا۔ گھوڑے۔ تلوار اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف بیان کئے اور بقول مولانا شبلی مرحوم یہی مضامین آجکل مرثیوں کے مہمات موزوں ہیں اس کے علاوہ واقعہ نگاری کی بنیاد رکھی اور جزئی واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ مولانا موصوف موازنہ انیس و دبیر میں لکھتے ہیں کہ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور اور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی غلط الفاظ جو مرثیوں کے لئے گویا جائز مان لئے گئے تھے۔ اکثر ترک کر دیئے۔ اور یہ کیا کہ ان سے پہلے مرثئے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے انہوں نے سب سے پہلے تحت اللفظ کو رواج دیا۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے کلام میں جس قدر محاسن ہیں میر ضمیر کے ہاں سب پائے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اُس وقت جو یہ ضرب المثل مشہور تھی کہ "وہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا دھاڑی مرثیہ خواں"۔ اس کا قطعی بطلان میر ضمیر کی ذات مبارک سے ہوا۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار یہاں دئے جاتے ہیں۔

جا کے میدان میں کس طرح یہ محبوب لڑے	یہ تو کہیئے کہ غلام آپ کے کچھ خوب لڑے
چیر کر فوج کو اس پار سے اُس پار گئے	میں نے خود دیکھا کہ دریا پہ کئی بار گئے
تھا دیدۂ حیران ہر اک زخم بدن میں	انگشت تاسف تھی زباں سب کے دہن میں
پنہاں زرہ میں ہوتی تھی اس طرح سناں	بجلی چمک کے ہوتی ہے جُوں ابر میں نہاں

اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو بیم جاں
تھا اڑدہائے موسی عمراں کی وہ زباں

گھوڑا وہ تیز رو ہے کہ ناگاہ ایک بار
اتنا کہا تھا وہم نے ہاں چل تو ساتھ یار

دونوں نے ہم عنانی و سرعت کی اختیار
آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار

کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مقدور بھر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

ضمیر **ضمیر** :- مولوی سید محمد ضمیر خلف الصدق میر کفایت علی مرحوم سیتاپوری آپ کے آباواجداد اب سے ایک صدی قبل قصبۂ براہی ضلع لکھنؤ سے آکر سیتاپور میں قیام گزین ہوئے۔ حضرت ضمیر سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اور وہیں تمام عمر رہے۔ اپنی وضع کے پکے اور اپنے آبائی مذہب شیعہ اثنا عشر کے اصولوں کے پابند تھے۔ ۱۳۴۹ھ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

تو اسیرانِ قفس ہوں نہ پریشاں کیونکر
بھول جائے انہیں دو دن میں گلستاں کیونکر

ماسوا سے مجھے کیا کام تیری الفت میں
غیر کا دھیان کرے مجھکو پریشاں کیونکر

شکل میں حور ہے تو رنگ میں گل وضع میں بت
مجھکو حیرت ہے کہ تجھکو کہوں انساں کیونکر

جاں گسل ہجر کا غم روح فزا وعدۂ وصل
زیست کیونکر ہو گراں موت ہو آساں کیونکر

دست وحشت سے ہو کیا موت کی مشکل آساں
چاک ہو جامۂ ہستی کا گریباں کیونکر

ضمیر **ضمیر** :- نظیر احمد خاں بنارسی شاگرد صاحب عالم میرزا قادر بخش صابر دہلوی مرحوم تازہ معانی کے جویا۔ نازک خیالی کے دلدادہ تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

اک لطف ہر گھڑی ہے نیا ہجر یار میں
بڑھ جائے طول اور شب انتظار کا

کہتے ہیں لوگ جس کو جہاں میں ضمیر برق
افسردہ شعلہ ہے وہ دل بیقرار کا

آتا ہے درد میں خلش خار کا مزہ
زخم جگر میں تیر ترا رہ گیا نہ ہو

آئی شکست شیشہ کی اُڑتی سی اک صدا
دل آپ کی نظر سے کسی کا گرا نہ ہو

رہتا ہے مثل غنچے کے بستہ دل ضمیر	شاید ترا وہ عقدۂ بندِ قبا نہ ہو
سینکڑوں سال کی عمر اسمیں گذاری ہمنے	ہے مقدر کی سیاہی شبِ فرقت میری
پاؤں میرا نہیں تھمتا درِ جاناں پہ کبھی	اسقدر زور پہ ہے گردشِ قسمت میری
اتنی نفرت ہے کہ گھر چھوڑدیں اپنا وہ ضمیر	کھینچدے کوئی جو دیوار پہ صورت میری
اس کے آنے سے ہوئیں لاکھوں بلائیں نازل	شامِ ہجراں کو تری زلف کا نقشہ سمجھے
رہگئی ٹوٹ کے اسمیں جو ترے تیر کی نوک	اے ستمگر ہم اُسے دل میں تمنا سمجھے

ضمیر

ضمیر:۔ مولوی ضمیر الحق ولد شیخ نبی بخش ساکن آرہ ضلع شاہ آباد۔ آپ نے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں عربی کی تعلیم پائی۔ صاحب تذکرۂ یادگار ضیغم نے آپ کا نام ضمیر الدین لکھا ہے۔ جو سہو ہے۔ بقا غازی پوری وشمشاد لکھنوی سے تلمذ تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دنیا میں کسے بے سروساماں نہیں دیکھا	اس باغ میں کوئی گلِ خنداں نہیں دیکھا
محشر میں جو یاد آئی مجھے کوئے صنم کی	مرکے بھی سوئے گلشنِ رضواں نہیں دیکھا
یہ خاکِ عاشقِ ناشاد سو اُن کو کدورت تھی	کہ پھر فاتحہ دامن اٹھا کر آئے مدفن پہ
اب لامکاں میں پھرتی ہے عالم کو چھانتی	مدت سے میری آہ تلاشِ اثر میں ہے

ضمیری

ضمیری:۔ میرزا مظہر بنارسی۔ شگفتہ مزاج۔ صوفی مشرب تھے۔ سیاحی کا شوق تھا۔ روم وشام وغیرہ کی سیر کی تھی اور وہاں کے طریقۂ معاشرت وتمدن کو نگاہِ حسن آفریں سے دیکھا تھا۔ ۱۲۷۱ھ کے قریب کبھی کبھی دِلّی آتے اور یہاں کی ادبی مجالس اور مشاعروں میں شریک ہوتے۔ فارسی اُردو دونوں زبانوں میں فکر کرتے۔ تذکرہ گلستان سخن سے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

ہم نہ کہتے تھے ضمیری بے وفاؤں سے نہ مل	اپنے کاموں کا نتیجہ تجھ کو حاصل ہو گیا
یوں عدوں کو تری کیا کیا نہ جانتے تھے	لیکن تجھے ستمگر ایسا نہ جانتے تھے

ضو

ضو:۔ منشی کمال الدین الہ آباد کے قدیم باشندے تھے۔ آخر عمر میں ضعفِ پیری کے

ہاتھفوں جو اسی میں خلل آگیا تھا۔ قوت بینائی جاتی رہی تھی۔ کنجِ تنہائی میں زندگی بسر کرتے۔ طبیعت کو شاعری سے لگاؤ تھا۔ مزیدار شعر کہتے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

سینے میں رہی آگ بھڑکتی کی بھڑکتی	اے دیدۂ تر تو تو کسی کام نہ آیا
عشاقِ تفتہ جاں پہ کبھی اِک نگاہ بھی	اے برق منتظر ہے یہ مشتِ گیاہ بھی
دیکھنا ہے تو دیکھ لو ضوؔ کو	آگے کیا جانئے کہ کیا ہو جائے

ضوؔ

ضوؔ:۔ افضل علی ولد مولوی یاد علی مرحوم۔ قدیم شرفائے بدایوں سے تھے۔ ظہور اللہ خاں نواؔ بدایونی آپ کے اجداد سے تھے۔ لڑکپن سے مضمون نگاری اور شاعری سے دلچسپی تھی۔ فنِ سخن گوئی میں مولوی راشد علی ضیاؔ مرحوم شاگرد حضرت منیرؔ سے تلمذ تھا۔ انگریزی فارسی میں اعلےٰ درجہ کی لیاقت تھی علم مجلسی میں طاق تھے۔ ہمیشہ رؤسائے نامدار کی مصاحبت میں رہے اور اپنی کارگذاری کے صلے میں انعام و اکرام حاصل کئے دو ایک ریاستوں سے ان کا سالانہ مقرر تھا۔ کئی برس تک اپنے وطن سے سعید الاخبار۔ بدایوں گزٹ۔ نکلتے رہے۔ گلدستہ بدایوں بھی دوبارہ جاری کیا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار وطن کو خیرباد کہکر لکھنؤ میں رنگ جمایا۔ اور وہاں سے ایک پرچہ ہر روزہ کے نام سے جاری کیا۔ بدقسمتی سے وہ بھی نہ چلا۔ تو اخبار نویسی کی طرف سے جی کھٹا ہو گیا۔ انتظام کی قابلیت اچھی تھی۔ اور ہر ایک سوسائٹی میں رسائی حاصل کر لیتے تھے۔ کبھی کسی علاقے کے مینجر رہے کبھی کسی کارخانہ کے مہتمم۔ کبھی انگریزی فیصلہ جات کا ترجمہ کرتے رہے۔ اسی طرح راحت و آرام کے ساتھ لکھنؤ میں دن گذارے۔ میرزا محمد جعفر خلف میرزا دبیرؔ ان سے نہایت محبت رکھتے اسی بنا پر آپ نے مولانا شبلی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر کے جواب میں ردّ الموازنہ لکھی ہے جس میں اکثر جملے نہایت سخت اور تہذیب سے باہر ہیں۔ چند سال ہوئے کہ انتقال ہو گیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

تکلف سے نہیں کیا جنکی خلقت حسن آگیں ہو
نہیں ہے شاہد مضمون کبھی محتاج زیور کا

ترا احسان ہوگا اے اجل دم بھر ٹھہر جانا ۔
وہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھ لیں عاشق کا مرجانا

حسینوں کا یہ اک انداز ہے اسکی شکایت کیا
ذراسی بات ہے اقرار کرنا اور مکر جانا

تری زلفوں میں بھی انداز ہے تیری اداؤں کا
سنورنے میں بگڑ جانا بگڑنے میں سنور جانا

زیست کی صورت کہاں پیدا فراغ یار میں
منہ چھپا اے ضو نقاب جلوۂ رخسار میں

یاد آئے کیا مجھے شیریں زبانی وصل کی
زندگی بھی تلخ ہے اب تو فراق یار میں

حوریں بہشت میں ہوں تو یہ اور بات ہے
معشوق اس جہان میں تو آپ سا نہیں

بیخودوں کو حسن و قبح ذات کی پروا نہیں
زیست میں شہرہ ہو یا بعد فنا تشہیر ہو

ہاں تمہارے دم سے روشن ہو گئی دیوانگی
سچ ہے اے ضو تم چراغ خانۂ زنجیر ہو

ضیا:- سید صغیر حسین دہلوی تلمیذ حضرت داغ مرحوم ۔ معنی پرداز اور شیریں مقال ہیں ۔ مشکل سے مشکل مضمون کو آسان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ۔ ترکیبیں شائستہ اور بندشیں برجستہ ہوتی ہیں ۔ خوش اخلاق و ملنسار ہیں ۔

ضیا

کہتے ہیں اسکے رنگ سے نکہت ملائیں گے
لائے ہیں ایک پھول چمن سے گلاب کا

انکار جو کرے وہ بڑا بدنصیب ہے
وہ دست ناز اور وہ ساغر شراب کا

کیا اعتبار عمر دو روزہ کا اے ضیا
پیش نظر ہے بن کے بگڑنا حباب کا

نئی باتیں ہیں کچھ انداز بھی تو اب نرالے ہیں
جواں ہو کر غضب کے تم نے پر پرزے نکالے ہیں

نظر بازوں سے چھپ کر اچھی صورت رہ نہیں سکتی
حسین خلق جہاں میں ہیں سب اپنے دیکھے بھالے ہیں

جناب شیخ کی قلعی کھلی جب مے کی بو آئی
ہم ان کو جانتے تھے یہ بڑے اللہ والے ہیں

تجھے تو دل لگی سوجھی ہے اپنی جان جاتی ہے
اجل آ بھی یہ کیا بیوقت کے غمزے نکالے ہیں

ہم لاکھ عاجزی کریں لاکھ التجا کریں
وہ ایک مانتے نہیں اب اس کو کیا کریں

بے دیکھے بھالے دل نہ کسی کو دیا کریں ۔
اچھے رہیں ضیا جو ہمارا کہا کریں

لے آئی کسی روز نہ اُس ماہ لقا کو — کس کام کی ہے دیکھ لیا آہِ رسا کو
اے ابر کرم ہاں اسے گلزار بنا دے — سبزے کی ضرورت ہے مزارِ شہدا کو
اے چرخ جہاں میں نہ رہے تیرا ٹھکانا — تاثیر جو مل جائے غریبوں کی دُعا کو
سمجھ رہے تھے محبّت میں دل لگی ہوگی — خبر نہ تھی کہ قیامت کی بے کلی ہوگی
کوئی پہلو سے اُٹھ کر چل دیا حسرت رہی کیسی — سحر ہوتے ہی جانِ ناتواں پر بن گئی کیسی
لگی کا لطف جب آئے کسی پر مبتلا تم ہو — ابھی ناداں ہو کیا جانو کہ ہے دل کی لگی کیسی
شباب آتے ہی ہم کو زندگی کے پڑ گئے لالے — بہار آتے ہی یہ دل کی کلی مرجھا گئی کیسی
گلہ نہیں جو وہ ہم کو بھلا نہیں کہتے — یہی غنیمت ہے کہ مُنہ سے بُرا نہیں کہتے

ضیا

ضیا:- آغا سخاوت علی بیگ مرحوم خلف میرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی آپ کے دادا اصفہانی تھے اور نادر شاہی فوج میں کماندار ہو کر ہندوستان آئے تھے میرزا مراد علی خاں المخاطب بہ رکن الدولہ جو شجاع الدولہ کے عہد میں نظامت و دیگر عہدوں پر فائز تھے اس خاندان کے قابل فرد تھے۔ ضیا مرحوم غدر سے قبل فنانشل کمشنری صوبۂ اودھ میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد صدر نظامت آگرہ میں پیشکاری کی خدمت کو حسن و خوبی سے انجام دیا۔ ہنگامہ غدر میں اپنی جان پر کھیل کر کئی انگریزی مرد عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں۔ اکثر پناہ گزینوں کو لکھنؤ سے آگرہ پہنچایا۔ اسی صلے میں سرکار سے خلعت و جاگیر ملی تھی۔ سنہ ۱۲۸۵ھ میں میر وزیر علی ضیا مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ لکھنؤ میں عقد ہوا۔ ملنسار اور خلیق آدمی تھے۔ آپ ضلع ایٹہ میں پہلے سر رشتہ دار کلکٹری پھر تحصیلدار ہو گئے۔ سنہ ۱۲۹۶ھ میں انتقال ہو گیا۔ آپ صاحب دیوان تھے۔ مجموعۂ کلام میں ایک غزل میرزا قیصر حسین اکبر آبادی کی آپ کے نام سے درج ہو گئی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

جہاں تک ناخنِ تدبیر سے عقدہ کشا ٹھہرے — ہمارے سامنے کیا بندشِ بندِ قبا ٹھہرے

ضیا مرحوم پر سرقے کا الزام لگانا نہیں چاہیئے۔ غالباً تدوین کرنے والوں کی غفلت یا عدم واقفیت سے ایسا ہوا۔ اب ان کا کلام ملاحظہ ہو :۔

اے جنوں رہ گیا پردہ میرے پیراہن کا
دامنِ دشت نے بس کام کیا دامن کا

مر گئی بلبلِ ناشاد قفس میں شاید
رنگ بدلا نظر آتا ہے ضیا گلشن کا

اُترا نہ روز حشر بھی نشّہ شراب کا
سر پہ ہمارے سایہ رہا آفتاب کا

میرے مرنے کی خبر سُنکر وہ فرمانے لگے
جان سے اپنی گیا ناحق ہمارا کیا گیا

لطف ہے کالے کالے بادل کا
ساقیا کھول کاگ بوتل کا

سر پہ اُس شوخ کے ہے لاکھ بناؤ
اوڑھنا وہ اُلٹ کے آنچل کا

دوشِ بادِ صبا پہ جاتا ہوں
ناتواں ہوں جنازہ ہے ہلکا

غمِ ہجراں ہے ہم نفس میرا
یہی ہمدم ہے روزِ اوّل کا

نالاں ہو تیرا کشتۂ تیرِ نگاہ کیا
جو لے سکے نہ سانس کریگا وہ آہ کیا

آنکھوں کے آگے گردشِ لیل و نہار ہے
دیکھیں دکھائے یار کی چشم سیاہ کیا

توڑا زنجیر کو دامن کے اُڑائے ٹکڑے
اے جنوں تجھ سے ہوئے کار نمایاں کیا کیا

دیکھتا ہے رُخِ شفاف کو کس حیرت سے
آئینہ ہے تری تصویر کا حیران کیا کیا

قسمیں دے دے کے زہر دیتا ہے
اے ترے پیار نے ہمیں مارا

اُن نشیلی انکھڑیوں کا کُشتہ نظّارہ ہوں
میرے مرقد پر چڑھانا جام بھر بھر کر شراب

آیا شباب طالب دیدار آئے ہیں
یوسف کے ساتھ ساتھ خریدار آئے ہیں

قسمت ہی میں جو لکھی ہو افتاد کیا کرے
سر پر گرے پہاڑ تو فرہاد کیا کرے

دل میں مرے خیال ترا اے صنم رہے
روشن چراغ دیر سے شمع حرم رہے

دم گھُٹ رہا ہے چین نہیں اب کسی طرح
تنگ آگیا ہوں اس دل خانہ خراب سے

اپنے کُشتہ کو نہ کر خواب عدم سے بیچین
مان او فتنۂ محشر کے جگانے والے

ضیا

ضیا:۔ مولوی محمد راشد علی مرحوم بدایونی اپنے گرد و نواح کے نامی شعرا سے تھے۔ آپ نے علمِ عروض کی تحصیل میر کاظم حسین تنویر شاگرد جناب رشک سے کی تھی۔ مذہباً شیعہ تھے۔ غزل کے علاوہ وہ مرثیہ خوب کہتے۔ جس میں میر نفیس سے استفادہ حاصل کیا۔ منیر شکوہ آبادی کے لائق شاگردوں میں ان کا شمار تھا۔ کئی برس تک شاہجہان پور میں پھر بدایوں میں وکالت کرتے رہے۔ مگر مکروہاتِ دُنیا نے ہمیشہ پریشان رکھا۔ بعض رؤسا کی طرف سے قدر دانی ہوئی۔ تو اس طرح ہوئی کہ ان سے دیوان قصائد وغیرہ اپنے نام سے لکھوائے مگر جو رقم ٹھہرائی گئی وہ مرنے کے بعد ان کے ورثا کو بھی وصول نہ ہوئی۔ اور یہ فردوسی کی آغوشِ لحد میں جا سوئے۔ صنائع بدائع میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور علمِ عروض کے ماہر تھے۔ مذہبی مناظرہ کا شوق تھا مگر نہایت وسیع الاخلاق تھے۔ خوش وضع لیست قامت خوش تقریر شخص تھے۔ حضرت منیر کو ان پر فخر تھا۔ ۱۸۹۰ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ ایک دیوان غیر مطبوعہ اور مراثی کا ذخیرہ چھوڑا جو کچھ کلام دستیاب ہوا اس میں سے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

منتوں پر وہ بگڑتے ہیں کہا بوسۂ لب
جُھک گئے مجھ سے وہ شرما کے یہ مضمون سمجھ گیا

خیال روئے صنم قلبِ خاکسار میں ہے
ہے تیرے روئے منوّر کا دیکھنے والا

پاؤں چھونے نہیں دیتے رُخِ زیبا کیسا
مصرعہ قامت موزوں میں ہے سکتا کیسا

خدا کے نور کا پتلا نہاں غبار میں ہے
یہ ایک وصف ضیائے سیاہ کار میں ہے

ضیا

ضیا:۔ حکیم احمد علی۔ تلمیذ جناب ثاقب بدایونی۔ عرصہ ہوا جب بمبئی میں قیام تھا کلام میں شوخی اور بے ساختگی ہے۔ چند شعر درج ذیل ہیں:۔

ہم تو سمجھے تھے نامۂ دلدار
وہ بھی تقدیر کا لکھا نکلا

مرنے والوں کو تیرے کیا معلوم
جان نکلی کہ مدعا نکلا۔

جی کی جی میں رہیں تمنّائیں	نہ کبھی جی کا حوصلہ نکلا
اب تو دستِ جنوں کے ہاتھوں سے	دامنِ صبر اے ضیاؔ نکلا۔
جان ہو عاشق بیتاب کی یا دل کچھ ہو	ایک جانے کے لئے ایک ہے آنے کیلئے

ضیا

ضیا۔ میر ضیاء الدین دہلوی۔ دلّی کی بربادی سے متاثر ہو کر فیض آباد چلے گئے تھے۔ مگر زمانے کی گردشوں نے انہیں وہاں بھی نہ رہنے دیا۔ آخر کار پٹنہ عظیم آباد کی طرف رُخ کیا۔ کچھ دنوں قاسم علی خاں ناظم بنگالہ کی رفاقت میں رہے پھر عظیم آباد میں راجہ شتاب رائے کے فرزند دلبند نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وہیں خلوت گزین ہو گئے۔ اور درویشانہ طریقہ سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۱۹۶ھ میں انتقال کیا۔ انہوں نے اپنا دیوان ریختہ مرتب کر لیا تھا۔ قدرت اللہ شوق ان کو میر تقی میر کا شاگرد لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعد بڑے لائق شاگرد چھوڑے جن میں میر حسن مصنّف سحر البیان خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگِ خلق	اسکے کوچہ میں ضیاؔ تو آج پھر جانے لگا
سنے دل جلا ہوں آہ نہ میں سینہ تفتہ ہوں	میں داغ یاس و حسرت یاران رفتہ ہوں
ضیاؔ رکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی ہے ظالم	کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لہو آتے ہیں
رو دیں ہم بزموں کو کیا اپنے دلِ تو لگے پھیر ہیں	شمع محفل تھے ہو کل سو راکھ اب ڈھیر ہیں
رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ ہوس نہیں	ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں
دل جلے ہے غم سے اور آنسو بہانا منع ہے	لگ رہی ہے آگ گھر میں اور بجھانا منع ہے
گھر کو ہے اسکے بھولا یا راہ پھیر کی ہے	یارب تو خیر کیجو قاصد نے دیر کی ہے۔
تھوڑی بھی نیک و بد کی گروہ تمیز رکھتے	کافر ہو پھر جو دل کو اس سے عزیز رکھتے
لے آہ نیچ نکل نہ کہیں دل چھلک پڑے	یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

تیرے ضیا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے
اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے

آہستہ پاؤں رکھیو اے بوئے گل زمین پر
سوتے ہیں اس زمین میں نازک مزاج کتنے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا
آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا
ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے

ضیا

ضیا:- غلام جیلانی تلمیذ امراؤ مرزا انور مرحوم۔ ماہر فن اور صاحب فکر روشن تھے۔ ان کے کلام سے صرف چند اشعار مل سکے۔

واں ناز وہ کہ در تلک آیا نہ جائے گا
یاں ضعف یہ کہ جان سے جایا نہ جائیگا

حال خراب ان کو سنایا نہ جائے گا
اپنے پہ دشمنوں کو ہنسایا نہ جائے گا

گردن پہ بار خون ضیا کیوں اٹھاتے ہو
نازک ہو بوجھ تم سے اٹھایا نہ جائے گا

ضیا

ضیا:- صاحبزادہ علی محمد خاں خلف صاحبزادہ احمد علی خاں جدّ امجد نواب ٹونک طبیعت میں موزونی تھی۔ سیدھا سادہ شعر کہتے تھے۔ نمونہ فکر یہ ہے۔

میرے منہ سے جو تکلم میں نکلتا ہے دھواں
شمع رویوں نے دل زار جلا رکھا ہے

پوچھتا ہوں دل گم گشتہ کا اپنے احوال
کیوں خفا ہوتے ہو کیا تم نے چھپا رکھا ہے

اے ضیا الفت اصنام سے ہم نے صد حیف
دل جو کعبہ تھا وہ بت خانہ بنا رکھا ہے

ضیا:- ضیا محمد ابن مولوی وزیر الدین مرحوم بدایونی۔ آپ کا خاندان سنہ ۱۰۱ھ سے بدایوں میں آباد ہے۔ اور عہد شاہی میں سرفراز و ممتاز رہا۔ آپ حضرت عطا کے برادر اصغر اور مولوی عبد الحی صفا مرحوم کے عمّ زادہ ہیں۔ ابتدائے عمر سے شعر کہنے کا شوق ہے۔ منشی وزیر احمد نیر۔ مفتی اکرام احمد لطف۔ مولوی افضال احمد بسمل مرحوم اور نازش بدایونی کے ہم مشق ہیں۔ علم عروض و فن بدیع سے واقف ہیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں حضرت داغ مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لیتے تھے۔ اس زمانہ میں شاعرانہ مباحثات کا شوق تھا۔ منشی بنواری لال شعلہ [illegible] اور ضیا ان کی

بزم سخن کے زبردست رکن تسلیم کئے جاتے تھے۔

تم سا جفا شعار تو کوئی حسیں نہیں	دُنیا میں اور بھی ہیں اکیلے تمہیں نہیں
ٹھوکر لگا نہ مرقد حرماں نصیب کو	یہ حسرتوں کے ڈھیر ہیں ظالم زمیں نہیں
چھن چھن کے نور آتا ہے باہر نقاب سے	پردہ نشیں کا حسن تو پردہ نشیں نہیں
رہتے ہیں محبت میں یہی روز بکھیڑے	ہاں سے کبھی امید کبھی یاس نہیں سے

ضیا :- سید رضا حسین برادر سید ابرار حسین نپاں فتح پوری تلمیذ نسیم بھرتپوری۔ بزرگوں کا وطن رول ضلع متھرا ہے مگر آپ کے دادا فتح پور سیکری میں مقیم رہے آپ خوش فکر جوان طبع شاعر تھے۔ ۲۷ برس کی عمر تھی۔ کہ مرض جگر میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کرم فرماتے ہیں وہ آزما کر	اجل تو بھی کرم کر امتحاں تک
وفورِ شوق سے یہ بے خودی تھی	عدو سے کہدیا رازِ نہاں تک
پورا نہ ہو کسی سے وہ میرا سوال ہے	ممکن نہ ہو کسی سے وہ اُن کا وصال ہے

ضیا :- صاحب عالم حافظ میرزا منیر گورگانی۔ خلف الرشید میرزا رحیم الدین حیاؔ دہلوی۔ آپ کے مضامین رنگین اور کلام نمکین ہے۔ قلعۂ معلّٰی کی زبان کے سرمایہ دار اور سخنور خوش گفتار ہیں اوائل مشق سخن میں جناب جلال لکھنوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ اور فنِ شعر میں ان سے استفادہ کیا۔ زبان پر قادر تھے۔ اس لئے شیوا بیانی میں مشہور ہوئے۔ داغ دہلوی کی شاگردی نے کلام میں چار چاند لگا دئے۔ کتاب تحقیقاتِ ضیا آپ کی تالیف سے ہے۔ جس سے دہلی اور لکھنؤ کا اختلاف اللسان معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے جس شان سے الفاظ کی چھان بین کی ہے اور اس تالیف میں جو عرق ریزی اور جانفشانی کی ہے۔ اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں۔ جن کو زبان کی تحقیقات کا شوق ہے۔ شطرنج کھیلنے میں یکتائے روزگار۔

ریاست رامپور کے وظیفہ خوار ہیں۔ شیریں زبانی اور سادہ گوئی میں مشہور ہیں۔ سادگی اور متانت دونوں باتوں کا لطف ان کے ہاں موجود ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

یارب یہ تُو نے سینے میں دل ہم کو کیا دیا
گویا ہماری جان کو روگ اِک لگا دیا

تنگ آگیا ہوں اب تو کہیں ہٹ چکے یہ دل
اللہ جانتا ہے کلیجہ جلا دیا

تیرِ نگاہِ یار سے جان آج بچ گئی
کام آگیا ہمارے کبھی کا لیا دیا

رسوا عدو کے عشق میں ہو گے یہ سوچ لو
آیندہ اختیار ہے ہم نے جتا دیا

زخمِ جگر میں گاہ جلن گہ چبک رہی
کیا کیا خراشِ ناخنِ غم نے مزہ دیا

اسے کہتے ہیں محبت کہ ترے تیر کے ساتھ
دِل نکل آیا مگر تیر نکلنے نہ دیا

ہم نہ کہتے تھے نہ جائے دل کسی کوچے میں تُو
خوب اس نے گت بنائی کیوں وہاں پھر جائیگا

جان دیکر نام ہوگا آبرو ہوگی نصیب
آشنائے بحرِ الفت ڈوب کر تر جائے گا

ہم خوشی سے ان کو دے ڈالیں تو اچھی بات ہے
یہ دل اوّل جائے گا سینے سے آخر جائے گا

آگیا کوچۂ دلدار میں پھرتے پھرتے
کام آخر مری تقدیر کا چکّر آیا

آبِ آہن نے دیا ذائقہ آبِ حیات
زیست کا لطف جو آیا نہ خنجر آیا

عِشق میں کوئی لڑا چوٹ کسی پر آئی
جنگ آنکھوں میں ہوئی زخم جگر پر آیا

کیا ضبط سے نہ ہوگا صدمہ عیاں ہمارا
کہدے گی چُپ ہماری دردِ نہاں ہمارا

ہم دل کو ڈھونڈتے ہیں تم کیوں بگڑ رہے ہو
تم پر تو کچھ نہیں ہے صاحب گماں ہمارا

جب اُسے لکھتے ہیں خط ہم تو وہ ہوکر واپس
سامنے آتا ہے تقدیر کا لکھا بن کر

جس طرح پھول ہے کانٹوں میں زباں دانتوں میں
بشر اس طرح بُروں میں رہے اچھا بن کر

جنکو وطن سے اُنس ہے اہلِ وطن سے عشق
وہ خار بھی سمجھتے ہیں اپنے وطن کے پھول

مقدر وہ ملا ہے عشق میں ایذا رساں مجھکو
ستم سے گر وہ باز آئیں ستائے آسماں مجھکو

تمہارے تیر کا چوری سے آنا چھپ نہیں سکتا
جہاں بیٹھیگا درد اُٹھ کر بتا دیگا نشاں مجھکو

بڑھی ہیں عشق میں دونوں طرف بیتابیاں دل کی
غضب میں ڈال رکھا ہے وہاں انکو یہاں مجھکو

کیا میخانے کا میخانہ تقسیم اس نے اوروں پر
یہ کہتا ہی رہا میں مجھکو اے پیرِ مغاں مجھکو

قہر روز افزوں جفا پیہم رہے
تم نہ چھوکو ہم میں جب تک دم رہے

دشمن سے کہا حال ضیا تم نے کیا کیا
کہنا تھا تو کہتے کسی غمخوار کے آگے

دل نہیں سینے میں ارمان ہزاروں ہیں تو کیا
خانہ ویران ہے کہنے کو بھری محفل ہے

اک قیامت ابروئے خم دار ہے
دیکھنے کو اتنی سی تلوار ہے

کہتے ہیں کہنے ہی کی باتیں ہیں سب
جان سے جانا بہت دشوار ہے

ضیا

ضیا ۔ محمد ضیا خاں بریلوی تلمیذ حضرت نواہاں۔ شعر اچھے کہتے ہیں۔ طبیعت موزوں معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ حالات و کلام دستیاب نہ ہو سکے:۔

دیکھئے ان کا نکھرتا ہے یہ جوبن کس دن
رنگ لاتی ہے بہارِ رخِ روشن کس دن

دوری یار ستاتی ہے تو روتے ہیں ضیا
تر غمِ ہجر میں ہوتا نہیں دامن کس دن

ضیا ۔ سید محمد نصیر خلف میر وزیر نور لکھنوی مرحوم۔ حضرت عارف مرحوم لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

ناکام ابتدا سے ہوں [illegible] عشق میں
میرا سفینہ وہ ہے جو ساحل میں رہ گیا

ساقی نہیں اترتی مرے حلق سے شراب
محروم کیا کوئی تری محفل میں رہ گیا

مجھ سے تاکید کیا کرتی ہے یہ ہمت عشق
لاکھ ہو درد نہ منت کش درماں ہونا

دل کا پھوڑا دیکھکر اتنا ہوا کیوں بدحواس
گر گیا وہ ہاتھ سے لے چارہ گر نشتر اٹھا

آپ جسکو روز اٹھواتے تھے اور اٹھتا نہ تھا
آپ کے کوچے سے آخر آج وہ مر کر اٹھا

چرخ بھی شبنم کے آنسو رات بھر رویا کیا
شمع کو گریاں سر گور غریباں دیکھکر

کس طرح رات ہجر کی گذرے گی دیکھئے
جب شام ہی سے درد ہمارے جگر میں ہے

ضیا

ضیا ۔ میرزا عطا بیگ برہانپوری۔ قصبہ بوڈرہ مضافات دکن میں ۲۳ شوال ۱۱[illegible]ھ

کو پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں میر غلام علی آزاد۔ اور اُردو میں سراج اورنگ آبادی کے شاگرد تھے۔ عرصہ تک نواب میر حامد یار خاں مخاطب بہ ارسلان جنگ کی مصاحبت میں رہے۔ ۱۱۸۳ھ میں بمقام برہانپور انتقال کیا۔ فارسی اردو دونو زبانوں میں صاحب دیوان تھے۔ نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

تجھے کیا یاد ہے ساقی وہ عالم بے حجابی کا	اِدھر تو جام کا ہنسنا اُدھر رونا گلابی کا
کرتا ہے حشر برپا ساقی سے جلد کہنا	گردن اُٹھا اُٹھا کر شیشے کا دیکھ رہنا
دیکھتے ہی اس کے خط کی شال جی مرجھا گیا	اس دھوئیں کو دیکھ آنکھوں میں اندھارا چھا گیا
ادھر تو تم بھوؤں کو تان کر تیوری چڑھاتے ہو	اِدھر میں دل میں بسم اللہ بسم اللہ کہتا ہوں

ضیا۔ مرزا علی رضا ابن مرزا علی قدر مرحوم عظیم آباد پٹنہ کے باشندے تھے۔ پہلے ہائل عظیم آبادی شاگرد شوق نیموی سے اصلاح لی۔ پھر کچھ عرصہ بعد شوق نیموی سے تلمذ اختیار کیا۔ وارستہ مزاجی اور آزادہ روی اس قدر بڑھی ہوئی تھی۔ کہ اوائل شباب ہی میں فقیرانہ وضع اختیار کی۔ آخر ۲۱ برس کی عمر میں ۷ محرم ۱۳۱۹ھ کو بعارضہ ہیضہ وفات پائی۔ ان کا دیوان موسوم بہ "ریاض شباب" شائع ہو گیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

جب کہا اُن سے کہ دل تم پہ فدا کرتے ہیں	ہنس کے بولے کہ یونہیں لوگ کہا کرتے ہیں
عرصۂ حشر میں ہم اور شکایت تیری	ایسی باتیں بھی کہیں اہل وفا کرتے ہیں
میں نے پوچھا کہ ہے کیا شغل تو ہنسکر بولے	آجکل ہم تیرے مرنے کی دعا کرتے ہیں
آپکا عاشق آپکا شیدا آپکے مرنے والوں میں	ہے جو ضیا اک دردرسیدہ اسکو کیوں تڑپاتے ہیں
کچھ اور مزہ آئے تڑپنے میں شب غم	کچھ اور ترقی پہ اگر درد جگر ہو
مٹے خود سینکڑوں کو مٹتے دیکھا وا ئے نادانی	یہ ہم ابتک نہ سمجھے کیا تری الفت کا حاصل ہے

ضیا

ضیا و ضیائی:۔ میر بدرالدین دہلوی۔ علمی دستگاہ معقول تھی۔ مگر شاعری میں کوئی پایہ امتیاز حاصل نہ تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

کعبہ میں اور دیر میں دیکھا نہ ہم نے فرق	پایا ہر ایک نبض میں اِک اضطراب کو
جوشِ وحشت اس جہاں میں لیکے آیا ہے ہمیں	اب کہاں جائینگے یاں سے ٹھوکریں کھائے ہوئے

ضیا

ضیا:۔ سکندر جہاں بیگم دختر میر امیر علی سابق کوتوال ریاست جاورہ۔ شوخ طبع شاعرہ ہیں۔ علم مجلسی میں فرد ہیں۔ اِن کی چھوٹی بہن حیا تخلص کرتی ہیں۔ ضیا صاحبہ خوش خیال اور زود فکر ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

دل کا لہو رلا چکے اشک جگر کھلا چکے	دیکھئے اب کی رنگ لائے دیدۂ اشکبار کیا
بے وفاؤں کو باوفا سمجھا تا	ہائے کمبخت دل نے کیا جاتا
ہوا اک آفت جاں پر فدا دل	نہ دے دشمن کو بھی ایسا خدا دل
پئے عشق ستم آئے کہاں سے	تمہیں تو چاہیئے روز اک نیا دل
ہے کوئی آتش کا پرکالہ ضیا	سینے میں اپنے دلِ سوزاں نہیں
عشق کو دین سمجھتا ہوں وفا مذہب ہے	اے صنم تجھ سے جو پھر جاؤں تو کافر میں ہوں
کیجئے شکوہ بیداد تو کہتا ہے وہ شوخ	مجھ کو پھر آپ نہ چاہیں کہ ستمگر میں ہوں
تا کجا جرم بے حجاب ضیا	کچھ بھی خوف حساب ہے دل میں
یاد میں اس نرگس کیفی کی ہے سرشار دل	داب کر تو نے بغل میں پارسائی ہو چکی

ضیا

ضیا:۔ ڈاکٹر ہربنس چندر صاحب والد کا نام بابو رام کشور ہے۔ وطن قدیم مانک پور ضلع الہ آباد ہے۔ مگر حضرت ضیا کے والد نے دلوا شند پور ضلع رائے بریلی میں سکونت اختیار کی۔ ضیا سنہ ۱۹۰۰ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں پائی۔ بگری بی اے اور وکالت کی سندیں الہ آباد میں حاصل کیں۔ اسی اثنا میں حضرت بسمل الہ آبادی سے تلمذ اختیار کیا۔ اب آپ رائے بریلی میں وکالت

کرتے ہیں۔ بے تکلف اور سادگی پسند طبیعت پائی ہے۔ کلام اُردو رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ کلام میں درد بھی ہے اور لطف زبان بھی۔ انتخاب غزلیات ملاحظہ ہو:-

اس طرح میں مبتلائے درد و رنج و غم ہوا
دیکھتے ہی چارہ گر کا اور کچھ عالم ہوا

قبر میں بھی مجھکو تڑپایا خیال یار نے
خاک ہو کر بھی نہ آزارِ محبت کم ہوا

شام سے تا صبح ہنستے ہی رہے اہل چمن
کون گلشن میں شریک گریۂ شبنم ہوا

جھک کے ملتے ہیں تہی دستوں سے اہلِ ظرف والا
سر صراحی کا ہمیشہ پیشِ ساغر خم ہوا

اصل میں جو بات ہے وہ نقل میں ممکن نہیں
آپ کی تصویر سے مجھکو سکوں تا ہم ہوا

جو کبھی نذرِ جنونِ غم جاناں ہوتا
سو گریبانوں میں وہ ایک گریباں ہوتا

زیست کا لطف گیا لطفِ خلش کے ہمراہ
مجھ کو حسرت ہے کہ دل میں ترا پیکاں ہوتا

ہر طرف پھول مسرت سے کھلے جاتے ہیں
تم نہ آتے تو گلستاں نہ گلستاں ہوتا

نہ نکلی بزمِ جہاں میں قیام کی صورت
ہمارے بخت میں گردش تھی جام کی صورت

بہارِ گل میں مجھے کیوں ملے نہ کیف شراب
ہر ایک پھول چمن میں ہے جام کی صورت

نگاہِ خاص رہے اپنے جانثاروں پر
وہ لطف کیا ہے جو ہو لطف عام کی صورت

وہی ضیا ہے تمہارا غلام یاد کرو
ابھی سے بھول گئے تم غلام کی صورت

ختم کب ہوگا خدا جانے یہ دورِ مرگ و زیست
منزلیں ہی منزلیں ہیں آخری منزل نہیں

بس ہوں جویائے درِ مقصود بحرِ عشق میں
نہ کی جانب ہیں نگاہیں جانب ساحل نہیں

اپنی لغزش یاد کیا وقتِ نصیحت آ گئی
کیوں زباں میں حضرتِ واعظ کی لکنت آ گئی

سو سزاؤں پر نہ ہوتا کم مرا ذوقِ گناہ
اسکی رحمت دیکھ کر لیکن ندامت آ گئی

راہِ تسلیم و رضا میں یہ ہوا حاصل مجھے
اپنے دل پر مل گئی اب قدرت کامل مجھے

مطمئن راہِ محبت میں ہوں اس امید پر
کھینچ لے گی اپنی جانب خود مری منزل مجھے

ضیغم

ضیغم :- مولوی محمد غضنفر مغفور شاگرد مرزا فتح الدولہ محمد رضا برق۔ طبیعت میں روانی ہے۔ زبان کے اشعار زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اے پری رو دل مضطر کو کل آئی ہوتی
ہاتھ میں میرے اگر تیری کلائی ہوتی

جلد آؤ جو تم کو آنا ہے
دم کوئی دم میں یاں روانہ ہے

یار ہے باغ ہے لب جو ہے
جلد آ ساقیا جو آنا ہے

ترک دنیا ئے دوں تو کر ضیغم
لوگ بد ہیں برا زمانہ ہے

خار ہر گل نظر آتا ہے ہمیں تیرے بغیر
باغ میں جائیے کیا کس کا نظارہ کیجے

جب سے پیش نظر وہ صورت ہے
آئینہ کو بھی ایک حیرت ہے

ہجر میں درد کی یہ شدت ہے
سانس لینا بھی اک قیامت ہے

دیکھ ہر شے میں اسکی قدرت کو
زاہد اگر تجھے بصیرت ہے

سامنے تیرے دم نکل جائے۔
یہی دل میں ہمارے حسرت ہے

ضیغم

ضیغم :- حافظ اکرم احمد رامپوری شاگرد و داماد شاہ رؤف احمد رافت آپ کو سیر و سیاحت کا شوق زیادہ تھا۔ علم طب میں اچھی دستگاہ تھی۔ بیشتر کلکتہ اور ڈھاکہ میں قیام رہتا۔ صاحب دیوان تھے۔ ۱۲۸۹ھ میں قضا کی ۸۵ سال کی عمر پائی۔ اکثر دشوار زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے نمونہ کلام یہ ہے

اپنے سینے میں وہی عشق نہاں ہے کہ جو تھا
کعبہ دل میں وہی ذکر بتاں ہے کہ جو تھا

آہ و نالہ ہے وہی اور وہی رونا ضیغم
پر اثر نالہ و فغاں میں کہاں ہے کہ جو تھا

قفس میں بند ہو کر طوطی جاں شاد ہے ایسی
کسی کو قید ہونے کا ہی غم اس کو رہائی کا

ساقی شفق کو دیکھ کے کتنا ہے ناز سے
صہبا ئے سرخ شیشۂ چرخ کہن میں ہے

ضیغم

ضیغم :- محمد عبد اللہ خاں خلف محمد صالح خاں لکھنوی اوائل شباب میں لکھنؤ میں رہے۔ وہیں کتب درسیہ پڑھیں آتش کی شاگردی نے زیادہ وقوف وطن ہی میں رہ کے

دیا۔ سنہ ۱۲۶۵ھ میں قسمت آزمائی کے لئے حیدرآباد پہنچے اور یہاں انکی تقدیر کا ستارہ چمکا۔ حسن اتفاق سے صفی اللہ خاں بہادر المخاطب بہ سر شرف الامرا کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوگیا۔ سر شرف الامرا کو حکومت انگلشیہ سے تین ہزار روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی دولت آصفیہ سے بھی معقول منصب پاتے تھے۔ کرناٹک کے اعلے رؤسا میں آپ کا شمار تھا۔ حضرت ضیغم ان کے داماد ہونے پر فخر کرتے تھے اور اپنے تذکرۂ شعرا میں تحریر کیا ہے کہ نواب صاحب مرحوم رشتہ میں خالو ہوتے تھے۔

حضرت ضیغم علم عروض اور انشاپردازی سے ماہر تھے۔ انتظامی امور میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ فن شعر میں میر عباس حسن ششدر اور نواب نیاز محمد خاں ہوش مرحوم کے شاگرد تھے۔ ایک تذکرہ مسمّی بہ یادگار ضیغم آپ کی تالیف ہے۔ آخر عمر حیدرآباد میں فارغ البالی سے گزاری۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

پھر لے چلا ہے کوچۂ قاتل میں کھینچ کر — یارب برا ہو اس دل خانہ خراب کا
بستر کا تار تار تھا نشتر مرے لئے — کیا پوچھتے ہو حال شب انتظار کا
طول کہتے ہیں شب ہجر کا اس کو ضیغم — کہ نظر حشر تک آئے نہ سحر کی صورت
یہی ہے شرط محبت کہ جان تک دیدے — مگر کسی سے کسی کا کوئی گلہ نہ کرے

ط

طالب

طالب:۔ عاشور بیگ خاں پسر دولت بیگ خاں دہلوی۔ ان کے بزرگ توران سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ فن سخن میں میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ پُر لطف شعر کہتے۔ معاملہ بندی۔ روزمرّہ۔ صفائی زبان ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ ایک قدیم قلمی تذکرہ سے چند شعر انتخاب کئے جاتے ہیں۔

رہا تجھ کو وہاں خود کام اپنا — ہوا یاں کام اے خود کام اپنا

کہاں ملتا ہے طالب ہم سے وہ شوخ	یونہیں بدنام ہے یہ نام اپنا
رقصِ بسمل ہے طپش ہائے دل	تو بھی آ دیکھ تماشائے دل
ایک دم چین نہیں دیتا ہے	کاش سینے سے نکل جائے دل

طالب

طالب۔ محمد یعقوب ولد قاضی فیض اللہ۔ شاگرد حافظ قطب الدین مشیر دہلوی علوم رسمیہ سے آگاہ فنونِ ضروریہ سے بہرہ ور تھے۔ بابا سید حبیب اللہ کبروی خلیفہ سید علی احمد ہمدانی کی اولاد میں تھے۔ ابوظفر بہادر شاہ کے عہد میں آپکے والد معزّزین و شرفائے شہر میں سمجھے جاتے تھے۔

آپ کو شہرت اور نام و نمود سے نفرت تھی۔ شاعر بننے کا شوق نہ تھا۔ ملازمت دکن کے زمانہ میں آپ نے اپنا کلام جو ایک بیاض میں جمع کیا تھا۔ اس کو بے پرواہی سے تلف کر دیا۔ ایک مختصر اخلاقی مثنوی موسوم بہ نالۂ دلِ حزیں" طبع ہو چکی ہے۔ جو صوفیانہ رنگ میں ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

گھبرا کے مرے گھر وہ گل اندام نہ آیا	یہ جذبۂ الفت بھی کسی کام نہ آیا
کیونکر دلِ بیتاب کو تسکین ہو طالبؔ	قاصد نہ پھرا وصل کا پیغام نہ آیا
تو مجھکو ستاتی ہے عبث حسرتِ دیدار	روزن بھی ہوا بند وہ دیوار کا اب تو

از مثنوی۔ نالۂ دلِ حزیں"

حالتِ قوم

مجھے رنج رہتا ہے اس بات کا	نفاق اسقدر کیوں ہے پھیلا ہوا
سلامت روی سب نے کیوں چھوڑ دی	مروّت کی سلک آپ ہی توڑ دی
نہ ہے شکرِ نعمت نہ اقرارِ عیش	غذا کی جگہ ہے قلق اور طیش
عبث دل کھلاتے ہیں آلام میں	لگاتے نہیں دل کسی کام میں

پہنچتا ہے گہ فلک پہ بھی اثر
تباہی میں پڑ جاتے ہیں گھر کے گھر
اگر باہم الفت ہو اور اتفاق
ہو معدوم سب کے دلوں سے نفاق
ترقی ہو رونق ہو ہر کام میں
رہے قوم کی قوم آرام میں
ہے ایک نعمت بیکراں اتفاق
وہاں ہیں مزے ہو جہاں اتفاق

طالب

طالب:۔ شاہد علی منصوری نام۔ مورث اعلیٰ نواب منصور علی منصبدار شاہی تھے۔ بزرگوں کا اصلی وطن سیوہارہ ضلع بجنور ہے۔ لیکن آپ کے والد شیخ امجد علی مرحوم نے ترکِ وطن کیا اور امروہہ میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں بمقام امروہہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے اسکولوں میں حاصل کر کے ۱۹۲۷ء علی گڑھ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ چھ سات سال سے شاعری کا شوق ہے۔ اور شیخ منصور احمد صاحب افسر صدیقی امروہوی سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ جو چند اشعار بھیجے نذر ناظرین ہیں۔ تین سال سے کراچی میں مقیم ہیں۔ اور محکمہ ریلوے میل سروس میں ملازم ہوئے۔

فلک پہ برق زمیں پر ہے باغباں دشمن
چھپاؤں کونسے کونے میں آشیاں اپنا
پیمانِ لطفِ یار ہے وجہ سکونِ دل
ایسا نہ ہو تو ظلم سہیں کس گمان پر
آخر تمہارے رہنے کا کوئی مکان بھی ہے
آخر تمہیں تلاش کریں کس نشان پر
وفورِ گریۂ غم سے خیالِ ضبط پیہم سے
کبھی میں جوشِ دریا ہوں کبھی آغوشِ ساحل ہوں
لن ترانی سُن کے بھی ہمت نہیں ٹوٹی مری
مرے کانوں کو ابھی تک خواہشِ پیغام ہے
بر سرِ گورِ غریباں کہہ رہی ہے بیکسی
ہستیٔ فانی کا اے طالب یہی انجام ہے
آنکھوں میں اپنی مجھ کو جگہ دو تو خوب ہو
تنگ آ گیا ہوں گردشِ لیل و نہار سے
پردہ رہے جنونِ محبت کا اے خدا
صحرا ہی ڈھانپ لے مجھے گرد و غبار سے
مٹی کے ڈھیر سے نہ دبی آگ عشق کی
شعلے نکل رہے ہیں ہمارے مزار سے

بزمِ امکاں کی ہر اک شے میں ہے جلوہ تیرا
ایک ہی نور سے معمور ہیں سب آئینے

بیہوش تھا میں غفلتِ عہدِ شباب سے
پیری کی صبح دیکھ کے اٹھا ہوں خواب سے

اے شوقِ دید صبر کر آتے ہیں وہ ابھی
محشر الٹ نہ جائے ترے اضطراب سے

اتنا ہی میرے دل کو ہے ملنے کا اشتیاق
جتنا کہ ان کو میری طرف سے حجاب ہے

جلووں نے ہر نگاہ کو تسخیر کر لیا
تم یہ سمجھ رہے ہو کہ رخ پر نقاب ہے

شمع کے جلنے سے محفل میں یہ عقدہ کھل گیا
حسن کے پردے میں پنہاں عشق کی تصویر ہے

نظر ان کی محبت آفریں معلوم ہوتی ہے
یہ ظالم ہے مگر ظالم نہیں معلوم ہوتی ہے

عجب تاثیر رکھتی ہے خلشِ دردِ محبت کی
کہیں ہوتی ہے یہ لیکن کہیں معلوم ہوتی ہے

جس جا خیال کی بھی رسائی نہ ہو سکے
درکار ہے وہاں کے لئے نامہ بر مجھے

پھر اٹھنا چاہتا ہے حجابِ نگاہِ ناز
پھر اپنی عافیت نہیں آتی نظر مجھے

طالب

طالب :- مولوی اللہ داد۔ عرف حافظ شبراتی متوطن رام پور۔ چیچک میں آنکھیں جاتی رہی تھیں مگر چشمِ باطن روشن تھی۔ نابینائی میں کتب درسیہ پر عبور تھا۔ ملا حسن مرحوم اور قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ زمانۂ قدیم کے اچھے شعرا میں ان کا شمار ہے۔ زبان میں جدت کلام میں کیفیت پائی جاتی ہے۔ لطفِ زبان روزمرہ۔ محاورہ کی خوبی ان کے ہاں موجود ہے۔ تغزل میں سوز و گداز کا رنگ بھی ہے:-

ہر چند روسیہ میں بے نور بے بصر تھا
لیکن برنگِ سرمہ منظورِ ہر نظر تھا

جائے خوں سرخیِ گل تھی اس میں
چیر کر جب دل بلبل دیکھا

نہ اٹھا شورِ قیامت سے میں
منتظر ہوں ترے ٹھکرانے کا

اور اک رسم نئی آج سے ایجاد کریں
تو ہمیں یاد کرے ہم نہ تجھے یاد کریں

دل میں اک بات ہے مدت سے کہوں یا نہ کہوں
وقت فرصت ہے یہ اب آپ جو ارشاد کریں

ہم نفس اب تو یہ ٹھہری ہے کہ جتنے ہیں اسیر
پر کتر فصلِ خزاں میں انہیں آزاد کریں

گریہ میں چشم تر سے دن رات چاہتا ہوں
بویا ہے تخمِ الفت برسات چاہتا ہوں

چھیڑئے سینے کو شق کیجے دل دلگیر کو
یہ ہی دو جاگہ ہیں اور کیا کھا گیا ہیں تیر کو

آؤ عشق بتاں بھی کر دیکھیں
یہ بھی اک طبع آزمائی ہے

سب ہم صفیر اُڑ گئے صیاد دام سے
پر ہم تھے اور ڈھب کے گرفتار رہ گئے

بہ ہجر کے صدمے وہ ترے وصل کے وعدے
جینے نہیں دیتے مجھے مرنے نہیں دیتے

نفس عیسوی نہ کر ممنون
ہم کو دو دن کی زندگی کے لئے

طالب: شیخ محمد جان دہلوی خلف شیخ احمد جان ایک پیشہ ور شخص تھے۔ علم سے قطعی بے بہرہ۔ منیر حسن شوق سے مشورہ سخن رکھتے۔ ۳۲ برس کی عمر پاکر ۱۲۸۴ھ میں انتقال کیا۔ یہ نمونۂ کلام ہے:-

بشر آیا جو آفت میں محبت کے سبب آیا
کسی پہ دل اگر آیا حقیقت میں غضب آیا

رقیب اسکو بیٹھے ہیں گھیرے ہوئے
فلک تیری گردش کو کیا ہو گیا

یقیں آئے کیا توبہ طالب نے کی
خرابِ ازل پارسا ہو گیا

اُٹھاؤں کب تلک صدمہ الٰہی دردِ ہجراں کا
کسی صورت نہیں سامان بنتا وصل جاناں کا

دل پہ ہزار زخم ہیں قاتل پڑے ہوئے
تڑپیں گے حشر تک ترے بسمل پڑے ہوئے

طالب: مولوی امام الدین دہلوی لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ فنِ سخن میں شاہ نصیر سے تلمذ تھا۔ مولانا شاہ عبدالعزیز کے مرید تھے۔ علمی استعداد کافی تھی۔ شاعری کے رموز و نکات سے پورے واقف علم بدیع و عروض سے ماہر تھے۔ رسالہ تفویت الشعراء انہیں کی تصنیف سے ہے۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔ رباعیاں کہنے میں کمال تھا۔ اخلاقی مضامین سادہ پیرایہ میں خوب نظم کئے ہیں۔ دو رباعیاں درج ذیل ہیں

یارو جو کوئی کسی کو کلپائے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پائے گا
اس دارِ مکافات میں سن لے طالب
جو کچھ تو کرے گا آج کل پائے گا

دیگر

گھر پاس نہیں کہ یار پاس آئے مرے
زر پاس نہیں کہ یار پاس آئے مرے
مَیں پہلے ہی کر چکا ہوں طالبؔ قرباں
سر پاس نہیں جو یار پاس آئے مرے

طالب

طالب:- پنڈت الائچی رام باشندہ جلال آباد۔ ضلع امرت سر۔ شاگرد نسّاخ ان کے باپ کا نام سوبھی رام تھا۔ قوم کے برہمن تھے۔ ۱۸۶۱ئہ میں باریسال میں قیام تھا۔ ذکی الطبع اور ذہین تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

مجھ پر وہ ظلم یار نہ اغیار نے کیا
جو کچھ کہ بخت و چرخ ستمگار نے کیا
سختی سے سوم بھلا ہے کہ دے جواب شتاب
اجی تم اتنا تو فرماؤ آؤ گے کہ نہیں
بے گناہوں کو قتل کرتے ہو
روزِ محشر کا تم کو ڈر ہی نہیں
ہم تو مرتے ہیں ایک مدّت سے
واہ جی تم کو کچھ خبر ہی نہیں

طالب

طالب: مولوی طالب الدین خلف مولوی عزیز الدّین صادق۔ رئیس بدایوں فنّ شعر میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی میں کافی لیاقت رکھتے تھے۔ مرزا غالب کے کلام سے دلی محبت تھی۔ کلام میں روانی وسلاست ہے۔ چند شعر بطور نمونہ نذر ناظرین ہیں:-

علاج کرتے ہیں یوں سوزشِ نہانی کا
وہ آب تیغ سے لیتے ہیں کام پانی کا
جلوہ حسن وہ ہر شکل میں دکھلاتا ہے
کبھی یوسف کبھی شیریں کبھی لیلےٰ ہو کر
یہیں ہیں دلبروں کی دلربائی دیکھنے والے
ادا پر مرنے والے کج ادائی دیکھنے والے
لباس ظاہری سے کوئی اچھا ہو نہیں سکتا
صفائی قلب کی دیکھیں صفائی دیکھنے والے
نظر بازی کبھی کرتے نہیں حورانِ جنّت سے
حسیناں جہاں کی دلربائی دیکھنے والے
صنم سے عشق ہے تم کو نہیں ہو حضرت طالب
بتوں کو دیکھکر شانِ خدائی دیکھنے والے

طالب:- محمد قطب الدین احمد خاں ابن غلام رسول خاں رامپوری۔ آپ کا خاندان سلطنت اودھ کے دور میں معزز و ممتاز رہا۔ اور اس کے بعد ریاست ٹونک اور گوالیار میں رسوخ حاصل کیا۔ آپ کی والدہ نواب ضیاء الدولہ سعید الدین احمد خاں کی خواہرزادی ہیں۔ اور حکیم ارشد خاں ابن حکیم مسیحا معالج شاہ عباس صفوی ایران بھی آپ کے ننھیالی رشتہ داروں میں تھے۔

آپ ۱۸۵۵ء میں بمقام گوالیار پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسی ریاست میں اورسیری اور انجینیری کے خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۹ء میں وکیل دربار گوالیار ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں محکمہ پولیٹکل ایجنسی بھوپال میں اپنے والد بزرگوار کی جگہ حاصل کی۔ کلام میں مزا اور طرز ادا بانکی ہے۔ معمولی مضامین کو زور طبع اور زبان آوری سے نیا رنگ دیتے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

جلوہ سما رہا ہے جو وحدت کے نور کا
دل صاف آئینہ ہے تجلّیِ طور کا

جتنی بڑھی شمار میں اتنی ہی گھٹ گئی
اپنا حساب عمر عمل ہے کسور کا

وہ اگر زیب کمر رکھتے ہیں خنجر اپنا
ہم بھی پھرتے ہیں ہتھیلی پہ لئے سر اپنا

ظلم افلاک غم عشق ستم ہائے عدو
دیکھتے ہیں جو دکھاتا ہے مقدر اپنا

آگئیں یاد جوانی کی ترنگیں ہم کو
فصل گل میں جو کہیں ساغر و مینا دیکھا

خواب کا دیدۂ بیدار میں آنا کیسا
لگ گئی آنکھ تو پھر آنکھ لگانا کیسا

نظروں سے وہ غائب ہے تو پہلو سے یہ گم ہے
ہے کس کو پتہ تیری کمر کا مرے دل کا

کچھ ربط بڑھانے میں جھجکتے ہیں وہ طالب
شاید کہ بھروسہ نہیں انکو مرے دل کا

دل زار پھر مبتلا ہے کسی کا
نئے سر سے سودا ہوا ہے کسی کا

اٹھائے تو کوئی جفائیں تمہاری
ہمارے سوا حوصلہ ہے کسی کا

پھر رہا ہوگا انہیں کوچوں میں بھولا بھٹکا
تیرے گیسو کے سوا دل کہیں آیا نہ گیا

کبھی تو وہ ستمگر راہ پر آئیگا اے طالب
کبھی تو راستی پر ہم سے دَورِ آسماں ہوگا

خندہ و گریہ میں کیوں غم تلف کرتے ہیں
حال کہتے ہی نہیں کچھ گل و شبنم اپنا

ہم نشیں پھر بھی ہوا یہ ناتوانی کا اثر
درد کا اُٹھنا مرے پہلو سے مشکل ہوگیا

ہوتی نہیں جو ختم شبِ غم کسی طرح
سایہ پڑا ہے کیا مرے روزِ سیاہ کا

پہلا سا ربط ضبط ہی ان سے نہیں رہا
پیغام اور سلام ہے اب گاہ گاہ کا

اِک عمر سے ہے پیرِ فلک یوں جو سرنگوں
مارا ہوا ہے یہ کسی نیچی نگاہ کا

غضب ہے بزم میں ہم بیٹھیں میہماں کی طرح
نشستِ غیر ہو پہلو میں رازداں کی طرح

ہمارے دل کو ہے بے مہری فلک مطبوع
کہ اسکی بھی ہے روش اپنے مہرباں کی طرح

شباب ہی میں کیا زورِ عشق کے غم نے
بہار آئی چمن میں مرے خزاں کی طرح

مِرے پہلو سے کہاں جاتا ہے اُٹھ کر اے درد
اور تڑپے گا دلِ زار اکیلا ہو کر

اب نہ دل ہے مرے سینے میں نہ دِل میں ارماں
بہہ گئے آنکھ سے سب خونِ تمنّا ہو کر

اس مدرسے میں عشق کے آکر وہ لے سبق
جو پہلے یہ سمجھ لے کہ فاضل ہیں گھر سے ہم

ہیں کیوں تمہارے کوچہ کے چکّر یہ رات دن
کچھ بدگماں ہیں گردشِ شمس و قمر سے ہم

بوسہ دے کر یہ جتلاتے ہو کہ کب کچھ نہ دیا
دینے والے مری جاں اس سے سوا دیتے ہیں

آشوبِ دہر سے کہیں یارب اماں نہیں
وہ کونسی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

پیری بشر کی تا دمِ آخر رفیق ہے
ہے یہ عجب بہار کہ جس کی خزاں نہیں

دکھا کر وہ رُخِ گلگوں خجل کرتے ہیں گلشن کو
دہن سے غنچہ کو، عارض سے گل کو، لب سے سوسن کو

کبھی چرچا جو سُن لیتے ہیں فصلِ گل کی آمد کا
تو کرتے ہیں قفس میں یاد ہم اپنے نشیمن کو

ہوں وہ بیمارِ جنوں میرے لئے اے چارہ گر
نوکِ خارِ دشت جائے نشترِ فصّاد ہو

معرکہ میں عشق کے اے دل قدم رکھتا ہے تو
اب اُٹھانی ہی پڑے گی بار جو افتاد ہو

یہ آب و تاب زاہد بھی جو دیکھے تو پھسل جائے
دکھو کہ دختِ رز نے خوب ہی رنگت نکالی

کوئی کروٹ نہیں لیتا کوئی پھر کر نہیں آتا
عدم کے جانے والوں نے نئی دنیا نکالی ہے

ہمیں دونوں کا یکساں ہے مزہ فرق اس میں تم کر دو
زبانِ لب سے سمجھا دو یہ بوسا ہے یہ گالی ہے

جس پہ ان کی نگاہ ہوتی ہے
اس کی حالت تباہ ہوتی ہے

ذکرِ الفت وہ سن کے کہتے ہیں
کہیں یہ رسم و راہ ہوتی ہے

ضعف سے دردِ دل نہیں اٹھتا
کچھ کسک گاہ گاہ ہوتی ہے

کام کر دیتی ہے ادا اُن کی
ہاں قضا سدِ راہ ہوتی ہے

کام آتی ہیں عشق میں جانیں
کیا کٹھن اس کی راہ ہوتی ہے

جو آئے وہ تو طبیعت ابھارتے آئے
چلے تو وہ دلِ عاشق کو گدگدا کے چلے

کچھ آنے جانے کا اپنے کھلا نہیں اسرار
کہاں سے چل کے ہم آئے کہاں کو آکے چلے

بدگماں ہوتے ہیں اب تو وہ مری ہر بات پر
روٹھ جاتے ہیں خدا کی شان ہنستے بولتے

صبح کو اے دل جو کچھ گذرے گی دیکھی جائیگی
رات تو کٹ جانے دے ناداں ہنستے بولتے

آدمیت کے یہ معنی ہیں کہ ہنسئے بولئے
ورنہ دنیا میں ہیں کیا حیواں ہنستے بولتے

کل ہم سے سیکھتے تھے جو الفت کی رسم و راہ
چالیں وہ آج چلتے ہیں قدرت خدا کی ہے

جوبن ابھار پر ہے جوانی بہار پر
شہرت زمانے میں ترے نشو و نما کی ہے

میں نے جو پوچھا یاد ہیں کچھ ابتدا کے ربط
بولے مرے مزاج میں بھول انتہا کی ہے

اقرار ترے سچے ہیں وعدے ترے پورے
سچ یہ ہے کہ جھوٹے سے خدا کام نہ ڈالے

بسنت کی بھی تجھے کچھ خبر ہے اے بلبل
بہار لائی ہے سامان یہ سب خزاں کیلئے

نظر لگے گی نہ مشقِ ستم بڑھا ظالم
جفائیں رہنے دے باقی کچھ آسماں کیلئے

شیشے کے ساتھ ٹوٹینگے ہم میکشوں کے دل
ڈر محتسب خدا کیلئے اس گناہ سے

کیا کیا ترے ستم کی اٹھاتا ہے لذتیں
پوچھے کوئی مرے دلِ بیداد خواہ سے

آیا ہے اک جہاں ترے نظارہ کیلئے
دیر و حرم سے میکدہ و خانقاہ سے

بیقراری وہ شبِ ہجر کی سُن کر بولے
یہ بُت بھی خود کو خدا جانے کیا سمجھتے ہیں
ہمارے شیشۂ دل کو سنبھال کر رکھنا

لطف کیا وصل میں کچھ اس سے سوا رکھا ہے
دو روزہ حسن پہ کتنا غرور ہوتا ہے
ذرا سی ٹھیس میں یہ چُور چُور ہوتا ہے

طالب

طالب:- پنڈت کشن لال چودھری دہلوی۔ کشمیری پنڈتوں کے علم دوست فرقہ سے تھے۔ مذاقِ سخن نہایت پختہ تھا۔ ضروریات شعری سے پُورے واقف اور مشاق شاعر تھے مولوی محمد حسین آزاد اور نواب مرزا ظہیر سے تلمذ تھا۔ محکمہ تعمیرات و انہار میں اکونٹنٹ تھے۔ کئی رسالے نثر کے مثل گلگیر کشمیر وغیرہ اپنی برادری کے حالات سے متعلق لکھے۔ مذہبی معلومات بھی آپ کی اعلےٰ پایہ کی تھی۔ آخر عمر میں ملتان میں رہتے تھے۔ کئی برس گذرے وہیں اس جہان سے گذر گئے۔ کلام پاکیزہ اور طرزِ قدیم کے محاسن کا حامل ہے ملاحظہ ہو۔

محفل سے گر عدو کو اٹھایا نہ جائے گا
تو ہم سے بزمِ یار میں جایا نہ جائے گا

میں جاؤں اس جہان سے یا جان تن سے جائے
پر ہائے کوئے دوست سے جایا نہ جائے گا

شکوے کیا کیا کیجئے اس چرخ کج رفتار کے
اس کی چالوں نے تو یاں صد ہا کو برہم کر دیا

اوس ڈالی ہے فلک نے اس چمن پر ہے غلط
اپنے ہی اشکوں سے ہم نے کارِ شبنم کر دیا

دل سے جو مجھ کو عشق ہے اُس بے نیاز کا
مائل نہ عشوہ پر ہوں نہ قائل ہوں ناز کا

طالب اسی کو رہتی ہے اسرار کی خبر
ہے رازدار خود جو ہر اک دل کے راز کا

گرچہ خاموش کے ہے پار فضیلت سب کی
جانتے پر نہیں ناموس میں اور ننگ میں فرق

ہم نے سَو ڈھنگ زمانے کے بدلتے دیکھے
لیکن آیا نہ یہاں اپنے کبھی ڈھنگ میں فرق

عقبےٰ میں کام ہو گا نہ کچھ رنج و غم کیساتھ
دنیا کے مخمصے یہ یہیں تک ہیں دم کیساتھ

ماتم سدا نہ کیوں کہیں دنیا کو ہم دیدہ
ہستی میں ہم نے پانو رکھے چشم نم کیساتھ

طالب

طالب:- سید بشیر محمد تلمیذ حضرت غالب دہلوی۔ کلام معمولی پایہ کا ہے۔ نمونہ نذر ناظرین ہے:۔

اُس چشم سرگیں سے ملاتی نہ آنکھ تھی
لڑنا پڑا ہے اب تو خدایا قضا کے ساتھ

رنگت نہ ہاتھ پاؤں کی جائے تمام عمر
میرا لہو ملا کے ملو تم حنا کے ساتھ

بچتا کسی طرح سے کوئی شگفتہ نہیں
کیا لاگ ہے اجل کو تیرے مبتلا کے ساتھ

طالب یہاں جو کرنا نہ تھا وہ بھی کر چکے
اب دیکھئے بنیگی وہاں کیا خدا کے ساتھ

طالب

طالب: منشی ونایک پرشاد خلف الرشید منشی روشن لال سابق قانون گو تحصیل بنارس۔ کایستھ سری باستو۔ بزرگوں کا وطن قصبۂ اترولہ ضلع گونڈا اودھ ہے۔ ان کے جدِّ امجد منشی درگا پرشاد جو ضلع گورکھپور میں سررشتہ دار عدالت خفیفہ تھے۔ وہاں سے تبدیل ہو کر بنارس میں آرہے تھے۔ انگریزی ہندی۔ اردو۔ فارسی کی تعلیم وہیں پائی۔ پھر بمبئی میں مرہٹی اور گجراتی حاصل کی۔ کالج چھوڑ کر منشی صاحب نے برسوں ملک کے نامور اردو اخبارات میں اخلاقی تمدنی سیاسی زوردار مضامین لکھے۔ انشاپردازی میں مہذب ظرافت اور شوخی کا رنگ نمایاں تھا۔ جب کسی مضمون کے خلاف قلم اٹھاتے تو فقرہ فقرہ دلوں میں چبھ جاتا۔ بعض مضامین میں تاریخی دلائل کو اس خوبی سے قلمبند کرتے کہ ناظرین کی آنکھوں میں راستی اور صداقت کا نقشہ کھنچ جاتا۔ شاعری میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے ان کے تلامذہ کثرت سے تھے۔ مختاری کا امتحان دے کر الہ آباد ہائی کورٹ سے سند حاصل کی تھی مگر طبیعت کا رجحان شاعرانہ مذاق اور علمی مشاغل کیطرف تھا۔ قانونی جھگڑوں میں دل نہ لگا۔ بنارس سے کلکتے چلے گئے اور دو سال تک ڈاک خانہ کے محکمے میں کام کیا۔ اور اسی اثنا میں کئی ڈرامے لکھے۔ یہ فن نہایت گری ہوئی حالت میں تھا۔ اس کی اصلاح کرنے والوں میں آپ کو شرفِ اولیت حاصل ہے۔ آغا حشر اور سید مہدی حسن احسن آپ کے بہت مدت بعد اس میدان میں آئے۔ حضرت طالب کے قلم سے نکلے ہوئے ڈرامے جو عام طور پر مقبول ہیں اور جن کے صلے میں والیانِ ریاست نے انھیں تمغے دیئے تھے۔ آج تک سند میں پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ ڈرامے کی تصنیف

ہیں نہایت احتیاط سے کام لیتے۔ طرز معاشرت۔ طریقۂ تمدن۔ خصوصاً سینری کا زیادہ لحاظ رکھا انکے دیکھنے اور پڑھنے سے دل و دماغ پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ ظرافت بھی ہے مگر تہذیب کا پہلو لئے ہوئے۔ سوسائٹی کی کمزوریوں کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ ناگوار نہیں معلوم ہوتا۔ بیہودہ خیالات۔ پیچیدہ استعارے۔ مغلق الفاظ کسی مکالمے میں نہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن میں زبان کی خامیاں نظر نہیں آتیں۔ ٹریجڈی[1] کے حقیقی مقاصد کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ کامیڈی[2] کے جلوہ گاہ میں ان کا قلم خوشی کے پھول برسا دیتا ہے۔ ہر موقعہ پر شرم وحیا کا دامن ہاتھ میں رکھتے ہیں اور گرے ہوئے مذاق سے دُور رہتے ہیں۔ پندرہ بیس[؟] ڈرامے مطبوعہ ہیں۔

آپ کو شاعری کا شوق بیس برس کی عمر سے تھا۔ اوّل جناب راسخ دہلوی اس کے بعد جناب داغؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ عاشقانہ غزلوں کے علاوہ بہت سی نظمیں انھوں نے کہیں جو ملک کے رسالوں میں مشتہر ہوکر مقبولِ عام ہوئیں۔ کلام صاف ہے شوکت لفظی سے کلام کی رونق دوبالا کر دیتے ہیں۔ ترکیب کی رعنائی بندش کی زیبائی سپہر نظم پر چار چاند لگا دیتی ہے۔ زبان سادہ ہے سلیس محاورات نظم کرتے ہیں۔ رعایت لفظی کی بے ضرورت کھپت ان کے ہاں نہیں۔ اسی وجہ سے اُردو کے شعر شاذ نظر آتے ہیں۔

غزل میں اخلاقی خیالات کو بھی خوب ادا کرتے ہیں۔ جس طرح پریم چند فسانہ نگاری میں مشہور ہیں۔ اسی طرح ڈراما نویسی میں یہ سحر نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۲ئہ میں بمقام بمبئی انتقال کیا۔ جو کچھ کلام فراہم ہو سکا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

دیکھئے شوخی کہ خود ہی چھین کر دل لے گئے	اور خود ہی پوچھتے ہیں کیا ترا جاتا رہا
ہزار جان کے دشمن تھے ایک یار نہ تھا	ہزار غم تھے مگر ایک غمگسار نہ تھا
عدم سے بھیجتے احباب کو خبر طالبؔ	ہزار حیف کہ اپنا کچھ اختیار نہ تھا

[1] ٹریجڈی۔ غمناک قصہ۔　[2] کامیڈی۔ مسرت خیز قصہ۔

ہم عندلیب نالاں یہ بوستاں ہمارا / ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا
مرنا یہاں ہمارا جینا یہاں ہمارا / ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا
وہ بھی گھڑی تھی اپنی وہ بھی تھے دن ہمارے / جب معتقد بنا تھا سارا جہاں ہمارا
یونان میں ہمیں ہم ایران میں ہمیں ہم / چرچا یہاں ہمارا شہرہ وہاں ہمارا
جب آفتابِ غفلت ڈوبا تو دیکھ لینا / چمکیگا پھر ستارہ اے آسماں ہمارا

عاشق کو بد و نیک سجھائی نہیں دیتا / دیکھا ہے کہ الفت میں دکھائی نہیں دیتا
شہرہ ہے جہاں میں ترے خنجر کے چلن کا / وہ کون ہے جو دادِ صفائی نہیں دیتا

ٹل جاتے ہیں جس وقت ستم پر نہیں سنتے / ہاں ہاں سے جو روکیں تو وہ کہتے ہیں نہیں اور

آتشِ عشق جلی رہتی ہے ہر دم دل میں / آگ سے ہو نہیں سکتا یہ سمندر باہر

آنکھیں مری نثار ہیں ابروئے یار پر / پتلی کا ناچ دیکھئے خنجر کی دھار پر

پردہ خود آنکھ کا ہے ہمارے لئے حجاب / ورنہ ترے جمال کا جلوہ کہاں نہیں

اہل اسلام اور اہل ہنود / خاکِ ہندوستان ہیں دونوں
کیوں نہ دونوں کا دم غنیمت ہو / جسم ہے ملک جان ہیں دونوں
نام ہی نام رہ گیا ہے اب / اجڑے گھر کے نشان ہیں دونوں
دل جگر جس میں چاہیئے رہئے / آپ ہی کے مکان ہیں دونوں
دار فانی سے جا کے داغؔ و امیرؔ / خلد کے مہمان ہیں دونوں
خوش رہیں اب ظہیرؔ اور جلالؔ / شاعر خوش بیان ہیں دونوں

کیا بات ہے سفاک ترے تیرِ نظر کی / کہتا ہوں کہ رکھ لوں اسے دل میں کہ جگر میں

زیرِ زمیں بھی چین ملے کوئی دم ہمیں / امید تجھ سے اتنی بھی اے آسماں نہیں

واعظ ہمیں بہشت کی ایسی پڑی ہے کیا / کچھ میکدہ نہیں کوئی کوئے بتاں نہیں

انداز شوخیوں نے نکالے حجاب میں / اپنا سا منہ وہ رہ گئے لیکر نقاب میں

بدمستیوں سے جان پڑی ہے عذاب میں
کیا خاک جی لگے کسی کارِ ثواب میں

آئے گی روزِ حشر مرے منہ سے بوئے گل
پیتا ہوں روز پھول ملا کر گلاب میں

احباب سیر دیکھیں اگر آنکھ کھول کر
دریا میں ہے حباب تو دریا حباب میں

جھکیں منعم تہی دستوں کے آگے تو بُرا کیا ہے
صراحی جام کے آگے جھکا لیتی ہے گردن کو

لحد سے روزِ محشر بھی نکلنے کا گماں کیوں ہو
مرکاں جو مر کے ہاتھ آیا طبیعت پر گراں کیوں ہو

لگا دو آگ عالم میں جلا دو طور کو دم میں
یہ دعوےٰ ہے اگر تم کو تو پردے میں نہاں کیوں ہو

کیونکر ہو اختیار میں اظہارِ آرزو
لکھوں جو نامہ ان کو تو پوری کتاب ہو

لکھوں جو نامہ عارضِ گلگوں کی یاد میں
خط کا ہر ایک فقرہ گلستاں کا باب ہو

زاہدو کر لو مری پردہ دری
کیا ہوا اللہ تو ستار ہے

ہمارے خون سے سیکھے مکرنا
چھڑا لو داغ پہلے آستیں سے

یہاں سے دلبری سیکھی ہے تم نے
لگے استادیاں کرنے ہمیں سے

توکل ہو تو ہر مقصود ملجاتا ہے گھر بیٹھے
کہ دستِ موج خود آکر لبِ ساحل سے ملتا ہے

ریشِ گو چہرہ پہ زاہد کے خدا کا نور ہے
خانۂ دل دیکھئے تو خانۂ دیجور ہے

وسیلہ چاہئے اجرائے کار سے پہلے
ہوا ہمیشہ چلے گی غبار سے پہلے

طلب کی راہ میں اکثر لگا کے شوق کے پر
پہنچ گیا ہے پیادہ سوار سے پہلے

یہ کارگاہِ جہاں عدل کا مقام نہیں
عیاں ہے جبر یہاں اختیار سے پہلے

مرمٹیں تیری طلب میں تو سہی
یار بھی طالب ہیں اپنے نام کے

کاگ اڑے دور چلے سامنے بوتل آئے
میکشو مژدہ! بڑے زور سے بادل آئے

لختِ جگر کہ پارۂ اخگر بغل میں ہے
پہلو میں دل ہے یا کوئی نشتر بغل میں ہے

مسجد میں یہ دعا ہے کہ یارب کھلے نہ بھید
بوتل ہے میری جیب میں ساغر بغل میں ہے

انداز یہ نیا ہے تمہارے ملاپ کا
آئے گلے بھی ملنے تو خنجر بغل میں ہے

ہم نہ باہر ہوئے دم بھر کبھی میخانے سے
توڑ کر توبہ الگ پھینک دو میخانے سے

کبھی شیشے سے گذر کی کبھی پیمانے سے
ہو نہ ایماں شکنی میکشو پیمانے سے

قصۂ ہجر سناؤں تو سناؤں کیونکر
نیند آجاتی ہے اُن کو مرے افسانے سے

طالب اس جنگ کو ہم کیوں نہ مبارک جانیں
صلح اس بُت سے ہوئی بخت کے لڑ جانے سے

کسی کروٹ کسی پہلو تو ملے چین مجھے
کاش وُہ درد ہی بن کر دل مضطر میں رہے

نام سے عشق کے جلتے ہیں وہ اتنا کہ اگر
ان کا بس ہو تو شرارہ بھی نہ پتھر میں رہے

ہجر کی شب کر گئی اندھیر کیا
صبح محشر میں ہیں جلوے شام کے

رُوسیاہوں میں ہوئے ہم سرخ رُو
کیا کرشمے ہیں مے گلفام کے

خضر سے راہِ میکدہ پوچھیں
آدمی ہیں یہی ٹھکانے کے

طالب:- طالب حسین خاں ابن ملا حسین عسکری۔ جوانِ رعنا۔ کشیدہ قامت۔ خوش اخلاق۔ خوش تقریر۔ طبع بلند رکھتے تھے۔ مرشد زادہ میرزا سلیماں شکوہ کے ہاں خاصہ کی داروغائی پر معمور رہتے تھے۔ فن شعر میں سید انشا سے تلمذ تھا۔ کلام میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ تذکرہ شوق سے اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

دشت میں نالہ کیا یار جو طالب نے تیرے
ایک شعلہ سا گیا خار مغیلاں سے لپٹ

غیر سے مل کے شعلہ خو ناحق
کیوں جلے کے تئیں جلاتا ہے

مژدہ اے قیس تیری وادی میں
ناقہ لیلیٰ کا آج آتا ہے

آج طالب کا عشق میں تیرے
جلد آ ورنہ جی ہی جاتا ہے

طالب:- خدا بخش ولد عبداللہ ملتان کے رہنے والے ہیں۔ ۱۲۸۴ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت شوق نیموی و جناب شمشاد سے تلمذ تھا۔ ۱۳۱۰ھ میں دیوان قومی پریس میں طبع ہو چکا ہے۔ طبیعت کو شاعری سے لگاؤ ہے۔ فکر مضمون یاب ہے۔ پہلے تجارت پیشہ تھے۔ اب کرایہ مکانات وجہ معاش ہے نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

کسی کا دل نہ ہلا دے تو وُہ فغاں کیسی
کسی کے غم میں نہ تڑپے تو وہ جگر کیسا

دل میں نے سمجھ بوجھ کے اے جان دیا ہے
پھر کہتے ہو تم سا کوئی ناداں نہیں دیکھا

حسرت کبھی رہتی ہے کبھی ان کی تمنّا
کب خانۂ دل میں کوئی مہماں نہیں دیکھا۔

پوچھو نہ کچھ گدائے محبّت کی مفلسی
جانِ عزیز دی تو میسّر کفن ہُوا۔

کہتے ہیں ابروؤں سے مجھے قتل کرکے وُہ
ان خنجروں نے وار کیا ہم نے کیا کیا

شکایت ستم و جور سے تو در گذرے
اب اور رحم کریں کیا کسی ستمگر پر

نہ ہوگا صاف کبھی مثلِ شیشۂ ساعت
جمی ہے گرد کسی کے دلِ مکدّر پر

ہماری لغزشِ پا کا سنبھالنا دیکھو
گرے بھی ہم تو گرے آستانِ دلبر پر

عرش پیما تھی کبھی اے بت جو تیرے ہجر میں
آج لب تک بھی وہ آہِ نارسا آتی نہیں

لگائی تھی جو وقتِ قتل ٹھوکر اس نے ماتھے پہ
شہیدِ ناز کی شاید وہی مہر جبیں نکلی

طالب:۔ غلام زین العابدین لاہور کے رہنے والے ہیں۔ سید ناظر حسین ایڈیٹر اخبار ناظم الہند کے شاگرد ہیں۔ رعایت لفظی کیساتھ زبان کو بھی نبھاتے ہیں ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

عدم والے کہاں جاتے ہیں چپکے چپکے پوچھیں تو
بتا نے جائیں کیا دستور ہے شہر خموشاں کا

کیا مسلماں ہو کہ ہو طالب بتوں کے رات دن
شرم بھی کچھ تم کو اے مردِ خدا آتی نہیں

ہجر میں ہوش کہاں صبر و تحمّل کس کا
اب تو اپنے بھی نظر آتے ہیں بیگانے سے

ساغرِ مے کو جو گردش ہے زمانے کی طرح
دیکھ آیا ہے نرگسی آنکھ یہ میخانے سے

کس پری رو کی محبت میں ہے یہ حال اُن کا
کہ نظر آتے ہیں طالب ہمیں دیوانے سے

طالب: محمد عبد الرحیم خاں شاہجہان پوری۔ انسپکٹر محکمہ نمک۔ شاگرد جناب صفدر۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

لکھا مجھے جو خط تو یہ تازہ ستم ہُوا
دشمن کو بھی مرے وہی مضمون رقم ہُوا

پھرتا نہیں ادھر کا مسافر کوئی کبھی	کوچہ کسی کا جادۂ راہ عدم ہوا
"لکھئے جواب نامہ" یہ کوئی قصور تھا	اتنی سی بات پر سر قاصد قلم ہوا

طالب

طالب:۔ منشی ٹھاکر پرشاد ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگوں کا وطن مانکپور ضلع پرتاب گڈھ ہے۔ آپ کے دادا منشی ہنومان پرشاد زبان فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ابتدائی درسیات فارسی انھیں سے پڑھیں۔ بعد کو منشی ولایت علیخاں ولایت دمحمد عزیز اللہ شاہ عزیز ساکن قصبہ صفی پور ضلع اناؤ سے فارسی کی تکمیل کی۔ آپ کے دوران تحصیل میں آپ کے استاد منشی ولایت علی خاں نے آپ ہی کے لئے پنج رقعۂ ولایت تصنیف فرمایا تھا۔ شعر و شاعری کی طرف طبیعت ابتداء ہی سے مائل تھی۔ لیکن انکسار طبع کے باعث (جیسا کہ آپ نے خود اپنے کلام میں تحریر فرمایا ہے۔ کہ "میدانستم کہ کلام شعرائے سابق گویا زبان دیگراں بستہ است") زیادہ مشق سخن نہ فرماتے تھے۔ زمانہ ملازمت محکمۂ وثیقہ فیض آباد میں آپ کے احباب نے آپ کو ایک مشاعرے میں صدر قرار دیا جب سے مشق جاری ہوئی۔ آپ کا کلام سلجھا ہوا اور متین۔ زبان صاف استعارات پسندیدہ اور زبردستی کے پریشان کن صنائع سے پاک ہے۔ تصوف کا رنگ زیادہ ہے۔ ۱۹۰۴ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ کلام ارمغان خیال کے نام سے ۱۹۲۳ء میں طبع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر کا دن بھی ہے طالب سامنا بھی یار کا	دیکھئے دکھلائے کیا کیا ولولہ دیدار کا
کیوں نہ مجھ شوریدہ سر کو چھوڑ دیں ہوش و حواس	کیا سپاہی ساتھ دیں گرتے ہوئے سردار کا
دیدہ جاناں سے کیا چشم عیادت ہو مجھے	حال پوچھے گا کوئی بیمار کیا بیمار کا
آسمان بے ستوں سے طرفہ قدرت ہے عیاں	دیکھتے ہیں چھت پتا چلتا نہیں دیوار کا
ایک دل طالب وہ ہو کس کس مصیبت کا شریک	درد کا غم کا بلا کا ہجر کے آزار کا
ابر چھایا ہے چمن پر ہے کرم باری کا	ساقیا جلد پہنچ وقت ہے میخواری کا

تجھ کو یوسف نہیں کہتے میں تو باعث یہ ہے	حوصلہ تا نہ کرے کوئی خریداری کا
مدحتِ زلف میں دھیان آگیا عارض کا مجھے	خواب دیکھا ہے بھری نیند میں ہشیاری کا
اِن حسینوں کا بھی دِل آئے کسی پر طالب	پھل ملے ان کو بھی عاشق کی دل آزاری کا
فرقتِ یار میں کیا مدِنظر ہے دِل کو	آنکھ نے کیوں طرف گورِ غریباں دیکھا
دِل کو پیری میں محبت کا تری جوش آیا	بیخودی شب کو رہی وقت سحر ہوش آیا
خانۂ چشم سے یوں اشک نکل کر آئے	جس طرح سیپ سے موتی کوئی باہر آئے
ہاتھ خالی ہی رہا دونوں جہاں میں اپنا	نہ لئے جاتے ہیں کچھ ساتھ نہ لے کر آئے
تب تو سیفی کے اثر کا ہو مرے دل کو یقین	اپنی آئی ہوئی جب غیر کے سر پہ آئے
جمگھٹھا بادہ کشوں کا ہے یہاں اے واعظ	اس اکھاڑے میں کدھر آپ بھٹک کر آئے
صحنِ گلشن میں عنادل نے ہوا باندھی ہے	کِس طرح پھولوں کی بُو باغ کے باہر آئے
گل ہے بلبل سے خفا گل سے صبا بگڑی ہے	بعد مُدت کے گلستاں کی ہوا بگڑی ہے
نقش برآب ہے یہ نقش و نگارِ دُنیا	خانۂ دہر کی اوّل سے بنا بگڑی ہے
راہ بھولے مِرے گھر کی تو گئے غیر کے گھر	ہائے کیسی مری تقدیر خدا بگڑی ہے
خون کرنا اسے منظور ہے خود طالب کا	اس لئے خنجرِ قاتل سے حنا بگڑی ہے

طالب

طالب :- سید شاہ طالب حسین۔ عرف شاہ درگاہی خلف رضا حسین۔ سیورو جو صوبہ بہار کی نواح میں ایک قصبہ ہے۔ وہاں اُنھوں نے اقامت اختیار کر لی تھی۔ علم رمل سے ماہر۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں فرد تھے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ مگر طبیعت پر میل نہ آنے دیتے۔ نواب نصیر حسین خاں نے جو مختصر حالات بھیجے تھے وُہ درج کئے گئے۔ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ صرف ایک شعر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ضعیفی میں ہوئے ہو کور طالب	تمہیں کیا کام ہے اب دلربا سے

طالب

طالب :- منشی شبیر محمد خاں دہلوی شاگرد عبدالرحمٰن خاں احسان۔ ۳۴ برس کی عمر

پائی۔ طبیعت میں شاعری کی استعداد تھی۔ سلاست زبان کا نمونہ یہ ہے۔

بھرعیات آئیں تو اس وقت آئیں گے	جس وقت مجھ سے لب بھی ہلایا نہ جائیگا
انداز وہ بلا نگہِ پُرفسوں وہ قہر	اس فتنہ گر سے دل کو بچایا نہ جائیگا
ہر مُوئے تن ہے شعلہ فشاں ہجرِ یار میں	اس آگ کو کسی سے بجھایا نہ جائے گا

طالب

طالب:۔ حافظ محمد حنیف تلمیذ حضرت داغ مرحوم۔ معمولی طبیعت اور اوسط فکر کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ دو شعر بطور نمونہ درج ہیں:۔

کیونکر دل عدو میں سمایا وہ حور وش	دوزخ میں کس طرح سے الٰہی حرم ہوا
وجہ سرور مژدہ وصل صنم ہوا۔	کچھ دل کی آگ کم ہوئی کچھ درد کم ہوا

طالب

طالب:۔ مولوی محمد ریاض الدین شاگرد حضرت غالب مرحوم۔ ان کے تفصیلی حالات نہ معلوم ہو سکے۔ صرف دو شعر دستیاب ہوئے۔ جو درج ذیل ہیں۔

کیا اور وصف زاہد مے کش کا کیجئے	بد عہد اس قدر ہے کہ توبہ شکن ہوا
طالب پس فنا نہ ہوا کوئی پردہ پوش	میرا لباس عمر بھی آخر کفن ہوا

طالب:۔ حافظ الٰہ بخش تلمیذ حضرت رسا۔ کبھی صوفیانہ لباس پہن کر حال قال کی محفلوں میں نظر آتے۔ کبھی شاعری کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ جاتے۔ مدتوں عربی مدارس میں طالب علمی کی۔ ۱۹۰۸ء میں جب صاحبزادہ شبیر علی خاں دلی میں اقامت گزیں تھے تو یہ بزرگوار بھی ان کی مصاحبت میں تھے۔ شکل وصورت کے علاوہ آواز بھی عجیب وغریب تھی۔ جب غزل پڑھتے تو ان کے ہاتھ صف مشاعرہ سے گز گز بھر باہر ہو جاتے۔ عرصہ دراز سے کچھ حال نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کیا شغل ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ظلم اچھا نہیں ہوتا ہے کسی پر دیکھو	اپنے طالب کو نہ تم آنکھ بدل کر دیکھو
ورد فرقت سے کسی طرح نہ ہو گی صحت	اپنے بیمار کی تم آپ دوا کر دیکھو
وُہ دن بھی یاد ہیں تو اُٹھا تھا خود بٹھانے	محفل سے آج اپنی مجھکو اُٹھا رہا ہے۔

تجھ کو بتاؤں کیا میں کیوں شکل آئینہ ہوں	یہ حسن تیرا مجھکو حیران بنا رہا ہے

طالب

طالب:۔ منشی طالب علی خاں قصبہ بھگانہ ۔ علاقہ ننما ریاست جے پور کے باشندے ہیں۔ اجمیر میں کئی سال تک پولیس میں ملازم رہے۔ اردو فارسی سے بخوبی واقف ہیں۔ علم معانی وعروض میں دخل رکھتے ہیں۔ حضرت قتیل بھرتپوری سے تلمذ ہے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہوئے۔ کلام یہ ہے۔

پوچھو نہ کچھ حیات کا عرصہ ہے مختصر	میری شب فراق کا قصہ دراز ہے
قسمت رسا ہوئی تو کسی روز دیکھنا	وہ آستاں ہے اور جبین نیاز ہے
آنکھیں کریں گی پردہ دری یہ خبر نہ تھی	میں جانتا تھا عشق مرے دل کا راز ہے
دامن اٹھا کے چلنا ہے وہ بت مزار سے	اللہ میری خاک سے بھی احتراز ہے
جلتے ہیں اور جل نہیں چکتے فراق میں	ہم دل جلوں کے دل میں بھی کیا سوز و ساز ہے
دل لیکے پوچھتے ہیں کہ جیتے ہو یا نہیں۔	یہ بھی ادا ہے غمزہ ہے عشوہ ہے ناز ہے
طالب تو نکلا ایک ہی رند خراب حال	ہم تو سمجھتے تھے کہ بڑا پاک باز ہے۔
خودی کھودے جو انسان واقف اسرار ہو جائے	محیط عشق میں ڈوبے تو بیڑا پار ہو جائے
قیامت تک بھی اسکو جام صحت مل نہیں سکتا	جو اُن بیمار آنکھوں کا کوئی بیمار ہو جائے
ترے عشاق کو ظل ہما سے سخت نفرت ہے	نصیب انکو تو تیرا سایۂ دیوار ہو جائے
کس کس کو اس نے پھونکا کیا کیا چمن اجاڑے	یہ عشق فی الحقیقت دنیا میں اک بلا ہے
طالب رہ طلب میں پھیلا نہ پاؤں اتنے	ان بیوفاؤں سے بھی ممکن کہیں وفا ہے
دل کا سودا ہے کہیں پھیر بدل ہوتا ہے	فائدہ ناصح ناداں مرے سمجھانے سے

طالب

طالب:۔ نواب میرزا سعید الدین احمد خاں معروف بہ نواب احمد سعید خاں دہلوی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیّر درخشاں جاگیردار لوہارو کے خلف دوم وجانشین اور بزرگان سلف کی عمدہ یادگار تھے۔ علوم مشرقیہ میں درجہ کمال رکھتے۔ زبان انگریزی

میں بھی فی الجملہ مہارت حاصل تھی۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محمد بن حنیفہ کی اولاد سے ہیں۔ چنانچہ ایک مرثیہ کی ٹیپ میں فرماتے ہیں۔ ؎

المختصر کہ خادم شاہِ نجف ہیں ہم	مشکلکشا ہیں جنکے سلف وہ خلف ہیں ہم

خواجہ احمد بصریؒ اور شاہ ولایت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ آپ کے اجداد امجاد تھے۔ آپ کے نانا قدرت اللہ بیگ خاں فیروز کے والد قاسم جان معہ اپنے برادر خورد عالم جان اور عارف جان کے ہندوستان آئے۔ عارف جان نواب احمد بخش کے والد ان کے حقیقی جدِّ بزرگوار تھے۔ نواب قاسم جان مرحوم نے شاہ عالم روشن اختر شاہ دہلی کی خدمت اختیار کی اور حسنِ خدمات کے صلے میں جاگیر اور نواب شرف الدولہ سہراب جنگ بہادر کا خطاب حاصل کیا۔ نواب احمد بخش خاں کو گورنمنٹ انگریزی، نے ادائے خدمات کے صلے میں نواب فخر الدولہ "رستم جنگ" کا خطاب اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست عطا فرمائی تھی۔

حسب رسم قدیم روسا آپ کی تعلیم و تربیت اپنے مکان پر ہوئی۔ بہت جلد فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں سر رابرٹ ایجرٹن لفٹنٹ گورنر پنجاب نے آپ کو سرکاری ملازمت میں منتخب کیا۔ آٹھ دس سال تک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے عہدے پر ممتاز رہے بعد وفات والد بزرگوار ملازمت ترک کر کے خانہ نشین ہوئے۔ اور محاصل ریاست لوہارو سے وظیفہ مقرر ہوا۔ آپ روسائے شہر میں نہایت عزّت و وقعت سے دیکھے جاتے تھے۔ ملازمت کے بعد میونسپل کمشنر بھی ہو گئے تھے۔ مہمان نوازی عالی حوصلگی اور خوش خلقی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اطراف ہندوستان کی سیر و سیاحت سے تجربہ حاصل کیا تھا۔ اور تاریخ کی طرح علم جغرافیہ پر بھی عبور حاصل تھا۔

اوائل سن تمیز سے شعر گوئی کا شوق ہوا۔ شروع شروع میں چند غزلیں حضرت غالب

کی نظرِ کیمیا اثر سے گذریں۔ جب حضرت غالب کا انتقال ہوگیا تو اپنے برادر بزرگوار نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے اصلاح لینے لگے۔ پھر اپنے والد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کی صلاح سے میر مہدی مجروح کو کلام دکھایا۔ بلیغ اور بلند شعر کہتے۔ سوقیانہ الفاظ اور عامیانہ مضامین سے ہمیشہ احتراز کرتے عاشقانہ شاعری میں نسائیت اور بزدلی کے خیالات جو شامل ہوگئے ہیں۔ ان سے آپ بچتے رہے۔ رعایت لفظی اور بے محل استعاروں کی قید سے کلام آزاد ہے۔ شاعری جو ورثہ پدری میں ان کو ملی اس کو یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

حضرت نیّر کا سکّہ ہے جہاں میں چل رہا	ہے سخن کی مملکت طالب یہاں جاگیر میں

مرزا غالب اور ان کے تلامذہ سے نسبت تلمّذ رکھنے کی وجہ سے آپ بھی ذرّہ غبار اور برق اضطراب جیسی ترکیبوں کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر آمد بیساختہ پن اور بے تکلفی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ دیکھو اس شعر کا انداز بیان کتنا پُرلطف ہے۔

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے	زمانہ کو کیونکر نئی سوجھتی ہے۔

حسن محاورہ اور خوبی بندش ذوق زبان کے اعتبار سے یہ شعر قابل قدر ہے تخئیل کا انداز ملاحظہ فرمائیے ؎

تم آج شمع انجمن غیر کیا ہوئے	یاں بجھ گیا چراغ ہی بزم خیال کا

مصرعہ ثانی کی بلاغت پر سخن فہم حضرات غور فرمائیں۔ کہ بزم خیال کا چراغ کس طریقہ سے بجھایا ہے۔

مولانا شوکت میرٹھی نے جہاں تنقید کے پردے میں دنیا بھر پر اعتراض کئے ہیں۔ وہاں نواب صاحب مرحوم پر بھی عنایت فرمائی تھی۔ آپ کی جانبداری میں مولانا راسخ اور ان کے شاگردوں نے ایسے دھواں دھار مضامین نکالے کہ مولانا کا سفینۂ تجدید غرقاب ہونے کے قریب ہوگیا۔ وہ میرٹھ سے دلّی تشریف لائے اور صلح کرکے ان مضامین کا

سلسلہ بند کرایا۔

مؤلف تذکرہ کے والد مرحوم اور نواب مغفور سے بچپن سے یارانہ تھا۔ اور اسی وجہ سے مؤلف پر بزرگانہ شفقت فرماتے اور درخواست پہ اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے۔ اور غزل پڑھتے۔ علم دوست اور قدر دانِ کمال تھے۔ کئی قلمی دیوان مؤلف کے کتب خانہ سے لے کر نقل کرائے۔ اور ضروری حالات کا اضافہ و صحت کی۔ مؤلف کے ساتھ آپ کی بزرگانہ شفقت کی ایک ادنےٰ مثال وہ تقریظ ہے۔ جو اس تذکرہ کی جلد سوم میں درج ہے۔ آخر عمر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کا فارسی دیوان بھی آپ نے طبع کرایا تھا۔ حضرت طالب کا مجموعۂ کلام ایک دیوان سے زاید تھا۔ افسوس ہے کہ اب اس کے شائع ہونے کی امید نہیں۔ زندہ دلی۔ حق پسندی اور نیک نیتی آپ کی طینت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ممتاز والیانِ ملک رامپور۔ جاورہ مالیر کوٹلہ سے برادرانہ اور دوستانہ تعلق تھے۔ ظرافت و بذلہ سنجی بات بات سے پیدا ہوتی۔ شعر خوانی کی طرز ایسی لاجواب تھی کہ ہر شعر پر حاضرین سے خراجِ تحسین وصول کرتی تھی۔ افسوس ہے کہ آپ کی ذات جو دہلی کی قدیم صحبتوں کی جھلملاتی ہوئی شمع تھی بادِ فنا نے یکم ستمبر ۱۹۲۵ء کو خاموش کر دیا۔ آخر عمر میں ورم پا کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ مگر اس پر بھی شگفتہ مزاجی میں فرق نہ آیا تھا۔ انتخاب کلام درج ذیل ہے۔

یاں طائرِ جاں سینکڑوں پھنستے ہیں خود آ کر
دلکش ہے عجب دام تری زلفِ دوتا کا

طالب مرے مرقد پہ نہ کیوں آکے وہ روئے
کشتہ ہوں دمِ خنجرِ تسلیم و رضا کا

کسی نے اس سے یوں پوچھا کہ کس کے ساتھ جاتے ہو
تو بولے ہے جنازہ ایک بیچارے مسلماں کا

شور ہے عالم میں برپا نالہ و فریاد کا
بول بالا ہو رہا ہے کس ستم ایجاد کا

رہروانِ جادۂ الفت سے کہہ دو دوستو
وہ چلے اس راہ جو رکھتا ہو دل فولاد کا

تھا جو بسمل واقفِ آداب۔ وقتِ ذبح بھی
دست دامن تک نہ آلودہ کیا جلاد کا

فصلِ گل میں رکھ دیا میرا قفس گلزار میں
کیا ستم آمیز احساں مجھ پہ ہے صیّاد کا

دیکھنا جدّت رگ و پے میں ہمارے عشق کی
آب نشتر ہو کے پانی بہہ گیا فصّاد کا

کیوں نہ ہو مستغرقِ بحرِ محبّت دم بخود
بھول جانا آپ کو ثمرہ ہے اس کی یاد کا

تند بادِ قہر نے کشتی کو توڑا پر یہاں
زمزمہ لب پر وہی ہے ہرچہ بادا باد کا

اس سے ستم کی وجہ کوئی پوچھتا نہیں
پرساں ہے اک زمانہ ہمارے ہی حال کا

طالب کی تو خبر کہ وہ بیمارِ ناتواں
دنیا میں کوئی دم کے لئے مہماں ہے اب

تیر ترکش میں رہے ہیں چند ہی قاتل کے پاس
اور یاں فوجیں پڑی ہیں حسرتوں کی دل کے پاس

بوالہوس اور امتحاں میں جائے یوں پورا اتر
بس نہ مانوں گا کیا ہے ممتحن نے دل کے پاس

محتسب نے خوب پی پیرِ مغاں کے ہاتھ سے
راہ پر آیا جو پہنچا مرشد کامل کے پاس

خون بنکر سب غذائے سوزِ الفت ہو گئے
ایک بھی پیکاں نہیں ہے آپ کا اب دل کے پاس

دیکھنا مہلت نہ دینا اتنی ذوقِ انفعال
عرض حال اپنا کریں کچھ داورِ محشر سے ہم

ساقیا ہے بزمِ آخر دور بھی ہے آخریں
دیکھنا محروم رہ جائیں نہ اک ساغر سے ہم

اس کے در سے اُٹھے اُٹھائے ہوئے
ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں

چپّہ چپّہ پہ جہاں شورِ قیامت دیکھو
اس کے کوچے میں چلا ہوں میری شامت دیکھو

الٹا جو رخ سے بزم میں اس نے نقاب کو
شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطفِ حجاب کو

میری شبِ فراق ملا داورِ جزا
کرنا اگر دو چند ہے روزِ حساب کو

اگر ہے سب کی نظروں سے نہاں تو
تو کیوں ہے ذرّہ ذرّہ میں عیاں تو

متاعِ صبر میں گھاٹا نہیں ہے
ضرر تو نفع تو سود و زیاں تو

تری حمد و ثنا ہے حصر تجھ پر
نظامِ نطق تو حسنِ بیاں تو

مہ و خورشید میں سب تیرے جویا
نہیں معلوم رہتا ہے کہاں تو

ترا جلوہ ہے ہر شے سے نمایاں
عیاں ہونے پہ اتنا ہے نہاں تو

عدم کی راہ ہو مجھ پر بھی آساں — کہ واماندوں کا ہے منزل رساں تو
کہے دیتی ہے طالب خوشنوائی — کہ ہے اک بلبلِ باغِ جناں تو

رہ گیا ارماں شہادت کا بھی باقی سر کے ساتھ — دل شہیدِ ناز کا ٹوٹا ترے خنجر کے ساتھ
اپنے بیگانے ہوئے سب لطفِ ساقی دیکھکر — پھر گیا ہم سے زمانہ گردشِ ساغر کیساتھ
نیّرِ رخشاں کا سایہ سر پہ کافی ہے ترے — کیا تعلق تجھ کو طالب ہر سخن گستر کے ساتھ

بلبل کو ہزاروں میں اگر نوحہ گری دی — عشّاق میں طالب کو بس آشفتہ سری دی
کچھ بھید سے خالی نہیں ساقی کا اشارہ — ساغر کے جو ہمراہ صراحی بھی بھری دی
گرم آہ کا ممنون ہوں سرد آہ کا مشکور — ہونٹوں کو کیا خشک تو آنکھوں کو تری دی

ہوئی یہ دوستی عنقا کہ ہے عجب آنا — اگر کسی کو کوئی اپنا یار کہتا ہے
زباں پہ فخر ہے دِلّی کی اب بھی طالب کو — زمانہ گو اسے اُجڑا دیار کہتا ہے

مگر چل گیا وارِ تیرِ نگہ کا — خلش دل میں ہے اور پیکاں نہیں ہے
جئے اس کی امید پر ہم مسیحا — کوئی آپ کا ہم پہ احساں نہیں ہے
ترے ساتھ نکلے دلمیں ارمان سارے — نہیں جب سے تو کوئی ارماں نہیں ہے
لگا نیمچہ اور قاتل کہ طالب — ابھی نیم بسمل ہے بے جاں نہیں ہے

یہ ادنےٰ سی واں شانِ صورت گری ہے — کہ مٹّی کے قالب میں ڈھالی پری ہے
مرے زخم پر اور چھڑکیں نمک وہ — بڑی یہ بھی اِن کی کرم گستری ہے
نہیں اس میں گنجائشِ کینِ دشمن — وہ دل جس میں تیری محبّت بھری ہے
مری جنس الفت ہے انمول منعم — یہ چاندی سے سونے سے سب سے کھری ہے
نہیں فکر کچھ ہم جو بیٹھے ہیں خالی — صراحی تو مے کی لبالب بھری ہے

دُوں نکلنے نہ تنِ زار سے جاں کو دمِ نزع — گر یقیں مجھکو یہ ہو جائے کہ تو آتا ہے
دل جگر چاک ہوئے دشنۂ غم سے شاید — سانس کے ساتھ جو سینے سے لہو آتا ہے

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے
زمانہ کو کیونکر نئی سوجھتی ہے

بتانا یہ نکتہ نہ غیروں کو ہرگز
کہ یاں رنج میں بھی خوشی سوجھتی ہے

قیامت کے وعدوں پہ تم جی رہے ہو
تمہیں زاہد و دور کی سوجھتی ہے

یہاں حال پر ہے ہنسی اپنے آتی
وہ سمجھے کہ اس کو خوشی سوجھتی ہے

ہیں دلفریب نقش و نگار جہاں و لے
کیا اس کا اعتبار ہے جو مستعار ہے

فسانے چند باقی ہیں جہاں میں سوز الفت کے
نہ اب فرہاد و شیریں ہے نہ اب مجنوں و لیلیٰ ہے

نفی ماسوا کر دی مرے حسن تصور نے
کھنچا ہے جب یہ نقشہ تب کہیں اس بت کو کھینچا ہے

طالب :- منشی طالب حسین خاں بریلوی۔ تلمیذ حضرت قیصر پختہ گو شاعر ہیں۔ کلام یہ ہے

سینکڑوں مصرعۂ پیچیدہ چلے آتے ہیں
وصف گیسو میں مجھے ہے ید طولیٰ کیسا

دم گلگشت دکھا کر قد بالا اپنا
سرو گلشن کو کیا یار نے سیدھا کیسا

کہتا ہے آفتاب قیامت جسے جہاں
اک داغ ہے جو سینے میں میرے نہاں ہے اب

اس درجہ ان کو میری طرف سے ہے بدظنی
اوروں کے بھی قصور کا مجھ پر گمان ہے اب

طالب کہیں چھپائے سے چھپتا ہے راز عشق
آتے ہیں خود بخود نظر اک مبتلا سے آپ

دختِ رز کو دیکھ کر تقویٰ سلامت رہ سکے
شیخ صاحب آپکے ہے یہ تو فرمانے کی بات

رہا پاس جفا ان کو رہا پاس وفا ہم کو
بھی ان بن رہی انکے ہمارے درمیاں برسوں

اللہ ری سیاہی و طول شب فراق
انداز سب وہی ہیں جو ہیں زلف یار میں

طالب :- محمد امانت حسین خاں ۱۸۸۴ئ میں منصرم سررشتہ سرونٹری گورکھپور تھے کلام میں شوخی ہے۔ زیادہ کلام اور حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ دو شعر نذر ناظرین ہیں

دیکھیں یہ ہم نے دل کی لگاوٹ کی شوخیاں
نفرت کریں جو ہم سے کرے ان کو پیار دل

طالب نثار حسرت دیدار ہو چکا
رکھتے تھے اپنے پاس جو اک غمگسار دل

طالب :- محمد امام الدین چوپڑہ ضلع خاندیس تلمیذ حضرت شمشاد لکھنوی۔ کلام معمولی

ہے۔ شوکت الفاظ اور قدیم مضامین کی طرف طبیعت رجوع ہے۔

ازل سے میں ہوں عاشق حسن روئے شاہ خوباں کا	سوئے حور جناں مائل مرا دل ہو نہیں سکتا
اگر ہر نکتہ پیرا سو زبانیں اپنی گھس ڈالے	تمہارے خال رخ کا وصف اک تل ہو نہیں سکتا

طالب:- محمد عنایت اللہ خاں رامپوری۔ نہ بندشوں میں تراش خراش ہے۔ نہ مضامین میں جدت معمولی شاعر ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

طالب

رواں ہر بگولے کے پیچھے ہے مجنوں	سمجھتا ہے لیلی کا محمل یہی ہے
کروں دختر رز سے کیونکر نہ باتیں	مرے منہ لگانے کے قابل یہی ہے
بنے گا وہ کوچہ بھی گنج شہیداں	اگر تیزی تیغ قاتل یہی ہے
سمجھتی ہے ان کی ادا خوب طالب	اشاروں سے مرتا ہے جو دل یہی ہے

طالب:- مولوی محمد عسکری لکھنوی تلمیذ حضرت جلیس مرحوم۔ آپ نے جناب جلیس کے بعد پیارے صاحب رشید مرحوم سے بھی اصلاح لی ہے۔ طبیعت کو شعر سے مناسبت ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہے:-

طالب

دیکھ کر اس کی طرف طالب مرا دم رک گیا	مسکرایا وہ مرے دل کا عجب عالم ہوا
اپنے محبوب سے چھٹ جاتا ہے پہلے آخر	بات اتنی تو محبت کی ہے پروانے میں
دل شکستہ ہوں نہ ٹوٹیں کہیں شیشے ساقی	میرا آنا نہیں اچھا ترے میخانے میں
حسن اور عشق کا طے ہو گیا قصہ دم صبح	نہ ہے اب شمع نہ دم ہے کسی پروانے میں
حسرت و درد و غم و اندوہ مہماں ہو گئے	خیر کچھ دل کے بہل جانے سے ساماں ہو گئے
گلے عشاق کے کٹتے ہیں آنکھوں کے اشارے سے	وہ خود مجرم نہیں لیکن نظر قاتل کی قاتل ہے

طالب:- پنڈت نندلال کشمیری ولد پنڈت ٹھاکر کول صاحب۔ آپ کے والد بزرگوار کشمیر کے رؤسائے جلیل القدر اور زمینداروں کے طبقہ کے معزز فرد ہیں۔ جو سنسکرت زبان کے ماہر اور عالم ہیں۔

طالب

طالبؔ ۱۸۹۹ء میں بمقام سری نگر (کشمیر) پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم کشمیر میں ہوئی۔ انگریزی۔ فارسی میں اعلیٰ سندیں حاصل کیں۔ ایم اے اور منشی فاضل کی ڈگریاں لیں۔ اردو میں ادیب فاضل کی سند حاصل کی۔ اس وقت آپ کشمیر گورنمنٹ کے ایس۔ پی کالج میں فارسی و اُردو کے پروفیسر ہیں۔

آپ کو لڑکپن سے شاعری کا شوق ہے۔ فنِ سخن گوئی میں راقم سے تلمذ ہے۔ آپ دورِ جدید کے حالات سے واقف ہیں۔ اور دُنیائے ادب کے مشہور انشا پرداز اور شاعر ہیں۔ ملک کے رسائل و اخبارات میں آپ کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کا کلام رشحات التخئیل کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب۔ بی۔ اے معتمد انجمن ترقی اُردو کی رائے ہے کہ "آپ نے وادی کشمیر میں رہ کر اُردو زبان پر ایسی قدرت حاصل کر لی ہے کہ بیان میں صفائی اور گداز ہے۔ جو آپ کی ذہانت اور فراست کی دلیل ہے"

مرتب تذکرہ ہذا نے ان کے دیوان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "وادیِ کشمیر میں رہ کر آپ ایسی صاف ستھری اردو لکھتے ہیں۔ طالبؔ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما لیتے ہیں۔ اپنے وقت میں وہ ضرور صاحب طرز مانے جائیں گے۔ احساسات قلبی کی تصویر کھینچنے میں کمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہی حال حقائق نگاری کا ہے۔ مناظرِ قدرت کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں"۔ کلام یہ ہے۔

عاشق نے دِل دیا تو یہ کس کا قصور تھا	پی کر شرابِ حسن نشے میں وہ چور تھا
مجھ کو تو نازِ عجز تھا قاتل کے سامنے	اس کو متاعِ حسن پہ فخر و غرور تھا
کیا کہیں تم سے کہ کیا سمجھے ہیں ہم رازِ حیات	آنے جانے کا اسے ایک بہانا جانا
قائل جنت و دوزخ نہ ہو کوئی تو نہ ہو	فکرِ عقبیٰ دلِ دانا کا تقاضا جانا
وا ہوئی خواب میں بھی چشمِ بصیرت جو کبھی	ہم نے دُنیا کو دو رنگی کا تماشا جانا

ہے پیٹ پالنا تو نکالو کوئی مشین

جگہ کیوں میں غم دلدار کو کیونکر نہ سینے میں
دلمیں ہیں افکار زیر خاک بھی

نہ غربی بن سکا ہاں شرقیت اپنی گنوا بیٹھا
زبانِ حال سے ظاہر ہے میری خانہ بربادی

وہ عاشق ہوں کہ وحشت میں بھی یادِ یار باقی ہے
واہ وا آئی ہے کیا اب کی گلستاں میں بہار
ہر کوئی محوِ تماشائے جمالِ یار ہے

غنچۂ سربستہ کہنے کو ہے اپنا حالِ دل
جس کو رفیق سمجھے تھے نشتر سے کم نہیں

بچپن کا اِک رفیق تھا اب وہ بھی چھٹ گیا
دِل میں کھُب جاتا ہوں رستہ پاکے راہ گوش کا

دم رگ بسمل میں ہوں اور خنجر قاتل میں آب
یا تو طالب ہے جنوں یا عہد طفلی کا سماں

زخمِ جگر کی تشنگی اے ہمنشیں نہ پوچھ
ہے اضطراب شوق نقاب سرخ امید

طولِ شب فراق کا چمکا ستارہ کیا
اصلاح اچھے اچھوں کو مل جاتی ہے یہاں

مری فریاد کی ظالم خوشی سے داد دیتا ہے
میں ہوا طالب تو رسوائے زمانہ ہو گیا

یہ خمیازہ نہیں ضبط و حیا کا گر تو پھر کیا ہے

اب شعر و شاعری کا زمانہ نہیں رہا
جو گھر میں صدر کی جا ہو وہی مسکن ہے مہماں کا
موت بھی جینا ہمارا ہو گیا

تتبع سے بھلا ہندوستاں کے ہاتھ کیا آیا
ہوں لبریز فغاں حیرت میں گویا بے زباں ہو کر

خودی میں بے خبر اور بیخودی میں باخبر ہو کر
باغ میں جنگل میں کالج میں دبستاں میں بہار

ناچتی پھرتی صبا ہے اور گاتی ہے بہار
راز کلیوں کی چٹک سے کہہ سناتی ہے بہار

پہلو میں ایک خار ہے میرے بجائے دِل
دِل میرا آشنا ہے نہ میں آشنائے دِل۔

بنکے اِک مضمون کبھی اخبار کے کالم میں ہوں
شور بلبل۔ بوئے گل۔ اور قطرۂ شبنم میں ہوں

اِس دو رنگی کے اثر سے میں عجب عالم میں ہوں
ہر شورِ نالہ شور نمکداں سے کم نہیں

تار نگاہ پردۂ مژگاں سے کم نہیں
داغِ جگر بھی شمع شبستاں سے کم نہیں

بزم مشاعرہ بھی دبستاں سے کم نہیں
صدائے سوز ہے یا سازِ مضمر ہے مری شیشیوں میں

وہ ہوا مطلوب تو بڑھ چڑھ گیا تو قبر میں
مری میت پہ وہ اب بن کے ماتم دار بیٹھے ہیں

ٹوٹ جائے میری پستی سے بلندی کا غرور
اس زمیں پر سایہ افگن آسماں کوئی نہ ہو

جلوہ حسنِ ازل تصویر حیرت کر مجھے
لب پہ حسن و عشق کی پھر داستاں کوئی نہ ہو

تاکہ میراان کا افسانہ نہ طشت از بام ہو
چھیڑ خانی سے انھیں آخر عداوت ہو گئی

کہو بلبل سے آکر سیکھ لے طرز فغاں کوئی
کہ آیا ہے عدم سے کہنہ مشق نوحہ خواں کوئی

لطف جفائے یار کا نقشہ نہ کھنچ سکا
کس کام کی ہماری یہ طبع لطیف ہے

دیکھا جو وقت نزع کہا دے رہا ہے دم
طالب بہانہ ساز بھی ہے اور ظریف ہے

ایک تنکا تک نہ چھوڑا ہستی موہوم کا
اس چمن سے آشیاں ہم دوش پر لیکر گئے

سورج کی پہلی کرن

ہے جلوہ ریز سوئے زمین آسمان سے
شمع سپہر ارض جہاں گرد آفتاب
تصویر آب و تاب

ہے موج زر نگار شب ماہتاب میں
یا لطف خیز جزر و مدِ دورِ اضطراب
تفسیرِ انقلاب

یہ جام چرخ سے مے احمر چھلک گئی
یا جوہر بلور کا ہے حسن بے نظیر
ہم رنگ زمہریر

انگڑائی ہے نشے میں یہ مست شباب کی
یا محورِ رقص نغمہ ہے ارماں کی نفیر
مفہوم دلپذیر

ترچھی نگہ کسی کی ہے یہ ناز آفریں
یا اک تموّج دل رنگیں کا انتشار
بے تاب و بیقرار

تصویر زندگی کی جھلک کی نمود ہے
یا جادۂ سکونِ محبت کا اقتدار
سو بار جلوہ بار

ہے شعلۂ ازل کا یہ اک رنگ سوز و ساز
یا حور نور عالمِ رقص و سرور میں

لرزاں چمک دمک ہے دُرِ تابدار کی
نازاں غرور میں
یا غرق تار کاہکشاں بحرِ نور میں
ضو کے وفور میں
نقش و نگار قدرتِ حق کا ظہور ہے
یا نور پاش تابش افشاں مہ جبیں
خوش رنگ و دلنشیں
پیغام زیست مُردہ دلوں کا کہوں اسے
یا عشوہ تبسّم محبوبِ نازنین
اِک مظہرِ جبیں

طالب

طالب:۔ بابو منوہر لال کپور بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی خلف الصدق لالہ بالمکند صاحب کھتری پیدائش ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء آباؤ اجداد پشاور سے آکر چکوال (پنجاب) میں مقیم ہوئے۔ طالب صاحب چکوال میں وکالت کرتے ہیں۔ شعر و سخن کا اچھا مذاق ہے۔ اکثر رسائل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ حُبِّ وطن کے جذبات بھی کلام سے مترشح ہیں اچھی طبیعت پائی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

تماشا گاہ عالم کی حقیقت یہ سمجھتا ہوں
کہ اِک بے رنگ خاکہ ہے مرے خوابِ پریشاں کا
قیامت واسطے سرمایہ داروں کے بپا ہوگی
یہی ڈر ہے ٹھکانا ان غریبوں کا کہاں ہوگا
خدا کی سرزمیں تنگ آئیگی سرمایہ داروں پہ
زمیں کا ذرّہ ذرّہ انکے حق میں آسماں ہوگا
علاّمہ بن گیا کوئی مولانا بن گیا۔
کوئی ادب کی شمع کا پروانہ بن گیا
قادر کلام کوئی۔ کوئی قادر زبان
وہ معتقد ملے جسے وہ کیا نہ بن گیا
مرنا مشکل ہے بہت مرنے سے جینا مشکل
یہ وہ بادہ ہے کہ پینے سے نہ پینا مشکل
جینے مرنے کا وہ دھندا ہے کہ طالب جس کو
کم نظر کہتا ہے آسان تو بینا مشکل
حسن کو پردوں میں بھی نقابِ بے نقابی کا جنوں
مغربی تہذیب نے پردے کی کردیں دھجیاں
وطن کے واسطے جو مر مٹے گا
رہے گا تا ابد زندہ جہاں میں

حیاتِ جاوداں مرتی ہے جس پر
اسے وہ موت ملتی ہے جہاں میں
زندگانی کا اعتبار نہیں
ہائے یہ نشہ پائیدار نہیں
رحمتوں کا نہیں ہے تیری حساب
غفلتوں کا مری شمار نہیں

ہمہ یہ تو کھلتا نہیں رازِ جہاں اس کے سوا
ہم اسیرِ آرزو ہیں یہ جہاں آرزو
جو تم آؤ تو آئے جان میں جان
کہ تم ہی راحتِ جانِ حزیں ہو
زباں پر مہر خاموشی گلے پر ہاتھ ظالم کا
رہینِ پنجۂ فولادِ استبداد ہوں میں بھی
توڑے ہیں آسماں کے تارے خیال نے
گلشن تصوّرات کا باغ و بہار ہے
اب ارادہ ہے کہ چھوڑیں شیوۂ تسلیم کو
دم زدن میں توڑ دیں حلقے کڑی زنجیر کے
خوگر آزار درد قوم ہو کر دیکھ لے
لذتِ زخمِ جگر تیری دوا ہو جائے گی
رشک کھائیگی تری پستی پہ رفعت دیکھنا
تیری پستی جب حقیقت آشنا ہو جائے گی
شعلۂ حُبِّ وطن سے لے فروغِ زندگی
اور ہی کچھ تیری ہستی کی فضا ہو جائے گی

طالع: میر شمس الدین ۱۱۷۵ھ سے قبل عالم شباب میں راہی ملک بقا ہوئے تذکرہ چمنستان شعرا سے یہ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے

جفائے یار کو ہم التفات یار کہتے ہیں
شفا و عافیت اپنی کو ہم آزار کہتے ہیں
زبس معمور ہے سینہ گلوں سے داغ الفت کے
شگافِ دل کو اپنے ہم درِ گلزار کہتے ہیں
عرصہ میں ہے اے زاہد اس دور میں پیمانہ
مسجد کے تئیں جاویں کیوں چھوڑ کے میخانہ
آباد کرے طالع تو چل کے بیابان کو
ہر نے سنی مجنوں کے ویران ہے ویرانہ
نجانا ناصح کی باتوں پر وہ تیر اور دکیا جانے
وہی کر تو ارے دل جسمیں کچھ اپنا بھلا جانے

طاہر: میر طاہر علی رضوی فرخ آبادی تلمیذ منشی امداد حسین صغیر ان کے بزرگ نیشاپور سے آئے اور نواب وزیر الملک کے زیرِ توسل قصبہ موہان میں آباد ہوئے ان کے خاندان کا اعزاز اور شرافت مسلّم ہے۔ میر طاہر ۱۸۴۰ء میں کانپور میں پیدا ہوئے

اگرچہ والد کا سایہ صغیر سنی ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے ابتدا سے شاعری کا شوق تھا۔ جو اچھے شعرا اور ادیبوں کے فیض صحبت سے پختہ ہو گیا۔ کلام کا رنگ متغزلانہ اور دلاویز ہے۔ کلام میں سوز اور اثر دونوں پائے جاتے ہیں۔ زبان کی گھلاوٹ۔ اسلوب کا سلجھاؤ اور روزمرہ کی برجستگی ان کے کلام کے خاص اوصاف ہیں۔ ایک دیوان طبع ہوا تھا جو اب نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ ایک اور دیوان ان سے یادگار ہے۔ کلکٹری کی پیش کاری سے پنشن پائی۔ ۲۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو ۸۱ سال کی عمر میں انتقال۔ انتخاب اشعار یہ ہے:-

یہاں انکار کرتے ہو ہمارے خونِ ناحق سے
قیامت میں بھی پیش داورِ محشر مکر جانا

ابھی تک کیوں رگڑتا ایڑیاں کیوں نیم جاں رہتا
مرے امکاں میں ہوتا اگر بے موت مر جانا

عدم کو جائینگے یا خاک ابھی چھانیں گے صحرا کی
تمہارے در سے اُٹھ کر دیکھئے ہوگا کدھر جانا

دل عشق سے خالی ہو تو بہتر نہیں ہوتا
پتھر ہے جس آئینہ میں جوہر نہیں ہوتا

کوئے حبیب میں نہ چشمِ رقیب میں
آخر کہیں پتہ بھی ہے میرے غبار کا

ابرِ رحمت کے لئے روز دعا کرتا ہوں
روز میخانے میں بچھتا ہے مصلےٰ میرا

اے پیرِ مغاں ہائے یہ بادل یہ ہوائیں
اور آج ہی خالی رہے پیمانہ ہمارا

دشمن نے مجھے کوچۂ جاناں سے نکالا
کانٹا تو نہ تھا میں کہ گلستاں سے نکالا

دوست مُنہ تکتے ہیں ناصح مجھے سمجھاتے ہیں
کوئی حامی نہیں بھرتا کہ انہیں لائیں گے

غیروں سے اشاروں میں ہوا کرتی ہیں باتیں
یہ بات نئی سیکھی ہے آنکھوں نے دہن سے

جو میرے نالوں نے ناقوس کے اُڑائے ڈھنگ
کہا بتوں نے کہ مُنہ چاہئے فغاں کے لئے

دل افگاروں کے مُنہ پر چارہ گر کو یہ نہ کہنا تھا
جو ڈوبے اس طرح دل میں وہ پیکاں کم نکلتا ہے

مشکل عشق میں لازم ہے تحمل طاہر
بات بگڑی ہوئی بنتی نہیں گھبرانے سے

دل سے دل کو راہ ہوتی ہے غلط ہے یہ مثل
ہم نے جس کی محبت اس کو نفرت ہو گئی

چوٹ کھائی ہے کچھ ایسی دل شیدائی نے
سانس کے ساتھ کلیجے میں کسک ہوتی ہے

کیا جی لگا کے وعظ کی محفل میں بادہ خوار
تعریف سن رہے ہیں شرابِ طہور کی

اے برہمن دیر سے جاؤں کہاں
بندگی بیچارگی مشہور ہے

دل کی روداد کوئی کیا جانے
اس کو میں جانوں یا خدا جانے

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اسکو چھٹی نہ ملے جسکو سبق یاد رہے

چھیڑ ہم اے ستم ایجاد کئے جائیں گے
چٹکیاں لینے کو فریاد کئے جائینگے

بزمِ دلدار میں سنتا ہوں یہ پروانے سے
کہ لگی دل کی بجھا کرتی ہے جل جانے سے

رند اُٹھتے ہیں تو کہتی ہے قدم کی لغزش
ہوش میں آؤ کہاں جاتے ہو میخانے سے

سینہ ہے چاک دیکھ کے پیکاں نکال لو
حسرتِ عیش کہ ملتی نہیں ہے جگر میں ہے

طاہر۔ حکیم شیخ محمد طاہر عرف ننھے صاحب تلمیذ حضرت عزیز لکھنوی۔ آپ رنگین فکر اور نازک خیال ہیں۔ زبان شیریں ہے۔ شعر میں برجستگی اور سادگی کی شان ہے۔ محاورات سے زبان میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو:۔

طاہر

ایکدن بھی ذبح ہونے کی نہ نکلی آرزو۔
یوں تو کہنے کے لئے ہر بات پر خنجر اٹھا

دل کے ٹکڑے ساتھ ہیں چھینٹیں کفن پر خون کی
قبر سے کشتہ تمہارا یوں سرِ محشر اٹھا

چند آنسو بہہ گئے دو چار آہیں کھینچ لیں
جب کبھی فرقت میں زانو سے ہمارا سر اٹھا

غریب دل کے ہزاروں ہی ہو گئے ٹکڑے
کچھ اس طرح شبِ فرقت امید فشار رہا

قوت ضبط محبت میں دکھاتے جاؤ۔
جس قدر صدمے اٹھیں تم سر اٹھاتے جاؤ

کھینچتے تو ہو مرے سینے سے تم اپنا تیر
زندگی کی کوئی تدبیر بتاتے جاؤ

خاک ہو کر یونہی اک دن یہ ہوا ہو جائیگا
تم اسی طرح مرے دل کو جلاتے جاؤ

کلیجہ پھٹ گیا میرا کچھ ایسا درد اٹھا ہے
زباں پر اب کبھی کا نام لیتا یا نہ آتا ہے

عادتیں رکھ کے پہلو سے تیرے دل سے یوں بھلایا
یگانہ کوئی آتا ہے نہ اب بیگانہ آتا ہے

مری وحشت کا اور دیوانگی کا پوچھنا ہی کیا	جب اس نے مسکرا کر کہدیا دیوانہ آتا ہے

طاہر۔ منشی خیراتی لال۔ مالک خیر خواہ اودھ۔ پختہ گو۔ خیال آفریں شاعر ہیں۔ بندش کی نفاست اور معنی کی خوبیوں سے ماہر ہیں۔ مگر کلام تعقید لفظی و معنوی سے پاک نہیں ہے نمونۂ فکر یہ ہے۔

اب تک وہاں غنچۂ گلوں سے نہ وا ہوا	منقار بلبلوں کی کھلی بھی تو کیا ہوا
وصفِ دہاں یار میں طاہر نہ ہو خموش	گویا زباں منہ میں نہیں ہے تو کیا ہوا
کس کا یہ روئے کتابی یاد آیا بزم میں	چشمِ حیرت حلقہ زن ہے حلقۂ زنجیر پر

طاہر۔ مولوی ابو طاہر صاحب رامپوری تلمیذ حضرت جلیل ان کا زیادہ حال دستیاب نہ ہوا۔ شاعر رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ طبیعت میں روانی ہے۔ بہت پُرلطف کلام ہوتا ہے۔ زبان کی صفائی کی طرف طبیعت زیادہ متوجہ ہے۔ شعر عاشقانہ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کلام ملاحظہ ہو۔

کیا کہا یہ کہ تجھے دیکھ کے جی بھر آیا	جائیے جائیے بس بس مجھے باور آیا
میں بھی دنیا میں عجب بیخود و مضطر آیا	اب ہے یہ سوچ کہ کیا کام تھا کیونکر آیا
نگہ تیز پڑی غیر پر اللہ اللہ	خیر ہے آج یہ غصہ تمہیں کس پر آیا
تم تو ایسے ہی ہو وعدے پہ ضرور آؤگے	رہنے دو قسمیں نہ کھاؤ مجھے باور آیا
نیم جاں خوب تڑپنے کا مزہ لوٹیں گے	دست نازک میں اگر یار کے خنجر آیا
عشق کے درد نے کچھ اثر ان پر بھی کیا	حال طاہر جو سنا سنتے ہی جی بھر آیا

طاہر۔ میر محمد رضا لکھنوی شاگرد جناب فاخر لکھنوی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

بنا کے آئینہ کھوئی ہر اک کی ہیبت ائی	رہیگا حشر تک الزام یہ سکندر پر
زمیں دبائے گی کیا اپنے بوجھ سے مجھکو	رہا ہے بار فلک عمر بھر میرے سر پر
فسانہ رہگیا عالم میں باقی کہنے سننے کو	نہ مجنوں ہے جہاں میں اب نہ لیلےٰ ہے نہ محمل ہے

طاہر

طاہر

عدم کے جانیوالوں کی ہے کثرت ہر جگہ طاہرؔ	نہ ہوگی حشر تک ویراں یہ وہ آباد منزل ہے

طاہر

طاہر:- میرزا طاہر بیگ صاحب ساکن مراد آباد تلمیذ حضرت افضل لکھنوی خوش فکر سخن سنج اور ظریف الطبع شاعر ہیں۔ اوائل عمر سے شعر و سخن کا شوق ہے۔ ہر قسم کے مضامین سادہ زبان میں نظم کرنے کی قدرت ہے۔ سوسائٹی کی خرابیوں پر شاعرانہ انداز سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اکثر قصوں اور واقعوں کو نظم کا جامہ پہناتے ہیں۔ اور ان میں نظیر اکبر آبادی کے طرز کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جن کو عام حضرات نہایت شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ تصانیف ذریعہ معاش ہیں۔ دیگر اصناف سخن کے علاوہ غزل بھی خوب کہتے ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

قیامت ڈھا گیا مجھ پر ادا سے دیکھنا اُن کا	نظر ایسی لڑی دل ٹوٹ کر بے اختیار آیا
دل لیا ہٹ کر کے اور توڑا کھلونے کی طرح	کیا ترا عہد جوانی بھی لڑکپن ہو گیا
مجھ سے کب بیٹھا گیا پہلو سے جب دلبر اُٹھا	دردِ دل کیساتھ میں بھی ہائے دل کہکر اُٹھا
یہ کہہ کے وہ قاصد کو بنا دیتے ہیں چھوٹا	زندہ کبھی مرنے کی خبر کہہ نہیں سکتا
کس کو چھیڑیں کس پہ بگڑیں کسکو دیں اُلٹا گالیاں	میرے مرنے سے بتوں کا مشغلہ جاتا رہا
ہائے اک کم سن کے ہاتھوں لٹ گیا عہد شباب	دل دکھا میری جوانی پر نہ چرخ پیر کا
چننے تنکے پھر اور در رہا اک پاؤں میں چکّر	نہ بیٹھا چین سے دم بھر بُرا ہو دردِ ہجراں کا
دیکھتا ہوں جب کسی کے چلبلے پن کیطرف	شوق کہتا ہے بڑھا دے ہاتھ گردن کیطرف
گھٹا بنکر برس پڑتی ہیں آنکھیں ہجرِ جاناں میں	کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بھادو جھمکے لے ہیں
کام کوشش سے اگر لیں تو بنے کام ضرور	فلسفہ کہتا ہے کیا دفترِ امکاں میں نہیں
جب کہا نوک پلک حسن میں کیا ہوتی ہے	ناز شوخی سے پکارا کہ ادا ہوتی ہے

خدا کو یاد کرنے آج کیوں بیٹھے ہو مسجد میں
نکالا کس لئے طاہرؔ بتوں نے تم کو مندر سے

طاہر:۔ لالہ چندو لال ابن منشی رام پرشاد طاہر شاگرد مرزا صابر۔ گوالیار کے رہنے والے تھے۔ طبیعت میں موزونی ہے۔ مگر معمولی فکر و خیال کے شاعر معلوم ہوتے ہیں نمونہ کلام یہ ہے:۔

یہ کہتے شب غم بسر ہو گئی
سحر ہو گئی اب سحر ہو گئی

کہاں ہم کہاں وہ ملاقات ہو
یہ قسمت سے لے نامہ بر ہو گئی

تمام عمر رلایا ہے خاک میں مجھکو
غضب ہے اس پہ جو دلمیں ترے غبار رہے

کوئی نہ ہم سا ملے گا کہ اس ستم پر بھی
ہزار جان سے یوں آپ پر نثار رہے

مدام ان سے رکھو پاک الفت اے طاہر
کہ عمر بھر یونہیں اخلاص اور پیار رہے

طاہر:۔ پنڈت شنکر دیال۔ ساکن گورکھپور۔ حالات کچھ معلوم نہ ہو سکے مندرجہ ذیل اشعار سے شوخی طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

ہمارے دلمیں یوں ارمان ہیں بند
کہ بُو جس طرح رہتی ہے کلی میں

پری رویوں میں بھی ہے کتنی شوخی
اڑایا کرتے ہیں مجھکو ہنسی میں

گھٹا جس دم اٹھی چپکے سے پی لی
بہت اچھی ہے عادت شیخ جی میں

طاہر:۔ سید جمیل احمد صاحب ساکن گلاوٹی ضلع بلند شہر۔ شاگرد حضرت اطہر ہاپوڑی ۱۳۰۳ھ میں ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے نانا حاجی میر احمد حسین برادر حقیقی حکیم سید محمد حسین صاحب متخلص بہ شفقت کے ہاتھوں تعلیم و تربیت پائی۔ کلام مجید ختم کرنے کے بعد عربی۔ فارسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۳۱۵ھ میں شعر و شاعری کی طرف رجحان ہوا۔ مولوی سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی کے شرف تلمذ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ میرٹھ کے مشاعروں میں شریک رہے ہیں۔ حضرت بیان و یزدانی کا فیضِ صحبت اٹھا چکے ہیں۔ اور طاہر انھیں کا دیا ہوا تخلص ہے۔ ۱۹۰۳ء سے ریاست جودھپور میں ملازم ہیں۔ شعر میں مضامین لطیف ہوتے ہیں۔ زبان بھی شستہ

اور سادہ ہے۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:۔

ناتوانی نے در یار سے رکھا محروم — حوصلہ پست ہوا آج توانائی کا
زلف برہم کو وہاں آپ سنوارا کیجے — حال ابتر ہے یہاں آپ کے سودائی کا
آج دنیا سے گیا طاہر خستہ سن لو — آپ نے حال نہ پوچھا کبھی شیدائی کا

دیکھتے دیکھتے احباب اٹھے ہیں طاہر — ایک دن یونہیں ہمیں بھی ہے فنا ہو جانا
کسی کو دیکے دل ہم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے — سکھایا عشق نے یوں جان سے بیزار ہو جانا

مدت سے جسم پر سر شوریدہ تھا گراں — میں قتل ہو کے آج سبکسار ہو گیا
ہوتا ہے کون کس کا مصیبت کے دن شریک — لو دل بھی اب اسی کا طرفدار ہو گیا

ستم ایجاد نے کیسا نرالا ڈھب نکالا ہے — جفا کرنا جفا کے ساتھ پھر عذر جفا کرنا

> شب وصل وہ روٹھ جانا کسی کا — وہ منت سے پھر دل منانا کسی کا
> وہ رک رک کے فریاد کرنا ہمارا — وہ رہ رہ کے ہم کو جلانا کسی کا
> نمک پاش تھا زخم دل پر ہمارے — دم ذبح وہ مسکرانا کسی کا

دے رہے ہیں اب تسلی عاشق بیتاب کو — ہاتھ رکھتے ہیں وہ دل پر دل کو تڑپانے کے بعد
ہے خیال حور جنت زندگی میں دلفریب — خاک میں مل جائینگے ہم خاک ہو جانے کے بعد

> یہ کیسا ہے پھول اس میں خوشبو نہیں ہے — وہ کہتے ہیں چٹکی سے دل کو مسل کر
> طاہر میں مصر و ہند کو آزاد دیکھ لوں — اللہ سے دعا ہے یہی صبح و شام روز
> میرا ماتم اور میرے سامنے — میرے آگے فاتحہ خوانی مری
> اظہار وصل تھا کہ شکایت رقیب کی — کچھ کہتے کہتے ہم سے وہ خاموش ہو گئے
> سرگرم جور تازہ وہ بیرحم پھر ہوا — سرگرم آہ پھر لب خاموش ہو گئے
> کہنا کسی کا ناز سے آکر یہ قبر پر — حوروں سے اب تو آپ ہم آغوش ہو گئے

پوچھتے پھرتے ہیں سب عاشق مضطر کا حال — مژدہ اے دل اب تو کچھ نالے رسا ہونے لگے

خرام ناز میں بھی تیرے اک عالم نکلتا ہے
کوئی پامال ہوتا ہے کسی کا دم نکلتا ہے

یہ چپکے چپکے آہیں سرد بھرنا کس لئے طاہر
بتاؤ تو یہ کس پردہ نشیں پر دم نکلتا ہے

طاہر اسوقت میں توبہ کی بھی اچھی سوجھی
یار پہلو میں ہے گھنگھور گھٹا کیسی ہے

کیسی کرم نما ہے طرز ستم بھی ان کی
وہ شکوے کر رہے ہیں اغیار کے مجھے سے

مایوسیاں ہیں ان کی عبرت فزائے عالم
بیٹھے ہیں ہاتھ دھو کر جو اپنی زندگی سے

طاہر

طاہر:۔ علیسو میاں صاحب۔ حسین میاں کے بیٹے ہیں۔ ریاست بڑودہ میں ملازم ہیں سیدھا سادہ شعر کہتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

سخت جانی نے مری جان بچائی ورنہ
صدمۂ ہجر نے تو مار ہی ڈالا ہوتا

صدمۂ ہجر سے ہوتی نہ یہ حالت طاہر
تم نے گر دل کو ذرا اپنے سنبھالا ہوتا

کچھ مجھے عذر نہیں چاہیں ابھی وہ لے لیں
دل جگر ہے جو مرے پاس وہ مال ان کا ہے

طاہر

طاہر:۔ میرزا طاہر بخش ساکن محلہ شوالہ شہر بنارس۔ اردو فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ عربی سے بقدر ضرورت واقف ہیں۔ انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم پائی ہے۔ چالیس سال سے کچھ اوپر عمر ہوگی۔ میرزا محمد فائز بنارسی کے ارشد تلامذہ سے ہیں۔ مضمون آفرینی اور فصاحت ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ جو غزلیں روانہ کی تھیں ان کا انتخاب نذر ناظرین ہے

اک جام مے سے جم کا بڑا نام ہو گیا
ظاہر ہے لفظ جم جو بڑھا جام ہو گیا

وارفتگان عشق کی ہستی شرار تھی
آغاز ہی میں زیست کا انجام ہو گیا

شہیدان نگہ کا خوں بہا جنت سے آیا ہے
چڑھانے کے لئے لائی ہیں حوریں پھول مدفن پہ

دل نالاں کے ٹکڑے ساتھ دود آہ کے نکلے
ترنم خیز گویا بلبلیں ہیں شاخ سوسن پر

خریداری ہیں جنکی قیمت کو ہیں ہے قاصر
تماشا ہے وہ بکنے کو سر بازار بیٹھے ہیں

رخسار و خط سے شان نئی آشکار ہے
گویا حلب تمام زمرد نگار ہے

اے چرخ دلبری کے درخشندہ آفتاب
ہر ذرہ اپنی خاک کا تجھ پہ نثار ہے

خدا حافظ ہے اچھا جاؤ لیکن دیکھتے جاؤ
کسی ناشاد کا کن حسرتوں سے دم نکلتا ہے

عالم میں ہیں بہار کے ساماں نئے نئے
جلوے دکھا رہے ہیں گلستاں نئے نئے

عاشق کی حسرتوں کا نہ پوچھو حساب کچھ
دل میں ہیں وصلِ یار کے ارماں نئے نئے

دکھاتی ہے جلوے محبت کسی کی
نگاہوں میں پھرتی ہے صورت کسی کی

وہ آتے ہیں منہ پھیر کے قتل کرنے
گلے مِل کے روئی ہے حسرت کسی کی

نظر کی تیغ میں طرفہ ادا نکلتی ہے
شہید ناز کے دل سے دُعا نکلتی ہے

عجب نصیب ہے الفت کے دردمندوں کا
کہ ڈھونڈھتی ہوئی ان کو بلا نکلتی ہے

تصدق اس ادا کے پوچھتے ہیں مجھ سے وہ ہنسکر
کسی پر دل جو آجاتا ہے کیا معلوم ہوتا ہے

زمانہ دیکھکر ہو تماشا ہو ہی جاتا ہے
خدا جب حسن دیتا ہے تو شیدا ہو ہی جاتا ہے

قسم کھائی تمہارے سر کی اتنی کی خطا ہم نے
ملال اس کا نہ رکھو دل میں ایسا ہو ہی جاتا ہے

کوئی ناکام دل کے ضبط سے گو کام لیتا ہے
مگر اے جان اظہار تمنّا ہو ہی جاتا ہے

کہا یہ شمع نے رو رو کے اہلِ محفل سے
بہت فریب سحر آئی بزم فانی کی

بگڑے ہیں دم سرد سے بیٹھے ہیں خفا سے
کچھ خیر ہے اب آپ تو لڑتے ہیں ہوا سے

طاہر - سید طاہر پیر حسینی چشتی قادری۔ آپ کرنول کے مشائخ میں ممتاز ہیں۔ آپ کے والد سید محبوب پیر دفتر مدارالمہام بیگن پلی میں میر منشی تھے۔ علوم صوری و معنوی میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ علوم قیافہ مسائل تصوّف سے واقف ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں کرنول میں تعلیم پائے ہے۔ اس کے بعد کوبل کونٹلہ میں اپنے چچا سے تکمیل تعلیم کی۔ شاعری میں حضرت نیساں سے تلمذ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

پھولوں کے رنگ میں ہے جلوہ نما الٰہی
غنچوں کی بو میں ہم نے دیکھا ہے نور تیرا

جہاں میں سمندر۔ سمندر سے قطرہ
وجود خدا یوں خدا ہو رہا ہے

کہاں سے لغزش دنیا میں وہ پھنسے طاہر
کہ جس کے پلّے پہ ربِّ غفور ہوتا ہے۔

طبیب

طبیب:۔ لالہ بابو لال تلمیذ صادق اکبر آبادی ۱۸۹۲ء میں بمقام آگرہ طالبعلمی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ابتدائی مشق کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

افشاں چنا کئے میں رہا انتظار میں
تارے ہی گنتے رات کٹی ہجر یار میں

بعد فنا بھی دل نہیں رہتا قرار میں
بجلی تڑپ رہی ہے ہمارے مزار میں

مٹی یہ آج اپنی ٹھکانے سے لگ گئی
لاشہ ہمارا دفن ہؤا کوئے یار میں

طپاں

طپاں:۔ سید سلطان علی بریلوی۔ شاگرد حضرت خواہاں۔ مضمون آفریں اور خوش بیان ہیں۔ بندشوں میں صفائی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

نوح کا طوفان ہے اس چشم کے گریہ کا ذکر
برق عالم سوز ہے اس دل کے افسانے کی بات

آپ کو اے حضرت واعظ پڑی ہے خوب چاٹ
جبّہ و دستار سے ہے مے کے بیعانے کی بات

زخم جگر پہ مرہم کافور کی جگہ
لیتے ہیں عکس عارض رشک قمر سے ہم

مر مر کے ہاتھ آئی شب وصل کی گھڑی
کیونکر نہ چاہیں عمر کو پہلے سحر سے ہم

تھمنے جو اپنے پاؤں تقاضائے عشق سے
کرتے طواف کوچۂ جاناں کا سر سے ہم

طپش

طپش:۔ منشی اوماں شنکر فرخ آبادی ولد منشی شیو پرشاد دیوان نواب صاحب فرخ آباد۔ آپ بھی اپنے والد کی طرح عرصے تک سرکار انگریزی کے ملازم رہے۔ پیشکاری اور قانون گوئی کی خدمات انجام دینے کے بعد ریاست رامپور میں برسر ملازمت قیام رہا۔ آپ کا مذاق سخن تصوف کی جانب زیادہ مائل تھا۔ عاشقانہ پیرایہ میں حقیقت اور معرفت کے مضامین نظم کرتے۔ الفاظ کی متانت اور زبان کی صفائی قابل آفرین ہے کلام میں شروع سے آخر تک ایک رنگ ہے۔ علم عروض کے ماہر تھے۔ حضرت طالب حسین مجیب کے شاگرد تھے۔ ہز ہائی نس والیٔ رامپور آپ کی باریک نظری اور معنی رسی سے نہایت خوش ہوتے اور قدر دانی فرماتے۔ افسوس ہے کہ آپ اپنا دیوان مرتب نہ کر سکے اور تقریباً پچاس ساٹھ برس کی عمر پا کر ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے

ہے غضب آئینۂ دل کا مکدّر ہونا
چاہیئے اہلِ صفا صاحب جوہر ہونا
حوصلہ بندہ بھی رکھتا ہے خدا ہونے کا
جوش قطرہ کا یہ کہتا ہے سمندر ہونا

اٹھایا لطف کیا ہم نے دو روزہ زندگانی کا
اِدھر آیا اُدھر جب تا رہا عالم جوانی کا
سرشک خوں ہے آنکھوں میں تو دل بھی خوں گرفتہ ہے
وہ ساغر ہے یہ شیشہ ہے شرابِ ارغوانی کا
کبھی چوٹی جو اس رشک قمر کی آئی ایڑی تک
زمین پر ہو گیا عالم بلائے آسمانی کا

خاک پا تیری جو آنکھوں میں لگائی ہم نے
سرمۂ دیدۂ اربابِ نظر دیکھ لیا

دل کو آئی ہے خوشگوار بسنت
ہو رہی ہے گلے کا ہار بسنت
تیری رنگیں ادائیاں ہیں غضب
تیری صورت پہ ہے نثار بسنت

چشم رحمت مجھے دزدیدہ نظر سے دیکھے
چھپ کے بیٹھا ہوں گناہوں سے پشیماں ہو کر
اسے منظور ہے پردہ طالب ہے دید کی مجھ کو
نظر دونوں کی ہے دونوں طرف سے ایک چلمن پر
وہی ہے رشتۂ الفت جسے زنّار کہتے ہیں
کہیں تسبیح زاہد میں کہیں دوش برہمن پر
نورِ وحدت کی یہ خواہش ہوئی یکتا ہو کر
کہ میں ظاہر ہوں کہیں صورت زیبا ہو کر
دیکھنا تھی اسے نیرنگی قدرت اپنی
جلوہ فرما ہوا گوکل میں کنھیا ہو کر
پہلو میں ہے کبھی کبھی دلبر کی زلف میں
وہ ابتدائے دل ہے یہ ہے انتہائے دل

دو جہاں سے جب نکل جاتے ہیں ہم
یار کے دل میں جگہ پاتے ہیں ہم
کام کچھ آتا نہیں آب سرشک
آتش دل سے جلے جاتے ہیں ہم
ملکیا جب سے کسی کے دل سے دل
اپنی خاطر میں کسے لاتے ہیں ہم
جب فنا ہوتے ہیں پاتے ہیں بقا
جب بگڑ جاتے ہیں بن جاتے ہیں ہم
ہے ہوا سر میں در دلدار کی
عرش پر دیکھو اڑے جاتے ہیں ہم
خاک ہونا ہے ہماری آرزو
پاؤں سے تیرے لپٹ جاتے ہیں ہم
ہر جگہ قصے ہیں حسن و عشق کے
وہ ہمارے ان کے کہلاتے ہیں ہم

شہیدوں پر بھی یہ اپنے کبھی سیدھی نہیں چلتی　عضب کی کج ادائی ہے تری شمشیر براں میں

ہمیشہ یاد ہے دلمیں کسی نور تجلے کی　چراغ طور روشن رکھتے ہیں اپنے شبستاں میں

ہیں لطف زندگی کے شراب وکباب میں　توبہ بھی اک عذاب ہے عہد شباب میں

پستی میں بلندی کی تاثیر نظر آئی　خورشید کی ذرّوں میں تنویر نظر آئی

خیال خام پہنچے کس طرح عشق حقیقی تک　یہ وہ سودا ہے جو سر دیکے بھی مشکل سے ملتا ہے

بہا دیتی ہے پھر باد مخالف بحر ہستی میں　میرا بیڑا جو بہہ بہہ کر لب ساحل سے ملتا ہے

زمانے میں درد آشنا دل یہی ہے　دکھا لو۔ دکھانے کے قابل یہی ہے

دلہن بنکے نکلی ہے شمشیر قاتل　گلے سے لگانے کے قابل یہی ہے

میرے سامنے غیر سے میٹھی باتیں　مری جان کو زہر قاتل یہی ہے

آواز دردناک ہے دلکش صدا بھی ہے　اس بزم میں کہیں طپش بینوا بھی ہے

تم مانتے نہیں ہو تو آئینہ دیکھ لو　تم سا تمہارے آگے کوئی دوسرا بھی ہے

دو جہاں میں مجھے اندھیر نظر آئے گا　منہ چھپا مجھ سے نہ او چاند سی صورت والے

جن کو دنیا سے ہے مطلب نہ غرض عقبے سے　وہی دارین میں ہیں عیش و فراغت والے

ہوگئیں منزل مقصود کی لاکھوں راہیں　پھیر میں پڑ گئے ہفتاد و دو ملت والے

نازدکھلاتی ہے وہ ابروئے خمدار مجھے　اپنے قبضے میں کریگی یہی تلوار مجھے

جب ازل میں ہوئی تقسیم بنام عاشق　باغ بلبل کو ملا کوچۂ دلدار مجھے

بلندی میں زیادہ کون قصر دل سے ملتا ہے　یہی پستی میں رہ کر عرش کی منزل سے ملتا ہے

کمال عشق میں پھر جستجو باقی نہیں رہتی　جو ہے معشوق خود وہ عاشق کامل سے ملتا ہے

طپش

طپش: مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان فرزند مرزا یوسف بیگ دہلوی یہ سید جلال بخاری کی اولاد سے تھے مولد خاص دہلی مگر لکھنؤ میں مرزا جہاں دار شاہ بہادر کی سرکار میں عرصہ تک رہے بعد ازاں شہر ڈھاکہ میں رہ کر مدت تک نواب شمس الدولہ

بہادر کی رفاقت کی ۔ سنسکرت زبان سے بھی واقف تھے ۔ خواجہ میر درد سے شرف تلمذ حاصل تھا ۔ شعر بہت پاکیزہ کہتے تھے ۔ قطعات لکھنے میں خاصہ ملکہ تھا ۔

صاحب سخن شعرا یعنی حضرت نسّاخ کا بیان ہے کہ ان کی غزلوں کے کچھ مسودے انہیں کے قلم سے لکھے ہوئے ملے جن میں ان کا تخلص طاء مہملہ سے لکھا تھا ۔ یہاں بھی تائے فوقانی سے نہیں لکھا گیا ۔ کلام ملاحظہ ہو :-

خاک ہیں ہم کو ملا کہتے ہو قیمت کیا دوں ۔ چیز اگر لیتے ہیں تو پہلے چکا لیتے ہیں
کھٹکتا ہے جو کانٹا سا دل افگار پہلو میں ۔ خدا دشمن کے دشمن کو نہ دے آزار پہلو میں
کبھی اے ہمنشیں کچھ بادہ نوشی کی ہے کیفیت ۔ کہ ساغر ہاتھ میں ہو ساقی سرشار پہلو میں

قطعہ

بدخواہ نے کل ایک جواں سے یہ جا کہا ۔ وارفتہ کچھ طپش فقط اک تم ہی پر نہیں
ملتا ہے ہر کسی سے ہر اک سے ہے اس کو راہ ۔ وہ کونسا ہے دل کہ جہاں اس کا گھر نہیں
بولا کہ دیکھنے میں تو ایسا نہیں ہے وہ ۔ باقی کسی کے دل کی کسی کو خبر نہیں

ہم غمزدوں کے دل میں ہوائے چمن کہاں ۔ دل ہی نہ ہو تو خواہش سرو سمن کہاں
چرچے شب وصال کے یارب وہ کیا ہوئے ۔ مینا کہاں وہ جام کہاں انجمن کہاں

ہاتھ سے میرے کس طرح اے غیر ۔ دامن اس کا جدا کرے گا تو
فرض میں نے کیا کہ یوں بھی ہوا ۔ کشش دل کو کیا کرے گا تو
کہتے تھے ہم طپش دل اس کو نہ دے ۔ اور جو دے گا برا کرے گا تو
تو نے کہنے پہ کچھ عمل نہ کیا ۔ ہم بھی اب دیکھیں کیا کرے گا تو

آزمایا ہم نے یاروں کو سدا ہر رنگ میں ۔ کیا کوئی لیوے جہاں میں دوستی کے نام کو
گلفشانی کی توقع کیا کہ میری قبر پر ۔ پھولوں کے دن بھی نہ لائے اس بت گلفام کو
طپش اب پیٹتا ہے دل کو اپنے ۔ بہا اس جنس کی کیے تو سے پر ہے

ہوئے ہیں خوبرو کتنے خریدار
کوئی دو بوسہ دیتے ہیں کوئی چار
سو یہ ہے عرض خدمت میں تمہارے
تو اب اس سے بھی کچھ بڑھئے زیادہ

شناسائی میں جن جن کو نظر ہے
دلے اس کا ارادہ بیشتر ہے
کہ ایسا آپ کو منظور گر ہے۔
یہ چرخِ نیلگوں نیلام گھر ہے۔

ہر طرف آج ہے بسنت کی دھوم
کتنے گلرو جو ہیں بسنتی پوش
کہتے ہیں مجھ سے آنکر ہنس ہنس
ہو مبارک تمہیں جنون طپش

سیر میں ہے ہر اک تماشائی
جی میں کھٹکے ہے جن کی رعنائی۔
دیکھ کر میری ناشکیبائی۔
پھر نئی رُت نئی بہار آئی۔

کس کیطرف سے آج طپش تجھ کو یاس ہے
سچ کہہ ہمارے سر کی قسم کیوں اُداس ہے
ہم خوش ہوئے سو راخ ونکے پڑنے سے جگر میں
اب نے کی طرح شوق سے فریاد کرینگے

طپش

طپش:- میر مدد علی اکبر آبادی شاگرد اسیر خلف حضرت نظیر اکبر آبادی۔ محاربات ہند۔ اور خزینۃ القواعد ان سے یادگار ہیں۔ کلام جو فراہم ہو سکا۔ انتخاب یہ ہے:-

لاکھوں جی جاتے ہیں اور سینکڑوں جی جاتے ہیں
یار نے سن کے مرے نالے تجاہل سے کہا
بے اثر ہوتی نہیں سنتے ہیں آہ عاشقاں
بعد مُردن قبر پر آیا مری وہ شکر ہے
نزری ہے عفو کی عادت مری ہر عصیاں کی
فراق و درد و الم غم ستم فغاں و طپش

سیر کو جب وہ نکلتا ہے ستمگر باہر
کوئی نو روتا ہے واللہ مقرر باہر
پھر یہ کیا ہے آہ کا اپنی اثر ہوتا نہیں
نخلِ الفت سچ کہا ہے بے ثمر ہوتا نہیں
کیا ہے کس لئے پھر مورد قصور مجھے۔
یہ ساتوں گھیرے ہیں ہفتے سے لئے قصور مجھے

طپش

طپش:- شیخ عبد الغفور ولد شیخ منیر الدین۔ آپ معززین اجمیر سے ہیں۔ قریب ۳۳ سال کے عمر ہے۔ فنِ سخن میں خواجہ محمد ایوب عیش سے تلمذ ہے۔ جوان طبع شاعر ہیں۔ صاف شعر کہتے ہیں۔ ابتدائی مشق کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

دل لگی ہی دل لگی میں دل گیا / دل لگانے کا نتیجہ مل گیا
کیا کہیں کس سے کہیں کس حال سے / تیرے کوچے سے ترا بسمل گیا
بلبلیں جو ہر طرف ہیں خندہ زن / کوئی گلشن میں نیا گل کھل گیا
پوچھتا ہے قیس یہ ہر ایک سے / کیا ادھر سے ناقۂ محمل گیا
تم طپش کا کچھ نہ کرنا رنج و غم / خاک ہو کر خاک ہی میں مل گیا

کیا سمجھتے تھے دل کو کیا نکلا / درد الفت میں مبتلا نکلا
اب بھروسہ وفا کا ہو کس پر / دل دیا جس کو بے وفا نکلا
نہ رہی تاب گفتگو مجھ میں / جب مرے سامنے وہ آ نکلا
لطف اس میں عجیب آتا ہے / درد بھی اس کا بامزا نکلا

قصۂ غم کہا کرے کوئی / نہ سنے وہ تو کیا کرے کوئی
کچھ کہو تو سہی بھلا کب تک / درد فرقت سہا کرے کوئی
مجھے صحرا میں لے چلا آخر / دل وحشی کا کیا کرے کوئی
زور چلتا نہیں ہے کچھ دل پہ / پھر بتاؤ کہ کیا کرے کوئی
روٹھ جاتے ہیں وہ طپش ہم سے / گرچہ جرم و خطا کرے کوئی

طرار

طرار:- منشی میر محمد رضوی خلف حاجی سید محمد غفور باشندہ مچھلی شہر (قریب جونپور) اپنے بھائی حضرت شہیر کے شاگرد ہیں۔ اچھی طبیعت پائی ہے۔ زبان صاف کہتے ہیں۔ مضمون آفرینی کی طرف بھی توجہ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ہندوؤں کا ہے وہ معبد یہ مسلمانوں کا / مسجدوں سے نہیں کم مرتبہ بتخانوں کا
بے کسی بھی جو مرے ساتھ نہ ہوتی طرار / کون غربت میں مرا پوچھنے والا ہوتا
ملائیں آنکھ وہ غیروں سے بیقرار ہوں میں / ستم ہے تیر کسی پہ چلے شکار ہوں میں
وہ خاک کر کے مرے دل کو مجھ سے کہتے ہیں / کہاں ہے اسمیں دکھاؤ تو آرزو میری

نمود عزت خوباں ہے یوں تذلیل عاشق سے
بلندی کی دکھانے والی جیسے صورت پستی ہے

حماقت سے دماغ اسکو ہے اپنی زہد وطاعت پر
سر بے مغز زاہد میں مئے نخوت کی مستی ہے

خراب آباد دل میں گھر کیا ہے رنج و حسرت نے
یہ ویرانے کا ویرانہ ہے اور بستی کی بستی ہے

طرار

طرار ۔ منشی سید زوار حسین سابق مترجم اودھ اخبار لکھنؤ۔ چند انگریزی افسانوں کے مترجم ہیں۔ لکھنؤ سے ایک رسالہ گوہر شاہوار نامی نکالا تھا۔ جو اب بند ہے۔ مزیدار شعر کہتے ہیں۔ نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

آنکھوں پہ کیا کھلینگے دلوں پر یہ کھلتے ہیں
تلوار کے نہیں یہ جو ہر زبان کے ہیں

غنچے ہزار کھل گئے اُن کے کھلے نہ لب
قائل سخن طراز صنم کے دہن کے ہیں

اب دیکھئے کسی کو نہ سیدھی نگاہ سے
معنی حضور آپ کے یہ بانکپن کے ہیں

طرار

طرار ۔ محمد مسیح اللہ شاگرد حضرت امیر مرحوم۔ رنگ قدیم کے مفتون تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے

نہ ہاتھ آیا نرا وحشی کسی کے موسم گل میں
جنوں نے پاؤں پڑ کر پاؤں میں زنجیر ڈالی ہے

ابھی ہے سادگی سے شوق عالم ہے لڑکپن کا
سنا ہے کان میں اسکے نہ بندا ہے نہ بالی ہے

طرب

طرب ۔ منشی دھومی لال مرحوم برادر زادہ راجہ کنول نین کایستھ۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد کے امرا میں تھے۔ شاہ نصیر مرحوم کے بارادت تلامذہ میں سے تھے۔ مشق سخن انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں ان کا توسن طبع خوب جولانیاں دکھاتا تھا۔ صاحب دیوان ریختہ تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

جو گرا آنکھوں سے پھر ہوتا نہیں ہے سر بلند
کس نے دیکھا ہے کہ اشک آنکھوں سے پھر گر کر اُٹھا

اک بار کرو قتل کہ جھگڑا ہی چک جائے
ہر روز کا تو جور و ستم اٹھ نہیں سکتا

ابر و مینا و مے و ساقی و مطرب ہے طرب
کیا مزا تھا جو مرے پاس وہ دلبر ہوتا

ہزاروں بار آیا ابر گھر کر خوب سا برسا
اگا سبزہ نہ ہرگز دل جلوں کے آہ مدفن پر

طرب نے دوستی میں ان بتوں کی جو اُٹھایا غم
نہ ہو یہ صدمۂ غم یا خدا دشمن کے دشمن پر

اس نے چہرے پہ دکھا زلفِ پریشان ہم کو
کردیا از سرِ نو بے سر و ساماں ہم کو

لو ہم بھی ہوئے جاتے ہیں روپوش جہاں سے
تم چہرہ کو پردے سے اگر وا نہیں کرتے

وصل اس صنم کا دیکھئے حاصل ہو کب طرب
اب کوئی فال دیکھ کے قرآن نکالئے

سخت جانی میں شہادت کے ہیں ارماں کتنے
عاشقوں کے ہیں ترے گنجِ شہیداں کتنے

عشوہ و غمزہ و زلف و نگہ و ابرو و ناز
آہ پیدا ہوئے اِک جاں کے خواہاں کتنے

طرب

طرب :- لالہ جھنّولال کایستھ لکھنوی۔ شاگرد رشید شیخ ناسخ عہد قدیم کے شعرا میں ممتاز تھے۔ سنگلاخ زمینیں بہت پسند تھیں۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔ مؤلف تذکرہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی نسخہ ملا جس میں سے مندرجہ ذیل اشعار ہدیہ ناظرین ہیں۔

اس قدر آنکھوں میں اپنی کھب گئی تصویر یار
اس کا خالِ رُخ ہماری آنکھ کا تل ہو گیا

پٹی نہ کھولی آنکھ سے ہنگام ذبح بھی
ارمان دید کا دل بسمل میں رہ گیا

مزاج اب رحم پر آیا ہے شاید اے طرب اس کا
جو شب اس شمع رو نے خود بخود گلگیر کو توڑا

معطّر اس کے نہانے سے بس کہ آب ہوا
حباب بحر ہر اک شیشۂ گلاب ہوا

صاف طینت کو نہ کج طبع سے پہنچے آسیب
جسطرح کانٹے سے کٹتا نہیں شمشیر سے آب

تیر سی لگتی ہیں برسات میں بوندیں تن پر
اُس لبِ غیر اب نہیں کم حق میں مرے تیر سے آب

عرق شرم میں غرق ہوا میں دم قید
کہ ٹپکنے لگا ہر حلقۂ زنجیر سے آب

سختیاں سی سختیاں کھینچی تھیں ہنگامِ بہار
کیوں نہ کانپ اُٹھے مرا دل سنتے ہی نام بہار

پھوڑ سر کو جیب کے ٹکڑے کر اور جنگل کو چل
ان دنوں میں مجھ کو یہ پہنچے ہیں احکامِ بہار

اب طرب رونا عبث ہے دل کو بیکل دیکھکر
دل تجھے دینا تھا ناداں روزِ اوّل دیکھ کر

عالم دیوانگی میں اپنا سر ہے اور سنگ
ہے ہجوم کودکاں اک شور و شر ہے اور سنگ

جب دیکھی اس نے تیری کلائی کی ناز کی
مانی کو ساری بھول گئیں دستکاریاں

گر نہ اس سبزہ میں ہو ہمراہ یار سبزہ رنگ
سبزہ آنکھوں میں لگے جوں نشتر برسات میں

خوف بارش ہوا نہیں رکھتے ہوں جو دیوار و در
مجھ بیاباں گرد کو ہو خاک ڈر برسات میں

جو ہوا ایذا بھی دست یار سے ہی موجب راحت
عجب کیا گر نمک پاشی سے اس کی کارِ مرہم ہو

بوقت نزع زباں بند جب ہوئی اپنی
تب اس نے پوچھا کہ کہہ کیا ہے آرزو دل کی

مژدہ اے چشم گہر بار اب ہوا یہ گوش زد
بہر زینت یار کو سلک گہر درکار ہے

نقشِ حُب کی عاشق صادق کو ہے کیا احتیاج
آہ میں بس اس کو تھوڑا سا اثر درکار ہے

ہر دم تڑپ رہا ہے بسمل نہیں تو کیا ہے
تیغ نگہ کا کشتہ یہ دل نہیں تو کیا ہے

اس کی طلب ہے جس کا ملنا نہیں ہے ممکن
ہم کو اگر خیالِ باطل نہیں تو کیا ہے

میں تو کچھ کہتا نہیں یہ کیجے وہ مت کیجئے
لیکن اتنی عرض ہے بندے کو رخصت کیجئے

اس کی غفلت اور بھی ہشیار کرتی ہے مجھے
واں فراموشی ہے جتنی اتنی ہی یاں یاد ہے۔

طرب ۔ مولوی رحیم بخش حضرت شیخ نور محمد قادری تھانیسری کے نواسے تھے کتب فارسی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں۔ فنِ شعر میں عبدالکریم سوزؔ سے تلمّذ تھا۔ غدر کے بعد زندہ تھے اور طبابت کے ذریعہ بسر اوقات کرتے تھے۔ ڈیوڑھی صاحبہ محل میں ان کی طرف سے بزم مشاعرہ بھی ہُوا کرتی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

طرب

مرغِ دل مشتاق ہے تیری مژہ کے تیر کا
دل نہ توڑا چاہئے صیاد اس نخچیر کا

قتل تو کرتا ہے مجھ کو پر میں ہوں برگشتہ بخت
خوف یہ ہے پھر نہ جائے منہ تری تلوار کا

دو ہی دن میں کچھ سے کچھ احوال میرا ہو گیا
جو مجھے دیکھے ہے کہتا ہے تجھے کیا ہو گیا

آفت زدہ تھے اور بھی دُنیا میں اے فلک
کیا خاک میں ہمیں کو ملانا ضرور تھا

اے طربؔ عشق سے پرہیز ہے لازم تجھ کو
جان جائے گی کسی بت پہ اگر دل آیا

ہیں ہاتھ میں سفّاک کے یہ تیغ و سناں آج
دو چار کے سر جائیں گے دو چار کی جاں آج

آگے کو دل لگانے کی توبہ ہے اب طربؔ
پر اب کسی طرح مرے قابو میں آئے دل

ہوائے شوق سے اُڑ کر چمن میں پہنچینگے
نہیں سہی ہم اگر بال و پر نہیں رکھتے

طرب

طرب: سید آل احمد نقوی سرسوی شاگرد محمد مصطفےٰ خورشید لکھنوی۔ لطف زبان کے ساتھ مضمون آفرینی کی جھلک بھی موجود ہے۔ زبان شستہ طبیعت رنگین ہے صفائی بندش کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ممکن نہیں کہ حسن چھپائے سے چھپ سکے
پنہاں ہو لاکھ پردۂ شرم و حجاب میں

سوز فراق یار کا ظاہر نشاں نہ ہو
جل جائیں شمع ساں جگر و دل دھواں نہ ہو

اس شرط پر رہا اسے صیاد نے کیا
بلبل کا شاخ گل پہ کبھی آشیاں نہ ہو

عیب کرنے کیلئے چاہیئے دانائی بھی
مجھکو تائب بھی جہاں کہتا ہے صہبائی بھی

قید صیاد سے دم بھر نہ رہائی پائی
کس نے دیکھا جو گلستاں میں بہار آئی بھی

خنجر براں کو کیا نسبت نظر کے تیر سے
تیغ ابرو ہے کہیں بڑھ کر تری شمشیر سے

ان بتوں کی بے دہانی اور ڈھٹائی ہے ستم
باتیں کرتے ہیں زبانِ خنجر و شمشیر سے

شب وصل ان کا کہنا منہ بنا کے
تجھے کیا مل گیا مجھکو ستا کے

ہمارا امتحان تو لے چکا ہے
ذرا غیروں کو بھی دیکھ آزما کے

وہ دل سنبھال کر لحد غیر پر گئے
اسکے عوض میں ہائے ہمیں کیوں نہ مر گئے

وہ چہچہے وہ نغمۂ دلکش کدھر گئے
اے بلبلو بہار کے دن کیا گذر گئے

طرب

طرب: شفقت علی بریلوی شاگرد حضرت حسن مرحوم ان کی طبیعت چلتی ہوئی ہے۔ کلام میں آمد۔ خیالات میں روانی ہے۔ نمونہ کلام سخن یہ ہے۔

تربت سے اُٹھ کے جا نہ سکا کوئے یار تک
یہ ناتوانیوں کا اثر ہے غبار میں

اب آگئی ہے حضرت دل کی قضا ضرور
جاتے ہیں بار بار جو یہ کوئے یار میں

کس خوبرو کو دیکھ لیا کس پہ مٹ گئے
کیوں اے طرب تم آج نہیں اختیار میں

گل توڑ کے اس گل نے کہا ہنس کے چمن میں
کیا بلبل ناداں تجھے الفت تھی اسی سے

آغاز محبت ہی میں گھبرا گئے اب ہے
کیوں حضرت دل نالہ و فریاد ابھی سے

طرز

طرز:۔ منشی گردھاری لال قوم کایستھ۔ شاہجہان آباد کے قدیم باشندے تھے قیام الدین قائم کے ممتاز شاگردوں میں گنے جاتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا زمانہ پایا تھا افسوس ہے کہ کلام میں صرف ایک رباعی دستیاب ہوئی ہے:۔

کھا زلف میں بل جو گوشوارہ ٹوٹا
دھڑکے ہے مرا جی کہ خدا خیر کرے
کیا جانئے کس کا دل بچارا ٹوٹا
اس رات میں بے طرح ستارا ٹوٹا

طرز:۔ احمد حسین دہلوی تلمیذ مرزا خدا بخش قیصر۔ آپ نے حضرت سالک سے بھی اصلاح لی تھی۔ طبیعت سوز و گداز سے آشنا تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

دل کا تیرے ستانا چاہا نہ ہم نے ورنہ
نے گریہ بے اثر تھا نے نالہ نارسا تھا
پڑی ہیں حسرتیں خون گشتہ لاکھوں
مرے مدفن سے اسکی رہ گذر تک
اب کی مل جائے وہ تو کام نہیں
اگلی پچھلی شکایتوں سے ہمیں۔

طرز:۔ میر التفات حسین شاگرد سید مقصود عالم صاحب ساکن قصبہ پہانی ضلع ہردوئی۔ پُر لطف شعر کہتے تھے۔ ایک مخمس کے چند بند بطور نمونہ نذر ناظرین ہیں:۔

جھوٹے وعدوں کا کیا ٹھکانا ہے
آپ کہتے ہیں ہم نے جانا ہے
تتّے بے فائدہ بتانا ہے۔
روز آنے کا اک بہانہ ہے
آئیے آئیے جو آنا ہے

آسماں سے ملی ہر اک کو گزند
قہر ہے زہر اور لطف ہے قند
کوئی پیدل کوئی سوار سمند
کوئی محتاج کوئی دولت مند
اس کی قدرت کا کارخانہ ہے

طغرا:۔ مرزا محمد رضا لکھنوی تلمیذ مولوی مرزا محمد ہادی لکھنوی بالیاقت اور طبیعت دار شخص تھے۔ شعر صاف کہتے تھے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

نہ پوچھ حالت بیمار شام ہجر نہ پوچھ
تمام رات فقط سانس کا شمار رہا

وہ آئے تھے مری تربت پہ فاتحہ پڑھنے
خرام ناز سے محشر سر مزار رہا

شریک کوئی بُرے وقت کا نہیں طغرا
شب فراق میں دل بھی نہ غمگسار رہا

ہر اک آنسو میں جزر و مدِ بحرِ غم نمایاں ہے
یہ وہ قطرے ہیں جو بڑھ بڑھ کے طوفاں ہوتے جاتے ہیں

کرشمے جب فدا تھے چشمِ ماہ مصر میں پنہاں
وہ اب تعبیر رویائے زلیخا ہوتے جاتے ہیں

سونے والے چونکتے ہیں سُن کے آہ
گو انہیں خوابِ جوانی کیوں نہ ہو

غیر ہاتھوں میں لگائیں جب حنا
پھر ہمارا خون پانی کیوں نہ ہو

واعظ کو دیکھ دیکھ کے رندانِ بادہ کش
کرنے لگے بلند صدا یا غفور کی

کن تیوروں سے دل کا نشاں پوچھتے ہیں آپ
پہچانتا ہوں میں بھی نگاہیں حضور کی

طغرا وہ ذکر حضرت واعظ کو ہے پسند
کچھ کیفیت ہو جس میں شرابِ طہور کی

طفیل

طفیل:- شیخ طفیل احمد شاہ جہان پوری۔ کلام معمولی ہے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

ناز وہ بار بار کرتے ہیں
جانتے ہیں کہ پیار کرتے ہیں

وعدہ کرتے ہو پھر نہیں آتے
روز ہم انتظار کرتے ہیں

مرغِ دل پھانستے ہیں گیسو میں
بیٹھے بیٹھے شکار کرتے ہیں

ضبط کرتے ہیں پر نہیں ہوتا
لاکھ جبر اختیار کرتے ہیں

آنکھ کیوں پھیری شہید ناز سے
کر دو زندہ عیسوی اعجاز سے

انگلیاں کانوں میں دھر لیتی ہیں وہ
اتنی نفرت ہے مری آواز سے

جب کبھی آتے ہیں مرقد پر مرے
چلتے ہیں دامن اٹھا کر ناز سے

سر سے پہلے اس لئے کاٹی زباں
تا نہ واقف ہو کوئی اس راز سے

کون پہلو سے چرا کر لے گیا
میرے دل کو اک نگاہِ ناز سے

طلب:- نواب میرزا بہاؤالدین احمد خاں دہلوی۔ نواب شہاب الدین احمد خاں خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں جاگیردار لہارو کے فرزند اور حضرت سائل دہلوی کے منجھلے بھائی تھے۔ فارسی اردو کی تعلیم اپنے جدّ والا قدر کی نگرانی اور تربیت میں حاصل کی۔ خود بھی طبّاع اور ذہین تھے۔ اور طبیعت کو شعر سے لگاؤ تھا۔ ابتداء سے شاعری کا شوق تھا۔ شروع میں میرزا علی حسین خاں شاؔداں اور میرزا عبدالغنی ارشد گورگانی سے استفادہ کرتے رہے۔ محکمہ ٹھگی ڈکیتی میں انسپکٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ اوائل مشق میں باؔطل تخلّص تھا۔ پھر طلبؔ اختیار کیا۔ سادگی، سلاست، شستگی کے اعتبار سے کلام میں فصیح الملک میرزا داغ کا رنگ تھا۔ الفاظ کی چستی۔ بندش کی درستی کہنہ مشقی کا ثبوت ہے۔ مضمون آفرینی بھی طبیعت میں بہت تھی۔ زبان کی روانی میں اکثر متروک الفاظ استعمال کر جاتے۔ بعض موقعوں پر قواعد کا بھی زیادہ لحاظ نہ رہتا یا یہ کہئے کہ استبدادی متروکات کو نہیں مانتے تھے۔ باوجود بے پروائی کے پُرمزہ اور دلپسند کلام ہوتا۔ کتنا اچھا شعر کہا ہے ؎

تجھے خوش دیکھ کر بلبل چمن میں	مجھے رونا پڑا یادِ وطن میں

اس شعر کا موضوع معمولی مفہوم سے گذر کر حقائق و معارف کی طرف بھی راجع ہے اور اگر اسے سیاسی نقطۂ خیال سے دیکھیں تو مہذب اور تعلیم یافتہ جماعت کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

مؤلف تذکرہ سے اور ان سے اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

بزمِ دشمن میں کھینچ ہی لایا	دل بے اختیار کیا کہنا
مرتے دم تک رہی مرے دل میں	حسرت وصل یار کیا کہنا
دل بڑھاتا ہوں کہہ کے قاتل سے	اور بھی ایک وار کیا کہنا

جھوٹے وعدوں پہ آ رہا ہے یقین
ایک بوسے کی آرزو کی تھی
وعدۂ وصل پر کریں سودا
بن کے بیہوش گر پڑا خم پر

طرز گفتار یار کیا کہنا
گالیاں دیں ہزار کیا کہنا
دل تمہیں دیں اُدھار کیا کہنا
طلب ہوشیار کیا کہنا

دل چھڑانے کے لئے کونسی تدبیر نہ کی
زلف پیچاں نے کسی پیچ کو چلنے نہ دیا

کہاں جاؤ گے آنکھوں میں سما کر
مرے دل میں رہو تم گھر بنا کر

وہی دزدیدہ نظریں تاکتی تھیں
وہی دل لیگئے ہوں گے چُرا کے

کیا کیا تمہارے ہجر میں صدمہ گذر گیا
تم کو سناؤں گا جو ذرا دل ٹھہر گیا

تجھے خوش دیکھ کر بلبل چمن میں
مجھے رونا پڑا یادِ وطن میں

سوال وصل پر ایسے ہیں خاموش
زباں گویا نہیں ان کے دہن میں

نہ الجھو راستی پر سرو سے تم
نہ فرق آئے تمہارے بانکپن میں

نکل جاتا ہے دم پر لطف اس کا دل میں رہتا ہے
عجب دلچسپ کیفیت ہے قاتل تیرے پیکاں میں

پری رویوں کی چاہت بھی نہیں آسیب سے خالی
خلل آیا ہے اکثر زاہدوں کے دین و ایماں میں

سنبھل کر نا تواں سے زور کیجو پنجۂ وحشت
کوئی تار نفس اُلجھا نہ ہو تار گریباں میں

لاغری دیکھئے کہ حالِ نعش
شبہ کرتے ہیں ہیں کفن میں نہیں

تیغ ترچھی لگا نہ اے قاتل
ہم کو شک تیرے بانکپن میں نہیں

کھل گیا جب سے گالیاں تجھے دیں
گفتگو اب تیرے دہن میں نہیں

بتاؤ تو کہاں سوغات میں بھجوائی جاتی ہیں
کہ اب تو روز تصویریں نئی کھنچوائی جاتی ہیں

لکھا تھا میں نے کچھ ایسا خفا تو ہو گئے لیکن
جواب خط میں تحریریں ابھی تک آئی جاتی ہیں

عدو سے مل کے باطل وہ مکرتے ہیں شرارت سے
مرے سر کی ہزاروں جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں

یہ سینہ زوریاں لازم نہیں بزم رقیباں میں
ذرا منہ ڈال کر دیکھو تو تم اپنے گریباں میں

طواف درکا ان کے شوق بڑھتا جاتا ہے لیکن — مری توقیر گھٹتی جاتی ہے چشمِ نگہباں میں

دِل لگائے نہ مے پئے واعظ — پھر فرشتہ بشر نہ ہو جائے

غش نہ آئے نہ دیکھو آئینہ — تمہیں اپنی نظر نہ ہو جائے

لے تو جاتا ہے تو طلب کا خط — سرِ قلم نامہ بر نہ ہو جائے

ہم ہیں کہ مر رہے ہیں تمنّائے دید میں — پروانہ ہے تو شمع منوّر کے سامنے

محنت ہے رات دن کی اور افلاس کم نہیں — تدبیر رو رہی ہے مقدّر کے سامنے

مشکل ہے صرف عشق میں اک امتحانِ دل — تیغ دودم کے روبرو خنجر کے سامنے

عادت سوال مے کی کسی سے بری نہیں — کام آئے گی یہ ساقی کوثر کے سامنے

عشاق کی خطا نہیں اس تیرے حسن نے — ہنگامہ کر رکھا ہے ترے گھر کے سامنے

نکالے وحشت دل کے بہانے — بڑے چکر دئے مجھکو قضا نے

غضب کھینچا تھا دل زلف دوتا نے — بچایا بال بال اب کے خدا نے

مرے دل اور جگر کو دیں دُعائیں — کہ ٹھیک اب ہو گئے انکے نشانے

بدل دے یوں زمانے کو الٰہی — کہ میں روٹھوں تو وُہ آئے منانے

سامنے تیرے آکے دیکھیں تو — جن کو دعوے ہیں پارسائی کے

اک نظر میں تھا فیصلہ دِل کا — ہم تو قائل ہیں اس صفائی کے

آخر اس بزم سے ہم رشک کے مارے نکلے — ہائے ارماں وہاں غیر کے سارے نکلے

دیکھ کر کاہشوں میں عمر گنوانی مری — خوب روئی مری صورت پہ جوانی میری

ان کے پیکاں میں پہلو سے نکالوں کیوں کر — کہتے ہیں رہنے دے دلمیں یہ نشانی میری

ابھی دل میں حسرت بڑی رہ گئی — شبِ وصل آدھی گھڑی رہ گئی

قیامت نہ پہنچی تری چال کو — ندامت سے نیچے پڑی رہ گئی

ادھر کیوں نہ دیکھا جو دل صاف تھا — نظر غیر سے کیوں لڑی رہ گئی —

طلب مر گیا عشق میں اے طبیب
تری ساری بوٹی جڑی رہ گئی

دشمن جان و عزت و دولت
اس زمانے کے آشنا نکلے

مجھے بلواؤ تم نہ آؤ اگر
کسی صورت سے مدعا نکلے

عشق کی ابتدا ہے مر جانا
حشر میں شائد انتہا نکلے

بنا بُت کدہ اپنی اُمید گہ
خداوند عالم تری شان ہے

عداوت عشق میں ہے اک جہاں سے
عدو سے۔ پاسباں سے۔ آسماں سے

قیامت ہے زمین و آسماں پہ
تری رفتار سے میری فغاں سے

رہا دیوانگی میں ہوش اتنا
کہ سر پھوڑا اسی کے آستاں سے

نہ ہم نے دعویٰ الفت کیا ترک
نہ باز آئے کبھی وہ امتحاں سے

نہ چھوڑا جذب دل نے کوئی پیکاں
وہ اب کھیلا کریں خالی کماں سے

نام تیرا حسن سے ہے میری شہرت عشق سے
کوئی یوں مشہور ہے اور کوئی یوں مشہور ہے

روز کی وعدہ خلافی کی نہیں ہے کوئی حد
صاف کہدو اکیدن جو کچھ تمہیں منظور ہے

محو ہوں ایسا جہاں بیٹھا ہوں گویا واں نہیں
جو مرے نزدیک بیٹھا ہے وہ مجھ سے دور ہے

طلب **طلب**:۔ منشی رام نرائن شاگرد واعظم حیدرآباد سندھ۔ دو شعر ان کے درج ذیل ہیں۔ آدمی طبیعت دار معلوم ہوتے ہیں :۔

جوش جنوں نے گھر میں نہ رہنے دیا مجھے
تیرا خیال باعث ترک وطن ہوا

عشاق اُٹھ کھڑے ہوئے آنے سے اسکے آج
دشمن ہی وجہ برہمی انجمن ہوا

طلیق **طلیق**:۔ سید محمد جعفر حسین مدرس رونڈہ۔ ساکن قصبہ کنار کی۔ افسوس ہے کہ زیادہ حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ کلام جو مل سکا درج ذیل ہے۔

صبر اے دل نہ ہاتھ سے دینا
آج وہ امتحان لیتے ہیں

اچھی صورت اگر کہیں دیکھی
اپنی جان اسکو جان لیتے ہیں

چلیے میکشو آج دورِ شراب
تجھے دیکھ کر زاہدوں نے کہا

وہ دیکھو فلک پر گھٹا چھا گئی
کوئی حور دنیا میں کیا آ گئی

دل سے یقین کر لیا دشمن کی بات کا
اس بھولے پن پر آپ کے قربان جائیے

ہم تو نکالے جائیں خدا کی یہ شان ہے
مقبول ہوں رقیب تیری بارگاہ کے

بُرقع اٹھا دے رُخ سے جو وُہ غیرتِ قمر
مُنہ پر اڑیں ہوائیاں خورشید و ماہ کے

خوبیِ تقدیر کی یہ بات ہے
ہم ہیں بیتابی ہے غم کی رات ہے

ہجر ہے تو وصل بھی ہوگا ضرور
اپنے اپنے وقت پر ہر بات ہے

طور:۔ میرزا محمد رضا خلف میرزا اعظم بیگ شاگرد الرشید فتح الدولہ میرزا محمد رضا برقؔ لکھنوی۔ غزل خوانی میں کمال تھا۔ چنانچہ مشاعروں میں حضرت ناسخؔ کی غزلیں اکثر یہی پڑھا کرتے تھے۔ طبیعت بہت رسا تھی۔ آدمی ذی استعداد تھے۔ گو خاندان ناسخ کی طرح یہ بھی رعایت لفظی کے زیادہ پابند تھے۔ مگر شعر مزیدار کہتے تھے۔ لطف زبان کے ساتھ لطف مضمون بھی ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ شوخی اور متانت کا پہلو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور شعر میں بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے قواعد فن سے بخوبی واقف تھے۔ زور طبیعت کا یہ حال تھا کہ مشکل سے مشکل اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں کو پانی کر کے بہا دیتے۔ الفاظ پرستوں کی جماعت میں بالخصوص ان کے کلام نے بہت شہرت حاصل کی۔ دیکھیئے کس قدر معنی خیز شعر کہا ہے

زورِ الفت نے تو اس کوچے تلک پہنچا دیا
اب مدد تیری مجھے اے ناتوانی چاہیئے

زورِ عشق کی بدولت کوئے یار تک تو رسائی ہو گئی۔ اب ضعف اور ناتوانی کو یاد کر کے مدد مانگ رہے ہیں۔ کہ اُٹھ نہ سکیں۔ اور وہیں کے ہو جائیں۔ مضمون کو کس قدر سب سے علیحدہ ہو کر لکھا ہے اور نشستِ الفاظ نے کیا تیور پیدا کر دیئے ہیں۔

ایک سادہ شعر اور ملاحظہ ہو۔

عجب سرکار ہے اللہ کی اے طور میں صدقے
ہنر مندوں سے پوچھے جائینگے واں بے ہنر پہلے

دیکھئے بے کمالی کا اعتراف کس شان سے کیا ہے۔

حضرت طور اپنے زمانے کے مشہور استاد تھے۔ دیوان بھی ان کا طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ اب کچھ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

لب جاں بخش دکھلایا تو ہوتا
ذرا عیسیٰ کو شرمایا تو ہوتا

کف پا اپنا دکھلایا تو ہوتا
ید بیضا کو شرمایا تو ہوتا

صبح ہجر عاشق جاں باز ہے او بے وفا
کھول دے زلفیں سیہ روئے سحر ہو جائیگا

دل کو اس سنگدل کے موم کیا
نالۂ پر اثر کا کیا کہنا

میں چلا اے پاسباں ان کی تو کچھ تدبیر کر
پاؤں اٹھنا کوئے جاناں سے بہت دشوار ہیں

بوسۂ رخ لے لیا تھا خواب میں اکدن کہیں
اس خطا پر وہ نہ آئے ایک مدت خواب میں

خاک کا پتلا ہے اکدن خاک میں مل جائیگا
دیکھ کر صورت نہ خوش ہو بیخبر آئینہ میں

کیوں کہ ہمارے دل میں تو اے سیمبر نہیں
آئینہ دیکھ لے تجھے باور اگر نہیں

ساتھ اکدن لپٹ کے سوئے تھے
عمر بھر تن سے اس کی بو نہ گئی

ہاتھ بھی جوڑے پاؤں پر بھی گرے
پیش کچھ اس کے رو برو نہ گئی

پھول نرگس کے میں خط میں اسکو رکھکر بھیجدوں
حسرت دیدار کی بھی کچھ نشانی چاہیئے

زور الفت نے تو اس کوچے تلک پہنچا دیا
اب مدد تیری مجھے اے ناتوانی چاہیئے

اس طرف ہنس کے اگر چاند سا مکھڑا کرتے
داغ فرقت کو چراغ ید بیضا کرتے

خال لب پر نہیں ہے دلبر کے
ہندو بیٹھا ہے لب پہ کوثر کے

ناتوانی سے اٹھ نہیں سکتے
بن گئے نقش پا ترے در کے

جاں دونگا تمہارے سر کی قسم
سامنے سے اگر مرے سر کے

لے گئی خاک کوئے دلبر تک
ہم ہیں ممنون باد صرصر کے

مر کے جنت میں بھی نہ جائینگے
رہنے والے ہیں کوئے دلبر کے

وہ ناتواں ہوں میں کہ پکاروں جو زور سے
طاقت سوال کی نہیں ہے نہ کوئی جواب دے

اک رشک ماہ مصر کو دیکھا ہے خواب میں
یوسف کہاں سے آئے جو تعبیر خواب دے

دل لگانا اجل کا آنا ہے۔
عشق اک موت کا بہانا ہے

کھل گیا ہستی و عدم کا مآل
یہ قفس ہے وہ آشیانا ہے

طورؔ یاں اس لئے مقام کیا
کہ بہت دور ہم کو جانا ہے

میں جی جاؤں اجل سے آپ آجائیں اگر پہلے
یہ پیغام زبانی خط سے کہنا نامہ بر پہلے

قدم وہ محفل جاناں میں بیخوف و خطر رکھے
ہتھیلی پر جو رکھ لے شمع کے مانند سر پہلے

شب وصل صنم میں نے دعا یہ صبح تک مانگی
الٰہی آج نکلے مہر تاباں سے قمر پہلے

خواب اگر آتا ہمیں شاید وہ آتا خواب میں
حشر کو شاکی اٹھینگے دیدۂ بیدار کے

طور

طورؔ ۔ پروفیسر غلام محمد ایم اے ولد غلام محی الدین سابق وزیر ریاست کشمیر آپ جولائی ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مورث اعلیٰ مولانا عبدالسلام کو شاہجہان کے عہد میں بارگاہ شاہی سے خدمات کے صلے میں کارداری کا عہدہ۔ مالی۔ دیوانی۔ فوجداری حاصل ہوئے۔ ضلع سیالکوٹ اور گورداسپور میں جاگیریں بھی تھیں۔ سکھوں کے عہد میں بھی آپ کا ستارہ اوج پر رہا۔ شیخ غلام رسول مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مصاحب اور شیخ امام بخش کاردار تھے۔

پروفیسر طورؔ نے ابتدائی تعلیم ایک ورنیکلر سکول میں پائی۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سیالکوٹ کے مشن کالج میں تواریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر علی گڑھ کالج میں تواریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر متعین کئے گئے۔ آپ انگریزی فارسی۔ اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اور مستند اہل قلم میں آپ کا شمار تھا۔ اخبار آبزرور۔ اخبار وطن۔ ہمدرد۔ کامریڈ کے صیغہ ادارت سے وقتاً فوقتاً تعلق

رہا۔ رسالہ مخزن بھی کچھ دنوں ان کے ہاتھوں میں رہا۔ آپ کی طبیعت کو شاعری سے مناسبت تھی۔ کشمیر کے نظارہ کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کوہسار شملہ کی فضا کا لطف اٹھا چکے تھے۔ اس لئے نظموں میں جہاں عشق و محبت۔ درد کی چاشنی ہے۔ وہاں قدرت کی رنگینی کی نقاشی بھی موجود ہے۔ شاعری کو عطیہ وہبی سمجھتے۔ استادی شاگردی کے قائل نہ تھے۔ افسوس کہ عمر تھوڑی پائی ورنہ شاید یہ خیال قایم نہ رہتا۔

۲۱ نومبر ۱۸۹۸ء کو ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ غزلیات کم کہتے۔ نظمیں زیادہ لکھتے۔ کلام کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

جہان فانی کے ذرّہ ذرّہ میں ہے تغیّر کا رنگ پیدا
بہار باغ قیام کر دیکھنی ہو کچھ تجھ کو طور مخزون

رہے گلشن میں ہم جب تک رہے گلشن کی جاں ہوکر
یہ کیا رہنا ہے گر دل میں رہے راز نہاں ہوکر

ازل میں جو شرارے اس رخ روشن کے چمکے تھے
الٰہی کون سی بجلی نہاں ہے بیقراروں میں

وہ مستی جس پہ سو سو جان سے قربان ہشیاری
نہ بالائے زمیں دیکھوں نہ زیر آسماں دیکھوں

جلا دوں خرمن ہستی کو خاکستر بنا ڈالوں
یہ ہیں تصویر عزت کی وہ عبرت کے نمونے ہیں

اسیری وجہ کاہش زاہد خلوت نشین کی ہے
عدم کے رہنے والو جان لیکر تم تو بھاگے ہو

جدا ہونے کو مل کر بزم میں سب یار بیٹھے ہیں
کھا نہ جائے کہیں ساقی اغم دنیا مجھ کو

تو ایسے صحرا میں سخت مشکل ہے سیر فصل بہار کرنا
تو دیکھ لے آ کے داغہائے الم کا دلمیں قرار کرنا

ہنسی گل کی چٹک غنچہ کی بلبل کی فغاں ہوکر
رہو نور آنکھ میں سینے میں دل قالب میں جاں ہوکر

وہی خورشید خاور ہیں۔ وہی ماہ منوّر ہیں
کہ اہل آسماں شامل ہیں ان کے غمگساروں میں

مثال اسکی نہیں ملتی جہاں کے بادہ خواروں میں
نگاہیں وہ عنایت کر فراز لامکاں دیکھوں

اگر اس حسن عالم سوز کو طور تپاں دیکھوں
ثریا پر جو رہتے ہیں جو زیر خاک رہتے ہیں

جہاں گرد ان صحرا اس سے بالکل پاک رہتے ہیں
ہما را حوصلہ دیکھو نہ افلاک رہتے ہیں

ابھی آئے تھے جاتے کو ابھی تیار بیٹھے ہیں
وقت امداد ہے دے بادہ و مینا مجھ کو

چھپانا شاہد گل کو ہے گر چشم عنادل سے
بنا دے باغباں گلشن میں اک دیوار پھولوں کی

مژدہ اے دل آمد فصل بہاری ہے شتاب
پھر بیابان جنوں ہے اور وحشت کے مزے

بے نمک تھی طبیعت انسان
عشق کا دے دیا مزا تو نے

کوہ مشرق سے روشنی کے لئے
ایک چشمہ بہا دیا تو نے

نقش باطل دلوں سے محو ہوئے
نقش ایسا جما دیا تو نے

فاختہ کا پیغام

ویرانۂ دہلی میں جو گیا اک فاختہ مجھ سے یوں بولی
پیغام تجھے میں دیتی ہوں سن اے غافل کوکو میری

یہ ویرانے جو دیکھتے ہو معمور تھے آبادی سے کبھی
یاں شہر بھی تھے باغات بھی تھے بستی تھی کنار جو میری

گو چرخ کہن کی گردش سے روپوش ہوئی محفل اپنی
ہے آج کے دن پھر متجسس یہ چشم نظارہ جو میری

تھا شور جہاں تکبیروں کا ہنگامے تھے جرّاروں کے
اب عالم ہو ہے چار طرف باقی ہے فقط کوکو میری

میں تیری طرح ہوں صحرائی ہے مشغلہ بادیہ پیمائی
خونابۂ دل سے کرتی ہے اس دشت میں آنکھ وضو میری

یہ درد آمیز صدا میری جنگل میں درائے قافلہ ہے
اے طور تپاں ملت کو سنا فریاد حزیں ہر سو میری

شاعر کی محفل

چراغاں ہو رہا ہے ہر طرف گلزار عالم میں
ہے تاریکی مگر شاعر کی بزم رنج و ماتم میں

ٹپکتی ہے مسرت اہل عالم کی نگاہوں سے
ہجوم اشک خوں افگن ہے اسکی چشم پر نم میں

جہاں والوں کی جاں میں جان آئی دید یاراں سے
مگر وہ جان دیتا ہے کسی کے ہجر کے غم میں

نظارے کر رہے ہیں اہل عالم نازنینوں کے
وہ نظارات بالا کر رہا ہے فکر پیہم میں

وہ ہے موجود عالم میں مگر مفقود گم راہی
وہ پوشیدہ بھی ہے عالم سے ظاہر بھی ہے عالم میں

مگر سننا خدارا طور کی آواز آتی ہے۔
کسی سے ہے مگر گویا وہ تنہائی کے عالم میں

یادِ رفتگاں

یاس و حسرت کیوں اُمنڈ آئے ہیں مجھ ناشاد پر
ہو رہی ہے کس لئے اقلیم دل زیر و زبر

کیوں ڈبونے کو مجھے ہے موجِ بحرِ اضطراب
کیوں بہا جاتا ہوں اس دریا میں جوں طفلِ حباب

کیوں تلاطم میں ہے لے دریائے چشم خونفشاں
تیرے ہر قطرے میں ہے سامان بحر بیکراں

میں ترا ممنوں ہوں لے احسان یاد رفتگاں
شوق سے آ اور لے پہلو میں میرے چٹکیاں

میری قسمت میں ازل سے ہی لکھا سوز و گداز
میرے سینے میں خدا تے ہے بھرا سوز و گداز

برق خرمن نور حسن اولیں کی مجھ میں ہے
آتشِ عشق اک بت پردہ نشیں کی مجھ میں ہے

درد کہتے ہیں جسے میں اس کی اک تصویر ہوں
درد کی یعنی بنا ہوں درد کی تعمیر ہوں

تیری منزل میرے دل سے بڑھ کے ہو سکتی ہی کیا
اس سے بڑھکر کون سا ہوگا مقام آرام کا

ہماری زبان

کشمیر سے دکن تک برہما سے تا بہ کابل
یک جاں ہمیں کریگی اُردو زباں ہماری

اس کے بغیر جینا ممکن نہیں ہے اپنا
معلوم کیا کسی کو دشواریاں ہماری

اس کو بچائینگے ہم جب تک کہ دم میں دم ہے
ہم میزباں ہیں اس کے یہ میہماں ہماری

عالم میں یک زبانی سے بن رہی ہیں قومیں
ہے مقصد زبانی بستی یہاں ہماری

شمع اخیر شب ہیں ہم محفل جہاں میں
باقی رہیگی کب تک پھر داستاں ہماری

ناواقف تپش کو معلوم کیا بھلا ہو
یہ ٹھنڈی گرمیاں ہیں طور نہاں ہماری

طوفان:- جناب مولوی عبد الجلیل۔ ڈپٹی کلکٹر ضلع فتح گڑھ۔ بہت صاف شعر کہتے ہیں زبان اچھی ہے۔ تلمذ کا حال نہ معلوم ہو سکا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

طوفان

ہیں سینکڑوں حجاب ہمارے نصیب سے
موسیٰ نے خوب دیکھ لیا تھا قریب سے

جوشِ جنوں نے پھر مجھے بے خود بنا دیا
پھر کہہ رہا ہوں دل کی تمنا رقیب سے

جو بن چمن کا جس کی بدولت نکھر گیا
وہ گل کھلے ہیں خونِ دل عندلیب سے

پردہ نشیں کے درد نہاں کو جتائیں کیا	کہنے کا ہو مرض تو کہیں ہم طبیب سے

طپش

طپش:۔ محمد یوسف حسن مارہروری۔ شاگرد حضرت داغ مرحوم۔ ابتدائی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ پہلے عزیز تخلّص تھا۔ اب طپش ہے ریاست رامپور کے درباری شعرا میں رہ چکے ہیں۔ زندہ دل ظریف آدمی ہیں۔ محاورات روزمرّہ کی طرف زیادہ توجہ فرماتے ہیں۔ شعر مزیدار دلنشین کہتے ہیں۔ اپنے اُستاد کے رنگ کو خوب پہچانتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

جان بھی لیتی ہے عاشق کی تو کس پیار کیساتھ	شمع آغوش میں لے لیتی ہے پروانے کو

آپ کو اساتذۂ فارس و ہندوستان کے اشعار کثرت سے یاد ہیں۔ لطائف و ظرائف کا دریا آپ کے سینے میں بھرا ہوا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

دل سے تم۔ تم سے دل سوا نازک	سب سے نازک معاملہ دِل کا
بدگماں خاک سے بھی میری ہے بدظن کیسا	وُہ چلا دیکھو بچائے ہوئے دامن کیسا
تو سہی ضبط میں انداز فغاں کے نکلیں	آپ شیون کو لئے پھرتے ہیں شیون کیسا
کل تو میں پھرتا تھا گلشن میں بتا لے صیّاد	آج پھرتا ہے میری آنکھ میں گلشن کیسا
جانا بھی قیامت ہُوا اُس غنچہ دہن کا	بو ہو کے اڑا جاتا ہے سب رنگ چمن کا
یہ جان لیا اس پہ کوئی حادثہ گذرا	قاصد کو ہوئی دیر تو ماتھا مرا ٹھنکا
وہ تیر بھی پیاسے ہیں وہ تلوار بھی پیاسی	کس کام پھر آئے گا لہو میرے بدن کا
خوش اسکو وصل میں بھی تو پاتا نہیں ہوں میں	دل کا معاملہ ابھی سمجھا نہیں ہوں میں
غم میرے دل میں یاد عدو تیرے دل میں ہے	تنہا نہیں ہے تو کبھی تنہا نہیں ہوں میں
وحشت میں کون جانب صحرا نکل گیا	صحرا پکارتا ہے کہ صحرا نہیں ہوں میں
شرمندہ کیوں نہ اپنے گناہوں سے میں رہوں	یہ بھی نہ ہو تو پھر ترا بندہ نہیں ہوں میں
خدا جانے غضب ڈھائینگی وہ مایوسیاں کیا کیا	جو اُمّیدوں سے پہلے آئی ہیں امیدواروں میں

ہم بھی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
سبحے ہیں میکدے سے ہو میں پی ہیں بادہ خوار نہیں
بن گئے درد محبت مرے تڑپانے کو
جان بھی لیتی ہے عاشق کی تو کس پیار کیساتھ
تیر چٹکی میں بھی لے کر کوئی رہ جاتا ہے
مے کی تعظیم بھی کرتا ہوں دم بادہ کشی
یہی اک لاش پڑی ہوگی تمہارے آگے
ساقیا ہم کو تکلف کی ضرورت کیا ہے
نہ شب وصل رہیگی نہ یہ سامان نشاط
خوش بہت لخت جگر سے ہوئے طفلان سرشک
ہم امتحان ترا کر چکے ہیں خوب اے موت
سحر ہوئی کہ خرابات گونج اُٹھے اک بار

جن کی تقدیر بگڑ جاتی ہے کیا کرتے ہیں
شکست توبہ کی تقریب ہے پرہیزگار و نہیں
دل میں آئے بھی تو آسے مرے تڑپانے کو
شمع آغوش میں لے لیتی ہے پروانے کو
آپ کیا کیا نہیں کرتے مرے تڑپانے کو
پہلے آنکھوں سے لگا لیتا ہوں پیمانے کو
کہہ تو دیکھو کسی جانباز سے مر جانے کو
گھر سمجھتے ہیں ہم اپنا ترے میخانے کو
سب یہ آرام کے پہلو ہیں بدل جانے کو
لال پائے تھے انہیں لڑکوں کے بہلانے کو
پڑے جو وقت کسی پر کبھی نہ تو آئے
پکارتے ہوئے میکش سبو سبو آئے

ظ

ظالم

ظالم: ظالم سنگھ برہمن بیگم شمرو کی سرکار میں متصدی تھے۔ جب بیگم صاحبہ موصوفہ نے وفات پائی اور ان کا پرگنہ سرکار میں ضبط ہوا تو آپ خانہ نشین ہو گئے۔ اور بیکاری سے پریشان رہتے۔ آدمی پڑھے لکھے تھے تعلیم اطفال کو معاش کی سبیل قرار دیا اور غریبانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ دو شعر جو دستیاب ہوئے ہیں۔ درج کئے جاتے ہیں۔

دن تو رو پیٹ کر کٹے لیکن
ہجر کی رات کیا پہاڑ آئی

ہم تنگ نہیں ہیں اگرچہ باغ عشق سے
مفلسی کا داغ سوزاں تر ہے داغ عشق سے

ظلامی

ظلامی: حکیم محمد عبدالرحیم ساکن بھڑوچ۔ ان کے حالات دستیاب نہ ہو سکے۔ صرف دو شعر

ہاتھ آئے ہیں۔ جن سے سادہ گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لکھا صنم کو کہ مدت سے خط نہیں آیا	جواب ہم کو دیا فرصت جواب نہیں
ادائیں۔ ناز میں۔ انداز میں ہو تم یکتا	حسیں ہو ایسے جہاں میں کہیں جواں نہیں

ظاہر۔ منشی رام پرشاد کھتری دہلوی۔ تلمیذ مرزا رحیم الدین ایجاد۔ ان کے آبا و اجداد ملازم سرکار شاہی رہے۔ خود ۱۸۵۵ء میں اہلمد مقرر ہوئے۔ پھر دہلی کے محکمہ کلکٹری میں عرصہ تک سر رشتہ دار اور ناظر رہے۔ ۱۸۶۴ء کے آخر میں گوالیار گئے اور بعد حصول سند وکالت ۱۸۹۹ء تک وکالت کرتے رہے۔ ۹ نومبر ۱۸۹۹ء کو مہاراجہ سندھیا والی گوالیار کی قدر دانی سے ضلع گرد گوالیار میں مجسٹریٹی کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔ میرزا قادر بخش صابر سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے۔ اور ان کے برگزیدہ ترین تلامذہ میں ان کا شمار تھا۔ صاحب دیوان ریختہ اور فن تاریخ گوئی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ "کان تاریخ" ان کی تالیف سے ہے۔ کلام میں آمد زیادہ ہے۔ لطف زبان کے ساتھ نزاکت مضمون بھی موجود ہے۔ یہ مطلع ملاحظہ ہو کس قدر بے تکلف زبان سے نکل گیا ہے۔

مانند شمع و شبنم یوں دن بسر کریں گے	مر مر کے شام کی ہے رو رو سحر کرینگے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

تم لڑاتے ہو غیر سے آنکھیں	یہ لڑائی نہیں تو پھر کیا ہے

غور کیا جائے تو اس شعر میں اعلیٰ درجہ کی نثر کا لطف موجود ہے۔ مؤلف تذکرہ سے دوستانہ مراسم تھے۔ جو کلام موصول ہوا۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

سارے افلاک نظر آئینگے مانند حباب	موج زن اپنا گر اشک کا طوفان ہوگا
تیغ دو مجھکو کہ میں اپنا گلا کاٹ لوں آپ	مفت میں آپ کا سر پر میرے احسان ہوگا
میں تو مر کر بھی نہ نکلا حلقۂ ماتم سے ہائے	گرد میری قبر کے بھی حلقۂ احباب تھا
کیا بجھاتا آتشِ شوقِ شہادت وقت قتل	ہاتھ میں سفاک کے خنجر بھی تو بے آب تھا

یہ قدم حدِّ مذاہب سے پرے رکھتے ہیں
کہیں دل تو نے اٹکایا تو ہوتا
ہمارا بخت خفتہ ہوتا بیدار
وفائے غیر کی تعریف اتنی
اپنے اشکوں میں بہ گئے ہم آپ
بہار آئی ہے ظالم خدا کرے
قسمت میں پائمال جو ہونا تھا ہم نفس
ظاہر کی وضع یہ تو نہ تھی پر کچھ ان دنوں
کیونکر جلے نہ مزرعہ امید باغباں
آنکھ ہے پر نظر نہیں آتا
آنکھ مجھ سے لڑائے جاؤ تم
مثالِ برق تمہیں بھی کبھی قرار نہیں
دیر سے کام نہ کعبے سے ہے مطلب ہم کو
برق کی طرح وہ مجھ پر ہی گری پڑتی ہے
ہم ہو کے باوفا ہیں دشمن تری نظر میں
تاثیر اس کے دل پہ پہنچے کریں گے نالے
ہرچند روز روز کی ایذا سے تنگ ہوں
سمجھا سبب مرض کا تو بن جائیگا رقیب
عشق میں کیا ترے ناشاد کیا کرتے ہیں
کہا تھا ابر میں نے چشم تر کو
ناز اس کے اٹھاتے ہیں جو ہم اور زیادہ

شیخ ہے مشربِ رندانِ قدح خوار جدا
محبّت کا مزہ پایا تو ہوتا
ذرا تو خواب میں آیا تو ہوتا
ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا
آج یہ ماجرا نیا دیکھا
مٹا نشان نہ بلبل کے آشیانے کا
میں رفتہ رفتہ مائل رفتار ہو گیا
زاہد کی ضد سے رند قدح خوار ہو گیا
ہے برق ریز نالۂ سوزانِ عندلیب
مثلِ نرگس ہیں ہم چمن کے بیچ
یہ لڑائی ہے دلربا بہتر
ہنسو نہ تم دل پُر اضطراب کے اوپر
تیرے کوچے کی محبّت ہی ترے در سے غرض
آپ کی تیغ ستم کو ہے مرے سر سے غرض
تو بیوفا ہے اور پھر تجھ پر نثار ہیں ہم
پہلے تو آفتوں سے خود ہی دوچار ہیں ہم
آتا ہے پر ستم پہ ترے پیار کیا کروں
عیسیٰ کے پاس جا کے میں بیمار کیا کروں
جاں سی چیز کو برباد کیا کرتے ہیں
لگا دی آگ اس نے میرے گھر کو
کرتا ہے وہ بُت ہم پہ ستم اور زیادہ

سلجھانا ہے شانہ اُسے جلنا دم تزئین
پڑتے ہیں تری زلف میں خم اور زیادہ

تم لڑاتے ہو غیر سے آنکھیں
یہ لڑائی نہیں تو پھر کیا ہے۔
یوں ہر اک بات پر اُلجھ پڑنا
کج ادائی نہیں تو پھر کیا ہے

مانند شمع و شبنم یوں دن بسر کرینگے
مر مر کے شام کی ہے رو رو سحر کرینگے
جب ضعف سے پہنچیں سینہ سے اپنے لب تک
کیونکر فلک پہ جاکر نالے اثر کرینگے

ذلّتوں سے حسرت نظّارہ کا بنتا ہے کام
گالیاں دیتے ہیں وہ مجھکو بلا کے سامنے
میہمانی اس کو کہتے ہیں جب آیا تیر یار
دل جگر سب رکھدئے ہم نے اُٹھا کے سامنے
یہاں ہم آئے تھے جس وقت آپ روتے تھے
چلے تو اپنے عزیزوں کو ہم رُلا کے چلے
لبوں پہ دم ہے خدا کیلئے ذرا بولو
ہماری جان چلی آپ کی ادا ٹھہری
بے سبب اسکی اٹھا کر جھڑکیاں ہر بار کی
آپ ہم نے خُو بگاڑی ہے بُت عیار کی
ابر اُٹھا دیکھ لے کعبہ کی جانب سے وہ شیخ
خوب سُنتا ہے خدا رندانِ بادہ خوار کی
کُچھ اُڑا دی کُچھ بہا دی کچھ گرا دی بعد مرگ
کیا ہماری خاک کی ظالم نے مٹی خوار کی
مزا نہیں جو ہمیشہ وصال یار رہے
ذرا تو چاشنیِ دردِ انتظار رہے
مَے دو سالہ کو پی کر میں کیا کروں ساقی
وہ مے پلا کہ دم مرگ تک خمار رہے
آنے دو یا نہ آنے دو تم اپنے ہاں مجھے
عاشق تمہارا جانتا ہے اِک جہاں مجھے
کثرت آب بھی ہے نخل کو نقصاں کا سبب
شاخِ نخلِ مژۂ اشک فشاں سوکھ گئی
کیوں نہ آوارہ پھریں غمزدگانِ دہلی۔
کہ ہے عنقا کے نشیمن میں نشانِ دہلی
کوئی ظاہر میں نہ تھا اس کی خرابی کا سبب
اپنے اعمال ہوئے آفت جانِ دہلی
صبح پیری کے ہے کافور سے انکو نسبت
گُل سے رخسار جو رکھتے تھے جوانِ دہلی

اک فلک اور بنا اپنے ستانے کے لئے
جب اُٹھا دل سے مرے دودِ فغانِ دہلی

خمسہ بر غزل خود

پہلے امید ہی امید میں رکھا مجھ کو
پھر بلایا کئی بار اور یوں ہی پھیرا مجھ کو
کون سی بات کا ہو یا یہ بھروسا مجھ کو
ہائے گھر میں نہ بلایا نہ بلایا مجھ کو
آج بھی آپ نے وعدے ہی پہ ٹالا مجھ کو

واہ کیا خوب گذرتی ہے تمہاری اوقات
شہر میں پھرتے ہو غیروں کے لئے ہات میں ہات
ان سے یہ بات کہ آتی نہیں جن کو کوئی بات
کو رہے ہترکہ نہ دیکھیں تمہیں اغیار کے سات
رنج دکھلاتے ہیں کیا دیدۂ بینا مجھ کو

چشم پُر آب مرے واسطے اک عالم ہے
دوست رونے ہیں رفیقوں کو نہایت غم ہے
ایک صاحب کی رُکاوٹ کا وہی عالم ہے
حالت نزع ہے مرتا ہوں لبوں پر دم ہے
آپ سے دوست نے اس وقت میں چھوڑا مجھکو

کیا کہوں شوق میں حالت ہوئی کیا کیا میری
تُو نے پوچھی نہ خبر آن کے اصلا میری
پاس کچھ بھی نہ کیا دل شکنی کا میری
ایک بھی تجھ سے بر آئی نہ تمنّا میری
تا دمِ مرگ رہے گی یہ تمنّا مجھ کو

واں گئے وہ کہ جہاں تک کا پہنچنا ہے محال
بس گیا ڈھونڈنے ان کو تو دیا مجھ کو نکال
لوگ کچھ اور ہیں واں اور ہے ڈھنگ اور ہی چال
پوچھنا حضرت ظاہر کا ہیں کس سے احوال
نہ ملا کوئی وہاں اپنا شناسا مجھ کو

ظاہر: خواجہ محمد خاں مرزا مظہر کے شاگردوں میں تھے۔ زیادہ حالات نہیں معلوم ہوئے تذکرہ فتح علی خاں سے مندرجہ ذیل اشعار انتخاب کئے گئے ہیں۔

پھر زلیخا نہ نیند بھر سوئی
جب سے یوسف کو خواب میں دیکھا
لئے آہ اس نے در تو گریۂ اثر نہ ہوتی
ممکن نہ تھا کہ اُس کے دل کو خبر نہ ہوتی
با ہمہ ہیں گو کسو سے تجھے دوستی نہ ہو
لیکن تجھے رعایت ظاہر ضرور ہے

ظاہر

ظاہر - سید امتیاز علی خلف میر اعجاز علی اپنے بڑے بھائی حافظ ممتاز علی کے شاگرد ہیں۔ ریاست بھوپال میں ملازم ہیں۔ پختہ عمر ہے۔ سیدھا سادا اصاف کلام ہے۔ انداز بیان میں اختراع اور تراش خراش نہیں۔ نمونۂ سخن یہ ہے۔

ہے تیرے تلوّن سے یہ سب ہم کو مساوی
کہتے ہیں کسے مہر و وفا جور و جفا کیا

بوسہ کا کیا میں نے سوال اُن سے جو ناگاہ
جھنجھلا کے کہا پھر تو کہو تم نے کہا کیا

جان و دل و دیں نذر بتاں کرچکا ظاہر
جز درد و غم و یاس مرے پاس رہا کیا

ظریف

ظریف :- لالہ منصول دہلوی شاگرد حضرت نسیم بھرتپوری مرحوم۔ طبیعت بہت رسا معلوم ہوتی ہے۔ پُرلطف اور مزیدار شعر کہتے ہیں۔ زبان کی صفائی کا خیال زیادہ ہے۔ انتخاب کلام درج ذیل ہے۔

جب کہا ان سے کہ کچھ حال بھی دل کا جانا
ہنس کے فرمایا کہ جھوٹے کا کلیجا جانا

پھر وہی تیر لگانا کہ تڑپ جائے دل
پھر کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کے شرما جانا

قبول ہوتی ہے منّت نہ التجا میری
یہ بت ذرا نہیں سنتے مرے خدا میری

مجھے بتائی بھی جاتی نہیں خطا میری
مجھی سے پوچھ رہے ہیں مگر سزا میری

شب فراق کے صدمے سہے نہیں جاتے
الٰہی آج کہاں مر رہی قضا میری

ستم یہ ہے کہ ستم بھی وہ اب نہیں کرتے
سمجھ گئے ہیں پسند اس کو ہے جفا میری

کسی کے سامنے کیوں جاؤں التجا لے کر
ظریف کیا نہ سنے گا مرا خدا میری

نہ کہئے حسیں کوئی ہمسا نہیں ہے
خدا کی خدائی میں کیا کیا نہیں ہے

نہ جھک جھک کے منہ نزع میں میرا دیکھو
نکلتا ہے دم کچھ تماشا نہیں ہے

ترا تیر کیوں چھپ کے بیٹھا ہے دل میں
اگر یہ ہماری تمنّا نہیں ہے

تپ غم جو نکلے تو کس طرح نکلے
مرا دم عدو کی تمنّا نہیں ہے

ظریف ایک ہی زندہ دل آدمی ہے
کبھی تم نے کیا اسکو دیکھا نہیں ہے

ظریف

ظریف:۔ سید ظریف حسن ساکن قصبہ تیتہ ضلع مظفر نگر تلمیذ نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی۔ جوان طبع۔ رنگین فکر۔ خوش بیان ہیں۔ غزل میں عاشقانہ راز و نیاز کو صفائی سے نظم کرتے ہیں۔ بندشیں سادہ اور مزیدار ہوتی ہیں۔ طبیعت کی شوخی خداداد ہے۔ قدیم و جدید طرز دونوں میں فکر کی جولانی دکھاتے ہیں۔ زبان پر زیادہ زور ہے۔ راقم تذکرہ کو جو کلام ملا اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

ہمارا حال کہہ دینا نواسنجانِ گلشن سے
گلستاں کی طرف صیاد تیرا ہو اگر جانا

غضب ہے یوں کسی جانباز کو دادِ وفا دینا
نگاہیں چار کرنا زیرِ لب پھر مسکرا دینا

لبِ خاموش سے یہ ہر حبابِ بحر کہتا ہے
حیاتِ جاوداں ہے اپنی ہستی کا مٹا دینا

دمِ نزع ہمیں نہ دیکھ آئینہ تو پچھتائیگا ورنہ
کہ اس کم بخت کو آتا ہے دیوانہ بنا دینا

سنبھل کر بیٹھنا او سنگدل ہوشیار ہو جانا
مری آہوں کو آتا ہے جگر کے پار ہو جانا

جگر کو تاکنا وہ ان کا نیچی نیچی نظروں سے
نگاہِ ناز کا وہ میرے دل کے پار ہو جانا

وہ مرے دل میں رہا میری تمنا بن کر
رہ گیا ٹوٹ کے سینے میں جو پیکاں تیرا

برق گرتی ہے وہیں سارے چمن کو چھوڑ کر
جس شجر پر دیکھتی ہے آشیانِ عندلیب

غم غلط ہوتا ہے مل جاتے ہیں جب کچھ ہم خیال
دل بہل جاتا ہے دیوانوں کی محفل دیکھ کر

جس قدر تڑپا کئے اے درد تو تڑپائے جا
لطف ان کو آ رہا ہے رقصِ بسمل دیکھ کر

سامنے آنکھوں کے پھر جاتی ہے زلفِ شمع رو
دل میں اٹھتا ہے دھواں دودِ چراغاں دیکھ کر

دیکھ کر حشر کے آثار ترے کوچے میں
جمع ہیں طالبِ دیدار ترے کوچے میں

آسماں بن کے ہمیں آنکھ دکھاتی ہے زمیں
ذرہ ذرہ ہے دل آزار ترے کوچے میں

جب کیا چاک گریباں نے سرِ تسلیم خم
ہم بغل اٹھ کر مرے دامن کی کلیاں ہوگئیں

دل اچکتی پھرتی ہیں انکی ادائیں خلق کے
شوخیاں آنکھوں کی بدنامی کا ساماں ہوگئیں

میری پیشانی میں جتنی تھیں لکیریں اے ظریف
رفتہ رفتہ جزوِ سنگِ بابِ جاناں ہوگئیں

آپ کا میرا کہیں ذکر جب آجاتا ہے
جان کو جان نہ سمجھا ہے نہ سمجھیں بخدا

بنکر حسین اسکی بھی مشکل میں جان ہے
یہ کون آج آگیا رندوں کے بھیس میں

زخمی اگر نہ کردے ترے دل کو تو سہی

چھپڑا کر مجھ کو ان کے آستاں سے
ہماری جان کے دشمن ہیں دونوں

حسرتیں پوری کرو دونوں کی اس تدبیر سے
جاننے والے بھی اب مجھکو نہیں پہچانتے

یقیں ہے کہ منہ چوم لو آپ اپنا
پھر ذرا کہنا یونہی اے کہنے والے پیار سے

عشق کی نعمت عطا ہوتی ہے اہلِ ظرف کو
نزاکت کی یہی تعریف ہوتی ہوگی دنیا میں

مری بیہوشیوں کا ذکر جب آیا تو فرمایا
ابرو تنے ہوئے ہیں نظر ہے پھری ہوئی

جس نے جلا جلا کے مجھے خاک کر دیا
بلبلوں کے وجد پر کیوں ہو نہ حیرانی مجھے

وہ چھیڑتے ہیں مرے زخم دلکو ہنس ہنس کر
وہ کر رہے ہیں مری وحشتوں کا نظارہ

ٹھہر اے دردا ابھی اٹھکر تڑپا سانس لینے دے
یہ کیسا انقلاب آیا خرابات محبت میں

لوگ ہاتھ کونسی جگہ تھام لیا کرتے ہیں
بات پر مرتے ہیں ہم آن پہ دم دیتے ہیں

ہر شخص کی زبان پہ ہے ظالم ادھر تو دیکھ
اے پیر مَے فروش اٹھا کر نظر تو دیکھ

آئنہ رکھ کے سامنے اپنی نظر تو دیکھ

مری قسمت کہاں لائی کہاں سے
زمیں بھی کم نہیں ہے آسماں سے

دل کو چھیدو تیر سے کاٹو گلا شمشیر سے
میری صورت کو ملاتے ہیں مری تصویر سے

جو تصویر تم کو دکھائیں تمہاری
دور ہی رہنا ہمارے سایہ دیوار سے

یہ وہ سودا ہے جو مل سکتا نہیں بازار سے
عدو کا ہاتھ ہوتا ہے تمہارا دوش ہوتا ہے

ہمیں معلوم ہے وہ جس لئے بیہوش ہوتا ہے
کیا پھر بگڑ گئی مری قسمت بنی ہوئی

وہ کیا بجھائے گا مرے دل کی لگی ہوئی
جب نظر آئے گلوں کی چاک دامانی مجھے

زہے نصیب جو یہ چھیڑ آئے راس مجھے
بنا رہے ہیں تماشا مرے حواس مجھے

دل بیتاب کو پھر بے قرار آیا ہے مشکل سے
نہ ساغر ہے نہ شیشہ ہے نہ ساقی ہے نہ محفل ہے

قطعات

ظریف اس نے یہ جب پوچھا ہیں پالیسی کے کیا معنی
غرض ہے جس سے کرنا ان کی بیجا نازبرداری
کہا میں نے گلا کمزور لوگوں کا دبا دینا
جو ہوں آفت رسیدہ خاک میں ان کو ملا دینا

چھائی ہوئی ہیں آفتیں خلقت کی جان پر
افلاس و قحط و بغض و نفاق و حسد ظریف
ہر وقت ہائے ہائے ہے سب کی زبان پر
نازل خدا کا قہر ہے ہندوستان پر

یہ ارادہ ہے ہمارا اے ظریف
لائیں ہم رنگیں بنا کر قوم کو
کچھ دنوں چل کر رہیں پردیس میں
بھیک مانگیں لیڈری کے بھیس میں

مخمس بر غزل خود

دخل دینا تیری قدرت میں مری منشا نہیں
مدعا اس خلق کا کچھ ذہن میں آتا نہیں
صرف اتنا پوچھنا ہے اور کچھ کہنا نہیں
عزت ملکی و قومی کی جنہیں پروا نہیں
اے مرے خالق انہیں کس واسطے پیدا کیا

رخ پہ زردی چھا گئی رنگ اس کا فق سا ہو گیا
ظلم اس نے کیا کئے تھے اور ستم کیا کیا ہوا
مجھ سے جب پوچھا گیا اے کشتۂ جور و جفا
حشر کے دن داورِ محشر سے یہ کہنا پڑا
جو ہوا اچھا ہوا جو کچھ کیا اچھا کیا

اُمرا کی حالت

بوئے نخوت سے دماغ اہل دولت ہے خراب
قوم کو ٹھکرا رہے ہیں کیسے کیسے انقلاب
کج روی کج خلقیاں کج رائیاں ہیں ہمرکاب
لیکن آنکھیں نم نہیں نہ آنسو ہیں نہ دل میں اضطراب
فکر عقبیٰ ہے نہ کچھ ملت کا اپنی ہوش ہے
کم سے کم ہیں ہستیاں وہ جن کے دل میں جوش ہے

چونکہ ان کا نفس ان کے قلب پر ہے حکمراں
مفلسوں سے بات کرنی جانتے ہیں کسر شان
اسلئے وہ بن نہیں سکتے معین بیکساں
چاک کر دیتے ہیں پڑھ کر بیکسوں کی عرضیاں

کس طرح پائیں نکالیں خستہ حالوں کے لئے
وقف ہیں ان کے نخرا اپنے منہ جمالوں کے لئے

علمائے قوم

ان کے کانوں تک اگر پہنچادے کوئی یہ خبر
باچھیں کھل جاتی ہیں سنکر مژدۂ فرحت اثر

آرہے ہیں تم سے ملنے کیلئے کچھ اہلِ زر
پیشوائی ان کی خود کرتے ہیں آ کر تا بہ در

وقعت و عزّت سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں انہیں
بے تکلّف اپنی مسند پر بٹھاتے ہیں انہیں

جائے گر انکی زیارت کے لئے کوئی غریب
پا نہیں سکتا جگہ وہ ان کے پہلو کے قریب

خوش نہیں ہوتا کبھی ہو کر مشرف بدنصیب
صورتیں دھوکے کی ٹٹّی سیرتیں بیحد مہیب

غنچہ دل جیب خالی دیکھ کر کھلتے نہیں
مفلسوں سے ہم بغل ہو کر کبھی ملتے نہیں

ظریف۔ سید مقبول حسین لکھنوی۔ تلمیذ و برادر خورد جناب صفی لکھنوی۔ پختہ عمر و پختہ مشق شاعر ہیں۔ اکثر لمبی لمبی نظمیں مزاحیہ رنگ میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ آجکل ریاست محمود آباد میں مقیم ہیں۔ وہیں تعلق ملازمت ہو گا۔ کئی بار لکھنے کے باوجود ذاتی حالات اور کلام بھیجنے سے آپ نے احتراز مناسب سمجھا۔ ایک نظم شعر آشوب سے چند بند یہاں دئیے جاتے ہیں۔

تجھ میں اے ہندوستاں کچھ آجکل حد سے سوا
اس مرض میں اب نوّاسی فیصدی ہیں مبتلا

چارسُو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
مستند شاعر ہے جس نے اک تخلّص رکھ لیا

شاعری گو عہد ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آگئی جانِ علوم

پیسے والے کی سمجھ میں آگئی ہے اب یہ بات
صرف بیجا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات

جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں پر یا برات
منعقد بزمِ سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات
پہلے اربابِ نشاط آتے تھے گانے کیلئے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کیلئے

گو کہ شاعر اور مغنّی میں تھا فطری ساز باز
پر جدا رکھتا تھا ان دونوں کو فنی امتیاز
تھا گلے پر اس کو اور اُس کو زبان پر اپنی ناز
محفلیں دونوں الگ تھیں اور جداگانہ تھے ساز
تھا جہاں نغمہ محل باتیں بنانے کا نہ تھا
بزمِ شعر و شاعری میں دخل گانے کا نہ تھا

کرتا تھا جذبات کی لفظوں سے یوں صورتگری
جس کی کر سکتا نہ تھا کوئی مصوّر ہمسری
نغمہ سنجی کی مدد سے فکر تھی جس کی بری
اب اسی کی شعر خوانی میں ہے رنگِ ابتری
یہ نمک پاشی ہے لے بیدرد و لگے گھاؤ میں
شاعری صورت دکھائے ارتھ میں اور بھاؤ میں

یاد ایام کہ شاعر کو زبان پر ناز تھا
قوّتِ تخئیل ہی سرمایۂ اعزاز تھا
لفظ ہی میں سوز تھا اور لفظ ہی میں ساز تھا
نغمۂ شاعر کا روح القدس ہم آواز تھا
اب اگر قابو ہوا ان پر تو ملے شاعر کو داد
سُر، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم اور دھیوت نکھاد

جب سخن سنجوں میں کثرت ہوا انہیں اصحاب کی
محض نغمے ہی کو جو سمجھیں کمال شاعری
قلب پر جنکے اثر کرتی ہو تان اور گٹکری
سوز سے ناآشنا دلدادۂ خنیا گری
اُٹھتے ہیں بیچین جو لَے کیلئے، دُھن کے لئے
بھیرویں سے وقف کی ہے اب غزل اُنکے لئے

مٹ گیا تانیث اور تذکیر کا سب امتیاز
اب نہ ڈاڑھی ہے نہ مونچھیں اور نہ وہ زلف دراز
رفتہ رفتہ بڑھ گیا گر شوقِ نغمہ ذوقِ ساز
شاعر اب آئینگے محفل میں پہن کر پیشواز

ختم اب اس فقرہ پہ ہوگی ہر غزل اُستاد کی
سنیئے میں ہوں جانکی بائی الہ آباد کی

ظفر

ظفر:۔ نواب سیّد محمد ظفر حسن خاں صاحب تعلقہ دار رسول پور خلف مہدی حسن خاں شاداب تلمیذ حضرت حفیظ جونپوری۔ کلام سے مشاقی پائی جاتی ہے۔

کسی حسین کو کسی پر جو مہرباں دیکھا
جو کہتے خاک ہوا جل کے دل تو کہتے ہیں

نظر اُٹھا کے ظفر سوئے آسماں دیکھا
اُڑی نہ خاک نہ اُٹھتا ہوا دھؤاں دیکھا

فدا ہے جان مری امتیاز قاتل پر
اُسی کو ذبح کیا جس کو نیم جاں دیکھا

اچھی صورت کا ازل ہی سے فدا ہے یہ دل
اپنے ہمراہ یہی حسن عمل جائے گا

یہ کہکے کوئی اور بھی بیخود بنا گیا
لو پھر کسی حسین پہ دل اُن کا آگیا

وہ حسن دلفریب وہ بوٹا سا قد ترا
یہ دل میں کھب گیا وہ نظر میں سما گیا

مہمان اس طرح کے نہ ہونگے جہان میں
غم آپ کا ظفر کے کلیجے کو کھا گیا

ظفر وہ بڑا بول پھر بولئے گا
مرے دل پہ قابو نہ ہوگا کسی کا

یہاں تو گلہ ہے مقدر کا اپنے
شکایت کسی کی نہ شکوہ کسی کا

تڑپنے والے دو ہی ہیں جہاں میں
زمیں پر ہم ہیں بجلی آسماں پہ

ہنس ہنس کے آپ گریۂ بے اختیار پہ
بجلی گرا رہے ہیں دل بیقرار پہ

تم تو بنے شباب میں گلدستہ حسن کا
جوبن ابھار پہ ہے جوانی بہار پہ

میں نے تمام خلق کو عاشق بنا دیا
سب چاہتے ہیں تم کو مرے اعتبار پہ

زہر کے گھونٹ سے کچھ کم نہیں آنسو پینا
قطرۂ اشک کو ہیرے کی کنی کہتے ہیں

چار میں چھیڑ کے قصّہ مرا چٹکی لینا
اور کس بات کو پھر طعنہ زنی کہتے ہیں

آشنا۔ آشنا ہیں مطلب کے
سچ ہے کوئی کسی کا یار نہیں

چاہیئے رسم محبّت کا نباہ
چار دن کی مہربانی کچھ نہیں

دیکھئے کثرت میں وحدت کا ظہور　　چھپنے والی اس کی یکتائی نہیں

جام خالی مے صراحی میں نہیں　　ساقیا بس زندگانی ہو چکی

ہوئے خوش جو وہ دیکھکر چاندنی　　بچھی جاتی ہے بام پر چاندنی

جہاں تم وہیں جلوۂ حسن ہے　　ادھر چاند نکلا ادھر چاندنی

تڑپتی ہے سو رو کے یہ برق تاباں　　کہ چمکاتی پھرتی ہے تلوار بدلی

سر بام کھولے نہ ہوں اس نے گیسو　　جھکی پڑتی ہے سوئے کہسار بدلی

ہوا پر اڑیں زلفیں بکھرا کے پریاں　　کہ منڈلاتی ہے یہ دھواں دھار بدلی

گلابی شلوکا بسنتی دوپٹا　　یہ پوشاک تم نے طرحدار بدلی

یہ چالیس ریاکاریوں کی جو آئیں　　ظفر تم نے زاہد سے دستار بدلی

ہمیں اپنی تصویر ہی بھیجدو　　تسلی کی کوئی تو صورت رہے

آنکھ ملتے ہی حسینوں سے یہ کیا ہوتا ہے　　دل سا ہمدرد ہمیشہ کو جدا ہوتا ہے

اثر ظل ہما سایۂ دیوار میں ہے　　صاحب تاج ترے در کا گدا ہوتا ہے

دم رخصت نہ مری بات بھی پوچھی تم نے　　دوست سے دوست گلے ملکے جدا ہوتا ہے

دیکھئے ہو گئی آنکھوں کی حیا بھی رخصت　　سامنے میرے رقیبوں کا گلہ ہوتا ہے

دل کو سمجھاؤ ظفر جان کی اب خیر نہیں　　عشق کا روگ مری جان برا ہوتا ہے

دل کے آتے ہی محبت نے کہا　　زندگی سے ہاتھ اٹھانا چاہئے

تیغ قاتل دیکھ کر کہتا ہے شوق　　اب گلے اس کو لگانا چاہئے

ظفر

ظفر: مظفر پوری آپ کا نام وغیرہ نہ معلوم ہو سکا۔ رسالۂ فتنہ سے اشعار ذیل نقل کئے جاتے ہیں جنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موزوں طبع خوش فکر ہیں۔

تم کو لہو رلائے پہروں مری کہانی　　لیکن ہے شرط اتنی سن لو مری زبانی

غنچوں کا یہ ابھرنا یہ سرو کا اکڑنا　　گلشن ہے یا کسی کی اٹھتی ہوئی جوانی

شیشے میں جو پری تھی دل میں اُتر گئی ہے	آنکھوں میں کھُب گیا ہے وہ رنگ ارغوانی
جلتے ہیں داغ دل میں سب آپکے دئے ہیں	پہلے کے تحفے کچھ ہیں کچھ اب کی ہے نشانی

ظفر :- بھیم سین صاحب۔ بزرگوں کا وطن انبالہ تھا۔ مگر آپ کے دادا ملتان میں قیام پذیر ہوئے۔ بھیم سین صاحب یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم پائی۔ تعلیم حسب دلخواہ نہ ہوسکی کیونکہ بچپن ہی میں والد (لالہ ایشر داس) کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مگر تعلیم کا شوق ہے اس لئے انٹرنس اور ادیب عالم کے امتحانات پاس کئے۔ اس سال (۱۹۲۳ء) ایف۔اے کے امتحان میں شریک ہوئے ہیں۔ ابھی ابتدائی مشق ہے۔ غزل کے مقابلہ میں نظم سے زیادہ دلچسپی ہے کلام یہ ہے۔

عشق میں نیستی بھی ہستی ہے	کون کہتا ہے مرگیا ہوں میں
عمر اپنی کوچۂ جاناں میں چل پھر کر گزار	رہگذار عشق ہے دُنیا کوئی منزل نہیں
آج صہبا کی مذمت ہے زبان شیخ پر	مے فروش حسن شاید زینتِ محفل نہیں
مرا معبود نہیں بت مرا مسجود نہیں	دل کے بہلانے کو تصویر بنا رکھی ہے
یہی وعدہ تھا ترا کیا یہ مناسب تھا تجھے	تو نے کیوں اتنی جفا ہم پہ روا رکھی ہے
مقید رہ کے جینے کا مزہ کیا	مٹا دے یا ہمیں آزاد کر دے

ظفر :- شیخ ظفر علی۔ ان کا بھی کچھ حال دریافت نہ ہوسکا۔ کلام مندرجہ ذیل سے کہنہ مشقی اور طبیعت داری کا ثبوت ملتا ہے۔

صحرا میں کیسے کیسے بڑھاتے ہیں خار ہاتھ	جوش جنوں میں ایک ہے دامن ہزار ہاتھ
منت کروں میں پاؤں پڑوں بوسہ اسکے لوں	آئے جو ایکدن وہ تغافل شعار ہاتھ
فصل بہار آتے ہی جوشِ جنوں ہوا	دامان و جیب کرنے لگے تار تار ہاتھ
ہے معرکہ سخن کا مرے ہاتھ اے ظفر	نامہ ملا کہ آئی مرے ذوالفقار ہاتھ

ظفر :- حضرت ظلّ سبحانی مرزا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ دہلی انار اللہ

ظفر

برہانہٗ و نور مرقدہٗ ابن سلطان عالم پناہ محمد اکبر شاہ ثانی فردوس آرام گاہ من اولاد حضرت امیر تیمور گورگاں عرش آشیاں۔ آپ کو زمانۂ ولی عہدی میں شاہ نصیر مرحوم سے تلمذ تھا۔ جب شاہ صاحب دکن چلے گئے۔ تو خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی مرحوم کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ شعر و سخن کے عاشقِ شیدا تھے۔ اپنے تخلص کی رعایت سے ملک شہرت کو تسخیر کیا۔ آپ کے دربار میں بڑے بڑے اساتذہ اور کہنہ مشق شاعر حاضر رہتے تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ حافظ عبدالرحمان خاں احسان۔ برہان الدین خاں زار۔ میر غالب علی خاں سید۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگرد میر تقی میر۔ مرزا اعظم بیگ عظیم۔ شاگرد مرزا سودا۔ میر قمر الدین منت ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ۔ یہ اساتذہ اپنا کلام سناتے۔ انہیں اساتذہ کے فیضِ صحبت اور خاقانی ہند کے فیضِ تلمذ نے حضرت ظلّ سبحانی فردوس آرامگاہ کی طبیعت میں سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ محاورہ بندی اور معاملہ نویسی پر کامل قدرت ہوگئی ہر قسم کے خیالات کو جس پیرایہ میں چاہتے نظم کر جاتے۔ جو کچھ کہتے سامعین کے دلوں میں تیر و نشتر کی طرح کھٹک جاتا تھا۔ خزائن دولت کی طرح برجستہ الفاظ کے گنج گراں مایہ ان کے سامنے ہر وقت موجود تھے۔ جس لفظ کو جہاں سجتا دیکھتے وہیں جڑ دیتے۔ مضامین کی باریکی کو لطافت کا جامہ پہناتے تھے۔ روشن خیالی اور صفائی ذہن کا یہ عالم تھا کہ نازک سی نازک تخئیل کو روزمرّہ اور محاورہ کے ساتھ ترکیب دیکر آئینہ کے مانند اہل بینش کے روبرو پیش کر دیتے تھے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

واہ تم صبح کو بھلے آئے دن چڑھے کہہ کے دن ڈھلے آئے

خداداد چستی اور بے مثال بندش نے جو لطف دکھایا ہے۔ اُسے کچھ مذاقِ سلیم رکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تو روزمرّہ تھا۔ اب استعارہ اور تشبیہ ملاحظہ فرمائیے۔

مِرے مژگاں سے آنسو اسطرح برسوں برستے ہیں کہ جوں برسات کے موسم میں مینہ چھاجوں برستے ہیں

نازک خیالی اور ادائے مضمون میں بول چال کا لحاظ رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے
منہ چھپا جوں بیٹھتے ہیں، پورا محاورہ نظم کر دینا اور آنسوؤں کی روانی کے سامنے بارش
کو شرمانا سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے۔ یہی قدرتی رنگ ہے،
جو ظفرؔ کے کلام پر میر تقی میر کا پرتو ڈالتا ہے۔ مگر مولانا آزاد مؤلف تذکرۂ آب حیات،
اُستاد پرستی کے والہانہ جوش میں لکھ گئے ہیں۔ ظفرؔ کا جو کچھ کلام ہے۔ وہ سب
حضرت ذوق کے فکر سخن کا نتیجہ ہے۔ دُنیائے اُردو اس بیجا ادّعا کو نامعتبر قرار دے کر
اس کی تردید کر چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا کافی ہوگا۔ کہ حضرت ذوق کے کلام کا جو
رنگ ہے۔ اُس سے ظفرؔ کا کلام بالکل الگ ہے۔ اگر یہ امر بھی تسلیم کر لیا جائے کہ
جناب ذوق نے طبع زاد کلام میں بہت کچھ استادانہ تصرف کیا ہے۔ تو اس سے
یہ نہیں لازم آتا کہ تمام و کمال ظفرؔ کا کلام ذوقؔ کے نام سے منسوب کر دیا جائے۔
اس کے علاوہ پنجابی اور ہندی میں بادشاہ مرحوم نے جو کچھ کہا اگر اسی پر نظر رکھیں
تو ظلِّ سبحانی کا پورا شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے ہندی میں شوخ رنگ تخلص لاتے تھے

حضرت فردوس آرام گاہ نے ۹۰ برس کی عمر پا کر ۱۲۹۹ھ میں بمقام رنگون انتقال
فرمایا اور وہیں کی خاک میں آسودہ ہیں آپ کی تصنیفات سے چار دیوان مطبوعہ
موجود ہیں جن میں ہر رنگ کا کلام پایا جاتا ہے۔ زبان اور مضمون کے بہترین شعر ملتے
ہیں۔ اکثر سنگلاخ زمینوں میں مضامین تازہ کے وہ پھول کھلائے ہیں۔ کہ شاہ نصیر
کی روح بھی خُلد میں وجد کرتی ہوگی۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کوئی صنم اُسے سمجھا کوئی خدا سمجھا	نہ سمجھے ہم کہ وہ کیا سمجھا اور کیا سمجھا
غم جدائی میں موت اس کو عین صحت ہے	مریض ہجر ترا زہر کو دوا سمجھا
شعلہ خو اک بات تو میری نہ آ کر سُن گیا	تیری باتوں سے کلیجہ جل گیا دل بھُن گیا
غلط ہے جو کہے یہ چُپکے رہنا کچھ نہیں اچھا	نہ کہنے میں مزا ہو منہ سے کہنا کچھ نہیں اچھا

باز آ اس خوں فشانی سے کہیں اے چشم تر
دیکھ میرا رازِ دل سب پر عیاں ہو جائیگا

نصیب ہوتے بھلے اپنے گر محبت میں
تو بد معاملہ سے کیوں معاملہ پڑتا

رفیق راہِ محبت کدھر گئے یارب
کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا

دل کو بوسہ پہ سمجھ تو نہ مری جاں مہنگا
مال اس مول نہیں یہ کسی عنواں مہنگا

عدو سے کچھ کہا اور مجھ سے آکر کچھ کہا تم نے
نہ کیونکر فرق دلمیں تمنکے ایسی بات پڑ جاتا

نرگس کی روش ہم نے ظفر آنکھ جو کھولی
اس گل کے سوا گلشن ہستی میں نہ سوجھا

شرار نالہ دل سے ستارونکی ہے یہ کثرت
کہ تل دھرنے کو خالی آسماں پایا نہیں جاتا

کدورت دل میں ہے ظاہر صفائی گر ہوئی تو کیا
ملاپ اُن سے ہوا تو کیا جدائی گر ہوئی تو کیا

نہیں پرواز کی صیاد بال و پر میں جب طاقت
قفس سے ہم اسیروں کی رہائی گر ہوتی تو کیا

کچھ ادا ایسا کیا حسن کی دولت نے اسے
بولتا ہی نہیں وہ شوخِ خود آرا سیدھا

جان بھی لیگا وہ بت کافر میں نے اب یہ جان لیا
چھوڑا اس نے پاس مرے کیا دین لیا ایمان لیا

دل نہیں مانتا میرا ناصح یہ مانے تو کام چلے
تو نے جو کچھ مجھ سے کہا سب سچ ہے وہ میں نے مان لیا

سوئے عدم ہستی سے چلا ہے بے سر و ساماں خالی ہاتھ
ہائے مسافر ساتھ سفر کا تو نے نہ کچھ ساماں لیا

دیکھ پھر آخر خزاں ہے کوئی دن ہے یہ بہار
اس چمن میں آشیاں اپنا نہ اے بلبل بنا

نہیں یہ سوز محبت نے ہم کو داغ دیا
ہمارے خانۂ دل کے لئے چراغ دیا

لب میگوں کے ترے لیگا بوسے گر لب ساغر
تو میں اے بادہ کش بوسے ترے ساغر کے لے لونگا

جو اس چشم مست کے مست ہیں نہیں ہے کچھ انکو ہوش ساقی
کہ جام کیسا شراب کیسی نشہ ہے کیسا خمار کیسا

نے دل رکھا نہ جاں رکھی میں نے عشق میں
جو کچھ کہ اے ظفر تھا مرے پاس کھو دیا

ہم نے کل ایک عجب آفت جاں دیکھا تھا
پر نہیں یاد ہمیں ہے کہ کہاں دیکھا تھا

دل کو کریگا خوب یہ دیوانہ پن خراب
اس کے ابھی سے ڈھنگ برے ہیں چلن خراب

جو یہ سمجھے کہ ملتا ہے وہی جو کچھ ہے قسمت میں
ہزاروں کو ظفر پھر بیش و کم سے کیا مطلب

یوں جو مل بیٹھے تو کیا ہے دل لگی کا جب مزا
دونوں ہم تم ایک دل ہوں دل کا ہو دل سے ملاپ

وہ کھا گئے سو بار مرے آگے قسم جھوٹ
اور پھر ہے یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹ

پھیر لی اس نے مجھے دیکھ کے چتون سچ مچ
ہو گیا پھر کے وہ مجھ سے مرا دشمن سچ مچ

زلف سیہ کی تیری لٹک لے شوخ پری رخسار ہے اور
یہ تو بلا کچھ اور ہے کافر یہ تو کچھ اسرار ہے اور
عشق ہے شاہنشاہ ظفر تم اس کے درگہ عالی میں
جاتے ہو تو ادب سے جاؤ دیکھو وہ دربار ہے اور

جس وقت ہوئے اشک فشاں دیدۂ تر اور
دل اپنا جلا اور بڑھا سوز جگر اور

کھلتا نہیں ہے حال کسی پر کہے بغیر
پر دل کی جان لیتے ہیں دلبر کہے بغیر

کچھ چشم تر و سوز جگر پہ نہیں موقوف
افشائے محبت کے بہت سے ہیں نشان اور

تو گھر کو سدھار اپنے خدا کے لئے ناصح
ہوتا تری باتوں سے ہے مجھ کو خفقان اور

کچھ لطف زندگی کا اگر ہے اسی میں ہے
ہے یہ جو دوستوں کی ملاقات چند روز

کس کس ادا سے دیکھے ہے منہ سے ملا کے منہ
وہ آئینہ میں اپنا اور اپنے ظفر کا عکس

رکھدو پیالہ جلنی کہ پیتے تھے روز مے
ہم آج پی گئے ظفر اس سے دو چند۔ بس

ہم چمن میں کر رہے ہیں آشیاں اپنا درست
کرتا ہے صیاد فکر دام و تدبیر قفس

نہ ہو کیوں مجھے بزم عشرت میں گردش
کہ جوں ساغر مے ہے قسمت میں گردش

بگولے کی مانند مجھ کو ہمیشہ
لئے پھرتی ہے دشت وحشت میں گردش

دلوا دے یاد کوئی انہیں یاد کر کے خط
تکیہ تلے وہ بھول گئے میرا دھر کے خط

سرشک دیدہ میں خوں ہو کے بہہ گئے ایسے
ملا نہ سینے میں میرے دل و جگر کا سراغ

بات سن پائیں گر مروڑ کی ایک
کہدیں لاکھوں میں ہم کروڑ کی ایک

روؤں اتنا کہ ڈوب جائے جہاں
اب تو یہ بات ہے نچوڑ کی ایک

دل ہزاروں کے ٹوٹ جائیں ظفر
بات کہدیں وہ ایسے توڑ کی ایک

رہی نہ کوئی نشانی پر اس کا داغ فراق
ہمارے پاس رہا یادگار برسوں تک

جیسی ہے عشق کی میرے دل بیتاب میں آگ
یوں کوئی بھر تو سکے ساغر سیماب میں آگ

لخت دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں
کیا تماشا ہے کہ یاں بہتی ہی سیلاب میں آگ

آگے تو ہم سے اسقدر رکھتا نہ کبھو الگ الگ
اب ہوئی ایسی کیا خطا رہتا ہے تو الگ الگ

رکھا جب پائے حنائی اس نے اپنا فرش پر
بس گئے عطر حنا میں سربسر قالیں کے پھول

داغ حسرت کیوں نہ پھولوں کی جگہ ہوں بعد مرگ
بیکسی کرتی ہے تیرے عاشق مسکیں کے پھول

جوں بوئے گل رفیق نسیم چمن ہیں ہم
اے ہمدمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

دل کی تپش سے شعلہ فانوس کی طرح
بیتاب بعد مرگ بھی زیر کفن ہیں ہم

گر زمیں پر ہے گئے تو آسماں پر مثل برق
ڈرتے ہیں اے شوخ آتش خو تری چھل بل سے ہم

وصل کی بس کر چکے تدبیر ہم
ہو گئے ناچار اے تقدیر ہم

پڑ گئی الفت کی بیڑی پاؤں میں
ہیں ہمیشہ پائے در زنجیر ہم

بعد مجنوں عشق بازوں میں ظفر
رکھتے ہیں تھوڑی سی کچھ توقیر ہم

سوا اس دل کے اپنے بس میں آئے کب کسی کے ہیں
اگر قابو میں ہیں تو ہم اسیکے ہیں اسی کے ہیں

کیونکہ آگاہ ترے طرز ستم سے ہو جائیں
جب تلک تیرے ستم دیدہ نہ ہم سے ہو جائیں

کس زلف کے سودے کی ہے تاثیر ہوا میں
ہے موج دخاں صورت زنجیر ہوا میں

خدا جانے کہ سینے میں مرے کیا رنگ ہے دل کا
نظر آتی ہے کچھ آمیزش خوں آج آنسو میں

نہ جانا چاہئے کوچے میں اسکے سچ کہا تو نے
پر اے غمخوار کیا کیجے نہیں دل اپنے قابو میں

پہنچیں گے کیونکہ چمن تک ہم قفس سے چھوٹ کر
طاقت پرواز اپنے بال و پر میں کچھ نہیں

کر چکے ہم اشک باری عشق میں پہلے ظفر
اب تو بجز خون جگر اس چشم تر میں کچھ نہیں

ناصح نصیحتیں تری ہم سن چکے بہت
خاموش ہو کہ اب نہیں طاقت دماغ میں

نہ آؤ گھر نہیں آتے مگر جواب تو دو
تمہارے در پہ کھڑے کب سے ہم پکارتے ہیں

میں نہیں اس میکدے میں آج کل سے مست ہوں
مے پرستِ عشق ہوں روزِ ازل سے مست ہوں

کوئی آئینہ دل کا نہیں کہ جہاں رُخِ یار کی جلوہ نمائی نہیں
یہ قصور ہے اپنی نظر کا فقط کہ جو دیتا ہم کو دکھائی نہیں

تری زلف دوتا نپٹ ہوش ربا وہ ہے دام بلا کہ بچائے خدا
کہ جو اس میں پھنسا وہ پھنسا ہی رہا کبھی اسکی امید رہائی نہیں

کہا میں نے جو اس سے کہ اسکو بجھا جو یہ دل میں گیا ہے تو آگ لگا
تو یہ سُن کے وہ ناز سے کہنے لگا مجھے آتی لگائی بجھائی نہیں

اے جنوں کیونکر اُتار اپنی تجھے پوشاک دوں
ہے لباس خاک تن پر جو تجھے میں کیا خاک دوں

مرد نیکوکار کو دُنیا سے آمیزش ہو کیا
اے ظفر یہ پاک جوہر اور وہ ناپاک دوں

ظفر وہ قہر وہ آفت ہے گردش میرے طالع کی
کہ ہے باعث سے جس کے آسماں دن رات چکر میں

یوں آنسوؤں کیساتھ پیا ہم نے خونِ دل
جیسے ملا کے پیتے ہیں پانی شراب میں

منّت کشِ اجل نہ ہوئے ہم کہ ہو لیا
کام اپنا ایک تیری نگاہ عتاب میں

کہے جو عدو سچ نہ جانا کرو
بُرا مانتے ہو تو مانا کرو

جانتے ہو تو اک بوسہ تم دے کے چلے جاؤ
آسان نہیں یوں ہی دل لیکے چلے جاؤ

لڑیں کیا زمانے سے کشتی کہ اس نے
پچھاڑے بہت پہلواں اچھے اچھے

اثر کیا خاک ہے گریہ میں تیرے ڈوب مر شبنم
کہ گل ہنستا ہے تجھ پر اور غنچہ مسکراتا ہے

وہ آئے یا نہ آئے پر دل بیتاب کو اپنے
تسلّی ہیں یہ دیتا ہوں اب آتا ہے اب آتا ہے

کہاں تک رو رہیگا اے دیدۂ تر روک اشکوں کو
ہماری آبرو کو خاک میں تو کیوں ملاتا ہے

نہ ہو ہم سے پر ہم کہ زلفوں کو تیری
صبا چھیڑتی ہے خطا وار وہ ہے

انتخاب از دیوان چہارم

موت آئی گر مریض ہجر کو اچھا ہوا — مر گیا کیوں اسکو کہتے ہو کہو اچھا ہوا

فلک پہ داغ دل کا رشک سے ماہ مبیں دیکھا — رخ روشن پہ کسکے اس نے خال عنبریں دیکھا

لب شیریں سے اسکے ہم جواب تلخ سنتے ہیں — مزہ دیکھو کہ زہر آلود ہم نے انگبیں دیکھا

دل گرفتہ ہی برنگ غنچہ رہنا خوب ہے — ہنس کے پایا گل نے کیا گلزار ہستی میں مزا

جو آیا دل میں اسکے صاف منہ پر کہدیا اس نے — نہیں آئینے سے کوئی زیادہ باصفا دیکھا

ظفر کی سیر اس گلشن کی ہم نے پر کسی گل میں — نہ کچھ الفت کی بو پائی نہ کچھ رنگ وفا دیکھا

جوگی بنا پھرے ہے اس ماہ وش کے غم میں — خورشید بھی بڑھا کر سر کی جٹا فلک پر

وہ حسن روز افزوں بڑھتا رہا ہمیشہ — سو بار نور مہ کا بڑھ کر گھٹا فلک پر

دی ناز سے جو اس نے مژگاں کو اپنی خلش — سو سو ڈبوئے نشتر ایک ایک نس کے اندر

نہیں ستارے کسی دل جلے نے گردوں پہ — تفنگ آہ میں مارا ہے بھر کے چھرا صاف

جو تیرے قد سے ہو ہمسر تو سرو کے سر پہ — چمن میں شہپر قمری ہو تکل۔ اڑا صاف

بے آرزو نہیں ہے یہاں کوئی دل مگر — ہر ایک دل الگ ہے ہر اک آرزو الگ

غیروں کے ساتھ یار ہے مے نوش اور ہم — حسرت سے بیٹھے پیتے ہیں اپنا لہو الگ

مغز میرا اڑ گیا ناصح نصیحت کو سلام — لو سدھارو گھر کو میں کرتا ہوں حضرت کو سلام

طالب دولت سلامی کب ہیں دولت مند کے — کرتے ہیں پردے میں اسکے اسکی دولت کو سلام

ترے ہاتھ سے دشت وحشت کی میں — جنوں کب تلک خاک چھانا کروں

خرد کچھ کہے ہے جنوں کچھ مجھے — کہو میں کہا کس کا مانا کروں

سوزش غم سے جب سے سینے کے گل چراغ ہوں — چارہ گروں کی عقل کے کیونکہ نہ گل چراغ ہوں

محفل انبیا ہو یا انجمن ملائکہ — اے ظفر ان میں حضرت شاہ رسل چراغ ہوں

لو گئے ناکر حضرت دل ان دغابازوں سے کیا — یہیں وہ عیار جب دینگے دغا دینگے تمہیں

اے ظفر زخمِ جگر پر جب وہ چھڑکینگے نمک — اس محبت کا مزا اپنی چکھا دیں گے تمہیں

رقیب سنگدل کو لا بٹھاتے ہیں مرے سر پر — اور آپ ہی پوچھتے ہیں مجھ سے وہ تم سرگراں کیوں ہو

یقیں جب یہ ہوا تمکو نہیں کوئی حسیں مجھ سا — تو پھر فرمائیے میری طرف سے بدگماں کیوں ہو

زلف اس کی صبا سے ہے برہم — دیکھو کافر ہوا سے لڑتی ہے

بزم میں ہر کسی سے آنکھ اسکی — چوری چوری حیا سے لڑتی ہے

اِک روز میرے یار کی ابرو جو چل گئی — لاکھوں سپاہی کٹ گئے تلوار چل گئی

شعلہ ہماری آہ کا ایسا ہوا بلند — بجلی تڑپ کے چرخ کہن سے نکل گئی

اے وائے انقلاب زمانہ کے زور سے — دہلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

نہ کر خیال کہ آئی گھٹا بہت سی ہے — ابھی تو شیشے میں مے ساقیا بہت سی ہے

کبھی ہمارا بھی خوں مل کے دیکھو ہاتھوں میں — لگائی آپ نے یوں تو حنا بہت سی ہے

زلف کے کوچے سے بہتر ہے ولا مانگ کی راہ — اس میں سو غم ہیں یہ اک سیدھی سڑک جاتی ہے

مجھ سے پھرا ہے سارا زمانہ جب سے پھری ہے تیری آنکھ — زلف ہی جب سے تیری برہم عالم برہم سارا ہے

اللہ اللہ رے اُن بتوں کا غرور — یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہے

موت آئے تو ٹل نہیں سکتی — اور آئی نہیں تو پھر کیا ہے

نہیں رونے میں گر ظفر تاثیر — جگ ہنسائی نہیں تو پھر کیا ہے

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں میرے دلکو قرار ہے — کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہو ان پہ کیسی جفا ہوئی — جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے

اے ظفر بھلا تجھے کس کا ڈر تو خدا کے فضل پہ کر نظر — تجھے ہی وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی کار ہے

ظفر

ظفر۔ نواب نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ مسند آرائے فرخ آباد۔ اپنے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کے مشورہ سے شعر کہتے تھے۔ بڑے سیر چشم عالی حوصلہ۔ دریا دل امیر تھے۔ علم موسیقی میں اچھا دخل تھا

سنہ ۱۲۶۲ھ میں ۴۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ منیر شکوہ آبادی ان کی سرکار کے دعا گو تھے۔ کلام باوجود کوشش دستیاب نہ ہو سکا۔ صرف دو شعر بہم پہنچے وہ نذر ناظرین ہیں

اشک سے تر مرا گریبان ہے ۔۔۔ ملک گوہر مرا گریبان ہے
اچھا نہیں ہے دامن محشر کا پھیلنا ۔۔۔ چھوڑو نہ پائنچے دم رفتار ہاتھ سے

ظہور

ظہور۔ منشی شیخ محمد ظہور حسین لکھنوی خلف منشی علیم اللہ۔ شاگرد حضرت امیر مرحوم آپ کے بزرگ عہد شاہی میں معزز رہے ہیں۔ یہ بھی واجد علیشاہ والئے اودھ کے زمانے میں کسی عہدہ پر ملازم تھے۔ فارسی۔ عربی میں اچھی استعداد تھی۔ انگریزی سے بھی واقف تھے شعر میں مضمون پیدا کرتے۔ زبان کی صفائی پر توجہ فرماتے۔ عرصہ تک سندیلہ میں حضرت واسطی مرحوم تعلقہ دار کی رفاقت میں رہے۔ منشی امیر حسن ہجر اور قاضی نہال الدین نہال ان کے تلامذہ سے ہیں۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

انصاف خوب برق تجلی نے یہ کیا ۔۔۔ دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا
پروانے کا قصاص جو گلگیر نے لیا ۔۔۔ گل شمع کا چراغ سر انجمن ہوا
میرے سوال کا نہ دیا یار نے جواب ۔۔۔ منہ کھولنا مرا اسے قفل دہن ہوا
آنکھ سے گرتے ہی پیوند زمیں تھا طفل اشک ۔۔۔ موت آئی گھٹنیوں چلنے کے قابل کیا ہوا
سبزہ کیا مال ہے سنبل کی حقیقت کیا ہے ۔۔۔ خط جو دس بیس پہ بھاری ہے تو سو پر گیسو
تاک میں رند ہیں او بنت عنب پنہاں رہے ۔۔۔ مجھکو بچتی نظر آتی نہیں حرمت تیری
سمجھکر سنگ اسود پوجتے تصویر پتھر کی ۔۔۔ کہ حرمت میں بھی کچھ باقی رہے توقیر پتھر کی
ہوا غش صورت موسیٰ جو میں اس بت کے جلوے سے ۔۔۔ بنیں ٹھہرا کے آنکھیں پتلیاں تصویر پتھر کی
جگہ ملتے ہی آئی انگشت حنا بند حسیناں پر ۔۔۔ چمک اٹھی ہے خاتم بن کے کیا تقدیر پتھر کی
وہ پا بہ رکاب اور اجل سر پہ کھڑی ہے ۔۔۔ اے نزع دو عملی میں مری جاں پڑی ہے
رو رو کے میری لاش پہ بولیں یہ حسرتیں ۔۔۔ یہ تو کہو کہ ہم کو چلے کس پہ چھوڑ کے

ظہور

ظہور: مولوی محمد ظہور علی دہلوی مرحوم خلف مولوی فتح علیخاں بہادر ۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ مفتی صدرالدین خاں آزردہ سے پڑھیں۔ اوائل مشق سخن میں چند غزلیں شاہ نصیر اور حکیم مومن خاں کو دکھائیں۔ بعد ازاں ذوق مرحوم سے تلمذ اختیار کیا۔ ملازمت پیشہ اور مشہور خوشنویس تھے۔ پہلے مدت تک تھانہ دار رہے۔ پھر سررشتۂ تعلیم میں مدرس فارسی مقرر ہوئے۔ سرکار شاہی سے شمس الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں بعمر ۶۵ سال انتقال کیا۔ ان کے والد سرکار انگریزی کے جاگیردار تھے گورنر جنرل ہند نے بمقام دہلی ۱۸۲۲ء میں بصلہ مدح گستری انہیں خلعت فاخرہ عنایت کیا تھا۔ سرکار شاہی سے بھی اکثر انعام و اکرام ملتے رہتے تھے انکے چھوٹے بیٹے منشی ذوالفقار حسین مدرسہ دہلی میں مدرس تھے اور انہوں نے غنی تخلص اختیار کیا تھا ظہور مرحوم کو معما میں بڑا کمال تھا اس فن میں ایک رسالہ جس میں معما حل کرنے کے قاعدے لکھے تھے نظم میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کو مرزا قادر بخش گورگانی نے طبع کرایا تھا۔ مگر یہ نسخہ ایام غدر میں تلف ہو گیا۔ دیوان مطبوعہ میں بیشتر حصہ غدر کے بعد کی تصنیف ہے۔ قصیدے اور مرثئے بھی خوب کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی اچھا ملکہ تھا۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں مشہور زمانہ تھے فکر بلند اور مضامین دلپسند ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہؤا برباد کیا لے ہمصفیرو آشیاں اپنا
کہ گلشن میں رہا باقی نہ کچھ نام و نشاں اپنا

تمہارے دوستوں کا تو کلیجہ ہو گیا ٹھنڈا
بلا سے گر تپ غم میں ہمیں جلتا ہؤا دیکھا

نہیں کچھ بود و نابود جہاں جائے غم و شادی
کہ یاں اسباب دنیا کو نہ ہرگز دیرپا دیکھا

گدا کو اے ظہور اکدم میں دیکھا یاں غنی ہوتے
غنی کو ایک لمحے میں یہاں ہوتے گدا دیکھا

تسکین دل ہو کیا ترے قول و قرار پہ
کب تک جیا کرے کوئی اس انتظار پہ

حیران ہوں دیکھکر سر مژگاں پہ اشک کو
کیوں طفل بیگناہ کو کھینچا ہے دار پہ

دشمنی ایک زمانے سے ہوئی ہے پیدا
اور کہ جا کے بتوں سے دل شیدا اخلاص

گردش ہے مجھے چشم کی مانند ہمیشہ	آوارہ ہیں گھر میں ہیں مسافر ہوں وطن ہوں
ہے چار طرف حسن کی جس کے یہ تجلی	وہ شاہد یکتا نہیں معلوم کدھر ہے
دونوں میں جب ہے ہی فرق دلبر ادھر ہمارے ادھر تمہارے	جہاں نمائی سے یہی ہیں گھر ادھر ہمارے ادھر تمہارے

ظہور

ظہور۔ منشی محمد ظہور خاں ساکن ریاست ٹیکم گڈھ ملک بندیل کھنڈ ان کا پیشہ ارباب نشاط کو تعلیم دینا ہے۔ فنِ موسیقی میں باکمال اور یگانہ سمجھے جاتے ہیں۔ علمیت اگرچہ زیادہ نہیں ہے۔ مگر نوشت وخواند میں مجبور بھی نہیں ہیں۔ طبیعت دار اور ذہین آدمی ہیں قریب ۵۵ سال عمر کے ہوگی۔ شاعری کا شوق عرصے سے ہے۔ اپنا کلام مولوی سید محمد نذیر حسن صاحب عباسی تخلّص فتنہ رئیس سنڈیلہ کو دکھاتے تھے۔ بہت خوش آواز اور خوش لحن ہیں۔ مشاعرے میں غزل اس طرح پڑھتے ہیں کہ تمام سامعین بے اختیار داد دیتے ہیں۔ عرصے سے کوئی حال معلوم نہیں ہوا۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ہے۔

بتوں نے باندھ رکھی ہے کمر ایذا رسانی پر	غضب ہیں جان کے پیچھے پڑے ہیں اس زندگانی پر
شباب آتے ہی دل کھنچنے لگے انکی طرف سب کے	ہزاروں انگلیاں اٹھنے لگیں اٹھتی جوانی پر
کیا اس درجہ کشتہ عاشقانِ سبزۂ خط کو	کہ قاتل جم گئی کائی ترے خنجر کے پانی پر
شہید عشق کا رتبہ مسیح وخضر کیا جانیں	مرے جاتے ہیں یہ طولِ حیات جاودانی پر
غضب ہے وہ نہ پائے کوئی قطرہ آبِ خنجر کا	کہ جس کی زندگی موقوف ہو اک گھونٹ پانی پر
ابھی بچپن ہے نچلے کیوں نہ بیٹھیں سادہ وضعی سے	قیامت بن کے اٹھیں گے جب اٹھینگے جوانی پر
ظہور اس سمت قاتل پھیرتا ہے حلق پر خنجر	ادھر حسرت کھڑی روتی ہے میری نوجوانی پر
کوئی مقتل میں دیکھے آکے یہ اعجاز قاتل کے	لگائی تیغ دشمن پر ہوئے ٹکڑے مرے دل کے
وہ کھل کھیلا نہ دشمن کیطرح تجھ سے کبھی یارب	نکلنے پائے ہی بھر کے نہ اب تک حوصلے دل کے
ہوائے آہ مجنوں سے یہی ہے جنگ کے بن میں	اڑے جاتے ہیں پردے آج سب لیلی کے محمل کے

ظہیر۔ راقم الدولہ سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا دہلوی خلف میر جلال الدین خوشنویس

ظہیر: راقم الدولہ سید ظہیر الدین عرف نواب مرزا دہلوی خلف میر جلال الدین خوشنویس

اُستاد محمد بہادر شاہ شاگرد خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ مرحوم آپ کے اکثر بزرگ سلاطین تیمور کے ہاں عہدہ ہائے جلیلیہ پر سرفراز و ممتاز رہے ان کے والد ماجد صلاح الدولہ مرصع رقم خاں حضرت بہادر شاہ بادشاہ غفران مآب کے فنِ خوشنویسی کے اُستاد تھے اور آپ خود بھی گیارہ سال کی عمر میں بعہدۂ داروغگی ماہی مراتب شرف اندوز ہوئے کسب علوم کا شغل اسی عمر تک رہا۔ بعدہٗ فن سخن کی طرف رجوع ہوگئی۔ حافظ قطب الدین خاں مشیہ، شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے تھے قرب مکان کے باعث آپکو بھی شریک بزم ہونیکا اتفاق ہوتا تھا اور یہی صحبت آپکی شاعری کا باعث ہوئی حضرت ذوقؔ کے انتقال کے بعد اپنے کلام کی آپ ہی نظر ثانی کرتے رہے۔ اور ہمیشہ اپنے معاصرین کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ عرصہ تک شعر و شاعری کا بازار گرم رہا۔ پھر یکایک ہنگامہ غدر برپا ہوگیا اور تمام شہر مع قلعہ معلّٰے تباہ و برباد ہوگیا۔ اگلی صحبتیں درہم و برہم ہوگئیں۔ ہر شخص سراسیمہ اور پریشان حال ہوکر اپنی جان اور ننگ و ناموس بچانے کی فکر میں جنگلوں اور صحراؤں میں مُنہ چھپانے لگا۔ حضرت ظہیرؔ بھی تمام اثاث البیت سے دست بردار ہوکر اپنے مکان سے فرار ہوئے۔ عرصہ تک بادیہ گردی اور دشت نوردی کا اتفاق رہا۔ آخر کار دارالریاست رامپور میں جاکر پناہ گزیں ہوئے۔ آپ کے والد اور چھوٹے بھائی امراؤ مرزا انورؔ بھی آپ کے ہمسفر تھے۔ دہلی میں جب امن و امان نے اپنی صورت دکھائی۔ اور سرکار سے واگذاشت جائداد کا حکم ہوا۔ تو آپ اپنے مکان پر تشریف لائے اور اثاث البیت پر قبضہ حاصل کیا۔ اب قوت لایموت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ چند روز کچھ وجہ معیشت بہم پہنچاکر گذر اوقات کی۔ پھر منشی گنیشی لال مالک اخبار جلوہ طور نے آپ کو بلند شہر بُلا لیا۔ اور اپنے اخبار کا اڈیٹر کر دیا۔ کچھ دن وہاں بسر ہوئے۔ پھر اپنے والد کے انتقال کے باعث دہلی چلے آئے۔ اسی اثناء میں مہاراجہ صاحب الور نے یاد فرمایا۔ چند روز ان کی رفاقت میں گذارے لیکن قسمت سے وہاں زیادہ مدّت رہنا نہ ملا۔ الور سے بھی آپ کا آب و دانہ اُٹھ گیا۔ اب

پھر پھر اکر دہلی آگئے۔ حسن اتفاق سے گذشتہ صحبت اور یاروں کی ٹولی پھر گرم ہوگئی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مکان پر مشاعرے ہونے لگے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ کی ابتدائی مشق تھی۔ غدر کے قبل کے مشاعروں میں سید معین الدین معینؔ۔ مولوی عبدالکریم صاحب منورؔ۔ حکیم مولا بخش قلقؔ۔ میاں غلام احمد تصویرؔ۔ میاں عبدالقادر توقیرؔ۔ نواب مرزا خاں داغؔ۔ وغیرہ باکمال شعراء کے ساتھ شریک بزم ہوا کرتے تھے۔ الغرض چند دنوں تک یہی صورت رہی پھر میاں ظہیرؔ کو آب و دانے کی کشش جے پور لے گئی۔ وہاں پہنچتے ہی ملازم ہوگئے۔ حضرت انورؔ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ وہ بھی وہیں رہنے لگے۔ بیس سال تک فکر سخن کا بالکل موقع نہ ملا۔ بعد انتقال مہاراجہ رام سنگھ والیِ جے پور روزگار ترک کرکے خانہ نشینی اختیار کی۔ مگر یہ صورت بہت دنوں تک نہ رہی۔ تھوڑے ہی دن بعد خوش قسمتی دکن کی طرف لے گئی۔ اور آپ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم مملکت حیدرآباد کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ وہیں دیوانوں کی ترتیب عمل میں آئی اور آپ کے تینوں دیوان یکے بعد دیگرے آگرہ اور بمبئی میں طبع ہوکر اشاعت پذیر ہوئے۔ آپ کے کلام میں زبان کے لطف کے ساتھ استعارہ اور مضامین کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ مضامین میں باریکیاں نہیں بلکہ موشگافیاں کرتے تھے۔ اور ادائے مطلب اور طرز کلام میں بہت فصاحت اور صفائی تھی۔ آپ دہلی کے پرانے سکول کی شاعری کے چند باقی ماندہ نمایندوں میں سے تھے۔ مؤلف تذکرہ کے دولت کدہ پر راقم بھی دو تین بار آپ کی ملاقات سے لطف اندوز ہوا۔ نہایت خوش خلق اور ملنسار بزرگ تھے۔ حیدرآباد میں مارچ ۱۹۱۱ء؁ ۱۳۲۹ھ میں جاں بحق ہوئے۔ آپ کے دم سے راجستان اور دکن میں اردو شاعری کے مذاق کو بہت فائدہ پہنچا۔ آپ کے تلامذہ کثرت سے تھے۔ جن میں یہ نام قابل ذکر ہیں۔ نادر علی برترؔ۔ صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق ٹونکی۔ محمد ابراہیم دبیرؔ۔ سید حسن سیدؔ کھوپالی۔ خواجہ حسین اثرؔ۔ سعید الدین تمناؔ۔ سورج نرائن خاطرؔ

رمضان علی۔ اختر سہارنپوری۔ اشتیاق حسن شوق۔ گوری شنکر قصیر دہلوی وغیرہم۔
انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

انتخاب از دیوان اوّل

اک اک خطا شعار سے رحمت کو ہے لگاؤ
الجھا ہے خار خار سے دامن نسیم کا

مرنا ہے جیتے جی ترے رنجور کا علاج
رکھا ہے تو نے درد میں درماں سقیم کا

پرستش تری جناب میں کیا زہد و کفر کی
عالم ہے مستحق ترے فیض عمیم کا

منظور کچھ شہود سے اپنا ظہور تھا
ہونے کو یوں تو نور سے پہلے بھی نور تھا

اے برق کس کی آگ میں کس کو جلا دیا
ہم بہر سوز رشک تجھے جلنے کو طور تھا

ساقی کی چشم شوخ کی کیفیتیں نہ پوچھ
جس سے نظر لڑی وہی مستی میں چور تھا

کہے دیتا ہے رہ رہکر کھٹکنا دل میں پیکاں کا
یہ تیر بازگشتی ہے اسی برگشتہ مژگاں کا

لب جان بخش پر جھوٹے مسیحائی کے دعوے ہیں
کہ دم پر دم نکلتا ہے مریض درد ہجراں کا

سلیقہ شرط ہے ہر کام کو بیداد آساں ہے
کبھی آنسو بھی پونچھا ہے کسی کے چشم گریاں کا

ملایا خاک میں جنکو تو پھر ان سے کدورت کیا
مٹا دو دل سے نقشہ خاکساروں کے مزاروں کا

گریگا خود فلک جان عدو پر برق بن بن کر
پڑیگا صبر آخر تو کہیں ہم بے قراروں کا

ذرا سے لب ہلانے میں تمہارا کیا بگڑتا ہے
کہ اک امید پر ہوتا ہے جینا بے قراروں کا

ستم دیکھو کہ دل لے کر مکرنا اور یہ کہنا
تمہیں کیوں اعتبار آنے لگا بے اعتباروں کا

تکلف برطرف اے میکشان محفل رنگیں
ظہیر مردہ دل بھی تھا کبھی تو یار یاروں کا

وحشت گردی کا مزا قیس کو حاصل نہ ہوا
خاک ہوکر بھی غبار پس محمل نہ ہوا

شب غم اور ستمہائے شب غم
فقط گرنا ہے باقی آسماں کا

اٹھ چکے ہیں حجاب حائل سب
چشم مجنوں ہے پردہ محمل کا

لیا جو رستہ نفاق و کیں کا تو پھیر کھایا کہیں کہیں کا
ملا نشاں منزل یقیں کا تو ایک تھا جادہ کفر و دیں کا

خود بخود دل مرے سینے سے کھنچا جاتا ہے
دلربا آپ کی ایک ایک ادا کو دیکھا

وہ نگاہِ شرمگیں کچھ اس ادا سے پھر گئی
آگیا انکار میں ہم کو مزہ اقرار کا

خوں بہائے عاشق ناشاد کیا
دلبروں کی داد کیا فریاد کیا

دل کو چاہا جس طرح سمجھا لیا
غمزدوں کا شاد کیا ناشاد کیا

نامرادی جس کی ٹھہری ہو مراد
وہ دل ناشاد ہو پھر شاد کیا

ہم کہاں جائینگے چھٹ کر دام سے
چھوڑ کر ہم کو کرے صیاد کیا

بدمستی و رندی میں یہاں عمر گذاری
باقی جو رہی یونہیں گذر جائے تو اچھا

نہ مانوں گا ناصح کہ دل پر ہے قابو
لگا کر کسی سے دکھایا تو ہوتا

وہم تھا یہ خط تقدیر نہ مٹ جائے کہیں
بدگماں نے مجھے سر پاؤں سے ملنے نہ دیا

حسب خواہش گر خدا دیتا تو انسان حریص
حشر تک ہر شئے یونہیں نوبت بہ نوبت مانگتا

جسقدر ثروت بڑھی اتنی بڑھی حرص و ہوا
خوب تھا انساں اگر صبر و قناعت مانگتا

اس جور و ستم پر تو ہے پیار چلا آتا
گر مہر و وفا ہوتی کیا قہر خدا ہوتا

تھی سر راہ میکدہ مسجد
رہ گیا پردہ پارسائی کا

سادگی میں ہے بانکپن کی نوک
ہائے انداز کج ادائی کا

رہنے دے بتکدے میں نہ چھیڑ اے خدا پرست
جاتا رہوں نہ کفر سے ایمان تو گیا

جفاؤں پر وفا کرنی بڑے ہر فن کی باتیں ہیں
بنا ہے چاہ دن تم سے کسی سے ہو نہیں سکتا

تمہارا کیا ہے تم تو قطع الفت کر چکے ہم سے
تمہیں ہم چھوڑ دیں یہ اپنے جی سے ہو نہیں سکتا

مجھی کو ذبح کرنے کو بنے ہیں سب نصیحت گر
او سے سمجھائے جا کر کوئی ایسا ہو نہیں سکتا

کون بنتا ہے مکیں اس خانۂ برباد کا
یہ دل ویراں نمونہ ہے جہان آباد کا

اک نگہ میں جاں بلب اک ادا میں شاد کام
شاد کرنا بات کیا ہے عاشق ناشاد کا

چارہ گر کیا پوچھتا ہے اسکے مژگاں کی خلش
ہے مری رگ رگ میں عالم نشتر فصاد کا

یہ کانٹا بھی نکل جائے شب ہجر
کہ دم کے ساتھ ہے کھٹکا سحر کا

وہ ہیں پیش نظر اور پھر نہیں ہیں
سراسر ہے قصور اپنی نظر کا

بتوں سے ڈھب نہ حوروں سے رسائی
ادھر کا ہے نہ یہ زاہد ادھر کا

کسی کا گلہ کرکے ہم کیوں برے ہوں
کوئی منفعل آپ ہوتا رہیگا

جیسے خواب میں تم دکھاؤ گے صورت
توقع میں تا حشر سوتا رہے گا

اے ظہیر اچھی نہیں آتش رخوں سے چھیڑ چھاڑ
اس ہنسی میں ایک دن جی کا زیاں ہو جائیگا

ان کے دل کی کدورتیں نہ مٹیں
اپنی ہستی مٹا کے دیکھ لیا

کچھ نہیں کچھ نہیں محبت میں
خوب جی کو جلا کے دیکھ لیا

گوارا ہے جو کچھ گوارا نہیں ہے
مجھے پاس کیا جانے کیا ہے کسی کا

گذرنا وادیٔ تسلیم سے کار نمایاں ہے
قدم یاں لڑکھڑا جاتے ہیں وقت امتحاں کیا کیا

مری آنکھیں ہی لڑ لڑ کر قیامت مجھ پہ ڈھاتی ہیں
نگاہیں توڑتی رہتی ہیں مجھ پر بجلیاں کیا کیا

جب زمیں پر پاؤں دھرنے کا سہارا ہو گیا
آدمی سمجھا فلک کا میں ہی تارا ہو گیا

مٹ گئے دنیا کے جھگڑے اک نگاہ ناز میں
تم ہمارے ہو گئے عالم ہمارا ہو گیا

ناگوار خاطر رشک آفریں کیا کچھ نہ تھا
مختصر یہ ہے کہ اب سب کچھ گوارا ہو گیا

ہائے ہم اور ترک پاس وضع اور پھر اسقدر
دل کے ہاتھوں کیا کہیں کیا کچھ گوارا ہو گیا

کیوں ظہیر خستہ جاں دیکھا محبت کا مزہ
دو ہی دن میں کیا سے کیا عالم تمہارا ہو گیا

آنکھیں تیری کھا گئیں تیرے جلووں کو دیکھکر
گو یا نظر سے ایک زمانہ گذر گیا

ہم کوچۂ دشمن ہیں بچھا دیں گے نگاہیں
دیکھیں گے کہ بچ بچ کے وہ جاتے ہیں کدھر آج

ہو چلا ہے کفر میرا رہنمائے راہ دیں
خلد مجھ کو یاد آیا کوئے جاناں دیکھ کر

حوصلے جرم کے کچھ اور بڑھا دیتے ہو
تم کچھ اس ڈھب سے بگڑتے ہو خطا واروں پہ

کچھ تحفے لیکے جائیے اہلِ وطن کے پاس
اک زخم تازہ چاہئے داغِ کہن کے پاس

اقرار بھی اُسی سے اُسی سے جواب بھی
اک دوسرا دہن بھی لگا لو دہن کے پاس

شکوہائے بیقراری سن کے وُہ کہنے لگے
تم تو ایذا دوست ہو آرام جاں سے کیا غرض

عشق کیا شے ہے حسن ہے کیا چیز
کچھ ادھر کی ہے کچھ اُدھر کی آگ

ستم وہ کس پہ کرتے ہیں کسے ناحق ستاتے ہیں
اُسی کو آزماتے ہیں جسے اپنا بناتے ہیں

یہاں غفلت شعاری ہے وہاں آمرزگاری ہے
وہ ہم کو یاد رکھتے ہیں ہم اُنکو بھولجاتے ہیں

مجھ سے ہی کیوں نہ پوچھئے میری بُرائیاں
مجھ سے سوا تو غیر مرا راز داں نہیں

مجھ سے بے مہری دُشمن کے گلے ہیں ان کو
واہ کس لطف کے پردے میں جفا کرتے ہیں

ضد ہے اگر وفا سے تو اچھا جفا سہی
دلدار کیا کہ تم تو دل آزار بھی نہیں

بھلی لگتی ہے کچھ جس کو تمہاری کج ادائی بھی
بُرے ہو کر بھی تم اچھے ہو اچھا اسکو کہتے ہیں

خدا کی خدائی میں سب چیز ہے
مگر دادِ خونِ شہیداں نہیں

ستمگاروں کی دلجوئی بھی عیاروں کی گھاتیں ہیں
یہ کس کے دوست بنتے ہیں یہ کسکے یار ہوتے ہیں

کچھ تو ہوتے ہی ہیں الفت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

یہیں تم کیوں نہ سن لو دردِ دل گر تمکو سننا ہے
یہیں ہم کیوں نہ کہدیں جو یہاں کہنا ہے محشر میں

یہاں یہ شوق مردن ہے کہ زندہ ہو کے مرجائیں
وہاں یہ بدگمانی ہے کہ جی اُٹھیں نہ ٹھوکر میں

جلوہ سو سو رنگ میں ہے پردہ در
گھر میں کیا ہو تم کہ ہو بازار میں

کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں کبھی ہونٹوں پہ نالے ہیں
فلک شاباش ہے کیا کیا مرے ارماں نکالے ہیں

یہاں بن بنکے مری جاں کہاں جاتے ہیں
یہ مرے قتل کے سامان کہاں جاتے ہیں

عجب کیا اُسکی رحمت سے اگر وُہ بخشدے زاہد
کہ آمرزش کے قابل ہم گنہگاروں کی باتیں ہیں

فکر آزادی سے پابند وفا آزاد ہیں
ہم رہا ہو کر اسیرِ الفت صیاد ہیں

دام سے چھوٹے تو سمجھو قید ہستی سے چھٹے
ہم اسیرانِ قفس خود قید کی میعاد ہیں

اے ظہیر اپنے سخن میں کیوں نہ ہو لطفِ زباں
سری ہے جوہری پر اہلِ جوہر رشک کرتے ہیں
کوئی دم کا مسافر ہوں کوئی ساعت کا ہوں مہماں
دل میں وہ زینت کا شانہ بنے بیٹھے ہیں
کیا بُری شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ
زمانے سے وفا کرتے ہو تم تو
سمائی ہے ظہیر ان کو یہ نخوت
کچھ سوچ لو کچھ دیکھ لو اس عشق کے انجام
ہر دم ان کا خیال ہے مجھ کو
سب آفتیں جہاں کی مرے دم کے ساتھ ہیں
اک التفاتِ عام نے سب کچھ بھلا دیا
ستم کو جو سمجھتا ہو عنایت
مرے گھر شوق سے آ جاؤ ناصح
اچھا نہیں اتنا بھی نگاہوں کا پھرانا
قیامت پر نہ رکھو فیصلہ دل کا خدا جانے
زبانِ خاص اُردوئے معلّیٰ اس کو کہتے ہیں

ہم نمک پروردہ شاہجہاں آباد ہیں
وہ ناقص ہوں کہ میں اس نقص میں بھی فن کامل ہوں
نگاہِ نازِ قاتل ہوں ادائے رقصِ بسمل ہوں
اور اس ربط پہ بیگانہ بنے بیٹھے ہیں
جرمِ ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں
جہاں میں بے مروت ہوں تو ہیں ہوں
جہاں میں خوبصورت ہوں تو میں ہوں
ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ دشمن کو نہ چاہو
ہجر میں بھی وصال ہے مجھ کو
بجلی ہی کیوں گرے جو مرا آشیاں نہ ہو
ایسے سے کیا گلہ ہو جو نامہرباں نہ ہو
شکایت ہو تو پھر ایسے سے کیا ہو
یہ سمجھوں گا کہ تم بھی اک بلا ہو
ایسا نہ ہو تم خلق میں انگشت نما ہو
تمہارے منہ سے کیا نکلے ہمارے منہ سے کیا نکلے
غضب جادو بیاں تم تو ظہیر خوش نوا نکلے

انتخاب دیوان دوم

ملنا ترا حشر پہ ہے معلوم
آیا جواب نامہ دلِ ناامید کا
نظر میں نیند بن کر پھر رہا ہوں

ہوگا جسے اعتبار ہوگا
قاصد کا سر گواہ ہے خط کی رسید کا
نگہبان میں ہوں خواب پاسباں کا

ظہیر آؤ چلو اب میکدے کو
کشتۂ ناز اک زمانہ ہے

اور تو دے لیں گے ہم سب کا جواب
چلو مل جاؤ طے ہو جائیں جھگڑے

ان کے وعدے پہ تسلّی شب غم دیتے ہیں
بزم دشمن میں بلاتے ہیں غضب تو دیکھو

مجھے ہاتھ سے کھو کے روئیگی دنیا
اٹھا دی جنوں نے قیود مذاہب
خطا بھی کوئی کوئی تقصیر میری

آج کل ہے نصف ہندی نصف انگریزی ظہیر
خدا ملتا ہے ڈھونڈے سے اگر انسان جویا ہو

نکالا زہد و تقوے نے ہے کہاں کا
تیغ منہ دیکھتی ہے قاتل کا

لیکن ان کی گالیوں کا کیا جواب
کہاں کے جھگڑے اور کس کی شکایت

ہم بھی کیا کیا دل بیتاب کو دم دیتے ہیں
اس پہ اپنے سر نازک کی قسم دیتے ہیں۔

فلک نے بہت پھر کے پایا ہے مجھکو
بڑی کشمکش سے چھڑایا ہے مجھکو
وہی ہوں میں جیسا بنایا ہے مجھکو

اب تو اُردو میں زبان میری آدھی رہ گئی
مگر ہاں آدمی کو آدمی مشکل سے ملتا ہے

انتخابِ دیوان سوم

تو نے خود چھیڑ کے پھر یاد دلائی اپنی
نہ کہیں طبیعت آتی نہ کسی پہ جان جاتی
یہ ہمیشہ مرنا جینا یہ امید و بیم کیسی
زندگی بھر اسی امید پر مرتے رہتے
سمجھ لو بات پردہ کی ہے بس پردہ ہی رہنے دو
جلوہ گر ہے ان بتوں میں کون زاہد دیکھ تو
بیقرار ہی ہوئے اجزائے دل بیتاب دیکھ
بزم دنیا میں ملے ہیں مجھ کو یہ دو غمگسار

ہم تو بھولے ہوئے بیٹھے تھے فسانہ تیرا
نہ یہ دل بغل میں ہوتا نہ یہ حال زار ہوتا
وہ بلا سے تھا جو ہوتا کہیں ایک بار ہوتا
تیرے وعدوں کا ستمگر جو بھروسا ہوتا
نہ پوچھو اس دل بیتاب میں ہے آرزو کیا کیا
تو جسے کہتا ہے کعبہ ہے وہ بتخانہ مرا
گوہر غلطاں ہے اک اک اشک کا دانہ مرا
شمع ہے مونس مری دلسوز پروانہ مرا

نالوں سے جتانے تو اٹھے دل سے ہزاروں
کمبخت نکلنے کو کوئی ارماں نہیں دیکھا

برا ہوتا بھلا ہوتا لکھا تھا جو مقدر میں
بلا سے ایک بار اے گردش ایام ہو جاتا

کیا تماشہ ہو کہ ہو حشر میں باہم تکرار
تم کہو دل مرا ہیں تم سے کہوں دل میرا

یار کچھ کہہ تو سہی کیا ترا مشرب ہے ظہیر
کافر اپنا تجھے کہتے ہیں مسلمان اپنا

ہیں کسی کا کبھی شرمندۂ احسان نہ ہوا
ملک الموت بھی آکر مرا پرساں نہ ہوا

دہلی اردو کی کان ہے گویا
کان کیسی جہان ہے گویا

یہ وہ خطہ ہے سرزمین اس کی
ہند کا آسمان ہے گویا

تھی جب آباد تھی کبھی دِلّی
اب تو اجڑا مکان ہے گویا

اب نہ دہلی رہی نہ وہ گفتار
ایک باقی نشان ہے گویا

جو زباں ہے بچی کھچی باقی
کوئی دن میہمان ہے گویا

ہے نئی روشنی رواج پذیر
دوسری اب زبان ہے گویا

نیم اردو ہو نیم انگریزی
بد عبارت کی شان ہے گویا

بن گیا شیخ خلد کا مختار
اس کے گھر کی دکان ہے گویا

ہر طرح دلنشیں ترا پیکان ہو گیا
غم بن گیا کبھی کبھی ارمان ہو گیا

اے چشم انتظار ترے شوق کو سلام
دشمن اب انکے در کا نگہبان ہو گیا

تلپٹ کیا دل اڑا کے جھٹ پٹ
اللہ رے نظر ترا جھپاکا

کیوں کیسی پلائی شیخ صاحب
یاروں سے ملاؤ ہاتھ آ کا

او قول الست کے نوازن
مشتاق ہے دل اسی صدا کا

زلف شبگوں کا دھیان ہے دلکو
رات بیمار پر ہے بھاری آج

ملا نصیب سے ہم کو مزاج داں صیاد
لگا رہا ہے چمن زیر آشیاں صیاد

کہانیاں تو بہت عمر بھر سنی ہونگی
کلیجہ تھام کے سن میری داستاں صیاد

کسی کمبخت نے چاہا اگر تم کو خطا کب کی
تمہیں بھی پیار آجاتا ہے اکثر اپنی صورت پر

بگڑنے کے ہیں سو پہلو خفا ہونا ہی جب ٹھہرا
نئی رنجش پہ رنجش ہے نئی تہمت پہ تہمت ہے

یہ آنا موت کا آنا ہے جانا جان کا جانا
وہ آئے تیر کی صورت گئے برقِ تپاں ہو کر

کہتے ہیں کیا سمجھ کے ہمیں تو نے دل دیا
ہونا ہے لین دین کسی اعتبار پر

دلدہی نے اور بھڑکایا فلق کی آگ کو
آنسوؤں نے پاؤں پھیلائے ہیں دامن دیکھکر

کیا جانے کوئی کون ہیں کیا ہیں کہاں ہیں ہم
جس سر زمین پر ہیں وہاں آسماں ہیں ہم

آکر تمہاری بزم میں اتنے سبک ہوئے
دشمن تو دشمن اپنے بھی دل پر گراں ہیں ہم

شوق دیدار طلب، طاقتِ دیدار نہیں
عاشقی کھیل نہیں کارِ ہوس کار نہیں

جب سے کعبے کو سدھارے ہیں ظہیر میخوار
کوئی جاروب کشِ خانۂ خمار نہیں

شام ہجراں کی درازی کیا کہوں
ایک شب کی چار راتیں ہوگئیں

کوہکن کیا جی پہ کھیلا اے ظہیر
ایسی لاکھوں وارداتیں ہوگئیں

وصلِ دشمن کوئی رخ ہے کہ چھپا سکتے ہیں
راستی حرف غلط ہے کہ مٹا سکتے ہیں

بزمِ جاناں میں مسلمان کا مردہ ہے رقیب
نہ جلا سکتے ہیں اسکو نہ بہا سکتے ہیں

ہائے بگڑی ہوئی قسمت کو بنائیں کیونکر
بات بگڑی ہو تو سو طرح بنا سکتے ہیں

وہ جلوے پیشِ نظر ہیں جو دو جہاں میں نہیں
مگر بیان کی قدرت مری زباں میں نہیں

زباں سے رنجِ نہاں شکوے بن بنکر نکلتے ہیں
چبھے ہیں دل میں جو کانٹے یہ وہ نشتر نکلتے ہیں

ہوس مرنے کی ہوتی ہے دوبارہ دادخواہوں کو
وہ اس انداز سے نادم سرِ محشر نکلتے ہیں

دنیا کے دغاباز ستمگر یہ حسیں ہیں
ایسوں کے مگر چاہنے والے بھی یہیں ہیں

جل تھل بھرے ہیں دیدۂ خونابہ بار ہیں
نشتر کی دیر ہے رگِ ابرِ بہار ہیں

بدنام کرنے والے ہوئے سینکڑوں تو کیا
ہونا ہے ایک چاہنے والا ہزار میں

ہم جانتے تھے ہوتی ہے دونوں طرف سے چاہ
دھوکے بہت اٹھائے اسی اعتبار میں

ہم سا مشتاق کوئی اور نہ پائیگی کہ ہم
جا نکلتے ہیں جو میخانے کی جانب کو ظہیر
اُسے مدِ نظر کیا ہو اُسے اپنی خبر کیا ہو
چھپے چوری سے گر ملتے رہو باہم تو بہتر ہو
چلے ہو اُٹھ کے کدھر کو ذرا سنو تو سہی
نوجوانی گئی شباب گیا
تو بہ توبہ غیر پہ ان کی طبیعت آئیگی
ہم جتا تے نہ محبّت نہ جدائی ہوتی
بسر کرینگے مگر گر ستم کش بھی کہیں اپنی
نظر لڑتی رہی جب تک نہ تھی کچھ قدر نظارہ
پیامی کی زباں سے تو بہت کچھ سن لیا تم نے
کرتا ہے کچھ اثر شوقِ شہادت
جواب النجا کا ہے قطع تعلق
یاد آتے ہیں جب عہد جوانی کے فسانے
آسماں سے جو نہ اُٹھا بوجھ وہ اس نے لیا
آنکھ کے لڑتے ہی کیا کیا خلق میں طوفاں اُٹھے

صبح تک تیری بلائیں شبِ غم لیتے ہیں
دوڑ کر اہل خرابات قدم لیتے ہیں
برنگ آئینہ حیرت میں جو محو تماشا ہو
نہ میں رسوائے عالم ہوں نہ تم بدنام گھر گھر ہو
مزاج کیوں ہوا برہم اجی کہو تو سہی
جھانکنے تا کنے کی خو نہ گئی
یہ وہ آنکھیں ہی نہیں جن میں محبت آئیگی
بات نکلی ہوئی منہ سے نہ پرائی ہوتی
اُٹھا لے اے فلک دنیا کے پردے سے زمیں اپنی
ہوئے جب روزن در بند آنکھیں کھل گئیں اپنی
سنائیں گے حقیقت اپنے منہ سے کچھ یہاں اپنی
رہ جاتی ہے کھنچ کھنچ کے جو شمشیر کسی کی
رسید اپنے خط کی سرنامہ پر ہے
شعلہ سا نکل جاتا ہے دل اور جگر سے
حوصلے اللہ و اکبر خاک بے بنیاد کے
باندھو کیا کیا بندھے اُفوائے بے بنیاد کے

ع

عابد:- مرزا زین العابدین خاں عرف کلن خاں ولد صاحبزادہ اصغر علی خاں نواب یوسف علیخاں جنت آشیاں والیٔ رامپور کے داماد اور جے پور میں مدار المہام تھے ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے موزونی طبع سے شعر کہتے کسی سے مشورہ کا اتفاق نہیں ہوا۔ جب حضرت

امیر مینائی مرحوم نے تذکرہ انتخاب یادگار تالیف کیا تھا۔ اُس وقت ان کی عمر بیالیس سال کی تھی۔ ان کی بیگم کو مہاراجہ مرحوم نے دھرم کی بہن بنایا تھا اور نہایت مہربانی فرماتے تھے جناب عابد کو مضامین عاشقانہ بزلہ سنجی و نازک خیالی میں کمال تھا۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مُنہ دکھانے میں تمہیں کونسی مجبوری تھی
نظر کعبہ میں جو آیا اسی کو دیر میں دیکھا
اے کاش نکلیں تو بھی تو لخت جگر کے ساتھ
جینے نہ دے ہجر یار مرنے نہ دے انتظار
غیرت تو کیوں نہیں ہے یہ مجبور دل سے ہوں

حال دل تھا نہ ہمارا کہ دکھایا نہ گیا
عبث جھگڑا ہے اے شیخ و برہمن کفر و ایماں کا
ارماں بھرے جو دل میں ہمارے ہزار ہیں
جاں یونہی بیقرار دیکھئے کب تک رہے
بنتی نہیں ہے یار سے بے التجا کئے

عابد:۔ سید عابد حسین سہسوانی ابن سید غضنفر حسین شاگرد حضرت امیر مینائی۔ عربی فارسی کے علاوہ زبان انگریزی سے بھی ماہر تھے۔ علم عروض جناب قدر بلگرامی سے حاصل کیا تھا۔ طبیعت وقاد اور ذہن رسا تھا۔ شعر میں کوئی نہ کوئی بات نکالتے انداز بیان کی شوخی سے کلام میں رنگینی پیدا کر دیتے الفاظ کی خوبی بندش کی خوش اسلوبی آپ کے ماہر فن اور کہنہ مشق ہونے کا ثبوت دے رہی ہیں۔ پندرہ برس کے قریب ہوئے کہ آپ نے انتقال کیا۔ بہم رسیدہ کلام کا انتخاب نذر ناظرین ہے

کہا تھا نہ جا اسکے کوچے میں لیکن
نہ کروں چاہ بتوں کی تو کروں کیا واعظ
اک مزے کا مشغلہ تو دل کے بہلانے کو ہے
پھر آئے مسجدوں میں حرم کی بھی سیر کی
دل کی تسکین کو بنا لیتے ہیں ہم سو باتیں
تماشا یہ ہے ان پلٹ کے نہ آئیں گے پھر کبھی

یہ دل کب کہا مانتا ہے کسی کا
دوسرے کام کے قابل ہی نہیں دل اپنا
ہم نے مانا حاصل آہ و بکا کچھ بھی نہیں
جو بتکدہ میں لطف ہے عابد کہیں نہیں
بھول کے بھی جو ادھر آپ نظر کرتے ہیں
دنیا کے خوب لطف اٹھا لو شباب میں

حضرتِ عابد حرم کو جائیں کیوں
کوئے جاناں کعبہ ہے انکے لئے

وعدہ کو لازمی وفا بھی ہے
شرط کے واسطے جزا بھی ہے

کاوشِ خارِ غم کا حال نہ پوچھ
کچھ کھٹک بھی ہے کچھ مزا بھی ہے

مزا ہے زہد کا رندی کیساتھ اے واعظ
شرابِ شب کو پئے دن کو روزہ دار رہے

تیغ سے وقتِ ذبح مل مل کے
رو لئے خوب حوصلے دل کے

وہ جب آئے برنگِ بادِ بہار
ہو گئے گل چراغ محفل کے

جب ابھار اشباب نے ان کو
لے اُڑے مجھ کو ولولے دل کے

دل کو تھامے ہوئے نکلتا ہے
جو نکلتا ہے تری محفل سے

دم لے اے چشمِ تر آنسو نہ بہا رہنے دے
خوں شدہ دل کا مرے کچھ تو پتا رہنے دے

دل کو لے لے مگر او تیرِ فگن دل کی جگہ
ناوک اپنا مرے سینے میں پڑا رہنے دے

اشاروں سے کیا کرتے ہو باتیں
زباں کا کام لیتے ہو نظر سے

کوئی تاثیر دکھائے کششِ دل ایسی
کہ طبیعت کی طرح آئیں نہ آنیوالے

عابد

عابد:۔ میرزا خاں صاحب دہلوی خلف و تلمیذ حضرت سالک دہلوی۔ نہایت خوش گو اور نکتہ سنج تھے۔ دہلی اور حیدر آباد کی ہیرا پھیری میں کلام ضائع ہو گیا پانچ چھ سال ہوئے قریباً چالیس برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

ایک تو موسمِ گل اس پہ گھٹا ہے واعظ
دل پہ کس طرح سے قابو رہے میخواروں کا

شمع پروانے کو محفل میں جلا کر نہ بچی
دیکھو انجام یہ ہوتا ہے دِل آزاروں کا

نقدِ جاں عشق کو درکار ہے لے بوالہوس
جنس ارزاں ہو تو مجمع ہو خریداروں کا

اہلِ ظاہر پہ کھلے کیا مدعا منصور کا
کس طرح کو نہ نظر پا جائے مضموں طور کا

اتفاقاً مل گئے ہو آج تو مدت کے بعد
ماجرا سننا پڑے گا عابدِ مہجور کا

عابد

عابد:- منشی دیبی دیال خلف منشی لبسنت رائے قوم کایستھ ساکن قنوج ضلع فرخ آباد قنوج میں وکالت کرتے تھے۔ ۱۲۹۱ھ تک حیات تھے۔ ان کا دیوان انھیں کی زندگی میں شائع ہوگیا تھا۔ تلمّذ کا حال معلوم نہ ہوسکا۔ شاعر معمولی درجہ کے تھے۔ کلام میں رطب ویابس موجود ہے۔ قدیم تخییل صنائع بدائع مضمون آفرینی کو شاعری کی روح و رواں جانتے تھے خیال کی رسائی ضلع جگت کے دائرہ تک تھی۔ اِن کے دیوان سے اشعار ذیل منتخب کئے گئے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

آیا گلشن میں جو خنداں گلِ رعنا میرا
خوب سرسبز ہوا نخل تمنّا میرا

ہجر مہ وش میں جو کاہش مجھے ہر شب کو رہی
بدر نے سیکھ لیا ہے وہی گھٹنا میرا

سوز فرقت نے جو اشکوں کا بہایا دریا
اس میں ماہی کی جگہ ہونگے سمندر پیدا

جوانی ہے جو لطفِ عمر پیری ہے مآل اس کا
مثل مشہور ہے یہ ساتھ ہے چولی داماں کا

کہا میں نے کہ کہتا ہوں میں سوزِ دل سرِ محفل
کہا اب تک یہ پوشیدہ ہے سب ماجرا چپ چپ

کہا میں نے پریشاں حال کس نے کردیا مجھکو
کہا دشمن تری ہے زلف کی کالی بلا چپ چپ

کہا میں نے یہ کس سرمے نے میری کھولدیں آنکھیں
کہا میرے قدم کی خاک ہے وہ توتیا چپ چپ

عقبیٰ میں جب کہ دیکھیگا حق نامۂ عمل
عابد جھکا کے سر کو کہیگا خطا معاف

ملنا اگر ہو وصل کا وعدہ ہو راست راست
کہنے کبھی ہو صبح کبھی شام واہ واہ

بند مخمّس بر غزل ذوق مرحوم

جام مئے دلدار کی تشبیہ اب میں کس سے دوں
خورشید کو جام کو میں ماہ کس منہ سے کہوں
سیدھی یہی اک بات ہے شام و سحر کہتا رہوں
جام بلوریں میں ہے یوں عکس شراب لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نور سحر رنگ شفق

عابد

عابد:- میر عابد حسین شاگرد مشتاق۔ خیال بند۔ الفاظ پرست شاعر ہیں۔ قدمائے لکھنؤ کے خوشہ چیں ہیں۔ نمونۂ کلام نذر ناظرین ہے۔

پسِ مردن بھی باقی ہے نشاں وحشت کے ساماں کا
ہمیں چاک کفن پر ہے گماں چاک گریباں کا

کھلا کچھ بھی نہ رازِ لن ترانی
ہوئے بیہوش موسیٰ کیا سمجھ کر

یکتائی صنم کے تو ناصح مقر ہیں ہم
تشبیہ اس کو خیر نہ دینگے خدا کے ساتھ

عابد

عابد:- میر عابد علی شگفتہ طبع۔ سادہ بیان۔ معنی آشنا سخنور تھے۔ اخبار کارنامہ سے ایک غزل کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

زلفوں میں پھنسکے سینکڑوں جھٹکے اُٹھا چکا
کیا پوچھتے ہو خاک کہوں ماجرائے دل

دونوں کا ایک حال ہے ایذائے ہجر میں
روتا ہے میری واسطے دل میں برائے دل

سُنتا ہوں آجکل وہ خریدار دل کے ہیں
دھوکے سے جاکے کوئی مرا بیچ لائے دل

اُٹھنے کو بزم یار سے عابد اُٹھے مگر
ہر ہر قدم پہ مُنہ سے نکلتا ہے ہائے دل

عابد

عابد:- سید عابد حسین صاحب لکھنوی شاگرد جناب فصاحت۔ خوشگو خجستہ فکر۔ زبان میں روانی۔ کلام میں مضمون آفرینی اور سادہ بیانی قابل داد ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

بھروں دم پھر بھی اُلفت کا تمہاری
اگر زندہ ہوں میں سو بار مر کے

رقیبوں کی خوشی تھی ان کو منظور
مری میت پہ آئے بن سنور کے

نہ جائیں گے تری جنت میں واعظ
رہیں گے کوچۂ جاناں میں مر کے

مری میت کو دفنا کر وہ بولے
ہوئے ختم آج جھگڑے عمر بھر کے

جیئے بھی تو جیئے ہو کر اسیر قید تنہائی
خضر بارہ آئے ہم ایسی حیات جاودانی سے

بھلا نامہ تو کیسا سانس کا لینا بھی مشکل ہے
یہ اپنا حال فرقت میں ہوا ہے ناتوانی سے

عابد

عابد:- قاضی سید عبد العلی ولد مشیر الدولہ سفیر الملک قاضی سید جمشید علی خاں صاحب جم مرحوم۔ وکیل عدالت شفائے مرادآباد میں ناسور اور اخبار مخبر عام کے ایڈیٹر تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ مولانا محمد صالح اتالیق بادشاہ عالمگیر آپ کے مورث اعلے تھے جن کو سلطان شاہجہان کی سرکار سے پرگنہ حسن پور ضلع

مراد آباد میں محمد پور وغیرہ سات آٹھ گاؤں معافی دوام عطا ہوئے تھے۔ وہیں توطن اختیار کیا۔ ان کا انتقال ہو جانے کے بعد سید محمد سعید اس جاگیر کے مالک ہوئے اور پرگنہ حسن پور کی قضا کا عہدہ حاصل کیا۔ جو نسلاً بعد نسلٍ اس خاندان میں منتقل ہوتا رہا۔ اس عہد میں جاگیر کا رقبہ ایک لاکھ بیگھہ کے قریب تھا۔ جو ۱۸۵۷ء میں سرکار انگریزی نے ضبط کر لیا آپ کے والد قاضی سیّد محمد جمشید علی خاں صاحب جمؔ میرزا غالب کے شاگرد عزیز اپنے زمانے کے مشہور مؤرخ اور نامور اخبار نویس تھے۔ اخبار جام جمشید اور رہیلکھنڈ پنچ مراد آباد کی ادارت کے علاوہ ریاست جے پور میں سر رشتہ دار فوجداری۔ کوئٹہ میں حاکم اپیل رہے۔ ممتاز الدولہ صاحب حکیم محمد سلیم خاں صاحب چیف سکرٹری کونسل جے پور بہت قدر دانی فرماتے تھے۔

عابد صاحب ۱۹ صفر ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ میر جویا صاحب مرحوم منشی ریاست جے پور نے ولادت کا قطعہ کہا جس کا آخری مصرع یہ ہے ؎ ع۔ سال تاریخ اوبلند اختر آپ عربی۔ فارسی۔ انگریزی زبان سے واقف ہیں۔ فن شعر گوئی میں ابتداً اپنے والد ماجد کو کلام دکھایا کرتے تھے۔ اسی دوران میں شوکت باغ کے مشاعروں کا آغاز ہوا۔ حضرت داغ بھی رامپور سے تشریف لا کر بزم سخن میں شریک ہوتے تھے۔ آپ نے جناب داغ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور پہلی تخئیل کو زبان اور سادگی کے قالب میں ڈھال کر نہایت دلاویز بنا دیا۔ غزل گوئی کے علاوہ تاریخ گوئی میں اعلےٰ درجہ کا ملکہ تھا۔ داغ مرحوم ہمیشہ آپ کو فخر داغ کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ حاسدانہ طور پر آپ پر جو اعتراضات شاعری اور تاریخ گوئی کے متعلق شائع ہوئے تھے۔ ان کو جناب جلال اور حضرت امیرمینائی نے غلط اور نامعقول قرار دیا۔ انجمن ہمدرد سخن جو ترقی اردو کے لئے مراد آباد میں قائم ہوئی تھی۔ جس میں صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں شرر۔ صاحب زادہ شبیر علی خاں شبیر۔ حضرت مضطر خیر آبادی۔ جناب جلیل وغیرہ شریک تھے۔ آپ اس کے سکرٹری بنائے گئے

تھے۔اپنے استاد کو صاحب طرز اور یکرنگ مانتے ہیں۔ اور مسئلہ جانشینی داغ کے ابتدا سے مخالف ہیں۔ اور اس کے متعلق با اثر اخبارات میں مضامین نکالتے رہے ہیں۔ اصناف سخن پر قادر ہیں اور محاورات سے ماہر۔ علمی۔ تاریخی اور اخلاقی مضامین کثرت سے لکھے ہیں چند ناول چھپ کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ فن سخن میں منشی محمد عبدالرزاق اثر۔ شیخ احمد بخش حسرت۔ منشی منظور احمد منظور۔ مولوی محمد علی ہوش۔ مولوی عاشق حسین عاشق۔ عبدالغنی فغاں۔ مولوی علی احمد ثمر آپ کے شاگردوں میں ہیں۔

عابد صاحب سرخ وسفید رنگ۔ خوشنما خط و خال۔ متوسط قد و قامت کے آدمی ہیں مزاج میں شوخی و ظرافت ہے۔ رامپور کے نامی مشاعروں میں داد سخن لے چکے ہیں۔ انجمن اتحاد سخن دہلی کی تحت جو مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے۔ زود گوئی میں فرد ہیں۔ الفاظ کی نشست۔ بندش کی خوبی روزمرہ۔ بول چال داغ کی شاگردی کا اظہار کرتی ہے۔ ہر شعر گلزار داغ کی شگفتہ کلی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں سادگی اور مضمون آفرینی کا رنگ ہے۔ مفتی تفضل حسین نے جو کلام روانہ کیا۔ اس کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

پیر میخانہ سے اے شیخ ہے بیعت لازم
سلسلہ ساقی کوثر سے ہے میخواروں کا

چھوڑ کر غیر کو وہ ساتھ ہمارے آئے
ایک چلتا ہوا فقرہ جو سنا یاروں کا

صدمۂ ہجر یہ ہم صبر تو کرتے لیکن
کام وہ کیا کریں جو کام ہو بیکاروں کا

آؤ اب مل کے بہم شکوۂ قسمت کرلیں
تم ہمارے نہ ہوئے غیر تمہارا نہ ہوا

چل دیا صبح شب وصل یہ کہکر مجھ سے
اب بھی کمبخت کلیجہ ترا ٹھنڈا نہ ہوا

تم سنو بھی تو سناؤں تمہیں دردِ فرقت
تم کو بھی جو کہوں ہجر میں کیا کیا نہ ہوا

آہ و فریاد کو روکیگی یہ چلمن کب تک
وہ سنیں گے نہ مرا نالہ و شیون کب تک

منتظر راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں بیک نظر
تم چھپاؤ گے نظر بازوں سے جوبن کب تک

وہ داستان درد جگر سن کے ہنس دئے
ایسوں سے کیا کہے کوئی پھر ماجرائے دل

ظالم کوئی حساب بھی ہے ظلم کا ترے
کتنے جگر دکھائے ہیں کتنے ستائے دل

جور سپہر ظلم بتاں صدمۂ فراق
بڑھ کر ہے ان بلاؤں سے مجھ پر بلائے دل

عابد کو عرض حال میں کیا عذر ہے مگر
دل سے کوئی سنے تو کہے ماجرائے دل

انہیں کیا نسخۂ قرآں اب اٹھاتے ہو نہ ملنے کا
جو مدت تک حمائل رہ چکے ہیں میری گردن میں

یہ حسیں روز نیا دل جو لیا کرتے ہیں
کچھ نہیں کھلتا ہے کیوں لیتے ہیں کیا کرتے ہیں

شوخیاں کہتی ہیں کھل کھیلو کہاں کا پردہ
شرم کیا چیز ہے کیوں آپ حیا کرتے ہیں

ماننے کی نہ ہو جو بات وہ مانیں کیونکر
آپ سو بار کہیں ترک جفا کرتے ہیں

اس شکل سے اب دیکھ لیا کرتے ہیں ان کو
اغیار کی محفل میں کبھی راہ گذر میں

کیا شیخ نے دیکھا کوئی صورت نہیں دیکھی
ڈھونڈینگے بتوں کو ہمیں کعبہ کے سفر میں

پردہ میں بھی پردہ ہے کوئی آنکھوں کا پردہ
دل میں مرے تم رہتے ہو پھرتے ہو نظر میں

نہیں کھنچتی نزاکت سے اگر تلوار تھوڑی سی
کٹے جھگڑا ہلا دے ابروئے خمدار تھوڑی سی

وہ کچھ ایسے بگڑ بیٹھے منائے سے نہیں ملتے
ہوئی تھی باتوں باتوں میں یونہی تکرار تھوڑی سی

مے سے توبہ میں کروں اے شیخ جی اچھی کہی
بس چلو رخصت مرے اب کان کیوں کھانے لگے

صدقے اس شوخی کے اس انداز کے اس ناز کے
آپ ہی چھیڑا مجھے اور آپ شرمانے لگے

یہ سب کچھ ہے کہ ضبط غم سے میری غیر حالت ہے
مگر ان سے کہوں کیا دور کی صاحب سلامت ہے

کیا شکوہ رقیبوں سے جو ملنے کا تو فرمایا
تمہیں کیوں رشک آتا ہے یہ اپنی اپنی قسمت ہے

گراں ہے دیکھنا کیا تم کو دزدیدہ نگاہوں سے
کوئی قیمت بھی ہو دل کی فقط اتنی ہی قیمت ہے

شکایت کیا کروں عابد میں انکی بد مزاجی کی
خفا ہونا بگڑنا روٹھنا بچپن کی عادت ہے

عاجز

عاجز :- سید محمد مبین صاحب ۱۹۰۴ئہ میں بماہ دسمبر بمقام بلتھو ضلع گیا پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تعلیم گھر ہی پر پائی ہے ۱۹۲۹ئہ میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ مقامی مشاعروں سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں حضرت نشتر بلتھوی کو اپنا کلام دکھلایا۔ ان کی وفات کے بعد سے جناب احسن مارہروی سے تلمذ ہے زبان اور معاملہ بندی کی طرف طبیعت رجوع ہے۔ ابھی تو مشق ہیں۔ کلام مرسلہ کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہائے لوٹا ہے تمہاری ان اداؤں نے مجھے
داور محشر سے شکوہ کرکے میں نادم ہوا
کس کے دردِ عشق سے عاجز دل افسردہ ہے تو
پردہ میں رہنے لگے عاشق سے شرمانے لگے
مجھ کو عاجز اُنکے آنے کی عبث امید ہے

چال متوالی۔ جوانی۔ آنکھ شرمائی ہوئی
یک بیک دیکھی جو آنکھ اس بت کی شرمائی ہوئی
شکل تیری کیوں نظر آتی ہے مرجھائی ہوئی
جب شباب آیا تو وہ کیا کیا ستم ڈھانے لگے
کب مرے گھر آئے ہیں جو آج وہ آنے لگے

آئی بہار جاں فزا
جاتی رہی سب خستگی
ہر شاخ ہے پھولی پھلی
کیا یاسمن کیا یاسمین
ایک ایک پتّی ہے ہری
پڑھتی ہے بلبل برملا
دلکش فضائیں باغ کی
مثل بتان آذری

لائی نوید دل کُشا
بڑھنے لگی دل بستگی
گُل بن گئی اک اک کلی
ہر نخل ہے وجد آفرین
پھولوں کی ڈالی ہے بھری
صلّ علےٰ صلّ علےٰ
ٹھنڈی ہوائیں باغ کی
کرتی ہیں کیا کیا دلبری

دیکھو تو عاجز یہ سماں
بدلے زمیں و آسماں

رباعیات

لوٹے گی خزاں آ کے بہار ہستی ہو جائیگا ویران دیارِ ہستی
اس باغ خیالی پہ نہ پھول اے عاجز مٹ جائینگے سب نقش و نگار ہستی

دیگر

عبرت کا مرقع ہے جہاں ہستی ہوتا ہے فنا جلد نشان ہستی
اِک آن میں اِک چشم زدن میں عاجز ہو جاتی ہے خاموش زبانِ ہستی

عاجز

عاجز:۔ جناب پیر شیر محمّد صاحب صدّیقی چشتی نظامی خلف پیر حیات محمد صاحب ساکن گھانگہ خورد ڈاک خانہ جلال آباد ضلع فیروز پور۔ آپ کے مورث اعلیٰ شیخ شہاب الملک بخارا سے ہندوستان تشریف لائے۔ اکبر بادشاہ نے ان کی کشف و کرامت کا شہرہ سنکر ایک بڑی جائداد خانقاہ کے لئے مرحمت فرمائی۔ شاہی عہد کے بعد سرکار انگریزی نے بھی اس خاندان کی بزرگی کا احترام کیا اور چند گاؤں عطا کئے سگ گزیدہ کا عمل آپکے خاندان میں نہایت مجرّب بتایا جاتا ہے۔ آپ کی عمر اس وقت پچاس سال سے زائد ہے۔ اردو۔ فارسی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف ہیں اوائل مشق میں اپنا کلام جناب منشی حیات بخش صاحب رسا مرحوم مقرّب نواب رامپور و تلمیذ جناب داغ کو دکھاتے رہے۔ چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے رہے:۔

"عاجز کو شاعری کا سلیقہ بھلا کہاں
ساری عنایت اس پہ جناب رسا کی ہے"

کلام میں جگہ جگہ تصوّف کی چاشنی ہے۔ ایک دیوان کرشمۂ عشق اور ایک رسالہ موسوم بہ ترانۂ حبیب آپ کی تصنیف ہے۔ ترانۂ حبیب میں نعتیہ کلام ہے اور دیوان میں عشقیہ غزلیات۔ اور قطعات تاریخ۔

کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض غزلیں غیر اصلاحی ہیں۔ متروکات

اور حشو و زوائد سے کہیں کہیں مستغنی ہو گئے ہیں۔ تاہم مجموعی حیثیت سے کلام قابل مطالعہ ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

کوئی ساعت کا مہماں ہے مریض ناتواں تیرا
لبوں پر جان ہے اور نام ہے وردِ زباں تیرا

بتائیں نام و نشاں کیا کہ اہل غربت ہیں
وہی مکان ہے شب کو جہاں قیام کیا

غرور حسن کچھ ایسا ہے ان کو اے عاجز
جواب تک نہ دیا ہم نے جب سلام کیا

قاصد کو بتایا نہ پتا رشک سے ہم نے
چکر میں ہے کمبخت کو اب گھر نہیں ملتا

ضعف سے کوچے میں تیرے بیٹھ جاتا ہوں اگر
آنکھ دکھلاتا ہے ہر روزن تیری دیوار کا

ہوں میں وہ مایوس دنیا میں کہ جس نے عمر بھر
خواب سوتے میں نہ دیکھا طالع بیدار کا

بیخودی نے دی مجھے سیر بیاباں سے نجات
سو گئے جب پاؤں پھر خطرہ رہا کیا خار کا

بجائے فرش میں آنکھیں بچھاتا
تو اپنے وعدے پر آیا تو ہوتا

حلقۂ بندگی یار کیا زینتِ گوش
عاجز آفاق میں اس وجہ سے مشہور ہوا

ملے ہیں خاک میں حسد حیف شاہانِ جہاں کیا کیا
ہوئے ہیں ریزہ ریزہ آج انکے استخواں کیا کیا

پلٹ کر کوئی بھی آیا نہ ابتک کنجِ مرقد سے
گئے ملکِ عدم کو کارواں در کارواں کیا کیا

بن گیا وجہ تسلی جب وہ پہلو میں رہا
اٹھ گیا پہلو سے جس دم آفت جاں ہو گیا

اس بہانا جو نے بلایا ہے جو محفل میں مجھے
ہو نہ ہو پھر کوئی تازہ ستم ایجاد کیا

نام سر نامے پہ دیکھیگا جو وہ قاتل مرا
قتل خط پڑھنے سے پہلے نامہ بر ہو جائیگا

ہو بغیر از گوشۂ عزلت کسے حاصل کمال
بے صدف کیا قطرۂ نیساں گہر ہو جائیگا

ہوئی ہے فقر کو دل بستگی بہت ہم سے
ہمارے تن سے خط بوریا نہیں جاتا

ہو گیا عہد جوانی خواب غفلت میں بسر
کب کھلی آنکھ آ گیا جب اپنے سر آفتاب

حسن کی میزان میں تولا تجھے جب عشق نے
تو زمیں پر رہ گیا پہنچا فلک پر آفتاب

نہ بر آئی کوئی امید میری واہ ری گردش
ستارہ روز پیدائش سے ہے برجِ نحوست میں

غربت نے شہر شہر کیا در بدر مجھے
آرام کا ملا نہ کہیں ایک گھر مجھے

زخم کھا کھا کے ہم رہے زندہ
تیغ میں آب زندگانی ہے

دیر و کعبہ میں تجھ کو ڈھونڈھ آئے
مدّتوں ہم نے خاک چھانی ہے

پوچھتے کیا ہو زیست کا احوال
ہجر میں خاک زندگانی ہے

قطعہ تاریخ رحلت حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

گلزار شاعری میں خزاں ہی خزاں نہ ہو
بعد از امیر داغ بھی کر بیٹھے انتقال

عاجزؔ فلک کے ہاتھوں سے یہ بے نصیبی ہوئی
ضامن علی جلال کا صدمہ ہوا کمال

عاجزؔ

عاجزؔ:- محمد حیات نواح وزیر آباد (پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ از خاندان حاجی صاحب جو اس علاقہ میں کامل بزرگ گذرے ہیں۔ عمر ۳۰ برس سے زاید ہو گی۔ اکثر رسالوں میں کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ پہلے آپ نے حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔ آپ کی ابتدائی مشق تھی کہ جناب ظہیر کا انتقال ہو گیا۔ پھر آپ مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی کو اپنا کلام دکھلانے لگے۔ پہلے ثابت تخلص تھا پھر عاجزؔ ہو گئے۔ طبیعت موزوں اور ذہن رسا ہے۔ بندش کی صفائی پر کم توجہ دیتے ہیں۔ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:-

وہ عدو کے گھر میں جا نکلے مرے دھوکے سے کل
بخت برگشتہ کے صدقے میری قسمت دیکھنا

سر ہتھیلی پہ جو رکھ لے تو وہ آگے آئے
در جاناں پہ جو پہنچے تو یہ لکھا دیکھا

چمن میں بلبل نالاں جو تیرا آشیاں ہوتا
کہیں صیّاد کا کھٹکا کہیں بیم خزاں ہوتا

تری نظروں سے گر کر گر گئے ہم چشم عالم سے
اگر تو مہرباں ہوتا زمانہ مہرباں ہوتا

بھلا یہ سرفرازی تھی کہاں میرے مقدر میں
کہ تم ہوتے مرے مہمان اور میں میزباں ہوتا

کم سنی ہے باز آؤ صحبت اغیار سے
رنگ بگڑا ہے زمانے کی ہوا اچھی نہیں

فائدہ اچھا ملا یہ پیار میں
مر مٹے ہم حسرت دیدار میں

دشمن جان سب زمانہ ہو گیا
کوئی دم میں ترا بیمار رخصت ہونیوالا ہے
برگشتہ رہا یہ فلک پیر ہمیشہ
ہرگز نہ مٹا گریہ سے اے دیدۂ نم ناک
لئے جاتا ہے دل راہ خطرناک محبت میں
پاؤں کیا ہو گئے قضا کے شل
کیا ہوئے اب وہ نالہائے رسا

پھل یہ پایا ان بتوں کے پیار میں
دم آخر تو چل کر دیکھ لے تو اپنے بسمل کو
بن بن کے بگڑتی رہی تقدیر ہمیشہ
رو رو کے مٹایا خط تقدیر ہمیشہ
خدا نے دی ہے کس ظالم کے ہاتھ میں عنان میری
کیوں شب غم ادھر نہیں آتی
آسماں کی خبر نہیں آتی

عابد **عابد**:- لالہ زور آور سنگھ کھتری دہلوی نبیرہ رائے انند رام مخلص۔ ان کو نصیر الدین عزت سے تلمذ تھا۔ طبیعت سادہ گوئی کی طرف مائل تھی۔ بیان میں برجستگی تھی۔ دو شعر جو دستیاب ہوئے ہیں درج تذکرہ کئے جاتے ہیں۔

عاشقوں کو نہ رہے اک جا نہیں آرام کہیں
شب مہتاب کس کمبخت کو ہجراں میں بھاتی ہے

دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں
کہ اس سے گرمیِ روز قیامت یاد آتی ہے

عاجز **عاجز**:- منشی کملا پرشاد صاحب عہد قدیم کے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ کلام میں جہاں آباد کی شاعری کا رنگ ہے۔ شاگرداں نصیر کا انداز ہے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

لائی نہ کبھی نکہت گیسوئے معنبر
عاجز نہ رکھو چشم وفا ماہ رخوں سے
بغیر دیدار روئے زیبا تڑپتے کبتک رہا کریں گے
بھرا ہے دل میں بخار کلفت تپ جدائی کی ہے حرارت

چل دور ہوائے باد صبا یاں سے ہوا ہو
جبتک کہ نبھے تم سے محبت کو نباہو
اجل تو جھگڑا چکا دے اپنا فراق میں جی کہاں تک تنگیں گے
اگر ہے سوز دروں سلامت دھوئیں لحد اٹھا کر نکلیں گے

عاجز **عاجز**:- مولانا شرف الحق کوتوال شہر دہلی شیخ جلال الدین تھانیسری کی اولاد میں سے تھے قبل از فساد غدر زندہ تھے۔ کلام میں مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ دو چار شعر جو کمال جستجو کے بعد ہاتھ آئے ہیں زیب دیدۂ ناظرین ہیں۔

مژگاں پہ مرے لختِ جگر آئے ہیں کیا کیا	یہ خار و خس اب دیکھ ثمر لائے ہیں کیا کیا
سنبل کو آج باغ میں ہے زندگی محال	اس سرو قد کی زلفِ گرہ گیر دیکھ کر
مدّت سے چھوڑ بیٹھا اس جسمِ ناتواں کو	دم تیرے دیکھنے کو آنکھوں میں آرہا ہے
کس کے یہ دیدۂ گریاں کی نظر ہے کہ اثر	کاہ جو دشت میں بے آب ہری رہتی ہے

عاجز

عاجز:۔ میرزا عبد اللہ بیگ دہلوی ابن میرزا احمد بیگ۔ میرزا صابر صاحب تذکرہ گلستانِ سخن کے دلی دوستوں میں سے تھے۔ بہت پُرلطف اور مزیدار شعر کہتے۔ طبیعت میں متانت اور شوخی تھی۔ مضامین سے سنجیدگی نمایاں ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

کہا نہ تھا کہ نہ کر برق تو مری تقلید	بتا کبھی بھی تجھے آج تک قرار آیا
لختِ دل صد پارہ ہے ہر نوکِ مژہ پر	ہے آج تو کچھ رنگ ہی اے دیدۂ تر اور
یاد آئے ہے جب اس نمکیں لب کا تبسّم	دیتے ہیں مزہ مجھ کو مرے زخمِ جگر اور
روتا ہوں تو ہنستے ہیں وہ کم ظرف سمجھکر	کرتے ہیں خجل مجھکو مرے دیدۂ تر اور

عاجز

عاجز:۔ اسمٰعیل خاں نبیرہ ملا شاہ نواز خاں۔ متوطن موضع نپسل۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ جوان خوش خلق۔ یار باش شائستہ مزاج ہیں۔ اگرچہ نومشق ہیں۔ مگر ذہن سلیم اور طبع مستقیم پائی ہے۔ یہ ان کا کلام ہے:۔

رکھتا ہے محبت جو کوئی آلِ نبی سے	عاجز نہیں کچھ خوف اوسے روزپسیں کا
جب سے لگن لگائی اُس خوبرو سے ہم نے	جوں شمع جلتے جلتے با چشمِ نم رہے ہیں
آکر کے جلد اپنے بیمار کی خبر لے	گنتی کے اب تو اُسکے دو چار دم رہے ہیں
نہ جاوے کہیں طوقِ جنوں گردن میں قمری کی	چمن میں سیر کرنے کو نہ اے سرو رواں جاؤ
جو کچھ بھی بے شب فرقت میں گذریگا سو گذریگا	یہی گر جاؤں جاؤں ہی تو پھر تم اے میاں جاؤ

عاجز

عاجز۔ نواب محمد حسن خانصاحب بریلوی۔ شاگرد میرزا عباس صاحب نادرو جناب نواب محمد عبدالعزیز خانصاحب عزیزؔ۔ بریلی کے موزوں طبع شعرا میں آپ کا شمار تھا۔ اساتذہ کے فیض سخن سے کبھی کبھی مشاعروں میں اچھا شعر نکال لیجاتے طبیعت موزوں پسند تھی۔ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

شمع ساں ہم شبِ ہجراں میں بسر کرتے ہیں
جلتے ہیں گھلتے ہیں رو رو کے سحر کرتے ہیں

سادہ ہی لیجا لفافہ نامہ بر آتا ہے شک
نام اس کا کیوں زبانِ خامہ سے تحریر ہو

کٹی ہجر کی کس مصیبت سے رات
مجھے اک گھڑی اک پہر ہو گئی

چھپایا تو ہم نے بہت رازِ دل
خدا جانے کیونکر خبر ہو گئی

تمہاری نظر مجھ سے کیا پھر گئی
کہ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو گئی

پیئے جو کفِ ساقی سے تو کہے ساقی
نہیں ہے زہد میں وہ لطف جو گناہ میں ہے

عاجز

عاجز۔ محمد فخر الدین بھاگلپوری۔ ان کا حال باوجود تلاش کے فراہم نہ ہو سکا۔ کلام کے دیکھنے سے آدمی طبیعت دار معلوم ہوتے ہیں۔ نیچرل رنگ میں ایشیائی شاعری کے مرقعے کھینچے ہیں۔ مگر مشرقی نازک خیالی اور الفاظ کی گلکاری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ ایک نظم کے چند بند درج ذیل ہیں۔

برسات آئی آگ بدن میں لگا چلی
مُنہ پر سے برق ابر کا گھونگھٹ اٹھا چلی

مژدہ دیا بہار نے ٹھنڈی ہوا چلی
میخانے پر برسنے کو اودی گھٹا چلی

دھانی لباس پہنے ہوئے ہر شجر ہے آج
خم کی ہو سیر ساقیٔ مہوش کدھر ہے آج

جوبن برس رہا ہے عروسِ بہار پر
گل بوٹے پتّے پتّے ہیں اپنے نکھار پر

نزہت غضب کی چھائی ہے ہر برگ و بار پر
جلوہ ہے شمع طور کا ہر نوکِ خار پر

بڑھ بڑھ کے پتّے پھولوں کے مُنہ چومنے لگے

مستی میں آکے نخل چمن جھومنے لگے

دلچسپ کیا ہی سبزۂ خودرو کی ہے بہار
دولھا بنا ہوا ہے ہر اک کوہ سبزہ زار

گلہائے تازہ پر ہے عجب تازہ تر نکھار
ہر برگ سے ہے قدرت صنّاع آشکار

اے ابر برشگال سحاب کرم ہے تو
سرچشمہ حیات خدا کی قسم ہے تو

عادل

عادل:۔ میر ریاست علی ابن میر منوّر علی۔ ولادت تقریباً ۱۸۹۴ء بمقام اورنگ آباد دکن۔ ان کے والد شاعری کا اعلےٰ مذاق رکھتے تھے۔ عادل صاحب کو ابتدا سے اساتذہ کا کثیر کلام ازبر یاد تھا۔ جب کچھ کہنے لگے تو حضرت آفت تلمیذ حضرت جلال کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذوق شاعری بھی ترقی کرتا گیا۔ فارسی میں منشی کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت جلیل سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینی شروع کی۔ امتحان جوڈیشل سرکار عالی میں کامیاب ہونے کے بعد اورنگ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔ نواب سالار جنگ بہادر کی اسٹیٹ سے خاندانی منصب کے علاوہ ایک موضع علاقہ سرکار عالی سے جاگیر ہے۔ انجمن عثمانیہ اورنگ آباد جو کم و بیش پچیس برس سے قائم ہے۔ اور جس میں ایک دارالاخبار اور کتب خانہ ہے۔ ایک عرصہ سے ان کی زیر نگرانی ہے۔ جو کلام روانہ فرمایا ہے اس کا انتخاب یہ ہے۔

آیا نہ رحم انہیں جو سُنی داستان ہجر
الزام دے رہے ہیں کہ کیوں دل دکھا دیا

عادل جہاں میں لاکھ حسیں ہوں تو ہم کو کیا
اپنا ہے بہ طریق جسے دل دیا دیا

جلد آجائیں وہ یارب جس نہیں بے چین ہیں
آج آغوش دعا ہے منتظر تاثیر کا

ظلم پر ظلم ڈھا کے دیکھ لیا
اس نے خوب آزما کے دیکھ لیا

کیا مزہ تیری تیغ ناز میں ہے
زخم پر زخم کھا کے دیکھ لیا

میرے رونے پہ رو دیا خود بھی
رونے والے۔ رُلا کے دیکھ لیا

پانی میں کوئی نقش سلامت نہیں رہتا
لیکن ترا نقشہ ہے مرے دیدۂ تر میں

اللہ رے کرشمے خلش نوک مژہ کے
ڈالے اسی بیدرد نے ناسور جگر میں

ایک کیا تجھ سے محبت ہو گئی
سارے عالم سے رقابت ہو گئی

بیاں ہجر کا اور زبانی ہماری
وہ چیخ اُٹھے سنکر کہانی ہماری

نہ چھوڑا غم ہجر نے مرتے دم تک
کٹی روتے ہی زندگانی ہماری

جب خبر دی ان کو قاصد نے کہ عادل مر گیا
ہائے یہ کیا ہو گیا۔ گھبرا کے فرمانے لگے

کالی گھٹا ہے چھائی اور مینہ برس رہا ہے
توبہ کہاں کی ساقی۔ لا دل ترس رہا ہے

نہ پوچھو آئینہ سے۔ مجھ سے پوچھو حسن تم اپنا
بہار گل کو دیکھا چاہیئے چشم عنادل سے

الٰہی مبتلا ئے درد فرقت ہو نہ دشمن بھی
گھڑی ایک ایک کٹتی ہے ہماری سخت مشکل سے

وہی ترچھی نگاہیں آجتک سینے میں چبھتی ہیں
ترے تیروں کی لذت کوئی پوچھے مرے دل سے

عارض

عارض :- منشی محمد وزیر علی نقشہ نویس پنشنر دہلی۔ کلام سلیس مضامین کی طرف دھیان رہتا ہے۔ اشعار ذیل نذر ناظرین ہیں۔

رہیگی بعد مردن بھی تری مٹی خراب ابدل
گئیے یہ دیدۂ تر گر ہمارے ساتھ مدفن میں

خاک نالہ رک سکے وحشت کی دارو گیر میں
پاؤں کی صورت زباں بستہ نہیں زنجیر میں

دل کو نکلے ہوئے پہلو سے زمانہ گذرا
اب جو کھٹکا ہے کھٹکتی کوئی حسرت ہو گی

عارف

عارف :- منشی شیو نرائن چودھری خلف بابو لالہ چودھری ساکن محلہ حاجی گنج۔ عمر تخمیناً ۰۰ برس۔ جناب شاد عظیم آبادی مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں۔ تصوّف کا مذاق ہے۔ زباں صاف ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ازل سے لائیے جو مستی بتھے اسکی خو نہ گئی
جو تھی خمیر کے اندر وہ رنگ و بُو نہ گئی

یہ طنز کہتی ہے پھولوں سے کھل کھلا کے کلی
تمہارا رنگ نہ بدلا ہماری خو نہ گئی

تو خال و خط کے محاسن کو چھوڑا اصل کو دیکھ
مکاں کی زینت و رونق مکیں کو چھو نہ گئی

ہیں روکے اشکوں سے خود اپنے ہو گیا ظاہر	حریم دل میں تری یاد بے وضو نہ گئی
وہ نخل تازہ و تر تھا خیال اے عارف	کہ سوکھ جانے پہ بھی طاقت نمو نہ گئی

عارف

عارف:- محمد احسن اللہ ساکن قصبہ سیمبھی ضلع اعظم گڈھ۔ شاگرد مولوی غلام عباس صاحب عباس مبارک پوری ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا۔ طبیعت فطرتاً موزوں تھی شعر کہنے لگے۔ اور کہتے کہتے مشاق ہو گئے۔ پہلے متخلص بہ اسم تھے مگر کچھ عرصہ سے وہ تخلص تبدیل کر کے عارف اختیار کیا۔ کچھ اخباروں کی نامہ نگاری بھی اکثر کی ہے۔ کلام میں ظرافت کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ رنگِ تغزل اچھا اور پاکیزہ ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

دورِ گردوں کا نہ شکوہ ہے نہ چشم یار کا	ہم تو روتے ہیں بس اپنی گردشِ تقدیر پر
تجھ کو اے ناصح نافہم بتائیں کیونکر	لے گئیں چھین کے دل اسکی ادائیں کیونکر
خوف ہے حضرت زاہد کو کوئی دیکھ نہ لے	سوئے میخانہ اگر آئیں تو آئیں کیونکر
بے آبرو ہوئے ہیں بہت چشم تر سے ہم	اشکوں کی طرح گر گئے سب کی نظروں سے ہم
کس درجہ راہ عشق میں ہیں بدگمانیاں	رہزن سمجھ کے ڈرنے لگے راہبر سے ہم
بوتل بغل میں ہاتھ میں جام شراب تھا	نکلے عجیب شان سے ساقی کے گھر سے ہم
ہمدوش کبھی اس بت کافر سے تو ہوتے	حسرت ہے کہ زنار برہمن نہ ہوئے ہم
سچ ہے بنے ہوئے آپ کبھی دوست کے بھی دوست	اے جاں کبھی دشمن کے بھی دشمن نہ ہوئے ہم
ملتے ہی آنکھ پہلو میں دل بھی تڑپ اٹھا	جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
ہوں تلاشِ یار میں یوں وقفِ گریہ و نالہ کش	جیسے کہتا ہو پپیہا پی کہاں برسات میں
ہیں وہ غم دوست کہ غم ہی کو سمجھتا ہوں خوشی	نالۂ درد ہے آواز ترنم مجھ کو
تارے گن گن کے شب ہجر کی عارف	کیا غنیمت ہوئے تنہائی میں انجم مجھ کو
اوصاف کوئے یار سے دل سے پوچھئے	گلشن کو پوچھئے تو عنادل سے پوچھئے

ان کا شب وصال بگڑنا غضب ہوا	جو مجھ پہ بن گئی وہ مرے دل سے پوچھئے

عارف:۔ نواب زین العابدین خاں۔ نواب غلام حسین خاں شرف الدولہ سہراب جنگ مسرور مرحوم کے خلف الصدق۔ نواب ضیا الدین احمد خاں نیر رخشاں کے بھانجے مرزا غالب کے شاگرد رشید اور سسرال کے رشتہ سے ان کے بھی بھانجے تھے۔ استاد کو حسن لیاقت و خداداد ذہانت کے سبب انسے کمال الفت تھی حضرت غالب ان کے کلام کو نہایت توجہ سے درست فرماتے اور ان پر فخر کرتے۔ اول اول چند غزلیں شاہ نصیر مرحوم کو دکھائی تھیں۔ پھر غالب کے سوا دوسرے کے طالب نہ ہوئے۔

عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۳۵ سال تک دنیا کی ہوا کھائی ۱۲۶۸ھ میں عالم قدس کو سدھارے۔ حالت نزع میں جب حضرت غالب عیادت کو تشریف لائے تو بستر پہ پڑے پڑے یہ شعر پڑھا۔

آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں	لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے

مرزا غالب نے حضرت عارف کی وفات پر ایک غزل بطور مرثیہ نہایت درد انگیز پیرایہ میں کہی ہے جس کا ایک ایک شعر جگر گداز ہے۔ یہ غزل مرزا کے اردو دیوان میں ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف	کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مرزا غالب نے عارف کے مرنے پر ان کے دونوں بیٹوں کو اپنے آغوش تربیت میں لیا۔ بچوں کی طرح پالا۔ اور متبنیٰ کیا۔ مگر افسوس کہ وہ ہونہار بھی غالب کے بعد عین شباب میں احباب کو داغ مفارقت دے گئے۔ حضرت عارف کے بڑے بیٹے نواب باقر علی خاں کامل ریاست الور میں ایک اعلےٰ عہدے پر ممتاز تھے۔ اور چھوٹے بیٹے حسین علی خاں شاداں دربار رامپور کے شعرا میں تھے۔

حضرت عارف کے غیر مطبوعہ کلیات میں بیس ہزار سے کم اشعار نہ ہونگے نہایت پُر گو شاعر تھے۔ غضب کی آمد تھی۔ اکثر غزلیں ساٹھ ساٹھ شعر کی ہیں۔ اور ہر شعر کا رنگ نرالا ہے۔ کوئی شعر معرفت اور تصوّف کے رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے۔ تو کسی میں حسن و عشق کا افسانہ ہے جب یہ مرزا غالب کی رہنمائی سے تخئیل کی دنیا میں پہنچ جاتے تو اس وقت اہل مشاعرہ دنگ رہ جاتے۔ اور ان کا کلام بلاغت نظام۔ ذوق۔ مومن۔ عیش وغیرہ سے ٹکرا جاتا۔ اور یہ ان سے مقابلہ کرنے میں مردِ میدان بنے رہتے۔ طبع رسا کے زور نے ۳۰ - ۳۲ کی عمر میں انہیں مسلّم الثبوت استاد منوا دیا تھا۔ الفاظ کی شوکت۔ بندش کی نزاکت۔ محاورات کی نشست ایسے بزرگوں کے دم قدم سے میر و میرزا کے جذبات کو زندہ کر رہی تھی۔ اگر عارف اور انور دونوں عمر طبعی پاتے تو اوّل الذکر کے خیالات کی رسائی اور آخر الذکر کا حسن بندش اُردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیتا۔ دیکھو حضرت عارف سیدھی سادی معمولی بات کو کیسی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں ؎

نہ آئے سامنے میرے اگر نہیں آتا مجھے تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

ایک جگہ انسانی زندگی کے درد انگیز پہلو کو یوں دکھاتے ہیں: ؎

برعکس ہُوا کرتے ہیں سب کام ہمارے اس واسطے مرنے کی تمنّا نہیں کرتے

شوخی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ؎

دھوکے میں آکے باغِ جناں ہی چلے گئے دِل میں خیال کوچۂ جاناں کئے ہوئے

سادگی سے باغِ جناں پر کوچۂ جاناں کا دھوکہ کھایا ہے۔ عجیب پُر لطف پیرایہ ہے حضرت عارف کے دیوان میں حسن کے شرارے۔ عشق کی دبی ہوئی چنگاریاں۔ فلسفہ تصوّف کے نادر مضامین اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مرثیہ اور سلام کا بہت شوق تھا۔ پانچ چار قصیدے بھی بہادر شاہ

ثانی اور میرزا فخرالملک ولی عہد کی شان میں بڑے زور کے لکھے تھے۔ افسوس ہے کہ لواحقین کی بے پروائی سے آپ کے کلام کی اشاعت نہ ہوئی۔ کلیات جو ایک نایاب چیز ہے مؤلف تذکرہ کے پاس موجود تھا۔ جودتِ ذہن اور تیزیٔ فکر نے ان کے جسم کو لاغر اور کمزور کر دیا تھا۔ وہ سال دہلی کے واسطے کسقدر منحوس ہوگا جس میں سپہرِ سخن کے تین ستارے اپنی حیات کا دورہ ختم کر کے عازمِ فنا ہوئے۔ یعنی حضرت عارفؔ جناب مومنؔ۔ میر تسکینؔ نے دنیا کو خیرباد کہی۔ میرزا قربان علی بیگ سالکؔ نے تینوں کے متعلق یہ قطعہ تاریخ وفات کہا۔ ؎

برس دن میں موئے یہ تین شاعر
کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت
رہی فکر اس کی سالکؔ کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب
ارم میں عارف و تسکینؔ و مومن

کلام کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

وہ صدمہ ہے شکستِ دلِ ناامید کا
گرتا ہے ساتھ کنگرہ عرشِ مجید کا

ہزاروں بار روز حشر ہو کر ہو گیا آخر
میں اب تک منتظر بیٹھا ہوں صبح شام ہجراں کا

یہاں تک چلتے چلتے تنگ اپنی جاں سے آئے
کہ لب پر آ گیا ہے دم تری شمشیر بُرّاں کا

ہماری خاک سے اسکو کدورت کب کی تھی یارب
سکھایا ہے اسے چلنا اُٹھا کر جس نے داماں کا

بخیہ گر جل گئے کیا ہاتھ ترے سوزش سے
کرتے کرتے جو رفو چاک جگر چھوڑ دیا

اے فلک خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو
وحشت میں ہنستے ہیں مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا

مہ و خورشید کی صورت کو ترستا ہے جہاں
دودِ آہِ دلِ سوزاں کی وہ چھائی ہے گھٹا

صبح ہجراں کی مصیبت جو یہ ہوتی معلوم
میں شبِ وصل کی ہرگز نہ تمنا کرتا

نہ آئے سامنے میرے اگر نہیں آتا
مجھے تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

کیونکر کروں نہ ناز کہ تصویر ہو گیا
تکتا ہوں جب سے میں تری صورت کھڑا ہوا

دیکھ کے اِک بار ہی اس کو یہ بیخود ہوئے
اُٹھکے میں دَیر سے یوں کعبے کو جاؤں عارف

ہنگامے کیسے رہتے ہیں اپنے سبب سے واں
اس ضعف کا بُرا ہو کہ ناکام رہ گئے

موت کے اپنی دعا پر مجھ کو ہنسوانا نہ تھا
گر ازل میں مجھ کو دیتے مانگنے کا اختیار

حذر کر اب تو کہیں لہو و لعب سے عارف
وفور نشۂ صہبا سے جھک گئیں آنکھیں

سخت جانی مری توڑے گی ہزاروں خنجر
تم اپنی زلف سے پوچھو مری پریشانی

دیوانگی میں غیر کو دوں خاک گالیاں
نامۂ اعمال میرا واں جو کھولا ناگہاں

کونسا شہر میں عالم ہے نہ جس پاس گئے
اس کو ہی پی کے مست رہے ہم تمام عمر

عارف بتوں سے اسکو محبت اگر نہ تھی
شیخِ حرم کو جس نے برہمن بنا لیا

جو کعبہ میں ہے ہے وہی بتخانہ میں جلوہ
دل لگا کر یس کہ رہتے ہیں پریشاں روز و شب

بلبل ناداں ہوا آہ یہ عارف نظر
پی کر تو دیکھ پیالہ کہ کیا ہے شراب

اس ننگ کا عالم شاید آپ نے دیکھا نہیں

پھر نہ ہوا حشر تک بار دگر دیکھنا
کیا کروں جبکہ ہو قسمت میں مسلماں ہونا

ہم سے ہی نام کوچۂ جاناں نکل گیا
آج اس کا اپنے ہاتھ سے داماں نکل گیا

ہو کے بیمار محبت میں جو صحت مانگتا
خضر کی عمر اور میخانے کی خدمت مانگتا

سفید بال ہوئے موت کا پیام آیا
شراب پینے سے اُلٹا اُسے حجاب آیا

دم نکلنا تو کچھ ایسا نہیں آساں میرا
کہ حال اسکو ہے معلوم ہو نہ ہو میرا

اب مانتا ہے کون بُرا میری بات کا
تھا گماں روز قیامت پر شب دیجور کا

رشک سے نام مگر تیرا بنایا نہ گیا
خونِ جگر بہیں شدت سے جوش ہو گیا

کیوں کعبہ ان کے غم میں سیہ پوش ہو گیا
اس بت کے در پہ ہم نے ہمیشہ مسکن بنا لیا

اک پردہ ہے سو شیخ حرم اٹھ نہیں سکتا
پشت دست عاشقاں ہے وقف دنداں روز و شب

دیکھتے ہیں حضرت غالب کا دیواں روز و شب
مست تو ہے شیشۂ گلنار بے سبب

آپ جو کہتے ہیں ہم رکھتے نہیں اپنا جواب

میں تو مر جاتا وہیں غیرت سے کوہ طور پر
اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے موسیٰ جواب

آتش و ناسخ کا سمجھا ہے کہیں یہ بھی کلام
لکھ سکے عارف غزل کا میری کوئی کیا جواب

چرخ تک جا کے نہ بدنام ہو لے نالۂ دل
بیٹھ جانے کو ہے یہ سقفِ کہن آپ سے آپ

کس نے دل اس کا دکھایا ہے جلا کر یارب
رو رہی ہے جو کھڑی شمع لگن آپ سے آپ

فرقت میں ہو جیو نہ جدا مجھ سے بیخودی
ہم اور تو یہ کاٹیں گے مل کر تمام رات

کھویا گیا ہے مہر بھی دیکھ اس کی تیرگی
بس ہو چکی یہ اے غم ہجراں تمام رات

گر موت ہی نہ آئے تو کیا کیجے ہجر میں
کرتا رہا ہوں مرنے کے ساماں تمام رات

رہتا ہوں دن کو دیر میں مسجد میں رات کو
کافر تمام دن ہوں مسلماں تمام رات

پھر دشمنوں کی خاک شکایت کریں بھلا
جب دوست دیکھ سکتے نہیں آرزوئے دل

باتیں ہزار پیچھے بناتے ہیں بیٹھ کر
مقدور کیا کہ بول سکیں روبروئے دوست

دل اسی پاس ہے میں بیکے رہوں گا اس سے
پیچ کرتی ہے تری زلف گرہ گیر عبث

دریائے خوں سے بھی نہ بجھی جبکی تشنگی
ہم سے ہو لیسے خنجر بُرّاں کا کیا علاج

گو زخمہائے تن مرے بھر آئے چارہ گر
اے بیخبر جراحت پنہاں کا کیا علاج

گرائی برق نگہ اس نے کعبۂ دل پر
غضب ہوئی ہے تری چشم سرمہ سا گستاخ

ہمارے خون پہ جمانے لگی ہے رنگ اپنا
ہے اس کو پاؤں تلے نوکہ ہے حنا گستاخ

ساغر اِک ہاتھ میں اِک ہاتھ میں مینائے شراب
ہے یہ انداز ترا ساقیِ سرشار پسند

دِل میں رہا کیا غم جاناں تمام عمر
گھر سے گیا نہ میرے یہ مہماں تمام عمر

آنے دو وہ بھلا روز قیامت کو بھی اِک دن
ناپیں گے ترے قامت رعنا کے برابر

مت چھوڑ کے جا مجھ کو تڑپتے ہوئے قاتل
اِک ہاتھ لگا اور بھی تو آ کے برابر

ہم بیکسوں کا آن کے تو ہی ثواب لے
اے موت رحم کر مرے حال تباہ پر

جبتک نہ خاک ہو جیئے حاصل نہیں کمال
یہ بات کھل گئی ہمیں اکسیر دیکھ کر

اک شمع اور بڑھ گئی محفل میں یار کی
جلتا رہا میں غیر کی توقیر دیکھ کر

دی ہم کو جان اور کیا ہم سے زر عزیز
زر جان سے زیادہ ہے دل بھی مگر عزیز

چپ پڑے رہتے تو کیوں یاں سے اٹھائے جاتے
ہائے کیوں شور مچایا تری دیوار کے پاس

ان کے آنے کی جنازہ پہ توقع کس کو
وہم کرتے ہیں جو آتے ہوئے بیمار کے پاس

تب بھی نظارہ سے سیری نہیں ممکن ہے اگر
لاکھ آنکھیں ہوں ترے طالب دیدار کے پاس

اور بھی تو بہت اعضا تھے بدن میں یا رب
خون ہونے کو ہوا کیوں جگر و دل مخصوص

اک دیکھنا ہے کہئے تو اسکو بھی چھوڑ دیں
رکھتے نہیں ہیں آپ سے اسکے سوا غرض

مشہور ہے کہ یار کی یاری سے کام ہے
فعلوں سے میرے رکھتے ہیں کیوں آشنا غرض

دل میں کیا ہے گھر مرے اور مجھ سے ہی حجاب
سارے جہاں سے آپ کا دیکھا نیا لحاظ

معشوق ہے تو صورت عاشق جلی ہے کیوں
کچھ آج تک نہ ہم کو کھلا ماجرائے شمع

دم تک نہ مارے اور جلے سر سے پاؤں تک
دیکھا کسی کو ہم نے نہ ایسا سوائے شمع

دل پہ داغ آتشیں کا ہے سدا روشن چراغ
یہ فسون عشق ہے جلتا ہے بے روغن چراغ

چشم عبرت ہو تو دیکھ اس خانہ ویراں کی طرف
کیا کریگا جاکے تو گور غریباں کی طرف

ساکنان کوچہ جاناں نے روز حشر میں
آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھا باغ رضواں کی طرف

آج کا کل پہ نہ رکھ کام کہ معلوم نہیں
کیا دکھائیگی تجھے گردش دوراں کل تک

قند و نبات کی ہے حلاوت زبان تلک
لذت ہے زہر غم کی مگر کام جاں تلک

وادی ایمن میں لگی ہے اسکی چنگاری کلیم
لگ رہی ہے وہ جو میرے سینۂ سوزاں میں آگ

سوز غم کے مضامیں اس میں لکھے ہیں بہت
خوف ہے عارف نہ لگ اٹھے مرے دیواں میں آگ

اس کے ملنے کی بتا دے کوئی تو ہم کو بھی راہ
اے خضر عالم میں تجھ کو رہنما کہتے ہیں لوگ

ڈال دو لیجا کے مجھ بیمار غم کو بھی وہیں
کوچۂ دلدار کو دار الشفا کہتے ہیں لوگ

تجھ پہ فدا ہے جان ہماری نثار دل
صدقے کریں جو پاس ہوں اپنے ہزار دل

عارف گناہ کیجیو سارے جہان کے
جان پر بن گئی یاں دیکھ کے بیتاب اسکو
ہوئے ہمیشہ کو رنج خمار سے فارغ
وہ شور عشق کی رگ رگ میں ہوگئی تاثیر
رکھتے ہیں دل میں خیال چشم مخمور بتاں
خاک جلکر ہوگئے تو لے اڑی ہم کو نسیم
گر خطا ہم سے کوئی سرزد ہوئی تو کیا عجب
نزع میں جو میرے لب ہلتے ہیں سننا ہمدمو
دیکھ کلتے ہے ترے بیمار کو عیسیٰ تو جواب
تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں
خود میں خجل کہ جیتے رہے اس کے ہجر میں
زاہدوں سے خوب ہی لیوینگے اب تو شوخیاں
کچھ تو ہے بات کہ خاموش رہا کرتا ہوں
کس نے یہ نامہ رکھا چشم سیہ کا تیری
زاہدا میکدے کی راہ سے گذرا مت کر
کہتے ہیں رنج ہجر سے کم ہے عذاب گور
دھوکے میں آکے باغ جناں میں چلے گئے
ڈر ہے کہ بہہ نہ جائے تصور ترا کہیں
عارف بتا کہ سر ہے یہ کس دن کیواسطے
برعکس ہوا کرتے ہیں سب کام ہمارے
شامت ہے کس کی منہ جو ترے ناصحا چڑھے

لیکن لگائیو نہ کہیں زینہار دل
گذرے اس نالۂ پُر درد کی تاثیر سے ہم
ملا کے آنکھ کسی چشم نیم خواب سے ہم
شراب پی کے رہے مجتنب شراب سے ہم
ڈالتے ہیں کعبہ میں میخانہ کی بنیاد ہم
در تلک پہنچے ترے جب ہوگئے برباد ہم
یارب آخر حضرت آدم کی ہیں اولاد ہم
درد الفت کی یہ شاید انتہا کہنے کو ہیں
لب جاں بخش ترے دیکھئے کیا کہتے ہیں
بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں
اپنا یہ منہ نہیں ہے کہ اس سے گلا کریں
میکدے کی ہوگئی ہے ہمکو خدمت ان دنوں
کچھ تو ہے کام کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں
شوخ اس طرح ہوا کرتے ہیں بیمار کہیں
رہن ہو جائے نہ یہ جبہ و دستار کہیں
مرنے کی کس لئے مجھے پھر آرزو نہ ہو
دل میں خیال کوچۂ جاناں لئے ہوئے
بیٹھے ہیں بند دیدۂ گریاں کئے ہوئے
پھرتا ہے آج تیغ وہ عریاں کئے ہوئے
اسواسطے مرنے کی تمنا نہیں کرتے
جو شخص یوں بلا کی طرح سر پہ آ چڑھے

لذتِ درد سے بیچارہ نہیں ہے واقف
لے گیا چھین کے غمخوار نمکداں مجھ سے

کس بات پہ کس بل پہ یہ بُت ہو گئے مغرور
ہے کونسی خوبی نہ کمر ہے نہ دہن ہے

نگاہِ یار کیا شے ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جگر کے پار ہوتی ہے نہ برچھی ہے نہ بھالا ہے

ہوں یہ بے پردہ بھی تو کیا نہیں دیکھے کوئی
جلوہ حسنِ بتاں ہوش ربا ہوتا ہے

اسکو کہتے ہیں چڑھانا کہ رقیبوں کا سلام
ان کے خط میں مجھے ہر بار لکھا ہوتا ہے

آغاز دردِ عشق کے انجام کو نہ پوچھ
یہ ابتدا ہے وہ کہ نہ جس کی خبر ملے

مجھکو اور آپ کو عالم میں نہ رسوا کیجے
آپ ہو رہئے مرے یا مجھے اپنا کیجے

ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کہے جائیں گے
ہیں جبیں آپ طرفداری لیلےٰ کیجے

آج کچھ شکل ہے کل اور ہے صورت اپنی
عاجز آ جائے نہ کیونکر زر و دربان ہم سے

کون سی جا ہے جہاں خاک نہیں ہے اپنی
بچ کے چلتا ہے کدھر سروِ خراماں ہم سے

زبانِ خضر تھکی کہتے کہتے بسم اللہ
کسی کی رہ میں جو ہم بیقرار ہو کے چلے

ناتوانی کا بُرا ہو کہ قدم اُٹھ نہ سکا
طرف کوچۂ دلدار اُٹھے اور بیٹھے

کبھی اے نالۂ دل اتنی تو تاثیر دکھا
ہو کے مضطر وہ جفاکار اُٹھے اور بیٹھے

قطعہ

جب سے سرکار عشق میں عارف
ہم ملازم ہوئے یہ بندی ہے

کہ خوشی کا نام لیجو نام کبھی
غم سے ہی تجھ کو بہرہ مندی ہے

کیونکہ شادی کو پھر پھٹکنے دوں
نوکری ہے کہ بھائی بندی ہے

قصیدہ کی تشبیب

صدفِ چشم میں ہیں میرے بھی کیا کیا گوہر
ایک سے ایک سرشکوں کے ہیں اعلیٰ گوہر

خانۂ چشم ہے در و دیوار نہ لٹ جائے کہیں
دیکھ اے دیدۂ تر آب تو نہ برسا گوہر

یہ بھی غمّاز ہوا کیا مرے دشمن کی طرح
کان تک یار کے ناگاہ جو پہنچا گوہر

دیکھ تو چشم حقیقت سے کہ ہے اے غافل
صنعت صانع قدرت کا تماشا گوہر

دہنِ مار و صدف میں ہے وہی اک قطرہ
ایک جا زہر بنا اور وہی اک جا گوہر

آبرو چاہے تو ہو گوشہ گزین عالم میں
گوہر بحر سے بہتر ہے یہ تیرا گوہر

دیکھے گر وہ ترے دندانِ صفا پرور کو
غرق ہو آبِ خجالت میں سراپا گوہر

گر نکلتا نہ صدف سے تو نہ ہوتا ہرگز
اس طرح برزن و بازار میں رسوا گوہر

رہگذر میں ترے مجنوں کے گرے ہیں آنسو
ہار کے تیرے یہ ٹوٹے نہیں لیلا گوہر

راستی پیشہ ہو گر چاہیئے عالم میں وقار
قدر پاتا نہیں ہرگز کہیں جھوٹا گوہر

عارف

عارف: سید عارف علی عرف پیر جی صاحب ساکن ریاست الور مقیم حال کوٹہ خطۂ راجپوتانہ۔ آپ نے فارسی کی کتب درسیہ مولوی امیر علی صاحب نارنولی سے پڑھیں جھالرا پاٹن کے ہائی سکول میں تعلیم پائی۔ وہیں محکمہ حساب میں اہلمد تھے۔ اب ریاست کوٹہ کے اکونٹنٹ آفس میں ملازم ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں جب ریاست جھالرا پاٹن کے دوثلث علاقہ کا کوٹہ کی ریاست سے الحاق ہو گیا۔ تو اس کے ساتھ ملازمین کا جم غفیر بھی کوٹہ میں آ گیا۔ اسی سلسلہ میں آپ کو بھی منتقل ہونا پڑا۔ ابتدا میں منشی عبدالشکور خاں صاحب برقؔ اجمیری سے اصلاح لیتے رہے۔ کوٹہ میں مولوی نذیر حسن صاحب فتنہؔ سندیلوی سے رسم دوستانہ قائم ہو جانے پر ان سے مشورۂ سخن جاری رکھا۔ ترتیب تذکرہ کے وقت آپ کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ کلام میں شگفتگی۔ طبیعت میں جدت اور آمد ہے۔ آپ خوشنویس بھی ہیں۔ اشعار ذیل آپ کے کلام سے انتخاب کئے جاتے ہیں۔

مقصود جو تھا کوچۂ دشمن میں ٹھہرنا
ہاتھ آ گیا حیلہ اُسے کیا لغزشِ پا کا

مشتاقِ ستم سینکڑوں ہیں چاہنے والے
دیدیتی ہیں کام ان کی جفائیں بھی وفا کا

عارف ایسی بیخودی بھی کیا تو نکے عشق میں
آدمیت ہی سے اے مردِ خدا جاتا رہا

غضب کی ہے ادا اس فتنہ زا میں
آتی ہے نظر خدا کی قدرت
دیتے ہیں تسلیاں وہ پیہم
ہے قیامت کہ وُہ یوں کرتے ہیں قائل مجھکو
اُٹھ کے پہلو سے خفا ہو کے یہ کہکر وہ چلے
تیری صورت سے جو کچھ ملتی ہے صورت اسکی
چل دیئے تاب و تواں جان حزیں رخصت ہوئی
کام آتی ہے دُعا اور نہ دوا آتی ہے
نہ طریقے کی محبت نہ قرینے کا ستم
کیا صبح شب وصل قیامت کی گھڑی تھی
دھوکا ہُوا کیا غیر کے گھر کا مرے گھر پر
سہل ہر بات ہی جو آپکے دل میں ٹھن جائے
تم اگر چاہو تو آساں ابھی سب کچھ ہو جائے
مجھے یاد کرکے وہ بھولے ہیں شاید
نہ نکلا کام کچھ آہ و فغاں سے
پھنکے ہم اف ری گرمیِ محبت
ہوئیں مشہور سب خلوت کی باتیں

حیا شوخی میں اور شوخی حیا میں
جب ان کا جمال دیکھتے ہیں
جب مجھ کو نڈھال دیکھتے ہیں
جان پیاری ہے کسی کو تو نہ دے دل مجھ کو
اب دکھانا اثر جذبۂ کامل مجھکو
دھوکے دینا ہے شب غم مہ کامل مجھ کو
مجھسے سب مٹ گئے دنیا سے اب فرصت ہوئی
ایک چلتی نہیں جب سر پہ قضا آتی ہے
نہ وفا آتی ہے تم کو نہ جفا آتی ہے
بلیساختہ آنسو مری آنکھوں میں بھر آئے
تم بھول کے اس وقت مری جاں کدھر آئے
نہ جفا آپ کو مشکل نہ وفا مشکل ہے
مشکلیں ہیں تو مجھے ہیں نہیں کیا مشکل ہے
کہ رہ رہ گئیں ہچکیاں آتے آتے
نہ بدلہ لے سکے ہم آسماں سے
جلے ہم آتشِ سوزاں نہاں سے
ذرا ہشیار اپنے رازداں سے

عارف: نواب سید خاقان حسین خاں دہلوی رئیس اعظم کانپور۔ ان کے بزرگ قم سے آکر شاہان مغلیہ کے دربار میں ملازم ہوئے۔ پچھلی صدی کے اوائل میں نواب معتمد الدولہ بہادر سرکار لکھنؤ میں عہدہ وزارت پر ممتاز تھے۔ حضرت عارف کے والد ماجد نواب سید ظفر حسین خاں صاحب خلف نواب معتمد الدولہ کے نواسے تھے وہ

سرکار انگلشیہ سے دو ہزار ماہوار وثیقہ پاتے رہے۔ علاوہ ازیں قسمت آگرہ میں بھی زمینداری ہے۔ ۱۲۸۵ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ اردو۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی سے واقف ہیں۔ مذاہب کی تحقیقات کا شوق ہے۔ کتب فلسفہ کا مطالعہ زیادہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی رسالہ زمانہ میں مضامین بھی لکھے ہیں۔ اپنے مذہب کی تائید میں ایک کتاب بزبان انگریزی لکھی ہے جس کا نام "اسٹڈی آف شیعہ ازم" ہے۔

شروع میں چند غزلیں حضرت داغ کو دکھائی تھیں۔ اب عرصہ سے اپنے کلام پر خود ہی نظر ثانی کر لیتے ہیں۔ صاحب حامد آذر بائجانی سے فارسی میں اصلاح لی ہے۔ مشق نے کلام میں پختگی پیدا کر دی ہے۔ حسن بیان اور لطف محاورہ کی لذّت سے دلوں کو گرما دیتے ہیں۔ آمد طبیعت۔ مضامین کا وفور۔ لفظوں کی شوکت قابل داد ہے۔ لیکن اکثر جگہ توارد بھی نظر آتا ہے مطلع ذیل ملاحظہ ہو:۔ ؎

وُہ مجھے ہجر میں جینے کی دُعا دیتے ہیں ‌ ‌ کس محبّت سے محبّت کی سزا دیتے ہیں

اسی غزل کا ایک شعر اور ہے۔ ؎

یہ ادائیں ہیں مری جان کی لینے والی ‌ ‌ یہ اشارے مجھے پیغام قضا دیتے ہیں

مندرجہ بالا دونوں اشعار حضرت داغ کے دیوان میں موجود ہیں۔ اور بلا تحریف الفاظ زبان زد عوام ہیں۔ اسی طرح یہ شعر بھی۔

گھر راہ میں ہو غیر کا یہ بھی مری قسمت ‌ ‌ اے جذب محبّت انہیں آنا تو نہیں تھا

حضرت انور کا شعر ہے۔ جس کے مصرعہ ثانی میں جناب عارف نے خفیف سی تحریف کی ہے۔ اس امر سے قطع نظر کلام اچھا ہوتا ہے۔ انتخاب ملاحظہ ہو۔

اپنے دشمن ہوں تو غیروں کی شکایت کیسی ‌ ‌ اور تو اور مجھے دل نے سنبھلنے نہ دیا

انہیں حسرت ہے اپنے چاہنے والوں میں شامل ہوں ‌ ‌ تڑپ کر مجھ سے کہتی ہیں کہ میں بھی ترا دل ہوں

مٹاتا ہے زمانہ آسماں آزار دیتا ہے ‌ ‌ یہ کس ناشاد کا ارماں یہ کس کمبخت کا دل ہوں

خوگرِ رنج و بلا ہوں مجھے راحت ہے عذاب
میں تو مر جاؤں اگر آپ نہ بیداد کریں

تاثیر دے خدا جو مرے اضطراب میں
گھبرا کے آپ آئیں وہ خط کے جواب میں

اے یاس جا کے غیر کے ارمان لوٹ لے
یاں کیا دھرا ہے اس دل خانہ خراب میں

جی چاہتا ہے آج سنیں کہکے وصل کو
وہ بات جو کبھی نہ سنی ہو جواب میں

کہنے لگے وہ میرا بُرا حال دیکھ کر
اچھا ہوا کمی تو ہوئی اضطراب میں

موسیٰ نہیں ہوں میں کہ مجھے آپ ٹالدیں
میں لن ترانیاں نہ سنونگا جواب میں

دم دے کوئی تو آپ پر احسان ہی نہیں
گویا کسی غریب کی کچھ جان ہی نہیں

کیوں بھیجئے اجل کو تقاضے کے واسطے
ہم جان دیں کہاں سے یہاں جان ہی نہیں

میرا مرنا بھی شب غم انہیں منظور نہیں۔
آج گھبرا کے چلے آئیں تو کچھ دُور نہیں

کوئی رہ جائیگا ارماں تو مصیبت ہوگی
خیر سے دل میں ابھی تک کوئی ناسُور نہیں

انکے اس کہنے پہ آتا ہے تبسم مجھ کو
پاس بیٹھوں گا تو چھیڑوگے بہت تم مجھ کو

میری خاطر سے وہ دشمن کو بُرا کہتے ہیں
آنہ جائے کہیں کمبخت تبسّم مجھ کو

تمھیں روؤگے جو مر جائینگے میرے دشمن
رات دن بیٹھ کے کوسا نہ کرو تم مجھ کو

کوئی نہ ہوگا میری قبر پر تو کیا ہوگا
غریب جان کے موجود بیکسی ہوگی

وفا کا اب تو کہیں نام بھی نہیں سنتے
کسی زمانہ میں شاید کسی نے کی ہوگی

شوخی کسی کی آنکھ میں تاثیر کر گئی
میری نگاہ شوق کدھر سے کدھر گئی

کیسا وصال کِس کی تمنّا۔ کہاں کا لطف
ہم بھی ہوئے تمام وہ شب بھی گذر گئی

پہلی سی وہ تراوش خوں آنکھ سے کہاں
دل کیا گیا کہ لذت زخم جگر گئی

یہ نظر غیر پر نہ ہو جائے
جو ادھر ہے اُدھر نہ ہو جائے

زلف جاناں ہوا سے بگڑی ہے
یہ کہیں میرے سر نہ ہو جائے

میری بلا سے کیوں میں کہوں کسکے گھر رہے
اب بھی وہیں نہ جاؤ جہاں رات بھر رہے

کہتے ہیں جسکو شرم وہ کچھ اور بات ہے
کچھ یہ نہیں ضرور کہ نیچی نظر رہے

ہم آج سے ارمان کسی کا نہ کریں گے
لو جاؤ تمہاری بھی تمنا نہ کریں گے

دشوار نہیں ہے انہیں کچھ میرا جلانا
اک ضد ہے کہ تقلید مسیحا نہ کرینگے

ہم سے گلۂ جور و جفا ہو نہ سکے گا
یہ تو نہ کیا ہے دل شیدا نہ کرینگے

ابھی سے رو کے کہتے ہو یوں مجھے اچھی کہی تم نے
قیامت تک کہونگا تمکو کیا سمجھا تھا کیا نکلے

ستم وہ ہو کہ جس میں لطف آئے مہربانی کا
عداوت وہ کرو جس میں محبت کا مزا نکلے

قیامت کی وہاں شوخی یہاں آفت کی بیتابی
مزا آئے جو دونوں کا برابر حوصلہ نکلے

سن لیجئے کچھ دل کا تقاضا تو نہیں ہے
فریاد مری آپ کا شکوہ تو نہیں ہے

دل میرا ستانے کو نہ لیجئے یوں آپ
ایسا تو نہ ہو دیکھئے ایسا تو نہیں ہے

دنیا مجھے کہتی ہے کہ دیوانہ ہوا ہے
مجھ آپ کو کیا آپ کا چرچا تو نہیں ہے

عارف

عارف۔ محمد عارف رفوگر کشمیری شاہ نجم الدین آبرو کے شاگرد اور میر و مرزا کے ہم عصر تھے۔ دہلی میں سکونت تھی۔ ایک پرانی بیاض میں کچھ کلام ملا۔ اُس میں سے چند شعر منتخب کئے گئے جن میں محاورات کی صفائی اور بندش کی چُستی قابل ملاحظہ ہے

جس قدر دشوار ہے ہم سے وفا کا چھوٹنا
تم سے مشکل ہے میاں جور و جفا کا چھوٹنا

یا الٰہی بلبل و گل میں رہے دائم ملاپ
ہے قیامت آشنا سے آشنا کا چھوٹنا

سرو سے کر عصا ترے آگے
ہے کھڑا چوبدار کے مانند

پاؤں لگتے ہی ترے بھاگ لگے مہندی کو
رشک سے ہم تو جلے آگ لگے مہندی کو

جس وقت اٹھ کے بزم سے تم یک بیک چلے
بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک چلے

وحشت نہ سنتے ہو کہ آن سے
ورنہ عارف اُفہم کھانا سے

ہمیشہ دل پہ خیال نگار گذرے ہے
اسی خیال میں لیل و نہار گذرے ہے

عارف

عارف:- مولوی انعام اللہ خاں سپرنٹنڈنٹ فرخ آباد۔ ان کی زبان صاف اور شستہ ہے محاورات خوب نظم کرتے ہیں۔ حسن بیان پاکیزہ ہے۔ مضمون آفرینی کی بھی کمی نہیں۔ بندش الفاظ اگر زیادہ چست نہیں تو اسقدر سست بھی نہیں ہے۔ کہ سننے والوں کو شعر بے لطف معلوم ہو۔ اکثر گلدستوں میں غزلیات شائع ہوتی رہی ہیں۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

مجھ کو حیرت ہے میں ہوں کس کے گنہگاروں میں
کہ ہے رحمت مرے عصیاں کے خریداروں میں

ٹکڑا ہے چاند کا رخ زیبا کہیں جسے
ٹکڑا ہے نور کا قد رعنا کہیں جسے

عشق بتاں کا رنج کہاں تک اٹھائیے
پتھر تو کچھ نہیں ہے کلیجا کہیں جسے

مشتاق وصل کیا ترے وعدہ سے شاد ہو
وعدہ بھی وہ کہ وعدۂ فردا کہیں جسے

مطلب نہیں ہے اور کسی خوش نصیب سے
قسمت بدل سکے تو بدل لوں رقیب سے

کیا سایہ ان پہ اس گل رعنا کا پڑ گیا
قمری سے سرو کھنچ گئے گل عندلیب سے

گلچیں کا ڈر ہے خار کا کھٹکا خزاں کا خوف
پوچھو نہ حال الفت گل عندلیب سے

شاید ہمارے مرنے کا ہے ان کو انتظار
خود حال پوچھ جاتے ہیں آکر قریب سے

عارف

عارف۔ میر جمال الدین مرحوم شاگرد خواجہ حیدر علی صاحب آتش۔ زیادہ کلام دستیاب نہ ہوا۔ جو کوئی رائے قائم کی جاتی۔ اشعار ذیل میں فرسودہ مضامین کے سوا کوئی جدت نہیں ہے۔

پلادو جام اے ساقی کہ جو ہو رشک جام جم
تماشا دو جہاں کا دیکھ لوں میں ایک ساغر میں

نکل جاتا ہے منہ سے رزق گر ہووے نہ قسمت کا
برنگ آسیا انساں رہے گر لاکھ چکر میں

مری وحشت کا باعث ان حسینوں کی ہے آرائش
وہاں زلفیں سنورتی ہیں جنوں چڑھتا ہے یاں سر میں

ادھر جنبش ہوئی اسکو ادھر لاکھوں ہوئے بسمل
قیامت کی برش دیکھی ترے ابرو کے خنجر میں

عاشق

عاشق:- مرزا والا جاہ بہادر عرف چھوٹے صاحب خلف نواب دلیر الدولہ

مرزا محمد علی خاں عرف آغا حیدر نیشاپوری فیض آبادی مقیم لکھنؤ۔ آپ کو سرفراز علی قادر سے تلمذ تھا۔ فنِ سخن کو حاصل کیا تھا۔ علوم معانی و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ عروض و قافیہ کے بھی ماہر تھے۔ طبیعت میں آمد اور شاعری سے مناسبت تھی۔ بڑی بڑی شورزمینوں کو الفاظ کے آبِ شیریں سے سبزہ زار بنا دیا ہے۔ جیسے نازک خیال تھے زبان پر بھی ویسی ہی قدرت رکھتے تھے۔ طبیعت کا زور مطبوعہ مختصر دیوان میں نہیں سماتا۔ لکھنؤ کے قدیم رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ الفاظ کی دھوم دھام سے معمولی مضامین کو بھی بلندی پر پہونچا دیتے ہیں۔ کیا اچھا شعر کہا ہے۔

امید نامہ نے لی جان آخر	مرا لکھنے کے قابل ماجرا ہے

ایک جگہ فرماتے ہیں:

اس لئے ہے ترے ابرو کا تصوّر دل میں — یہ نہ کہنے کو ہو کعبہ تو ہے محراب کہاں

شعرا دل کو کعبہ سے مناسبت دیتے چلے آئے ہیں۔ مگر حضرت عاشق نے اس میں یہ جدت پیدا کی ہے۔ کہ کعبۂ دل میں محراب بھی قائم کر دی۔

لیکن باوجود ان محاسن کے رعایت لفظی کے پھیر میں کبھی بھٹک بھی جاتے ہیں۔ اور واہی تباہی کہنے لگتے ہیں مثلاً ؎

لڑائی وصل میں سعنے پرائے پری ہو جائے — ہمارے آپ کے یہ جنگ زرگری ہو جائے

انتخاب میں ایسے اشعار قلمزد کر دئے گئے ہیں۔

افسوس ہے کہ آپ کے حالات دستیاب نہ ہوئے۔ جسقدر تحقیق ہو سکے زیب تذکرہ کر دئے گئے۔ آپ کا دیوان موسومہ بہ "فیض نشاں" ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ آپ کی عمر کا بھی حال نہ معلوم ہو سکا۔ صرف یہ تحقیق ہوا کہ ۱۲۸۹ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔ دیوان "فیض نشاں" کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

خزاں کے ہاتھ سے گلشن میں خار تک نہ رہا	بہار کیسی نشانِ بہار تک نہ رہا

حساب روز جزا سے مجھے فراغت ہے
کئے وہ جرم کہ جن کا شمار تک نہ رہا

مرے تو نشۂ الفت اُتر گیا عاشق
وہ کیا شراب تھی جس کا خمار تک نہ رہا

مجھ کو حیرت ہے عجب دریا ہی اس کوزے میں بند
اشک تھا آنکھوں میں جب ٹپکا سمندر بن گیا

اپنے باغِ حسن کا اس نے تماشہ دیکھ کر
آئینہ جب رکھ دیا پھولوں کی چادر بن گیا

سر پٹک کر خانۂ زنداں میں میں نے جان دی
در میں رخنے پڑ گئے دیوار میں گھر بن گیا

نشۂ فکر رسا سے کیوں نہ عاشق مست ہو
سر جھکا جب کاسۂ زانو کا ساغر بن گیا

بنا ہے روح مجھ افسردہ دل کو نشہ پانی کا
مے گلگوں کو سمجھا پھول باغ زندگانی کا

ہم کو کالے سے سوا وہ مار کاکل ہو گیا
آنکھ ملتے ہی چراغ زندگی گل ہو گیا

اس قدر مضمونِ غم لکھنے کی میں نے مشق کی
ایک عشرے میں کمیت خامہ دُلدل ہو گیا

رنگ دکھلاتا ہے پرنور روئے آشنا کا
کیں سونے کی نظر آتا ہے نتھ کا ناک کا

کل تو تھی سونے کی بالی آج بنوائی ہے نتھ
میرے مرنے سے بڑھایا اس نے زیور ناک کا

آپ صحرا میں جو میرے قتل کا بیڑا اُٹھائیں
پان کی صورت بنے ہر ایک پتا ڈھاک کا

مجھ کو قاتل کی نزاکت پر اچنبھا ہو گیا
تیغ میں نے کھائی اس کا ہاتھ جھوٹا ہو گیا

چور چوری سے گیا کیا ہیرا پھیری سے گیا
دُور سے دیکھ آتے ہیں جب سے مچلکا ہو گیا

گیسو حجاب روئے دل آرام ہو گیا
نور سحر سوادِ سر شام ہو گیا

وہ رشک مہر کوٹھے پر آیا ہے دیکھنے
عاشق جب آفتاب لب بام ہو گیا

کہتے ہو جنازے پہ ترے آئینگے اک روز
کیا کیجے بہانے سے ہمیں مر نہیں آتا

تم نے جگنو جو باندھے آنچل میں
برق چھپتی پھرے گی بادل میں

غم و شادی بھی یکجا ہے زمانے کی دو رنگی سے
ہنسی شدت سے جب آتی ہے تب آنسو نکلتے ہیں

دکھائے شعبدے اس چشم نے سیر چراغاں میں
دوالی میں جگانے کیلئے جادو نکلتے ہیں

پاؤں تھکتے ہی نہیں اس راہ میں
دل کھنچا جاتا ہے سوئے لکھنؤ

پھر گیا میرا ستارہ تو نکالوں گا غبار
خاک میں چرخ ملا دوں گا نئے تاروں کو

گھر جلا کر سیر دیکھی آہ آتشبار کی
بن گیا نالہ مرا آواز موسیقار کی

جنبش ہوئی ابرو کو لب یار سے پہلے
تلوار لگا بیٹھے وہ تکرار سے پہلے

کھٹکا ہے عبث آٹھ پہر راہ عدم کا
یا چار سے پیچھے گئے یا چار سے پہلے

مجھ کو جی بھر کے مزہ درد کا حاصل ہو جائے
دوسرے پہلو میں بھی چاہتا ہوں دل ہو جائے

کتنے ہو جائے گھر اسکے جو اپنے گھر آئے
یہ تو جب ہو کہ تمہارا سا مرا دل ہو جائے

بات جو منہ سے نکل جائے وہی بات سے ہے
ترک ہو اس میں محبت کہ ملاقات رہے

سوزش داغ و دم سرد و سرشک حسرت
کبھی گرمی کبھی جاڑا کبھی برسات رہے

نہ بڑھاؤ تو گھٹاؤ بھی نہ غیروں سے ہمیں
نہیں منظور ترقی تو مساوات رہے

لڑائی وصل میں سونے پرائے پری ہو جائے
ہمارے آپ کے یہ جنگ زرگری ہو جائے

غو نامہ و پیغام کی دلبر نہیں رکھتے
بت کیسے خدا ہیں کہ پیمبر نہیں رکھتے

صدا فریاد کی آتی ہے چاک سینۂ گل سے
چمن میں کوئی گل پھولے نہ گلچیں خون بلبل سے

امید نامہ نے لی جان آخر
مرا لکھنے کے قابل ماجرا ہے

عاشق:- منشی غلام حسین صاحب خلف اکبر و شاگرد مولوی غلام عباس صاحب متوطن سمبھی ضلع اعظم گڈھ۔ انہوں نے اپنے والد سے فارسی کی تحصیل کی۔ فن سخن میں بھی انہیں سے استفادہ کیا ہے۔ شاعری کا اوائل عمر سے شوق ہے۔ متعدد رسالوں اور گلدستوں میں کلام شائع ہو چکا ہے۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ شعر سمجھ کے کہتے ہیں۔ اور اچھا کہتے ہیں۔ اب کچھ حال معلوم نہیں۔ کلام یہ ہے۔

عاشق

نہیں گردوں پہ یہ مہ تاباں
عکس ہے اُسکے روئے انور کا

چشم بینا کے واسطے عاشق
ایک زینہ ہے سنگ و گوہر کا

کل تو آنا نہیں نہ گیہں شام سے ناصح مری
آج کیا حال کرے گی شب ہجراں مرا

عجب انداز سے اس سنگدل نے اس کو توڑا تھا — کہ نکلی شیشۂ دل سے صدائے آفریں برسوں

نہ دام بلا دو نو رہے گیسو کی الفت میں — مری جان حزیں برسوں دل اندوہگیں برسوں

رحمت حق سے تو محروم رہے گا واعظ — بخشے جاتے ہیں وہی جو کہ خطا کرتے ہیں

ابھی سے حشر کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں میں — ہماری شام غم صبح قیامت ہونیوالی ہے

عاشق

عاشق ۔ میرزا نظام الدین گورگانی از اولاد شاہ عالم ثانی۔ میرزا عالی کے شاگرد تھے۔ ستار خوب بجاتے تھے۔ اپنے رنگ میں اچھا کہتے تھے۔ زیادہ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ یہ چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

درد فراق جور بتاں نالہ ہائے شب — کن کن مصیبتوں میں خدایا نہیں ہوں میں

اس گل کے مگر باغ میں آنے کی خبر ہے — ہر غنچہ لئے ہاتھ میں یک مشت جو زر ہے

مجھے فیض سخن عالیؔ سے یاں پہنچا ہے اے عاشق — کہ ان کو فیض ثابت سے اور ثابت کو احساں سے

عاشق

عاشق ۔ نواب مہدی علی خاں دہلوی نبیرہ نواب علی مرداں خاں مرحوم۔ ان سے تین دیوان اور چند مثنویاں یادگار ہیں۔ شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں اپنے مکان پر مشاعرہ کیا کرتے ایک تذکرہ شعرائے ریختہ بھی مرتب کیا تھا۔ بڑے مضمون آفرین تھے شعر میں محاورات اور روزمرہ خوب نظم کرتے۔ زبان بہت اچھی تھی۔ نمونہ کلام یہ ہے

ابر آتا ہے۔ آفتاب چھپا — ساقیا مت شراب ناب چھپا

گو آہ میں اپنی نہیں تاثیر سر دست — پر ہے یہ بساط اپنی ہے اک تیر بہدف

دن تو جوں توں کے کٹا رات پھر آئی سر پر — آفت تازہ جدائی تری لائی سر پر

عاشق

عاشق ۔ میرزا رحمت بخش مرحوم نبیرہ شاہ عالم ثانی۔ میرزا رحیم الدین حیا کے شاگرد طبیعت دار و روشن خیال شاعر تھے۔ نتیجہ فکر کا نمونہ یہ ہے۔

دوستوں نے پس مردن یہ کیا مجھ سے سلوک — کہ رکھا اس ستم آثار کی دیوار کے پاس

پگھلے نہ دل بتوں کا نہ دل غیر کا جلے — نالوں کے اب اثر وہ خدا جانے کیا ہوئے

عاشق

عاشق :- محمد مرتضے عرف میرزا مچھو بیگ خلف میرزا اچھو بیگ و داماد مولوی مصطفےٰ خاں صاحب مطبع مصطفائی ارشد تلامذہ نواب اصغر علی خان نسیم دہلوی اخبار اودھ پنچ کے نامی اور قابل نامہ نگاروں میں تھے۔ "ستم ظریف لکھنوی" کے نام سے جو معرکتہ الآرا مضامین نکلتے تھے۔ وہ ان کی شوخی طبع کا نمونہ ہوتے۔ آزاد مزاج رند مشرب آدمی تھے۔ لوگوں کو آخر وقت تک نہ کھلا۔ کہ شیعہ تھے یا سنی المذہب عشق بازی کا چسکا اور حسن پرستی کا لپکا تھا۔ میرزا صاحب مرحوم نے اودھ پنچ کے زمانۂ شباب میں چانڈو خانوں کے متعلق جو مضمون شروع کیا تھا وہ ادبی حیثیت سے اہل قلم میں آج تک مشہور ہے۔ آپ نے ایک مثنوی "نیرنگِ خیال" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں لکھنو کی بیگماتی زبانوں کو نہایت خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ ایک لغات زبان اُردو میں مرتب کیا تھا۔ جس کے حصۂ اول میں الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک کے الفاظ ہیں۔ دوسری جلد مرتب کر رہے تھے۔ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے چیدہ ظریفانہ مضامین "چشمۂ بصیرت" کے نام سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ مگر قابلِ قدر ادبیات کا سرمایہ اب تک اودھ پنچ کی قدیم جلدوں میں محفوظ ہے فن شعر گوئی میں بھی یدِطولیٰ رکھتے۔ کلام سرتاپا عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہُوا ہے۔ پھر محاورات کی برجستگی۔ زبان کی شیرینی اور روزمرّہ کی صفائی قابل دید ہے جو کچھ کلام ہاتھ لگا ہے۔ اس کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

کچھ بھی نہ تھا جو حسن ترا جلوہ گر نہ تھا	اندھیر تھا جہاں میں جو تو اے قمر نہ تھا
کیا کیفیت بیان کروں شام وصل کی	جس طرح عیش خواب کہ وقتِ سحر نہ تھا
یہ اس کی شان کر گئی تاثیر یار پر	میری دعا کہ نام کو جس میں اثر نہ تھا
کیوں چارہ گر سے کہہ نہ دیا اپنے دل کا حال	کیا قابل بیاں لب زخمِ جگر نہ تھا
اسی نظرت سے واعظ کو شوق جنت کا	پینگے مفت کی چل کر شراب کوثر پہ

بتوں کی قدر تو کعبے میں جا کے مجھ کو ہوئی
حسن پریوں کا سنا کرتے تھے پر کچھ بھی نہیں

خدا کے گھر میں بھی سجدے کئے جو پتھر پر
دور کے ڈھول سہانے تھے مگر کچھ بھی نہیں

یُں دل لگا کے بہت خوش ہوا نہال ہوا
بیکار تھی دھوم چشم تر کی
جلتا ہے بتوں کے عشق میں دل
صبح شب وصل خاتمہ ہے
ابھی نہ آپ سمجھ لیجئے خدا کے لئے

خطا حضور پھر ایسی نہ عمر بھر ہوگی
اِک دن نہ بجھی لگی جگر کی
کیا قدر ہوئی خدا کے گھر کی
ساری ہے یہ دھوم رات بھر کی
بگڑ کے یہ تو نہ فرمائیے خدا کے لئے

عاشق:- پنڈت کنہیالال صاحب کشمیری دہلوی ثم لکھنوی خلف پنڈت ٹھاکر داس دہلوی۔ آپ کی ولادت اور تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ پھر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ مدتوں راجہ گڈھ امیٹھی کے دیوان رہے۔ آپ کی تصنیف سے ایک مکمل دیوان کے علاوہ ایک مثنوی گل باصنوبر اور بحر العروض مطول قابل ذکر ہیں یہ کتاب اس وقت تک کی فنِ عروض کی کتابوں میں طرۂ امتیاز رکھتی ہے۔ اوزان بحور اور اصول قافیہ سے نہایت معقول اور مفید بحث کی ہے۔ نظیر میں اردو اشعار دئے ہیں۔ آپ کا مذاق سخن اچھا ہے۔ دیرینہ مشاق اور سیدھے سادے طرز قدیم کے دلدادہ ہیں۔ دیوان اور عروض کی کتاب کئی بار چھپ چکے ہیں۔ دیوان میں رطب و یابس سب کچھ موجود ہے۔ کلام میں قواعد فن کی پابندی کی لگن زیادہ پائی جاتی ہے۔ جب اس سے علیحدہ ہو کر کہتے ہیں۔ تو مؤثر اور درد بھرے شعر نکال لے جاتے ہیں۔ بہت برس ہوئے شاید انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں سرگباش ہوئے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

فکر دارین سے معذور رہا خوب ہوا
تیر ہے دشنہ ہے خنجر ہے کہ تلوار نظر
جو تیغ کھینچی ہے سر حاضر۔ لگاؤ بسم اللہ ہاتھ لیکن

دل مئے عشق سے مخمور رہا خوب ہوا
صاف جو ہوگئی سینے کے مرے پار نظر
تمہاری صورت ہی دلبیں ہیں مبرا لگا نا ہاتھ اسکو تم بچا کر

کیا چشمِ ظاہری سوئے باغِ جناں کروں
لازم ہے چشمِ دل کو سوئے باغباں کروں

ہم کو بھی صبر دے گا دیا جس نے تم کو حسن
کیا آپ کا خدا ہے ہمارا خدا نہیں

یا الٰہی نہ ہوں کم جور و ستم قاتل کے
صدمۂ جور اُٹھانے کو جگر پیدا ہو

نہ کی عبادت نہ کچھ ریاضت نہ کی کبھی یادِ حق کوئی دم
کٹی گناہوں میں عمر ساری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

ترا ہے عفو عطا برابر مرا قصور و خطا سراسر
ہے عفو کی بس امیدواری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

خوش رہے گو نہ کیا وصل سے دلشاد مجھے
دل کے بہلانے کو کافی ہے تری یاد مجھے

عاشق: سید اقبال حسین عاشق خلف منشی نور الدین دہلوی۔ پرانے سخن سنج تھے۔ دہلی کے مشاعروں اور قدیم صحبتوں کو دیکھ چکے تھے۔ مگر ان کی طبیعت نے ابتدا میں جو رنگ اختیار کیا تھا۔ وہ آخر وقت تک نہ بدلا۔ ۱۸۵۸ء میں ریاست لوہارو میں ملازم تھے ۶۸ء میں سرکار بیکانیر میں وظیفہ خوار ہوئے ۱۸۸۴ء میں وکیل حاضر باش ریاست ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ ہوئے۔ چالیس سال تک مشق سخن میں مصروف رہے مگر اس میدان میں نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ معاملہ بندی کا عجیب ڈھنگ تھا۔ ان کی زود گوئی اور صفائی کے سامنے مضمون کا قافیہ تنگ تھا۔ اوائل سخن میں اساتذہ کی غزل پر غزل کہنے کا شوق تھا۔ اور ایک ایک قافیہ کو کئی مرتبہ لکھتے اور جب تک سامعین سے یہ نہ کہوا لیتے کہ آپ کا قافیہ دوسروں سے بڑھ گیا۔ اس وقت تک ان کا پیچھا نہ چھوڑتے آپ کو سخن فہم حضرات کی ہمیشہ تلاش رہتی۔ اپنے سامعین سے داد لینے کے لئے انہیں کئی روز تک اپنا مہمان رکھتے اور خاطر تواضع سے پیش آتے۔ چند ظرافت پسند حضرات نے ان کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا۔ کہ آپ داغ سے بہتر کہتے ہیں۔ اسی بنا پر آپ نے حضرت داغ کے

دو دیوانوں کا جواب قافیہ بہ قافیہ لکھا۔ کاتب کی غلطی سے جناب داغ کے دیوان میں ایک قافیہ غلط چھپ گیا تھا۔ آپ نے اس کا مطلق خیال نہ فرمایا۔ اور اس کو اپنے ہاں بھی اسی طرح باندھ دیا۔ جو کوئی بیکانیر یا دورانِ قیام اجمیر میں۔ آپ سے کلام سننے کے واسطے جاتا سب سے پہلے اس کو داغ کا دیوان دیا جاتا تھا۔ اُس کا فرض تھا کہ وُہ داغ کا شعر پڑھتا جاتا۔ اور آپ اپنا دیوان لیکر اسی زمین کا ہم قافیہ شعر سناتے اور دادِ سخن لیتے۔ حضرت داغ کو جب یہ واقعات معلوم ہوئے تو وُہ ہنسے اور انہوں نے مذاقاً اپنے کئی خطوط میں آپ کے باکمال ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت مضطر خیرآبادی نے ان کے دیوان کی تقریظ میں یہ مزیدار فقرہ بھی زیبِ رقم کیا ہے "حضرت داغ کا کلام ہنستوں کو رُلا دیتا ہے۔ مگر آپ کا کلام روتوں کو ہنسا دیتا ہے"۔ حضرت عاشق ہر قسم کی نظم و نثر پر قدرت رکھتے تھے تین دیوان اسرارِ عاشق۔ اذکارِ عاشق۔ اعجازِ عاشق ان سے یادگار ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز عجیب و غریب تھا۔ یارانِ مجلس بہترین اشعار کی داد بھی ظرافت کے پیرایہ میں دیتے تھے۔ اپنے آپ کو مرزا غالب کا شاگرد بتاتے تھے حضرتِ زکی دہلوی۔ مولانا راسخ۔ سوزاں وغیرہ کے ہم مشاعرہ اور بے تکلف دوست تھے سیاہ فام آدمی تھے۔ مگر آپ کا حسنِ باطن اور اخلاق تعریف کے قابل تھے۔ اکثر اپنے مکان پر بھی مشاعرہ کرتے۔ مرتبِ تذکرہ ایسی کئی صحبتوں میں شریک ہو چکا ہے۔ دہلی میں شاہ تارا کی گلی میں ان کا مکان تھا۔ تینوں دیوانوں کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

انتخاب دیوان اوّل و دوم

تھا وہم دوئی تفرقہ پردازِ وگرنہ اچھا ہیں بُرا سہی ولیکن عشق میں بس یہ ہنر پیدا کیا	جس مرتبہ تو دور تھا اتنا ہی قریں تھا تم اپنی کہو تمہیں ہُوا کیا کچھ نہ رکھا جس قدر پیدا کیا

جو نمک زخموں پہ چھڑکے رات دن
چارہ گر وہ ڈھونڈ کر پیدا کیا

چشم میگوں سے تری مست ہے عالم ساقی
پھر خبر کس کو کہ یہ نشۂ صہبا کیسا

تیر پہلو میں چبھو کر مرے کہتا ہے وہ شوخ
ہم بھی دیکھیں کہ ہے پتھر کا کلیجا کیسا

اے جنوں شوق ہو کیوں بادیہ پیمائی کا
گھر ہی ویرانے سے بہتر ہے تو صحرا کیسا

کمبخت اک امید پہ جیتے ہی رہے ہم
مرنا شب ہجراں میں تو مشکل نہیں ہوتا

تیر کا پیکاں جو میرے دل کے اندر رہ گیا
بدگماں بولا ادھر آ کیا چرا کر لے چلا

رہ گیا صیاد بھی بس دیکھتا کا دیکھتا
صید وہ تڑپا قفس کو بھی اڑا کر لے چلا

ہائے کس ناز سے کہتے ہیں وہ مجھ سے ہر دم
اپنی صورت کو تو دیکھو تمہیں چاہیں کیونکر

وہ عیادت کو جو آتے ہیں تو یہ کہتے ہیں
ناتوانی میں نکلتی ہیں یہ آہیں کیونکر

کرتے ہیں مجھ کو ہی وعظ و پند ناحق رات دن
حضرت واعظ اُسے کچھ جا کے سمجھاتے نہیں

تمناؤں کی رخصت ہے تو ارمانوں کی آمد ہے
مسافر سینکڑوں مہمان سرائے دل میں رہتے ہیں

انہیں غصہ کہ میری بزم میں یہ کس لئے آیا
مجھے یہ غم کہ وہ پہلو میں کیوں دشمن کے بیٹھے ہیں

مقدر اپنا اپنا ہے کسی کا کیا اجارہ ہے
عدو سے من کے بیٹھے ہیں وہ مجھ سے تن کے بیٹھے ہیں

نگاہِ ناز سے لوٹا ہے سارا قافلہ دل کا
کلیجے پر ہزاروں تیر اس رہزن کے بیٹھے ہیں

وہ دل ہے خاک جس میں تری آرزو نہ ہو
وہ گل ہے خار جس میں محبت کی بو نہ ہو

نامہ کے ساتھ ساتھ چلی جان بے قرار
عاشق کو نامہ بر کی ضرورت نہیں رہی

گر ہماری بندگی ہے ناقبول
تو بتوں کی اب خدائی ہو چکی

ابھی تو عمر نہیں ہے حیا کے آنے کی
عجیب خو ہے تمہاری لجا کے آنے کی

جو آؤ تم تو رہے منتظر لبوں پر جان
وگرنہ راہ نہ دیکھے قضا کے آنے کی

کل تو سمجھاتے تھے حضرت ناصح مجھ کو
آج اُسے دیکھ کے خود بن گئے دیوانے سے

ہم مٹے ہائے مگر وصل کی لذت نہ مٹی
دل گیا ہائے مگر دل سے یہ ارمان نہ گئے

شب فرقت مری آسنی پڑی ہے
قیامت جس کی اک کچّی گھڑی ہے
یہاں وہ آئینگے کہنے کی ہے بات
بناوٹ ہے یہ فقرہ ہے تڑی ہے
اس شرارت کو تو دیکھو کہ دم نزع وہ شوخ
ہنسکے کہتا ہے کہ پہلے سے تو حال اچھا ہے

از دیوان سوم

آنکھ جادو تھی مگر اس کو نہ چلتے دیکھا
زلف ناگن تھی مگر من نہ اُگلتے دیکھا
تیرہ بختی مری صبح شب وصل آئی کام
چھا گئی ایسی کہ سورج کو نکلنے نہ دیا
ابھی چڑھتی جوانی ہے ابھی اُٹھتی اُمنگیں ہیں
ابھی دل کو ہٹالوں دل لگی سے ہو نہیں سکتا
قیامت کل کی آنیوالی یارب آج آجائے
دل بیتاب سے اب صبر فردا ہو نہیں سکتا
دل کس کی نگاہوں کا پڑا تجھ پہ اثر آج
جو ہم سے بچائے ہوئے جاتا ہے نظر آج
مُنہ تکتے ہیں آئینہ و پروانہ و عاشق
ہو تم کو نہ ان حسن پرستوں کی نظر آج
اسی دل کو برباد تم نے کیا
رہے جس مکان میں مکیں دیر تک
کسی کے جو آنے کی امید تھی
رہی لب پہ جان حزیں دیر تک
شوخی نے رخنے ڈالدئے ہیں نقاب میں
سو بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں
ملتے ہی کام کر گئی وہ چشم سرمہ سا
گویا ہیں اس طرح ہوں کہ منہ میں زباں نہیں
غیر فتنہ تو نہیں ہے کہ اٹھایا اسکو
ہیں قیامت تو نہیں ہوں کہ اٹھادیتے ہیں
غیر کو بھیجتے ہیں میری عیادت کے لئے
مرنے پر اور وہ سو ذرے لگادیتے ہیں
لے لیا بوسۂ رخسار تو کیا جرم کیا
پیار کی بات پہ ناحق وہ سزا دیتے ہیں
لگا لینگے مجھے سینہ سے وہ ہمدم یقیں آیا
مری پرچھائیں سے جو بھاگتے ہیں مجھ سے ڈرتے ہیں
ترے گیسو پریشاں ہوکے کیوں آتے ہیں عارض پر
یہ کافر ہیں کلام اللہ پہ کیوں ہاتھ دھرتے ہیں
سینہ پر میرے نشانِ کف پا رہنے دے
اسکو ظالم مری چھاتی سے لگا رہنے دے
شیخ جی تاک میں ہیں دختر رز کی ساقی
در میخانہ کو ہرگز نہ کھلا رہنے دے

کوئے جاناں میں چلوں بھیس بدل کر شاید
پاسباں جان کے درویش پڑا رہنے دے

نیت بھی بُری اس کی نگاہیں بھی غضب ہیں
ہاں دختر رز آئیے نہ دیندار کے آگے

عاشق

عاشق :- یوسف صاحب عرف وولارے صاحب ولد کپتان مانوک صاحب قوم فرانسیسی۔ ریاست بھوپال کے منوسلین سے ہیں۔ علمی مذاق اعلےٰ درجہ کا ہے تفنگ اندازی میں ہوشیار ہیں۔ ایک یورپین کا فرزند ہو کر آپ مشرقی شاعری کی جملہ خوبیوں کو برتنے میں مشتاق ہیں۔ کلام میں قدما کا رنگ ہے۔ زبان صاف ہے محاورات اور امثال کو بہت خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات پُر لطف ہوتی ہیں۔ کیا خوب کہا ہے :-

سرخئی نہاں ہے کب ابروئے خمدار کے پاس
ایک سپر رکھ لی ہے قاتل نے یہ تلوار کے پاس

یہ سپر بالکل نرالی ہے۔ ایک مغربی نژاد شخص پر مشرقی معاشرت وادبیت کا اس قدر اثر پڑنا علم نفسیات کا ایک باریک نکتہ حل کرتا ہے۔ یعنی مذاق کی ہم آہنگی ذہنی یگانگت پیدا کر دیتی ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو :-

محو نظارہ ہوا کس کے نظر کے تیر کا
طائر دل پر گماں ہے طائر تصویر کا

سیاہی زلف شبگوں کی مری آنکھوں میں چھائی ہے
گماں ہوتا ہے خورشید فلک پر دن کو جگنو کا

چبھوتا ہے کوئی میرے جگر میں نوک خنجر کی
اشارہ یاد آتا ہے جب اس قاتل کے ابرو کا

اشک کا ہر ایک قطرہ ہے سمندر کا جواب
ابر نیساں کب ہے میرے دیدۂ تر کا جواب

ہنستے ہنستے چلے آئے مرے گھر آپ سے آپ
میرے گریہ نے دکھایا یہ اثر آپ سے آپ

کیا ہوا کس نے کئے دل کے جگر کے ٹکڑے
خون روتا ہے مرا دیدۂ تر آپ سے آپ

دیکھو دنیا اسی کو کہتے ہیں
یاں ہے سب کی جدا جدا قسمت

مہربان کچھ ہوں وہ لے عاشق
دیکھیے اب دکھائے کیا قسمت

نے فقط خنجر ابرو کا اشارہ کافی
قتل عاشق کی کیا کرتے ہو تدبیر عبث

گل کسی کو چمن کس کو، کسے سرو و سمن یاد | باقی جو رہا بھی تو رہا گور و کفن یاد
دل میں خیال ہے جو کسی مست خواب کا | ہر لحظہ ہر گھڑی مجھے کیونکر نہ آئے نیند
باندھا تصور قد جاناں تو سو گیا | عاشق مثل یہ سچ ہے کہ "سولی پہ آئے نیند"
سرمئی خال ہے لب ابروئے خمدار کے پاس | اک سپر رکھ لی ہے قاتل نے یہ تلوار کے پاس
ہے عجب۔ گل سے بن گیا غنچہ | ہنستے ہنستے ہوا وہ جب خاموش
ہم نے کافر جان کر اس کو جو سجدہ کر لیا | اس لئے ملتا نہیں طفل برہمن کا دماغ
آتشیں رخ کو چمن میں مرے گلرو کے نہ دیکھ | ورنہ پڑ جائینگے دل میں ترے چھالے بلبل
وصل کتنے ہیں لسے باغ جہاں میں عاشق | بس میں بلبل کے ہو گل۔ گل کے حوالے بلبل
سوزن عقل نے گو بخیہ گری دکھلائی | دست وحشت نے مگر جامہ دری دکھلائی
نزع میں جب اس نے پکارا مجھے | ہو گیا جینے کا سہارا مجھے

عاشق

عاشق:- کنور گوبند سہائے نوجوان۔ شوخ طبع۔ خود رو شاعر ہیں۔ طبیعت میں جدت ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں اچھے شعر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ارم کو لے اڑی وحشت کسی بلقیس کے پیچھے | پری زادوں نے لوٹا ہے سلیماں کی دہائی ہے
نہ کیونکر لیلیٰ و مجنوں کو ہو الفت میں یکرنگی | ہوئے جب چشم جاناں کی محبت میں ہرن کالے
اثر نالوں کا ہو گا برق سوزاں سے سوا عاشق | مری آہوں سے ہو جائینگے جل کر سب چمن کالے

عاشق

عاشق:- نواب شمس الدین علی خاں رئیس اجمیر شریف تلمیذ حضرت داغ دہلوی۔ نواب مہابت خاں امیر عہد جہانگیری کی اولاد سے ہیں۔ جاگیردار ہیں۔ برسوں حضرت ظہیر کو کلام دکھایا۔ مؤلف تذکرہ سے اجمیر میں ملاقات ہوئی تھی۔ اُس وقت پچاس کا سن ہو گا۔ حضرت ظہیر سے تلمذ کے علاوہ قرابت بھی تھی۔ انہیں نانا جان کہا کرتے تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کی طبیعت میں آمد زیادہ پائی جاتی ہے مضمون

کی تلاش میں الفاظ کا گورکھ دھندا اور استعارے کے اینچ پینچ سے کام نہیں لیتے بلکہ سیدھی سادی زبان اور روزمرہ لکھتے ہیں۔ کثرتِ فکر سے طبیعت بہت مشاق ہو گئی ہے بے ساختگی اور بے تکلفی کلام میں بہت پائی جاتی ہے۔ شوخی اگرچہ بدرجۂ اتم ہے۔ مگر متانت کے پہلو کو مدِّ نظر رکھتے ہیں۔ یہ کلام کا انتخاب ہے۔

کس طرح کر سکے تری رحمت کا سامنا
اتنا تو حوصلہ نہیں میرے گناہ کا

وہ کہتے ہیں تو بتلا ہے کسی کا
خطا ہے تری جرم کیا ہے کسی کا

جوانی کے دم تک ہیں ساری بہاریں
سدا دور دورہ رہا ہے کسی کا

نہ لینا کبھی صبر تم دلجلاوں کے
مری جان ستانا برا ہے کسی کا

اڑا لے گئے دل کو وہ اک نظر میں
قیامت تھا ان کا ادھر دیکھ لینا

ایک دل تھا پاس وہ بھی اے خدا جاتا رہا
دل لگی کا لطف جینے کا مزا جاتا رہا

دل اڑا کر پوچھنا ہے یہ تجاہل سے کوئی
آپ کیوں خاموش ہیں کہئے تو کیا جاتا رہا

کس کے نصیب تم نے جگائے ہیں رات بھر
آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں جو میخوار کی طرح

سزاوار جور و جفا اب ہیں بیشک
مگر بعد مرنے کے یاد آئینگے ہم

وہ منہ پھیر کر ہائے کہنا کسی کا
مرو یا جیو یونہی ترسائینگے ہم

در پہ مجھکو وہ پڑا دیکھ کے یہ کہتے ہیں
کیا کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں گھر ہی نہیں

یہ تو فرماؤ جنہیں چاہنے والے کیونکر
قتل کرتے بھی نہیں پاس بلاتے بھی نہیں

جان دینے کو میں پھرتا ہوں تو وہ اس ضد سے
آج کل ہاتھ میں تلوار اٹھاتے بھی نہیں

حضرتِ دل کی عنایت ہے مری رسوائی
دیکھتے ہی یہ حسینوں کو مچل جاتے ہیں

دل بھی میرا لیگئے برباد بھی مجھ کو کیا۔
پھر بھی کہتے ہیں کہ یہ جور و جفا کچھ بھی نہیں

غیرت میرے لئے ان کا یہ کہنا دیکھو
دیکھو اس شکل کو اور ان کی تمنا دیکھو

دل یہ کہتا ہے کہ تم عشق ہی کرتے کیوں ہو
جان کا ڈر ہے تو اس شوخ پہ مرتے کیوں ہو

شکوۂ جور پہ وہ ہنسکے یہ دیتے ہیں جواب
قطع ہو گی دم خنجر سے مسافت میری

جان پیاری ہے تو پھر عشق ہی کرتے کیوں ہو
جان لیکر ہی کٹیگی شب فرقت میری

ہائے یہ کہکر اٹھایا بزم سے اس نے مجھے
بدنظر ہے یہ مجھے اس کی نظر ہو جائیگی

لوگ کہتے ہیں کہ اک روز قیامت ہو گی
میں یہ کہتا ہوں یہ تیری ہی شرارت ہو گی

وہ بھری بزم میں کہتے ہیں اٹھا کر مجھ کو
پھر نہ آؤگے اگر کچھ تمہیں غیرت ہو گی

عرض مطلب پہ مرے ہائے کسی کا کہنا
کوئی سنتا بھی ہے اسکی یہ کہنا کیا ہے

یہ تو سمجھاؤ مجھے حضرت زاہد للّٰہ
دل مرا چور ہے کیوں آپ لبند کے ہونے

یہ تم نے چھیڑ کے پہلو نئے نکالے ہیں
تماشا دیکھتے ہو غیر سے لڑا کے مجھے

جب کہا کان میں اک بات مری سن لیجے
بولا دھوکے نہ سے معلوم ہیں عیار مجھے

بوسہ پھر کیوں نہیں دیتے ہو کہ جھگڑا پک جائے
تم تو کہتے ہو کہ بھاتی نہیں تکرار مجھے

عاشق :- صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب خلف صاحبزادہ محمد سعید خاں رئیس ٹونک آپ نواب امیر خاں کی اولاد سے ہیں۔ اجمیر میں پیدا ہوئے۔ وہیں میو کالج میں ابتدائی تعلیم پائی کچھ عرصہ دہلی میں رہے۔ نکات شاعری خواجہ الطاف حسین حالی سے حاصل کئے۔ حضرت داغ کو بھی آپ نے اپنا کلام دکھایا اور انہیں کا رنگ تغزل دل سے پسند کیا۔ سب سے آخر حضرت ظہیر دہلوی سے تلمذ اختیار کیا۔ آپ کا شمار ان کے ارشد تلامذہ میں ہے۔ ۱۹۱۰ئ میں مؤلف تذکرہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ فالج کیوجہ سے آپ کا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا تھا۔ مگر مشق سخن برابر جاری تھی۔ کلام میں روانی اور سلاست ہے۔ زبان صاف ہے۔ کلام کا انتخاب مندرجہ ذیل ہے۔

انھیں نے حال محبت کو آشکار کیا
چھپا چھپا کے زمانہ کو رازدار کیا

نہیں ہے حیرت شکوہ کہ اس نے آخر کار
ملال آپ کے دل کا مجھے غبار کیا

جو آپ اپنی ہی آنکھیں چرائے ہر لحظہ
وہ چھوڑ دے گا کوئی چیز پھر پرائی کیا

آگیا اب وہ زمانہ عشق میں
ان سے ترکِ عشق کرنا تھا کہ بس

باعث آرام فرقت ہو گئی
اور بھی دونی محبت ہو گئی

دیا اس نے جواب صاف اہل کیس بے نیازی سے
کہ ہیں گر اور بھی اچھے تو میری التجا کیوں ہے

ندامت اور کیا ہوتی کہ طعنِ ربطِ دشمن پر
وہ کہتے ہیں تمہارا ہی کوئی ہوگا مرا کیوں ہے

گلے شکوے مرے سن سن کے وہ چپکے سے کہتے ہیں
سنانے بھی نہیں دیتے تو دل تم نے دیا کیوں ہے

خلاف ایک سے ہے ایک دلربا کیلئے
کہ دل نے لطف اٹھا ہوں سے بھی چھپا کیلئے

عاشق:۔ نواب مجید الدولہ ممتاز الملک مرزا محمد ابوطالب علی خاں بہادر رستم جنگ استعارہ اور تشبیہات پر والہ و شیدا تھے۔ لکھنؤ کی قدیم شاعری کو سرمایہ افتخار جانتے تھے۔ زبان کی طرف توجہ بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ اور سادہ بیانی کا رنگ نامطبوع خاطر ہے۔ کہیں کہیں محاورات بھی نظر آجاتے ہیں۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

گر دکھادے رخِ رنگیں بُت پر فن اپنا
بھول جائے گُل تازہ ابھی جوبن اپنا

مسی مالیدہ تیرے لب سے اُسے نسبت کیا
مُنہ تو بنوائے ذرا باغ میں سوسن اپنا

تم اٹھادوگے جو اپنے روئے روشن سے نقاب
ٹکڑے ٹکڑے چاند مانند کتاں ہوجائے گا

شب فرقت میں اب تو اے غم یار
تجھ سے بہتر کوئی رفیق نہیں

کنج مرقد میں بے کسی کے سوا
کوئی مونس نہیں شفیق نہیں

سب کو نجات دیتی ہے قید حیات سے
احساں کسی کے سر پہ ترا اے اجل نہیں

اللہ جانتا ہے یہ حسرت ہے اے بتو
دیکھا کروں یونہی تمہیں بٹھلا کے سامنے

وہ مست آنکھیں اس میکش کی اس دم یاد آتی ہیں
مجھے معذور رکھ صحبت میں ساقی جام صہبا سے

تمہاری محرم اب واں جس دن سے دیکھی ہیں
اٹھایا سر حبابوں نے نہ اپنا آب دریا سے

ہمیشہ دیکھ کر سینے کو مرغِ دل پھڑکتا ہے
اُڑے جاتے ہیں طوطے ہاتھ کے محرم کے چڑیا سے

لڑی ہے آنکھ ان موزوں جو پھر اک شوخ کم سن سے
آنکھیں کھلی ہیں بعد فنا بھی جو قبر میں
کٹے گا ماہ نو شمشیر ابروئے ہلالی سے
بہار آتے ہی یاں تک شدّت وحشت میں گل کھائے
ریاض حسن میں اب دلکی آرزو کم ہے

نہیں قابو میں میرے یہ دل نادان کئی دن سے
کس باقی جفا کا انہیں انتظار ہے۔
گر بگی ایک دن بجلی تیرے کانوں کی بالی سے
مشابہ ہاتھ اپنا ہو گیا پھولونکی ڈالی سے
کہ اس چمن کے گلوں میں وفا کی بُو کم ہے

عاشق:۔ شیخ عاشق الزمان خاں صدیقی۔ شاگرد حضرت امیرؔ۔ زیادہ حال اور کلام نہ مل سکا۔ زبان اچھی ہے۔ الفاظ چست ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

بدلی کے نظر آتے ہی نیّت مری بدلی
حسرت دید میں مرتا ہوں میں اک مدّت سے
کیا کہا پیک اجل نے کوئی پوچھے تو کبھی

توبہ کا رہا پاس نہ گھنگھور گھٹا میں
دیکھنا جا مجھے او آنکھ چرانے والے
کیسے خاموش چلے جاتے ہیں جانے والے

عاشق۔ محمد کریم بخش تلمیذ حضرت محمد طاہر میں پوری۔ ذہن رسا رکھتے ہیں فکر عالی پائی ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔ کلام ذیل ان کی فکر کا نتیجہ ہے۔

یا خدا وہ دل ویران کبھی آباد نہ ہو
ضبط کہتا ہے کبھی شکوہ جلاد نہ ہو
شکوہ ظلم و جفا اس سے عبث ہے اے دل
مجھے روٹھا ہوا پایا ہے جب شوق شہادت نے
کعبہ و دیر کو تو چھوڑ کے آئے تھے یہاں
لطف جب ہے کہ دل دینے سے نکل جائے

جس میں دنیا کا ہو غم اور تیری یاد نہ ہو
سر بھی کٹ جائے تو لازم ہے کہ فریاد نہ ہو
جس کی بیداد کی فریاد نہ ہو داد ہو
گلا کس پیار سے تیغ دو پیکر نے لگایا ہے
در دلدار سے جاتے تو کدھر کے ہوتے
ہم بتوں کے یہ بیت اللہ کے گھر کے ہوتے

عاشق۔ نواب راحت علی خاں صاحب شاگرد میر تجمل حسین تجمل۔ رعایت لفظی کے پابند ہیں۔ مگر انداز بیان اچھا ہے۔ محاورہ بھی لکھتے ہیں۔ فرسودہ استعارات اور [illegible] زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا نمونہ کلام یہ ہے

سیہ چادر جو میری قبر پر یاروں نے تانی ہے
کسی کی زلف کا مارا ہوں یہ اسکی نشانی ہے

قضا آتی ہے یوں تو ایکدن اور جان جانی ہے
شبِ فرقت میں آجائے تو اسکی مہربانی ہے

سراپا عاشقِ کا کل یہ بدبختی کے پتلے ہیں
بلا میں مبتلا ہیں اک پریشاں زندگانی ہے

نہ چھٹ جائیگی مہندی پانو کی چل دیکھ اے لیلی
کہ تیرے عشق میں مجنوں نے کیا کیا خاک چھانی ہے

عاشق - لالہ گوکل چند قوم کایستھ ساکن محلہ اشرف آباد لکھنؤ۔ کبھی کبھی ریختہ بھی کہہ لیتے تھے۔ مندرجہ ذیل چند اشعار تذکرۂ شوق سے انتخاب کئے جاتے ہیں۔

آپ کا دل ہم سے شاید کچھ میاں بیزار ہے
ورنہ کیا تشریف لانا اک قدم دشوار ہے

آنکھ سے نیند اڑ گئی اور چین بھی دلکو نہیں
اے طبیبو دیکھیو یہ کونسا آزار ہے

ارے ہی لئے آہ ہر دم شعلہ ساں اٹھتی ہے کیوں دل سے
خدا کا ڈر نہیں تجھ کو کسی کا گھر جلائے گی

عاشق - شاہ محمود احمد ردولوی۔ ردولی ضلع بارہ بنکی اودھ کے رہنے والے ہیں آپ حضرت شاہ التفات احمد صاحب قدس سرہٗ سجادہ نشین کے عزیز ہیں۔ باکمال بزرگ ہیں۔ ترتیب تذکرہ کے وقت عمر ۶۰ سال سے متجاوز تھی۔ نہایت خوش مزاج اور خوش اخلاق ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اردو میں حضرت اسیر مرحوم سے تلمذ تھا۔ آپ کا اردو کلام اگر جمع کیا جاتا تو کئی دیوان مرتب ہو جاتے مگر افسوس ہے کہ ان کا کہیں نشان تک نہیں ملتا۔ چند اشعار جو دستیاب ہو سکے ہدیہ ناظرین ہیں۔

موسے سے لن ترانی احمد سے خوش بیانی
بدلا ہے رنگ اس نے کیا خوب گفتگو کا

تارِ نظر سے اپنے ٹانکے لگاؤ اس میں
چاک جگر ہمارا محتاج ہے رفو کا

ہمارے اشک سب چشم ہی میں واو رے ضبط
کسی حسین کا جوبن نہ تھے کہ ڈھل جاتے

عبث پھرا کئے عشاق تیرے آوارہ
تری گلی میں جو آتے تو کچھ بہل جاتے

یہ وہ مرض ہے کہ جاتا ہے تن سے روح کیساتھ
مریض عشق کو دیکھا نہیں سنبھل جاتے

عاشق
عاشق

عاشق

عاشق۔ جگنّاتھ پرشاد عرف بتو۔ ذات کھتری سَریں۔ خلف منشی رادھا کشن مرحوم ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ محلہ چھوٹی پٹن دیبی شہر عظیم آباد میں سکونت تھی ۱۸۹۷ء میں مرض سل میں مبتلا ہوکر انتقال کیا۔ بڑے موزوں طبع تھے۔ جناب شاد عظیم آبادی سے تلمّذ تھا جن کی اصلاح نے لطف کلام کو دوبالا کردیا تھا۔ مزاج میں انکسار و ہمدردی کا مادّہ بہت تھا۔ بڑے دوست پرور تھے۔ مرنے سے کچھ قبل ایک غزل کہی جس کا مقطع تھا

لباس تن بہت میلا ہوا ہے — ارادہ ہے کہ اے عاشق بدل دیں

دیوان معروف بہ کارنامہ عاشق اگست ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا۔ کلام میں لطف زبان کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

رہا نہ ہوش انہیں عشق میں بجا اپنا — بتوں کو سجدہ کیا جان کر خدا اپنا

گلی میں یار کی اللہ رے بیخودی دل کی — میں سب سے پوچھتا پھرتا ہوں خود پتا اپنا

ان کے فقروں میں اگر آ جائیگا — دل سے کہتا ہوں کہ پچھتائیگا

عالم نزع ہے فرصت کم ہے — ادھر آنا ہو تو جلد آئیگا

قطعہ

کوچۂ یار میں اک دن عاشق — چل کے جب پاؤں کو پھیلائیگا

دیکھیئگا جو ملے گی راحت — آپ میں پھر نہ کبھی آئیگا

لطف ہے قبر کی تنہائی ہے — آنکھ لگ جائیگی سو جائیگا

بن جڑ کا تھا کل جنازہ رہ گیا — جی اُٹھے عاشق تمہارا رہ گیا

فصل گل تو جا چکی عاشق مگر — سر میں اب تک اپنے سودا رہ گیا

کیا خوب عاشق ہے کہ اُسے جانتے نہیں — مرتے ہیں جس پہ ہم اُسے پہچانتے نہیں

ناصح تو چھوڑ قیس کی ہرگز نہ دے مثال — ہم تو سنی سنائی کبھی مانتے نہیں

قیبۂ اُنچھ دل یہ نہ تھی زلف گرہ گیر میں بھی — ہم تو آزاد رہے خانۂ زنجیر میں بھی

اِک حسیں ہم نے تصوّر میں بنا رکھا تھا	وہی صورت نظر آئی تری تصویر میں بھی
ہے فرق صرف نام کا پر ذات ایک ہے	تم رام یا رحیم کہو بات ایک ہے

عاشق:- پنڈت شیوراج ناتھ دہلوی قوم برہمن کشمیری عرف کول خلف پنڈت کاشی ناتھ صاحب ان کے خاندان میں بہت نامی نامی لوگ گذرے ہیں اور اچھے اچھے عہدوں پر سرفرازی حاصل کی ہے۔ یہ بھی پہلے ریاست بنارس میں سپرنٹنڈنٹ کارخانہ جات تھے۔ اب عرصے سے ریلوے کے محکمہ میں ملازم ہیں۔ اور قیام زیادہ تر بمبئی میں رہتا ہے۔ شعر و سخن کا شوق ان کو عنفوانِ شباب سے ہؤا پہلے مولانا نظام گلشن آبادی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد شاہزادہ مرزا قیصر بخت فرخ خلف مرزا قادر بخش صابر گورگانی سے فیضِ سخن پاتے رہے آپ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ اودھ پنچ۔ زمانہ اور انڈین گرافک میں آپ کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔ اجمیر شریف کی ایک تاریخ بھی آپ نے لکھی ہے جو آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ وقیع ہے۔ بہت حاضر جواب۔ بذلہ سنج۔ خوش خو اور خوش لباس آدمی ہیں۔ تخمیناً ۵۰ برس کی عمر ہوگی۔

صوفیانہ خیالات کے شاعر ہیں۔ عاشقانہ رنگ بھی اچھا ہے۔ سلجھی ہوئی طبیعت پائی ہے۔ زبان پاکیزہ اور صاف ہے۔ کلام سے کہنہ مشقی اور پختگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

کبھی دل میں آ کر جانا کبھی آنکھوں میں آ جاتا	رہ کرتا ہے وہ ظالم نہاں برسوں عیاں برسوں
میری تربت پہ بھی یاروں کا رہیگا مجمع	پاس ارماں کبھی ہونگے کبھی حسرت ہوگی
آپ جب عرصۂ محشر میں خراماں ہونگے	ہاتھ جوڑے ہوئے قدموں پہ قیامت ہوگی
وہ بھری بزم میں کہتا ہے اٹھا کر مجھ کو	پھر نہ آئیگا اگر کچھ تجھے غیرت ہوگی
چٹکیاں لے کے کیا پہلو سرخ	پاس بیٹھے پہ شرارت اتنی

بکتے پھرتے ہو جو عاشق اتنا
پی نہ جایا کرو حضرت اتنی

دل یہ کہتا ہے بہت عشق کا پایا ہے مزہ
آنکھیں کہتی ہیں ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے

دیکھ لیجے کسی بیدرد پہ عاشق ہو کر
مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں ہجر میں ہوتا کیا ہے

ماجرا اور محبت کا کہوں کس کس سے
سب یہی پوچھتے ہیں حال تمہارا کیا ہے

ہم برے ہیں تو برے ہی سہی بس جانے دو
بزم اغیار میں پھر ذکر ہمارا کیا ہے

بیخودی وصل میں اس درجہ بڑھی تھی عاشق
نہ رہا یاد مجھے میری تمنا کیا ہے

عاصم

عاصم۔ سید میاں خلف سید قاسم متوطن قدیم کڈپہ احاطۂ مدراس۔ ان کے بزرگ بسبیل تجارت کڈپہ سے نندیال آئے۔ ایک صدی تک وہاں سکونت رہی مگر اب یہ بنگن پلی میں مقیم ہیں۔ مہدوی مشرب کے آدمی ہیں۔ شاہ نلیسان کو کلام دکھاتے ہیں نعتیہ شاعر ہیں۔ عاشقانہ غزلیں کم کہتے ہیں گلدستہ معراج خیال مدراس میں اکثر کلام شائع ہوتا تھا۔ فکر سخن معمولی ہے مگر کسی قدر کلام میں صفائی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اضطراب جنون الفت میں
مجھ سے بھولے سے بھی گلہ نہ ہوا

وہ شان حق کا تصور ہے رات دن مجھکو
تجلیات کا دل میں مرے ظہور ہوا

گرانی جرم تغافل کی کیوں ہو سر پہ مرے
نبی کا نام لیا مجھ سے جب قصور ہوا

عاصی

عاصی۔ حافظ سید محمد سلیمان تلمیذ حضرت داغ۔ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ طبیعت شگفتہ رکھتے ہیں۔ یہ نمونۂ کلام ہے۔

بیقراری نے رہ شوق میں چلنے نہ دیا
وہ مرے پانوں اکھڑے کہ سنبھلنے نہ دیا

پوچھتے ہیں اب وہ اپنے عاشق محزوں کا حال
ہو چلا شاید اثر کچھ نالہ و فریاد کا

تاب رخسار وہ جس وقت دکھا دیتے ہیں
جلوۂ طور کو آئینہ بنا دیتے ہیں

حسرت و شوق و تمنا ہیں بلا کے دشمن
مٹتے مٹتے بھی یہ کمبخت مٹا دیتے ہیں

آپ جرأت تو کریں قتل کی ہمت تو کریں
لیجئے ہم سر تسلیم جھکا دیتے ہیں

عاصی

عاصی :- سید علی عبد القادر عرف شاہ مرشد علی۔ معمولی فکر و خیال کے شاعر ہیں کلام میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ چند شعر ان کے درج ذیل ہیں۔

نیازِ شوق و حسرت ہے ادھر سے
جفا و ناز و استغنا ادھر سے

نزاکت کہتی ہے زلفِ دوسر سے
یہ دوہرا بوجھ اُٹھےگا کب کمر سے

یہ ٹھنڈی گرمیاں لاے ابر کب تک
برس کر سامنا کر چشم تر سے

عاصی

عاصی - منشی گھنشام رائے کایستھ ماتھر دہلوی خوشہ چین خرمن شاہ نصیر دہلوی شاہ عالم ثانی کے زمانہ سے بہادر شاہ کے عہد تک دفتر شاہی سے متعلق رہے اور فارغبالی سے اوقات بسر کرتے رہے۔ شعر و سخن سے کمال ذوق تھا۔ پُرگوئی۔ تیز طبعی۔ حاضر جوابی میں بے مثل تھے۔ غدر سے بہت پیشتر مدرسہ نواب غازی الدین خاں بیرونِ اجمیری دروازہ میں منشی پارسا کے اہتمام سے بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی اور مدت تک وہ ہنگامہ گرم رہا۔ شاہ نصیر کی تحریک سے یہ قرار پایا کہ ہر مشاعرے میں علاوہ غزل طرح "تیلیوں" کی زمین میں بھی طبع آزمائی ہوا کرے۔ ایک روز شیخ ابراہیم ذوق نے یہ شعر سر مشاعرہ پڑھا۔

چق ترے دالاں کی نازک بہت ہے نازنین
کیا لگائی اس میں ہیں پائے مگس کی تیلیاں

جناب عاصی نے اعتراضاً یہ قطعہ فی البدیہہ کہکر سنایا۔

قطعہ

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں

آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہرِ خدا
یار کی چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں

شیخ صاحب وہ چلمن ہو کہ جس میں بید رنگ
باندھئے گر ہو سکیں تارِ نفس کی تیلیاں

الغرض یہ شاعر شاہ صاحب کے شاگردوں میں بڑے سیف زبان اور دبنگ گذرے ہیں۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء میں ... ان کے بڑے صاحبزادہ

مکند لال بہادر شاہ ثانی کے میر منشی تھے۔ اور چھوٹے صاحبزادہ منشی بنسی لال تحصیلدار تھے۔ مشتاق اور قیصر ان کے حقیقی نواسے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

عزیزو ضبط اشک دیدۂ تر ہو نہیں سکتا
کروں کیا بند کوزے میں سمندر ہو نہیں سکتا

مرے گریہ کا سن کر ماجرا اس نے کہا آخر
کہ اس برسات میں آنا ترے گھر ہو نہیں سکتا

وہ معجزہ سے حسن کے اپنے کمال کر
ابرو ہلا کے چاند کے دے دو ہلال کر

ناسور جگر پہ نہ لگانا کوئی مرہم
رسنے سے ہوا بند تو بس جائینگے مر ہم

اس پہلو میں خنجر ہے ادھر تیر ہے عاصی
لے سکتے ہیں کروٹ نہ ادھر ہم نہ ادھر ہم

وہ رند بادہ کش ہوں کہ تو کیا ہے زاہدا
قاضی نے نذر دی مجھے بوتل شراب کی

سو جائیں ایسے بخت کہ جاگیں نہ پھر کبھی
ہو آرزو اگر مجھے فرقت میں خواب کی

ادھر اپنے رخ تاباں پہ زلف اس نے پریشان کی
ادھر خورشید پر چھائی گھٹا بس آکے جھٹ کالی

خیال زلف کیونکر اس دل آشفتہ سے جائے
چھٹائے سے چھٹے کب جب بلا جائے چمٹ کالی

عاصی ۔ منشی عبدالرحمٰن خاں خلف الصدق چودھری نور محمد خاں صاحب مالگذار قصبہ ننگ تھالہ ضلع حصار مسلمان راجپوت ہیں اور حنفی المذہب۔ عمر ۲۸ سال ہے۔ رنگ گندمی۔ دراز گردن۔ خندہ پیشانی۔ موزوں قد۔ سن بلوغ سے قبل ہی سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ کاروبار خانگی کی اہم ذمہ داریوں کا بار سر پر آپڑا۔ اوائل عمر سے ہی شوق شاعری دامنگیر ہے۔ منور احمد صاحب ناسخ ہانسوی کے فیضان صحبت نے اس شوق کو دو بالا کر دیا پھر حضرت خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے مشورہ سخن کرنے لگے کلام اکثر رسالہ منظر لکھنؤ۔ رسالہ ناسخ ندرۃ گیا۔ اخبار مسلم راجپوت۔ امرتسر وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ نثر لکھنے کا بھی شوق ہے۔ کلام خامیوں سے خالی نہیں۔ امید ہے استاد کے فیضان مشورہ اور مشق سے نقائص دور ہو جائیں۔ جو کلام بھیجا اس کا انتخاب درج ذیل کیا جاتا ہے۔

عاصی

دل وہ ہمارا لیکے ہنس ہنس کے کہہ رہے ہیں
کیوں نہ ہوتا دمِ رفتار قیامت کا گماں
کس کے نالوں سے ہوئی باغ میں بلبل خاموش
حرف کوئی نظر آتا ہے نہ کوئی مضمون
نہ لینگے نام حوروں کا کبھی اے حضرتِ زاہد

بیخودی تجھ پہ جان و دل سے نثار
ایک دفتر ہے زندگی اپنی
لیکے خود جا رہا ہوں نامۂ شوق

لاکھ کوشش کیجئے قابو میں دل آتا نہیں
کیوں اپنے ساتھ دفن دلِ بے قرار ہو

قابو میں جو ہے جسکے اس کا ہی مال ہوگا
چال سے اسکے عیاں حشر کا انداز بھی تھا
نغمہ سنجی پہ اسے فخر بھی تھا ناز بھی تھا
درد ہی درد بھرا ہے مرے افسانے میں
اگر بیٹھینگے دو دن آپ جاکے گلعذاروں میں

دونوں عالم سے بے خبر ہوں میں
اور سمجھو تو مختصر ہوں میں
آپ ہی اپنا نامہ بر ہوں میں

آج کیا ہے آپ کو میں آپ میں پاتا نہیں
لازم ہے ہم سے دور کچھ اس کا مزار نہیں

عاصی:۔ مولانا احمد علی خاں موسوم بہ شوخ بیچین۔ اصل میں نارنول کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے عمر ہی میں اپنے والد کے ساتھ رام پور گئے اور وہیں تعلیم پائی۔ پہلے نیاز احمد خاں ہوش بریلوی کے شاگرد ہوئے۔ پھر حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ بذلہ سنجی اور ظرافت نگاری میں فرد تھے۔ اخباری دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ میرزا ستم ظریف۔ جناب سید محمد صاحب آزاد۔ نامہ نگارانِ اودھ پنچ کے ان محاورات کی برجستگی اور بیساختہ پن کے معترف تھے۔ ظریفانہ مضامین کے ذریعہ معاشرت کی اصلاح ان کا حصہ تھا۔ مضامین کا مجموعہ جس میں بعض ظریفانہ نظمیں بھی شامل ہیں شاہد ظرافت کے نام سے فضل الدین بک ڈپو لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ایک رسالہ شیخ و برہمن کے اتحاد کے نام سے لکھا تھا۔ جس میں ہندو مسلمانوں کو باہم اتفاق پر توجہ دلائی ہے۔ ایک واسوخت۔ نالۂ دلشکن۔ احمد المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا تھا فسانۂ عجائب

عاصی

کے طرز پر فسانۂ لاجواب تصنیف کیا تھا۔ جو طبع نہ ہوا۔ بریلی میں قاضی محمد عبدالجلیل خاں تخلص جنون رئیس بیر چشم تھے۔ وہ ان کی کفالت کرتے تھے۔ آخر عمر میں بریلی ہی میں قیام رہتا تھا۔ اور وہیں ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ قریب ۷۰ سال کے عمر پائی۔ غزل۔ قصیدہ خمسہ سب کچھ کہہ سکتے تھے۔ کلام کا رنگ پختہ ہے۔ غزل گوئی میں پستی اور بلندی کا نام نہیں۔ آپ نے اپنے بعد مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا کافی مجموعہ چھوڑا۔ دیوان اور رشاہد ظرافت کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا تھا۔ جو اب تک نہ طبع ہوا۔

مولوی عبدالکریم عروج۔ بنے میاں شاکی۔ حاجی کلب حسین نادل ان کے تلامذہ سے ہیں فراہم شدہ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

جو عشق میں دارین سے غافل نہیں ہوتا
ظاہر سے کہیں ہوتی ہے باطن کی صفائی
دل میں لینا ہے مرے علم الٰہی موجیں
کعبہ و دیر تو معمور ہے جلوہ سے ترے
ہستی میں نیستی ہے فنا ہے بقا کے ساتھ
دم کو سمجھ عدم کا مسافر ہے راہ میں
میں بھی کسی کا روز ازل رازدار تھا
رحمت کسی کی ڈھونڈتی پھرتی ہے حشر میں
لب یک ترانہ شیشہ و ساغر ہے سامنے
کس کا حجاب دیکھنے والا ہی کون تھا
دل میں رہے کسی کے کسی کی نگاہ میں
دنیا کو پیار چاند لگا نے ہیں حسن نے

عارف نہیں ہوتا کبھی کامل نہیں ہوتا
غازہ سے کوئی حور شمائل نہیں ہوتا
ایک قطرہ میں ہے ڈوبا ہوا دریا کیسا
پھر بنا شیخ و برہمن میں ہی جھگڑا کیسا
بس کا یقین تھا وہی وہم و گماں ہے اب
ہر دم رواروی میں نہ کارواں ہے اب
جو کہہ رہا ہوں گذری ہوئی داستان ہے اب
اس کے گناہگاروں کا مجمع کہاں ہے اب
وہ پارسائی حضرت عاصی کہاں ہے اب
شرما گئے وہ طور پہ اپنی ادا سے آپ
نکلے کبھی نہ پردہ کے باہر حیا سے آپ
عالم چمک اٹھا ہے کسی کی ضیا سے آپ

مست وحدت نے کہی ہے ہوش اڑ جانے کی بات
عقل سے خالی نہیں ہے اسکے دیوانے کی بات

گل پہ بلبل جان دے پروانہ اپنی شمع پر
طالبِ حق عشق ڈھونڈے ہے یہ مرجانے کی بات

چلبلی۔چنچل۔البیلی شوخ ہرجائی بہار
مسکراتی۔ناز کرتی جھومتی آئی بہار

جب چمن میں آئی دولھا کی روش بادِ صبا
کیا دلھن کی طرح سہمی جھجکی شرمائی بہار

اہل عرفاں سے کوئی پوچھے حقیقت دل کی
کعبۂ دل کو مرے عرشِ خدا کہتے ہیں

کفر و اسلام میں سب کہتے ہیں اپنی اپنی
جو سمجھ کر نہیں کہتے انہیں کیا کہتے ہیں

جان منصور نے دی اپنی تنک ظرفی سے
راز کی بات کہیں مردِ خدا کہتے ہیں

اٹھ کے کعبہ کو چلو کوئے بتاں سے عاصی
کچھ خبر بھی ہے تمہیں لوگ برا کہتے ہیں

رہیگا رندوں کے سر پہ سہرا بنیگا ہر مست آج دولھا
عروس گل اب نہ منہ چھپائے بہار آئی بہار آئی

عاصی

عاصی:- جناب مولوی احمد رضا صاحب خلف الصدق مولوی حسن رضا صاحب۔ساکن سندیلہ قصبہ اودھ زیادہ حال نہ معلوم ہو سکا۔نمونہ کلام یہ ہے

پھولے پھلے شاداب رہے تا دمِ آخر
عاصی کا الٰہی چمنستان تمنّا

جلوہ ہو جس کے نور کا ہر چیز میں عیاں
اسکو بتاؤں کیا کہ کہاں ہے کہاں نہیں

والشمس کے ہے گرد میں واللیل کا سواد
اس رُخ کے گرد گیسوئے عنبر فشاں نہیں

شہ اقلیم یکتائی محمد ہیں محمد ہیں
مہ چرخ دل آرائی محمد ہیں محمد ہیں

اس بزم کی جو بُو ہے کہاں وہ چمن کی بُو
کھاتی ہے شرم اس سے خطا و ختن کی بُو

بلبل کو رنگ و بوئے گل تر ہو ناپسند
سونگھے اگر کہیں وہ مرے گلبدن کی بُو

آتا ہے جی میں جامۂ ہستی کروں میں چاک
آتی ہے یاد جب مجھے اس پیرہن کی بُو

پہنچائے لے صبا تو یہی ان کے دماغ تک
اس عاصی نحیف کے دل کی جلن کی بُو

قطعہ

تخلیقت کا دو عالم کی سبب ہیں تو یہی ہیں
اُن سب کے لئے رحمتِ رب ہیں تو یہی ہیں

اسرار الٰہی کے تھے سب بند خزائن | مفتاح در علم و ادب ہیں تو یہی ہیں

عاصی

عاصی: منشی برج باسی لال صاحب خلف منشی دھوم سنگھ کایستھ بھٹناگر رئیس مراد آباد تحصیل امروہہ میں واصلباقی نویس تھے۔ اس سے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ دیوان ان کا ۱۳۰۶ھ میں "نغمۂ طرب" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کے دیکھنے سے کثرتِ مشق اور پرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کلام میں لطافت اور صفائی ہے۔ مضمون آفرینی کے ساتھ زبان اور محاورات پر بھی توجہ رہتی تھی۔ اکثر مشکل مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ رباعیات کہنے میں بھی مشاق تھے۔ تلمذ کا حال دریافت نہ ہو سکا۔ طبیعت میں آمد بہت ہے۔ مگر کہیں کہیں مضمون آفرینی کی قید سے لطف زبان کم ہو گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے کلام اچھا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

میں نے کہا کہ مفت مجھے خوار کیوں کیا | کہنے لگے کہ تو نے ہمیں پیار کیوں کیا

کیفیت عشق اس کو سناتی تھی جو منظور | عاصی نہ بتاتے اسے تم نام ہمارا

آنکھوں نے مری اس کی ادا کو نہیں دیکھا | ان دیکھنے والوں نے قضا کو نہیں دیکھا

کیا قافلے آنکھوں سے چلے جاتے ہیں یارب | اس راہ میں نقش کف پا کو نہیں دیکھا

کہتا ہے مرے سامنے حوروں کی جو باتیں | زاہد نے بت ہوش ربا کو نہیں دیکھا

حسرت مری جس طرح مجھے پیٹ رہی ہے | یوں میں نے کسی اہل عزا کو نہیں دیکھا

ہر ذرہ میں تاباں ہے اسی مہر کا جلوہ | عاصی کہیں کس طرح خدا کو نہیں دیکھا

کامل سجود دیر سے ایماں ہو گیا | دیکھا رخ صنم کہ مسلماں ہو گیا

وہ ظرفہ آئینہ ہوں میں دیدار یار سے | آیا جو دیکھنے مجھے حیران ہو گیا

عاصی صنم پرستی سے ایماں ہوا نصیب | کافر جو میں ہوا تو مسلماں ہو گیا

ہزار اس جبلے غلط کہتے ہیں وہ کہ گنت سے | مگر نہیں کی جگہ لفظ ہاں نہیں ہوتا

پہیرا [illegible] دل پر یا [illegible] | کہاں یہ ہوتا ہے ورود اب کہاں نہیں ہوتا

میں کیا کہوں کہ ہے سب کچھ حضور پر روشن
جو مدعا ہے زباں سے بیان نہیں ہوتا

ظاہر میں گو وہ ملتے ہیں الفت کہاں ہے اب
دل میں جگہ کہاں ہے محبت کہاں ہے اب

مر جاؤں کاش ہجر کے صدمہ سے ہو نجات
مجھ میں ستم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب

بیشک بجا ہے راست ہے جھوٹا ہوں میں مگر
تم ہی کہو وہ پہلی سی الفت کہاں ہے اب

عاصی بشر کو چاہیئے دیکھے بچشم حال
بھولے ہو جس پہ تم وہ ریاست کہاں ہے اب

رندی کسی نے زہد کسی نے کیا پسند
عاصی کسے خبر ہے کہ ہے اسکو کیا پسند

اے بت ترے دماغ میں کتنا غرور ہے
کرتا نہیں کسی کی خودی کو خدا پسند

مجمع حشر سر راہ تماشائی تھا
ہیں جو گذرا طرف کوچۂ جاناں ہو کر

رک گیا آ کے لبوں پر جو شب ہجر میں دم
رہ گیا موت کا سر پر مرے احساں ہو کر

نہ ہوا صاف غبار دل جاناں عاصی
مل گئے خاک میں ہم گرد بیاباں ہو کر

باقی نہیں رہا ہے گریباں میں تار تک
وحشت یہ کیا کرے گی ترے انتظار تک

ایک ہی دم میں زباں سوکھ کے کانٹا ہو جائے
جو مری طرح کرے باغ میں نالے بلبل

واہ جی واہ ہنسی میں یہ بگڑنا کیا خوب
ہم تو سمجھتے تھے کہ کچھ ہو گے مگر کچھ بھی نہیں

کیوں دم مرگ نہ ہو فکر گنہگاروں کو
ہے سفر دور کا اور زاد سفر کچھ بھی نہیں

روٹھیں ہم آئیں وہ منانے کو
یاد کرتے ہیں اس زمانے کو

ہونا تھا ایک کا ہمیں ممنون ہجر میں
جو وہ نہ آئے موت ہی احسان کر گئی

سر میں وہ اب جنون کہاں وہ ہوا کہاں
آندھی سی چڑھ کے آئی طبیعت اتر گئی

قطعہ

ہرزہ گردی یہ مری قابل الزام نہیں
بے سبب دیر و حرم تک نہیں چکر اپنا

حق یہ ہے انکی رہا کرتی ہے ہر وقت تلاش
نہ تو گردش ہے نہ برگشتہ مقدر اپنا

رباعیات

کرتا ہے کوئی خوشی کوئی غم افسوس
شادی ہے کہیں کہیں ہے ماتم افسوس

ہے فکر میں اپنی اپنی ہر ایک عاصی	بھولا ہے اُسے تمام عالم افسوس

دیگر

اعلیٰ کیسا ہے اور ادنیٰ کیا ہے	پستی کیا شے ہے اور بالا کیا ہے
جس کو کہ نہیں ہے نیک و بد کی تمیز	کیا جانے بُرا کون ہے اچھا کیا ہے

عاصی

عاصی:۔ محمد شرف ولد ابا ذر پیرزادہ ساکن قصبہ آنولہ۔ آپ جوان وجیہ باوقار ذہین خوش اطوار و خوش خلق تھے۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ میرے حال پر بہت مہربانی فرماتے ہیں۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ رعایت لفظی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا ایک مختصر دیوان ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

کس لیا ہم کو کسوٹی پہ وفا کی سو بار	تس پہ ملتے نہیں تم سیم بدن کیا باعث
زلف سیہ کے پیچ میں جاتا ہے خود بخود	اس دل کو ہائے کچھ نہیں کالی بلا کا خوف
ناصح خیال زلف تو سر سے نہ جائے گا	اُلفت اب اُس سے ہو گئی ہے مجھکو مو بمو
ہمیشہ غیر پہ کرنا کرم اور مجھ پہ جھنجھلانا	نہیں معلوم مجھ سے کیا ہوئی تقصیر صاحب کی
تیغ نگاہ ڈوب رہی ہے لہو میں آج	کس ناتواں غریب کو تم پار کر چلے

عاصی

عاصی:۔ ان کا نہ نام معلوم ہو سکا نہ کچھ حال۔ لالہ شنکر داس کی بیاض سے اشعار ذیل نقل کئے جاتے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ کلام میں کس قدر سوز اور شوخی ہے۔ بہت پُرگو اور مشاق معلوم ہوتے ہیں۔ ترکیب الفاظ اور انداز بیان بتا رہا ہے کہ دورِ چہارم کے شاعر ہیں۔ اب کلام ملاحظہ ہو۔

زلف و خط کیوں نہ بگاڑیں دل ناکام کے کام	آہ گستردہ ہیں اس شوخ کے اندام کے دام
دل کا دانہ چھین لیا تو سہی اس پہ دیا	مال ٹالا لیا اور لٹے دام کے دام
بلبے دمساز ہیں صدقے تری دمسازی کے	صبح کے صبح لٹے اور دئے شام کے شام

یک قلم حرفِ محبت یہ مٹایا دل سے جو مجھ سے یار صادق کو وہ عالم آشنا سمجھے	کبھی خط بھی نہ لکھا عاصیؔ بدنام کے نام بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے

عاصی

عاصی :- منشی مہادیو پرشاد صاحب تلمیذ جناب منشی بالکرشن صاحب قمرؔ لکھنوی شاگرد حضرت امیرؔ مینائی۔ والد کا نام منشی گنگا پرشاد تھا۔ آپ کالیست سریواستو ہیں۔ آپ کے جدِ امجد دیوان پرم سکھ رائے صاحب ڈلمئو ضلع رائے بریلی سے قانون گوئی چھوڑ کر شاہ نصیر الدین حیدر والیِ اودھ کے دربار میں عہدہ جلیلہ پر مقرر ہوئے۔ اُن کے انتقال کے بعد ان کے خلفِ اکبر دیوان لچھمن پرشاد صاحب مشعلخانہ کے دیوان مقرر ہوئے۔ فوج کے دو رسالے آپ کی تحت میں تھے۔ جب دیوان لچھمن پرشاد صاحب کے ہاں دوسرا پوتا یعنی منشی گنگا پرشاد پیدا ہوئے۔ تو عین مسرت میں دیوان جی نے دو ضرب توپ کا حکم دے دیا۔ ہرکارہ نے پرچہ لگایا۔ فرمانِ شاہی صادر ہوا کہ قصوروار کو گرفتار کرکے حاضر کرو۔ فی الفور عہدی آئے۔ مگر دیوان جی کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ لیکن دیوان جی نے فرمان کی نہایت توقیر کی فنس پر روانہ ہوئے۔ دربار پہنچ کر بادشاہ سلامت (واجد علی شاہ) سے عرض کی کہ جہاں پناہ غلام کے گھر پر پوتا ہوا تو خوشی نے از خود رفتہ کر دیا۔ اور یہ قصور سرزد ہوا۔ بادشاہ سلامت نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور خلعت عطا فرمایا۔ اور چھٹی کے روز محل خاص سے ایک شیردہان جڑاؤ کڑے کی جوڑی اور دیگر سامان آیا۔ انقلاب سلطنت کے ساتھ دیگر مقربین بارگاہ سلطانی کی طرح ان پر بھی تباہی آئی۔ یعنی ۱۸۵۷ء کے غدر میں گھربار لٹا۔ مکان مسمار ہوا۔ اور دفینہ تک نہ بچا۔

جناب عاصیؔ منشی گنگا پرشاد کے خلفِ اکبر ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے آپ نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۲ء میں بعمر ۱۶ سال انٹرنس

پاس کیا۔ غدر کی تباہی کا اثر خاندان پر ایسا پڑا کہ اسی عمر میں جناب عاصی تلاش معاش کی فکر میں گرفتار ہو گئے۔ مختلف دفتروں میں کام کیا۔ فی الحال واٹر ورکس لکھنؤ میں کام کرتے ہیں اور لکھنؤ میونسپلٹی کے عہدہ داران میں آپ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ مگر جناب قمر سے اصلاح لینا اور مشاعروں میں شریک ہونا انٹرنس پاس کرنے کے بعد سے شروع کیا۔ صحبت فقرا سے بہت کچھ فیض پایا ہے۔ ہندی میں بھی بھجن تصنیف کئے ہیں۔ اردو اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں طبیعت کا میلان حقانیت کی طرف زیادہ ہے۔ عشقیہ کلام بہت کچھ ضائع کر دیا۔ زبان شستہ اور بندشیں چُست ہیں۔ تخییل پاکیزہ اور پُر لطف ہے۔ نمونہ کلام نذر ناظرین ہے۔

مرحبا صد مرحبا دل نذر دلبر ہو گیا
پہلوئے بے دل ہمارا یار کا گھر ہو گیا

جسم خاکی پر پڑی جب مہر مرشد کی ضیا
ذرہ ذرہ نور ایماں سے منور ہو گیا

مل گیا جب سے مئے وحدت کا تھوڑا سا مزا
دُردِ خم میرے لئے کوثر سے بہتر ہو گیا

اشک عاصی فیض مرشد سے ہوئے بحر نما
داغ عصیاں دُھل گئے دامن اگر تر ہو گیا

عشق نے قصہ چکایا کافر و دیندار کا
دانۂ تسبیح سے رشتہ ملا زنار کا

سحر ہے عالم پہ کس کے پرتو انوار کا
ذرہ ذرہ میں ہے پیدا حوصلہ دیدار کا

کشتیِ عاصی کو ہے موجِ حوادث کا خطر
ناخدائی کیجئے فرماں روائے دوار کا

نہ کوئی رہنما تھا اور نہ کوئی خضر منزل تھا
طریقِ عشق جب آشنا نہیں میں تھا مرا دل تھا

زن و فرزند و خویش و اقربا کا زعم باطل تھا
انیسِ باوفا وقتِ مصیبت اک مرا دل تھا

اٹھایا تم نے کیا مجھکو اٹھا دی بزم کی گرمی
دلِ سوزاں مرا رونق فزائے حسنِ محفل تھا

اجل سے پہلے کچھ تو ہچکی دم تمنا تھا نکلنے کو
[illegible] تھا

کیا ہوا دل مرا پہلو میں جو پایا نہ گیا
ان نگاہوں کے سوا اور تو آیا نہ گیا

مختصر رازِ حقیقت کی حقیقت یہ ہے
عاصی ہیچمداں کو وہ بتایا نہ گیا

ان کے چہرہ پہ ہے شباب کا رنگ
ہیچ ہے غازہ و گلاب کا رنگ

شیخ جی بزم مئے پرستاں میں
جم چکا جم چکا جناب کا رنگ

خونِ دل سے لکھا تو ہے نامہ
دیکھنا ہے مجھے جواب کا رنگ

آپ اُڑ جائیگا حجاب کا رنگ
اُن پہ آنے تو دو شباب کا رنگ

ہوگئی صبح شام آتے ہی
تھا شبِ وصل میں شباب کا رنگ

حسن خود آیا آئینہ بن کر
دیکھنے کو ترے شباب کا رنگ

چشمِ میگوں یہ ان کی کہتی ہے
اب چھلکنے کو ہے شباب کا رنگ

ایک بُتِ نایاب پر مائل طبیعت ہوگئی
تھی کشش دل کی کہ بے صورت کی صورت ہوگئی

تیرا عکسِ رُخ پڑا آئینۂ کونین پر
اس دوئی کے ہاتھ سے وحدت میں کثرت ہوگئی

ہم عدم میں تھے تو نورِ حق کا وحدت نام تھا
روشنی وحدت کی جب پھیلی تو کثرت ہوگئی

تیری قدرت نے دکھائے وہ مناظر دلفریب
دل تجھے بھولا تیری صنعت سے اُلفت ہوگئی

جس پہ عاصی کہہ کے سب کہتے تھے نفرت سے نظر
رحمت مرشد سے اسکی بھی شفاعت ہوگئی

عاصمی:۔ خواجہ برہان الدین، منشی لچھمی نرائن شفیق اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "شاعر و مورخ عدیم المثال تھے" فنِ سپہگری میں بھی مہارت تھی مندرجہ ذیل اشعار ان کے ہیں۔

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی بھیڑ تھی اور شور تھا غل تھا

خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو کے یاں غنچہ تھا واں گل تھا

رات کو میں شمع کے مانند رو کر رہ گیا
صبح کو دیکھا تو سب تن اشک ہو کر بہ گیا

عاقل:۔ جناب رماشنکر صاحب طبیعت جدت پسند اور شوخ پائی ہے

افسوس ہے کہ حالات اور زیادہ کلام نہ دستیاب ہوا۔ یہ چند شعر فراہم ہوئے جو درج ذیل ہیں۔

اس کے لبوں کے سامنے جامِ شراب ہے
گویا کہ دو ہلالوں میں اک آفتاب ہے

مرتا ہوں میں تو اس بتِ جادو جمال پر
جس کی چڑھی جوانی پہ نازاں شباب ہے

ممکن نہیں کہ خاک سے میری سبو بنے
مرنے کے بعد بھی مری مٹی خراب ہے

کہتے ہیں وہ کہ کیجیے فردا کا انتظار
یاں تو قیامت آج ہی اپنے حساب ہے

مجھ سے نہ ہوگی خاک بھی پرسش بروزِ حشر
بندوں پہ اس کا رحم اگر بے حساب ہے

عاقل:۔ میاں عاقل محمد خاں جاگیردار خلف میاں شیر محمد خاں عمائد بھوپال سے ہیں۔ ۱۲۶۴ھ سال پیدائش ہے۔ طبیعت میں روانی اور صاف بیانی ہے بہت سمجھکر شعر کہتے ہیں۔ اور ہر شعر میں کچھ بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تلمذ وغیرہ کا حال دریافت نہ ہو سکا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

ساغر ذرا چلے تو سہی چشمِ یار کا
پوچھیں گے پھر مزاج ہر اک ہوشیار کا

کس وقت انکی چشمِ فسوں گر نے کی کمی
جب کام رہ گیا تھا فقط اک وار کا

کھٹکا مدام دشمن بد بیں کی آنکھ میں
کانٹا بنا خیال مری چشمِ زار کا

جو کہ ظالم ہیں جزائے ظلم سے بچتے نہیں
شمع کا سر کاٹ کر کالا ہے منہ گلگیر کا

آتا ہے ترے چہرۂ رنگیں سے چمن یاد
کانٹوں میں گھسیٹیگی تری غنچہ دہن یاد

وار لاکھوں میں کیا مجھ عاشقِ ناشاد پر
واہ وا جلاد پر اور آفریں اس یاد پر

مرحبا آفریں شاباش ہے تجھ کو ساقی
ایک چلو میں کیا تجھ کو بھکا کر بے ہوش

فرقتِ گل میں نہ کر سوز کے نالے بلبل
پڑ نہ جائیں تری منقار میں چھالے بلبل

عاقل:۔ حکیم مرزا محمد علی بیگ دہلوی۔ ان کا دیوان معصوم علی خاں سوختہ نائب تحصیلدار علی گڑھ کی حسب فرمائش آگرہ میں چھپا تھا۔ ایک واسوخت بھی ان سے

یادگار ہے۔ مضمون آفرینی اور لطفِ زبان میں مشاق ہیں۔ یہ کلام انتخاب ہے۔

ہاتھ میں لے کے وہ اب خنجرِ برّاں نکلا
مژدہ اے شوقِ شہادت ترا ارماں نکلا

اس پتے سے ڈھونڈھنا قاصد گھر اس خونخوار کا
خون ہوتا ہے وہاں ہر روز و شب دو چار کا

غیر سے یار کا پتہ پایا
مدعی سے ہی مدعا پایا

لاغر ہیں اسقدر کہ نہاں ہیں نظر سے ہم
گویا کہ اب مشابہ ہیں اسکی کمر سے ہم

آہ میں سوز ہیں گریہ میں اثر کچھ بھی نہیں
کیا قیامت ہے اُسے میری خبر کچھ بھی نہیں

نہ دن کو چین آتا ہے نہ شب کو نیند آتی ہے
لگایا تم نے کیا دل پڑ گئی آفت سے جاں میری

زمیں جنبش میں آئی ہے فلک چکر میں آیا ہے
خدا جانے کریگی اور کیا بیتابیاں میری

جفا سے باز وہ آتے نہیں ہیں کیا کہئے
بھلا کہا ہے جسے اُس کو کیا بُرا کہئے

عاقل :۔ منشی فخرالدین باشندہ میرٹھ۔ مولانا شوکت کے تلامذہ سے ہیں اکثر مقطعوں میں اپنی فضیلت شاعری کا ادّعا کیا ہے۔ اور کیوں نہ کریں۔ جب کہ جناب شوکت جیسے خود ستا استاد کے شاگرد ہیں۔ کلام میں کوئی خاص لطف نہیں۔

مژگاں کی سوزن آج بڑے کام آگئی
تار نظر کا زخم پہ ٹانکا لگا دیا

حاصل کچھ اس سے نفع سوائے زیاں نہیں
جس آدمی کے بس میں خود اس کی زباں نہیں

رقیب رُوسیہ کسطرح پہنچا کوئے جاناں میں
گذر ابلیس کا کیونکر ہوا گلزار رضواں میں

عاقل :۔ شیخ فقیر علی متوطن کانگڑہ مقیم جموں شاگرد یاس۔ ریاست میں ملازم ہیں۔ زبان صاف ہے۔ زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔ زمانہ نو مشقی کا کچھ کلام دستیاب ہوا جس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

نہ بھولے گی تری بیداد مجھ کو اے صیاد
بہار آتے ہی تیرے قفس میں بند ہوا

جلاتا ہے سرِ شام آکے کوئی شمع مدفن پر
نصیبہ جاگ اٹھا آجکل گورِ غریباں کا

آہ کرتا ہوں تو جلتا ہے جگر اے عاقل
ضبط کرتا ہوں تو پڑتا ہے پھپھولا دل میں

چھری تیری رُک رُک کے چلتی رہی	مری موت آآ کے ٹلتی رہی
خدائی ہوگئی دشمن ہماری	بتوں سے ہم نے ناحق دوستی کی
ستایا جائے جتنا وہ ستالیں	یونہی حسرت نکالیں اپنے جی کی
مزہ ان کو نہیں کچھ درد دل کا	تری نوک مژہ کے جو ہیں شاکی

عاقل

عاقل:۔ مولوی احمد حسین صاحب متوطن مچھلی شہر شاگرد حضرت اسیر لکھنوی طبیعت دار شاعر تھے۔ یہ دو شعر ان کے درج کئے جاتے ہیں۔

لگایا اس نے جو ہے تیغ آبدار کا ہاتھ	ہمارا زخم جگر کیوں نہ پھر ہرا ہو جائے
اُٹھا کے آنکھ بھی دیکھوں کبھی نہ جنت کو	گذر جو کوچہ دلدار میں مرا ہو جائے

عاقل

عاقل:۔ سید محمد سلطان دہلوی۔ ۱۵ ار شعبان ۱۲۷۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق پیدا ہوگیا۔ عالم جوانی میں بنارس گئے۔ میر وزیر علی صاحب سفید پوش کے ہاں شادی ہوئی۔ جو بنکیتی کے فن کے نامی اُستاد تھے۔ اپنے خسر سے انہوں نے اس فن کو حاصل کیا۔

شاعری میں پہلے مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا قادر بخش صابر دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ سُننے میں آیا کہ مرزا صابر جیسے اُستاد فن کو ان کی شاگردی پر ناز تھا۔ لیکن کلام جدت طبع۔ مضمون آفرینی تخیل کی رفعت اور اسلوب کی برجستگی سے معرا پایا گیا۔ ہاں پُرگوئی اور مضامین فرسودہ کو سلاست اور رعایت لفظی کا جامہ پہنانا ضرور پایا جاتا ہے۔ قواعد فن کی رُو سے آپ کا کلام اغلاط سے پاک ہے۔

عاقل مرحوم بمقتضائے وقت حیدر آباد کی قدر دانیوں کا آوازہ سُنکر ۱۲۹۹ھ میں وہاں تشریف لے گئے۔ چند ہی دن میں طبقۂ اُمرا کی کمال شناسیوں کا ایسا ہجوم ہوا۔ کہ وہیں قیام پسند فرمایا۔ علاوہ شعر و سخن میں دخل رکھنے کے علم مجلس

میں بھی کچھ ایسا ملکہ حاصل تھا کہ جس محفل میں تھوڑی دیر بیٹھ جاتے اپنی جادو بیانی و شیریں کلامی کا سکّہ جما کر اٹھتے۔ چند ہی روز میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ بعض احباب کی رائے و مدد سے ایک مطبع قائم کر کے اخبار "ہزار داستان" نکالنا شروع کیا۔ عرصہ تک یہ اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا۔ مگر بعض وجوہ سے ہزار داستان سے قطع تعلق کر کے مطبع آصفی قائم کیا۔ اور سنہ ۱۳۱۱ھ سے اخبار آصفی کی اشاعت شروع کی۔ مرحوم اعلیٰ خیالات کا مجموعہ تھے۔ جن کو اپنے زورِ قلم سے بذریعہ اخبار ملک پر ظاہر کرتے رہے۔

عالی جناب نواب نظام یار جنگ حسام الملک خان بہادر و عالی جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت و عالی جناب نواب بہرام جنگ بہرام الدولہ بہادر بالخصوص مرحوم کے قدر شناس تھے۔ آخر میں نواب بہرام الدولہ بہادر عاقل مرحوم کے نہایت درجہ کفیل و معین رہے۔ حتیٰ کہ اُن کے انتقال کے بعد سے اب تک ان کے عیال کی پرورش اسی سرکار فیض آثار سے ہو رہی ہے اور دیوان بھی سرکار محتشم الیہ کی فیاضی سے طبع ہوا ہے۔ جو اعلیٰ قدر افزائی کا ایک دیرپا ثبوت ہے

حضرت عاقل مرحوم باوجود شاعرانہ خیال اور وجیہ و جامہ زیب ہونے کے حد درجہ صالح اور متقی تھے۔ افسوس کہ صرف ۳۹ سال کی عمر میں ۸ محرم ۱۳۰۹ھ کو اس دارِ فانی سے رحلت کی۔ ایک فرزند رشید سید فخر سلطان کو اپنی نشانی چھوڑ گئے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

عدم آباد کو جب کاروانِ دَم رواں ہوگا
تنِ خاکی جسے کہتے ہیں گرد کارواں ہوگا

یہاں ہے ضبط مانع صبر واں قفلِ وہاں ہوگا
ہمارا آپ کا انصاف یاں ہوگا نہ واں ہوگا

جب کہا میں نے کہ کب آئے گا
ہنس کے بولے یونہی مر جائے گا

چھیڑ کی حد ہے چلو چپ بھی رہو
ہم جو چھیڑینگے تو گھبرائے گا

اب ناز سے وہ پاؤں زمیں پر نہیں رکھتے
بوسہ نہ ملا خاک ہوئے پر کف پا کا

نہ زندہ نہ مردہ نہ دنیا نہ دین کا
مجھے تو نے رکھا نہ ظالم کہیں کا

ہاں اہل حشر چین سے آرام اب کرو
دفتر کھلا مرے گنہ بے حساب کا

داغ ہوتے جو نہ سینے میں تو ویراں ہوتا
دل اگر باغ نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

غنچے کو دیکھ لو ہنسنے کی کہاں فرصت ہے
دل اگر جمع کبھی ہوتا تو پریشاں ہوتا

تم نہیں غیر سہی غیر نہیں مرگ سہی
مدعا یہ کہ کوئی جان کا خواہاں ہوتا

شرما کے منہ پھرانا لڑا کر نگاہ کو
ظالم یہ سیدھی سی ہے ادا بانکپن میں کیا

وصل میں پیتا ہوں آنسو بدشگونی جان کر
گریۂ شادی ہوا ہے گریۂ پیما نہ آج

کیوں آئینے پہ پیار کی پڑتی ہیں نگاہیں
ہو جائے نہ تم کو کہیں لے جان نظر آج

یارب یہ چلی کیسی ہوا بزم میں ان کی
رخ کرتے ہیں غیروں کی طرف تیر نظر آج

ضبط نے قتل کے وقت اشک بہانے نہ دیئے
حلق میں اترے وہ آب دم خنجر ہو کر

ہر اک سمت ارمان گھیرے ہوئے ہیں
مرے دل سے جاؤ گے کیونکر نکل کر

وطن کو چھوڑنا لازم نہیں گو ہو پریشانی
کہ بوئے گل پریشاں ہو کے رہتی ہے گلستاں میں

وہ ہے ناآزمودہ کار اور مجمع قیامت کا
کہیں کہہ دے نہ گھبرا کے اس کا میں ہی قاتل ہوں

کدورت دل کی ہے آہوں کے ہمراہ
بنا دینگے زمیں ہم آسماں کو

وصل کی شادی ہجر کا صدمہ ان سے کہا تو کہتے ہیں
روز تو نہیں تم جیتے ہو اور روز تو نہیں تم مرتے ہو

دل میں ہو اور آنکھ میں جلوہ عیاں نہ ہو
یہ بھی کوئی ادا ہے وہاں ہو یہاں نہ ہو

گذرا میں جور و خلد سے ظالم نہ کر شہید
دو دن شگفتہ ہوا ہے تو بدگماں نہ ہو

جو چپ رہوں تو کہیں کیا ماجرا کیا ہے
جو مدعا کہوں کہتے ہیں مدعا کیا ہے

کہتا ہے کہ ہے حسن بتاں قدرت اللہ
[illegible]

ناز یہ اور یہ برداشت خدا کی قدرت
ناز کرتے ہیں ترے ناز اٹھانے والے

عاقل

عاقل:- محمد فدا علی خانصاحب وکیل رامپور۔ تلمیذ جناب داغ دہلوی۔ کلام میں سادہ بیانی ہے۔ اشعار تکلف اور ہر قسم کی بناوٹ سے پاک ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

عشق کر کے دُکھ لگایا جان کو
دل میں اب کوئی تمنا ہی نہیں

آپ لایا اپنی شامت کیا کہوں
میہماں ہیں خود بدولت کیا کہوں

شوق سے کھنچوا لیجئے دیوار در کے سامنے
دل چرایا ہے مرا پوچھو تو صاف انکار ہے

اس کی کیا بنیاد اس شوریدہ سر کے سامنے
یہ غضب اس پر کہ بیٹھے ہیں کسی کے سامنے

عالم:- صاحبزادہ عالمگیر محمد خانصاحب رئیس جاورہ۔ تلمیذ حبیب کنتوری۔ آپ جناب نیاز محمد خانصاحب مرحوم کے جو بعہدہ کپتانی فوج جاورہ ممتاز تھے۔ فرزند ارجمند تھے۔ نواب صاحب بہادر ریاست جاورہ کے رشتہ دار تھے۔ ریاست سے منصب بھی ملتا تھا۔ اور جاگیر بھی تھی۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ پر گوئی کا یہ عالم تھا۔ کہ وہی برس میں صاحب دیوان ہو گئے۔ زبان اچھی کہتے تھے۔ اگرچہ مضامین رسمی ہیں۔ مگر شگفتہ بیانی سے انہیں تازہ بنا دیتے ہیں۔ متانت کے ساتھ شوخی بھی اپنا رنگ دے جاتی ہے۔ قریب تین چار سال کے ہوئے کہ انتقال فرمایا۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

نگہِ شوق ہر جگہ پہنچی
وقتِ بد میں شریک درد و الم

جلوہ یار جا بجا دیکھا
نہ برادر نہ آشنا دیکھا

آ گئے پہلو میں جب تم پھر کہاں رنج و الم
ترے جمال کا پرتو مری نظر میں رہا

اے صنم اک بات میں سارا گلہ جاتا رہا
ہزار شکر یہ سودا ہمیشہ سر میں رہا

برائے نام بنا گرچہ فاعل مختار
مگر نہ دخل مجھے کوئی خیر و شر میں رہا

خدمت سے خوش ہو تم نہ اطاعت پسند ہے
ان حسینوں سے کہاں جاؤ گے بچکر عالم

صاحب نکالو کوئی تو رشتہ نباہ کا
آنکھ جب لڑ گئی مشکل ہے چھپانا دل کا

عاشقی نے خراب حال کیا

بنائے گا عالم کو دیوانہ اک دن
شراب خانے میں زاہد کدھر سے آنکلا

ذرا بھی اس کے مزے سے ہو یہ اگر آگاہ
جفائیں کرکے شرماتے نہیں وہ
شبِ فرقت کے صدمے جھیلتا ہے

ستم دیکھو وہ لیکر پوچھتے ہیں
ایک پر ایک کو خالق نے فضیلت دی ہے
ہمارے سامنے غیروں کا نام لیتے ہیں
جب سے مے پیتے ہیں رحمت کی گھٹا آتی ہے
بے نیازی کے چلن سب سے جدا ہوتے ہیں
باتوں باتوں میں اڑا لیتے ہیں عشاق کے دل
جس دل پہ ناز تھا وہی خون ہو کے بہہ گیا
دل لیکے مکرتے ہو یہ کیا بات ہے صاحب
ذبح کرنا مری جاں خوب تھا ترسانے سے
جی چاہتا ہے چیر کے پہلو کو پھینک دوں دل
زیبا ہیں شوخیاں نگہِ یار کے لئے
ہرگز نہ ان حسینوں سے کوئی لگائے دل

رقیبوں سے میرا گلہ ہو رہا ہے
ہر طرف سے ہی نالوں کی صدا آتی ہے
دی تسلی ہجر میں آکر خیالِ یار نے

ورنہ اپنا بھی اک زمانہ تھا

پس پردہ جلوہ دکھانا کسی کا
مگر اسے بھی اڑا لائی ہے ہوائے شراب
تو اپنے ہاتھ سے زاہد ہمیں پلائے شراب
خفا بھی الٹے ہوتے ہیں ہمیں پر
جری دل شیر دل میرا کڑا دل

کہاں ہے اب وہ تیرا چلبلا دل
ہیچ وہ ہی جو سمجھتا ہے کہ یکتا ہوں میں
زباں سے تیغ کا اب تو وہ کام لیتے ہیں
واعظا رند بھی خاصانِ خدا ہوتے ہیں
جھوٹے دعوے سے کہیں بت بھی خدا ہوتے ہیں
ان حسینوں کے اشارے بھی بلا ہوتے ہیں
جس پہ جیتے تھے فدا تھے وہ صورت نہیں رہی
جھوٹی قسم اچھی نہیں اور وہ بھی خدا کی
زندگی تلخ ہوئی جاتی ہے غم کھانے سے
نکلیں دل و جگر جو نہ آنکھوں کی راہ سے
تیزی ہو جتنی وصف ہے تلوار کے لئے
سب بیوفا ہیں لاکھ میں کہہ دوں پکار کے

ستم کرتے ہو یہ کیا ہو رہا ہے
کھول ساقی در مے خانہ گھٹا آتی ہے
آج آنسو ڈبڈبا کر چشمِ تر میں رہ گئے

عالی

عالی:۔ سید محب اللہ الرفاعی الملقب نواب میر منوّر علی خاں بہادر۔ آپ کے جدّ اعلیٰ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں مچھلی بندر اور ارکاٹ (حصۂ ملک دکن) کے صوبہ دار تھے۔ اس خاندان کا سلسلہ سید احمد کبیر رفاعی تک پہنچتا ہے۔ اس قبیلہ کی صاحبزادیاں شاہی خاندان اور والیانِ سلطنت سے بیاہی گئی ہیں۔
آپ کے والد نواب مظفر جنگ مرحوم حضرت آصف جاہ خامس والیِ دکن کے نواسے تھے۔ جو اپنے زمانہ کے فاضل اجل خطاط ہفت قلم اور فارسی کے عمدہ شاعر شمار کئے جاتے۔ وہ آخر دم تک صیغۂ امور مذہبی کے ناظم رہے۔ درویش صفت برگزیدہ صفات نیک خو تھے۔ دودمان آصف جاہی کی اکثر شہزادیاں آپ کے خاندان میں منسوب ہوئیں۔ انھوں نے نظام گورنمنٹ میں تین سال کبنٹ کونسل میں رہ کر اپنی انتظامی قابلیت کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔
حضرت عالی کو لڑکپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں نشتر تخلّص کرتے تھے اپنے والد بزرگوار کی فہمائش سے اس تخلّص کو چھوڑا اور عالی تخلّص کیا۔ اس زمانہ میں آپ کی عمر چودہ۔ پندرہ سال کی تھی۔ پہلے آپ سید محمد کاظم حسین شیفتہ کنتوری مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ پھر ان کے بعد کبھی اپنا کلام سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی حیدر یار جنگ کو دکھاتے رہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ اپنے دادا نواب فریدوں جنگ رفیع الدولہ حیدر الملک ثانی مرحوم کی نگرانی میں گذرا۔ پھر آپ کے والد بزرگوار نے تعلیم پر دلی توجہ فرمائی۔ آپ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ خوشنویسی باپ سے ورثہ میں ملی ہے۔ اور چار خطوط میں کمال حاصل ہے۔ آپ کو اصلاح زبان اردو اور محاورات والفاظ کی تحقیقات سے خاص دلچسپی ہے۔ آپ نے ایک انجمن اربابِ اُردو کی بنا ڈالی تھی۔ جس کے معتمد اعزازی رہے۔ رسالہ تحفہ کے مدیر اعلیٰ تھے۔ آپ نے ایک

ضخیم کلیات قدما کے طور پر مرتب کیا ہے۔ جس میں تقریباً دس ہزار بیت ہیں۔ اور ایک دیوان بھی مرتب کیا ہے۔ جدید وضع کی شاعری میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ کلام میں شوکت الفاظ کے ساتھ شوخی اور متانت بھی ہے۔ نہایت پُرگو اور زود فکر ہیں۔ گو آپ دہلی اور لکھنؤ کی بیجا پیروی کو حلقۂ غلامی سمجھتے ہیں۔ اور خذ ما صفا کے مؤید ہیں۔ لیکن کلام کا زیادہ حصہ قدمار لکھنؤ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

حضرت عالی سلیم الطبع۔ منکسر المزاج۔ کم سخن۔ درویش صورت و درویش سیرت۔ خوش اخلاق۔ گوشہ نشین۔ حنفی المذہب۔ صوفی مشرب ہیں۔ مؤلف تذکرہ کو جو کلام روانہ کیا گیا تھا۔ ان کا انتخاب درج ذیل ہے

ہوا ہوں پرشکستہ فصل گل میں اڑ نہیں سکتا
میں رہ جاتا ہوں منہ تک تک کے دیوار گلستاں کا

اہل بینش میں کہاں سرمہ بنائیں آکر
سوختہ برق تجلی سے ہے خرمن اپنا

جب ہوئی وحشت تو عریانی کا ساماں بڑھ گیا
پاؤں سے دامن تو ہاتھوں سے گریباں بڑھ گیا

اس آئینۂ دل میں مجھے کیا نظر آیا
کچھ کہہ نہیں سکتا جو تماشا نظر آیا

صورت تیری آغاز میں بھولی نظر آئی
انجام میں پتھر کا کلیجا نظر آیا

بدل گئی ہے فغاں سے مری زباں کی طرح
دعا بھی منہ سے نکلتی ہے آہ فغاں کی طرح

آئی بہار آتشِ گل نے لگائی آگ
جلنے لگی ہے آج سرِ شاخسار شمع

رتبہ شعر ہے الفاظ و معانی سے بلند
پھول پھل ہوتے نہیں دنیا میں شجر کی رونق

رعب حسنِ یار کے باعث نہ نکلا ایک حرف
ورنہ کیا کیا سوچ کر آئے تھے اپنے دل میں ہم

خیر محبت میں یہی فیصلہ اپنا ان کا
نہ سہی آج اگر کل بھی تو کچھ دور نہیں

منکشف ہوتے رہے راز ہر اک گھونٹ کے ساتھ
یا الٰہی شب ہجراں تو نہیں شب یہ نہیں

وصل دشمن کی کرتے ہیں ہر روز و شب دعا
کس درجہ بے ادب ہیں یہ بندے خدا کے ساتھ

رنج و غم کیونکر جدا ہوں ہائے اپنے دم کے ساتھ
تم چھوٹ جاؤ گے مگر جائینگے ہم بھی غم کے ساتھ

رو دیئے سوزشِ تنہائی کو | یا بُرا کہیئے نوجوانی کو
قِصّۂ قیس تو سُنا تم نے | کبھی سُن لو مری کہانی کو

جلوۂ یار و تمنّا و امید و ارماں | جمع ہیں دل میں تماشے بھی تماشائی بھی
تو ستمگر ترے انداز ستمگر ظالم | تری تلوار بھی قاتل تری انگڑائی بھی
اس قدر بڑھ گئی وحشت تیرے دیوانوں کی | دامن کوہ بھی صورت ہے گریبانوں کی
مثل ہے ہوتی ہے نعمت کی قدر بعد زوال | اُمنگیں پیری میں یاد آتی ہیں جوانی کی
باندھی جو آسماں نے ہوا انقلاب کی | وہم و خیال ہو گئی ہستی حباب کی
اعمال میں نہیں ہے مرے ایک بھی ثواب | محتاج ہی نہیں مری فردیں حساب کی
نہ صرف علم کے پڑھنے سے آدمی ہوگا | بشر کو چاہیئے کچھ سیکھے آدمیت بھی
ہاتھ میں نو رچتیوں ہے جوش سودا سر میں ہے | سارے ویرانوں کی ویرانی ہمارے گھر میں ہے
میں جو ہو جاؤنگا خوگر رنج کا پھر لطف کیا | کچھ خوشی بھی چاہیئے اے آسماں میرے لئے

کام کر دیتی ہے تمام ادا | مفت مرنے کا نام ہوتا ہے
گلے ملتے ہیں تیغ قاتل سے | آج قصّہ تمام ہوتا ہے۔

کہوں کیا محبت کی تکلیف حالی | جو گذری ہے مجھ پر خدا جانتا ہے۔
کبھی تو اپنی جفاؤں سے باز آ ظالم | کبھی تو لینے دے اے سنگدل قرار مجھے
ہماری سرفروشی پر زمانہ بھر کو حیرت ہے | کسی کی تیغ بھی تکتی ہے ہم کو چشم جوہر سے
یوں مجازاً ہیں ترے چاہنے والے لاکھوں | فی الحقیقت وہی تیرا ہے جسے تو سمجھے
نہ دل سے شکوہ نہ بخت سے شکوہ نصیب کا ہو رہیگا لکھا | نوشتۂ کاتب مقدر بھلا کہیں رائیگاں ہوا ہے
مری آنکھوں سے جو دیکھو آئینہ | تم بھی رہ جاؤ کلیجہ تھام کے
وفور ضعف سے فرقت میں لڑکھڑاتا ہوں | خدا کے واسطے اے بیخودی سنبھال مجھے
چلوں نہ دوڑ کے حالی نہ ٹھوکریں کھاؤں | پسند اس لئے ہے راہِ اعتدال مجھے

کروں کس کس طرح عرضِ مطلبِ دل
روز اک ظلم نیا اے ستم ایجاد رہے
پرستش میں تری شیخ و برہمن سر بسجدہ ہیں
لطف جب ہے ایک سمجھو عاشق و معشوق کو
کیا جانے کیا کیا سوچ کے آئے تھی دلبیں ہم
وہ جو پہلو سے مرے اٹھ کر چلے
دل کو تسکین دے رہا ہوں میں
دیکھتا ہوں کہ وہ محفل میں کدھر دیکھینگے
حیف اے دل تو نہ سمجھا عمر بھر
محبت ہے جو مجھ وحشی کو حسنِ فتنہ ساماں سے
بگولے خاک اڑاتے ہیں قبائے گل دریدہ ہے
ہم کو عمرِ شاہدِ گل اے صبا معلوم ہے
اس سے کچھ کہنا اگر چاہوں تو کہتا ہے وہ شوخ
خلوت پسند ہے مجھے اور حشر عام ہے

انہیں نفرت ہے حرفِ مدعا سے
دل کو کچھ حسن پرستی کی سزا یاد رہے
یہاں تو ایک راہ کفر و دیں معلوم ہوتی ہے
شمع میں ہے کس کا جلوہ کون پروانے میں ہے
خاموش رہ گئے تری صورت کے سامنے
دل پہ بس چھریاں چلیں خنجر چلے
وہ نہ آئیں اجل تو آتی ہے
یہی ہر اک کو گماں ہے کہ ادھر دیکھینگے
عمر گذری تجھ کو سمجھاتے رہے
جنوں نے سر نکالا ہے مرے چاک گریباں سے
جنازہ آج بلبل کا نکلتا ہے گلستاں سے
ہے مخالف باغِ عالم کی ہوا معلوم ہے
ہم کو پہلے سے تمہارا مدعا معلوم ہے
کہدو کہ یہاں نکل نہیں سکتا مزار سے

عالی :- میرزا عالی بخت گورگانی ابن میرزا فیروز بخت خلف شاہ عالم ثانی۔ حضرت احسان دہلوی اور میرزا فخر الدین ثابت سے تلمذ تھا۔ خوش فکر، عالی خیال شاعر تھے نمونۂ کلام یہ ہے۔

مژگان سنگدل کی طرح روزِ ازل سے
جوں نخلِ شمع ہوں نہ کبھی سبز آب سے
صد حیف اس کو اگر جان دل جتا نہ سکے
بیٹھوں تو دل کی نہ بجھے آگ آہ اس پر سے

جو شخص کہ ٹیڑھا ہے وہ سیدھا نہیں ہوتا
آتش اگر ہو سر پہ رہوں آب و تاب سے
تو کیا غزل میں بھی بڑھ بڑھ کے ہم سنا نہ سکے
ذرا سا وار کے پانی بھی یار نہ لا سکے

عالی

عالی:- منشی میرزا علی صاحب مرحوم لکھنوی۔ آپ عرصہ تک بگرام اور سندیلہ میں سیاہہ نویس رہے۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد منشی سید التفات رسول تعلقہ دار سندیلہ کے ہاں ملازمت کر لی اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ بہت با وضع اور خوش اخلاق تھے۔ سید منصب علی صاحب ہنر مرحوم سے دوستانہ مراسم تھے۔ اور انہیں سے کبھی کبھی مشورہ سخن بھی کرتے۔ ساٹھ ستر برس کے قریب عمر پائی۔ لکھنؤ میں جا کر انتقال ہوا۔ آپ کا دیوان غنچۂ رمز کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ پُر گو شاعر تھے۔ مشاعرہ میں بالعموم دو غزلہ پڑھتے۔ شعر میں صنائع بدائع رعایات لفظی کا زیادہ خیال تھا۔ باریکی اور نکات کو مدِ نظر رکھتے نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

زکوٰۃ حسن ہے اک بوسہ دے بھلا ہو گا	دعا فقیر کی بھی لے نگار لیتا جا
جو جاہا نزع میں لپٹوں تو ہٹ کے وہ بولے	لحد میں حسرتِ بوس و کنار لیتا جا
کرو رنگا خون میں اپنا نہیں تو اے صیاد	قفس مرا طرف لالہ زار لیتا جا
ملال و حزن و درد و غم نکلتے ہی نہیں دل سے	یہ مہماں خوب میرے گھر کے مالک بنکے بیٹھے ہیں
جس مرغِ دل کو تاک لیا ہو گیا شکار	تیرِ قضا کا ڈھنگ تمہاری نظر میں ہے

عالی

عالی:- سید زبیر احمد صاحب سکندر آبادی تلمیذ حضرت داغ دہلوی۔ زبان بہت پیاری ہے۔ انداز بیان دلکش ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

شیخ جی یہ میکدہ میں تاک جھانک	کیا بُری حضرت کی نیت ہو گئی
روز بوسے کی طلب اچھی نہیں	دیکھو عالی کیا بری لت ہو گئی

عامل

عامل:- میرزا محمد یعسوب ولد میرزا ایوب بیگ دہلوی۔ ریاست جے پور میں مدرس ہیں۔ میرزا عبد الغنی ارشد مرحوم کے شاگرد ہیں۔ میرزا سعادت یار خاں رنگین کو اپنا نانا بتاتے ہیں۔ سادہ گفتار سلاست پسند ہیں۔ کلام جو کچھ فراہم ہوا اس کا انتخاب درج ذیل ہے

غم عالم ہمارے دل میں ہے۔	کیا ٹھکانا ہے اس سمائی کا

دل جگر لڑ رہے ہیں ناوک پر
بھائی دشمن ہوا ہے بھائی کا

پہلو سے نکل کے کھو گیا دل
کیوں نام لگائیں ہم کسی کا

ہے کچھ اثر مرے دلِ پُر اضطراب کا
اُڑتا گھڑی گھڑی ہے جو گوشہ نقاب کا

انداز ہے چلنے میں وہ اس رشکِ پری کا
جیسے کوئی جھونکا ہو نسیمِ سحری کا

فتنہ نہ اُٹھے آج کوئی اے دلِ بیدل
کیوں خیر تو ہے کیوں وہ ادھر دیکھ رہے ہیں

خانہ برباد کسے جائیے ہاں شوق سے آپ
فکر اس بات کی کیا ہم کو یہاں گھر ہی نہیں

تمھیں کہہ دو ذرا خدا لگتی
تم کو دل دے کے کیا کرے کوئی

کس جفا کار ستمگر پہ طبیعت آئی
بس جی بس حضرتِ دل آپکی شامت آئی

حال یہ پوچھئے مرے دل سے
رات گذری ہے کیسی مشکل سے

کٹتی اک اک گھڑی ہے مشکل سے
جان آفت میں آگئی دل سے

ایسے بے مہر پہ نہ دیتے جان
ہم تو مجبور ہوگئے دل سے

اُف ری سوزِ جگر تری گرمی
بڑھ گئے دل کے آبلے دل سے

تمھیں بتاؤ نہ کیوں جان بیقرار رہے
جو دل سی چیز پہ اپنا نہ اختیار رہے

عبادت

عبادت :- میر عابد علی صاحب۔ خوش فکر پاکیزہ خیال شاعر ہیں۔ بندشیں صاف ستھری ہوتی ہیں۔ اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

تپِ فرقت کی اللہ رے حرارت
نکلتے ہیں شرارے تن بدن سے

الجھتا ہے سدا کانٹوں سے دامن
جنوں ہم باز آئے پیرہن سے

ہر اک کی آنکھ میں بھر آئے آنسو
ہوئے رخصت جو ہم اہلِ وطن سے

ہوا مجنوں سے روشن نام لیلےٰ
ملا شیریں کو رتبہ کوہکن سے

عبادت بندگی حق کیا کر
وسیلہ رکھ جہاں میں پنجتن سے

عباس

عباس :- عباس خاں برادر زادہ اخوند زادہ ارادت خاں صاحب۔ مصاحبانِ نواب

عنایت اللہ خاں سے تھے۔ قدرت اللہ صاحب شوق نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "عالی حوصلہ۔ خوبصورت پاکیزہ سیرت با تمکنت ہیں اگرچہ نومشق ہیں۔ مگر ذہن اچھا پایا ہے"۔ محمد قائم سے ان کو تلمذ تھا۔ یہ ان کا کلام ہے۔

جز عشق و سوز دیر نہ کعبہ سے کام ہے — اُس کو تو رام رام اور اس کو سلام ہے
رُخ دام زلف دام ہے کاکل ہے دام دل — ہے راست یہ کہ اس کا ہر اندام دام ہے
بازار و شہر و مسجد و بت خانہ باغ و راغ — دیکھا تو تیرے عشق ہی کی دھوم دھام ہے
نجانے کیا ہوا ایدل تجھے پھر ان دنوں ہے ہے — کہ ہر نالہ میں تیرے حشر ہے شور قیامت ہے

عباس

عباس:۔ سید محمد جعفر علی عرف شہریار مرزا۔ عامیانہ محاورات و بازاری عشق کے معاملات ان کے تغزل کی جان ہیں۔ چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

نہیں بھولتی یاد جانی تری — زباں پر ہے ہر دم کہانی مری
پیام اجل ہے ترا روٹھنا — غضب ہے یہ نامہربانی تری
کیا حشر برپا تری چال نے — قیامت ہے جانی جوانی تری

عباس

عباس:۔ مرزا محمد عباس المشتہر بہ علی مرزا تلمیذ حضرت حکیم لکھنوی۔ بہت مشاق شاعر ہیں۔ کلام سے پختگی کا رنگ ٹپکتا ہے۔ لطف زبان کیسا تھ لطف مضمون بھی موجود ہے زیادہ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ فراہم شدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

پڑی تھی کیا اُسے کیوں جاگتا وہ ساری رات — نصیب خفتہ مرا چشم انتظار نہ تھا
شب فراق ہمیں اور شب وصال تمہیں — سحر کا شام سے دونوں کو انتظار نہ تھا
امید وصل پہ عباس اور جیتا تھا — ہزار وعدہ کا اس بت کے اعتبار نہ تھا

عباس

عباس:۔ میرزا عباس بیگ مرحوم بریلوی۔ کہنہ مشق پرگو شاعر تھے۔ فن شعر گوئی میں خواجہ آتش سے تلمذ تھا۔ اساتذہ بریلی میں نامور اور شہیدی کے ہم عصر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ غدر میں ان پر جرم بغاوت عائد کیا گیا۔ اور پھانسی دیگئی۔ میرزا صاحب مرحوم

نہایت سنجیدہ مزاج تھے۔ انہیں شور و شر سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے اسوقت بریلی کا جو حاکم تھا وہ مشرقی لٹریچر اور اردو شاعری کی خوبیوں سے ناواقف تھا۔ جس وقت اس نے یہ شعر سنا ؎

اختر جھپک گئے ترے خالونکے سامنے	گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالونکے سامنے

تو اس کو بغاوت پر محمول کیا اور ان کو پھانسی کا حکم دے دیا۔ اگر اس موقعہ پر کوئی ہندوستانی ہوتا تو وہ زبان داں ہونے کیوجہ سے اختر اور خال کی چمک۔ سیاہی اور سپیدی کے فرق کو سمجھ لیتا۔ اور اس سے یہ غلطی سرزد نہ ہوتی۔ کلام جو کچھ دستیاب نذر ناظرین ہے۔

جب بیعتِ گل کا شجرہ گل نے نکالا	گیسوئے نباسلسلہ سنبل نے نکالا
اس قامتِ موزوں نے کیا سرو کو سیدھا	بل طرہ شمشاد کا کاکل نے نکالا
بدلا ہوا ہے رنگ سیاہی گھٹا کی ہے	لا ساقیا شراب کہ رحمت خدا کی ہے
پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کئے	قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے
عباس روزِ حشر یہ کہتا اٹھوں گا میں	لوٹا مجھے بتوں نے دوہائی خدا کی ہے

عباس عباس۔ مولوی غلام عباس صاحب۔ آپ قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڈھ کے باشندے ہیں۔ اپنے والد سے عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ عرصہ دراز سے قصبہ سمبھلی میں سکونت پذیر ہیں۔ علم دوست اخلاق پرست دوست ہیں۔ اکثر اصحاب آپکے فیضانِ علمی سے مستفید ہوچکے ہیں۔ عربی فارسی میں اعلےٰ درجہ کی لیاقت ہے۔ احادیث و آیات قرآن کو بے تکلف اردو شعر میں نظم کردیتے ہیں۔ فن شعر میں آپ کو صابر نظام آبادی سے تلمذ ہے جو حضرت ناسخ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ متعدد رسالہ جات میں آپ کا کلام شائع ہوچکا ہے۔ کلام نہایت بامزا ہوتا ہے۔ جو پختہ مشقی کا ثبوت ہے۔ آپ جس طرح پرگو شاعر ہیں۔ اسی طرح مشاق نثار بھی ہیں۔ عرصہ تک اخبارات میں مضامین

لکھتے رہے ہیں۔ غزل کے علاوہ سلام بھی کہتے ہیں۔ کلام جو منشی محمد احسن صاحب نے روانہ کیا اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

جس کو طوفانِ نوح کہتے ہیں
تھا وہ طوفان دیدۂ تر کا

نزع میں چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے
بس یہ جھگڑا ہے اور دم بھر کا

سنگِ اسود کو چومتے ہیں بشر
یہ بھی پتھر ہے کیا ترے در کا

کہاں جنت کہاں کوئے صنم خاموش اے واعظ
ارے دیکھا ہوا ہے باغ فردوس و ارم میرا

سلام اس بندگی کو۔ دیں ہزاروں گالیاں ان نے
ہوا جب سامنے اسکے سرِ تسلیم خم میرا

اِن دنوں شوق جو ہے ان کو خود آرائی کا
عالم آئینہ میں ہے چشم تماشائی کا

جس کو عبّاس ہم ولی سمجھے
وہی رندوں کا پیشوا نکلا۔

لَو لگائی جو بتوں سے تو خدا کو پایا
دل روشن ہے چراغ رہ عرفاں میرا

وفورِ داغ سے ہے لالہ زار دل اپنا
یہ بوستاں کبھی منت کش بہار نہ تھا

تمہاری جستجو میں ہم نے برسوں خاک اُڑائی ہے
زمیں یہ مدتوں سر پر پھری ہے آسماں ہو کر

جب تک گہر صدف میں رہا آبرو نہ تھی
عبّاس قدر ہو گئی جب نکلے گھر سے ہم

بحرِ عالم میں ہے اپنی زندگی شکل حباب
جب چلا جھونکا ہوا کا ہو گئے برباد ہم

مے بھی ہے ابر بھی ہے۔ باغ بھی ہے۔ جام بھی ہے
سب تو موجود ہے پر ساقی کمسن ہی نہیں

دم بدم آتی ہے اے عبّاس لوئے باغ خلد
کوچہ جاناں میں بستر ہے کہ میں جنت میں ہوں

ناز سے جب وہ مسکراتے ہیں
برق کو شرمسار کرتے ہیں

وہ خلوتخانہ دل میں ہیں موجود۔
حرم میں دیر میں کس کیلئے جائیں

جدائی ہے اگر منظور عبّاس
جدا تن سے ہمارا سر کئے جائیں

چھیڑ کر کہتا ہے مجھ کو وہ پری رو عبّاس
لوگ کیوں آپ کو دیوانہ کہا کرتے ہیں

کہتا ہوں دلمیں درد ہے ان کو یقیں نہیں
کہتے ہیں ہاتھ رکھکے کہاں ہے کہیں نہیں

جب نظر تم دو چار کرتے ہو
تیر سینے کے پار کرتے ہو
وہ تلوّن مزاج ہے عباسؔ
اس کا تم اعتبار کرتے ہو

ویرانۂ دل میں تجھے ہم ڈھونڈ رہے ہیں
اے حسرت مردہ تری تربت نہیں ملتی
ایک دل میں کیا ہے یادِ خدا یادِ صنم
لطف تھا ہم کو جو ملتا دوسرا دل اور بھی
دن تو فرقت کا گذر جاتا ہے اٹھتے بیٹھتے
کاٹنا راتوں کا ہو جاتا ہے مشکل اور بھی
ترک ملت کر چکے جب ہم تو کچھ حاجت نہیں
ہاتھ کو تسبیح کی اور دوش کو زنار کی
طرح انداز مکان و لامکاں تو ہی تو ہے
زمزمہ سنج نوائے کن فکاں تو ہی تو ہے

اس را کہ عقل بیش غم روزگار بیش
بیعقل جو یہاں ہو وہی بے نیاز ہے
کیوں ہنسے آپ دل میں کیا سمجھے
کیا مرے دل کا مدعا سمجھے
خاک ہی سے بنے تھے خاک ہوئے
ابتدا اور انتہا سمجھے
بیٹھ کر پہلو میں کس انداز سے
لے گئے وہ دل نگاہِ ناز سے

میری آنکھوں سے جو آنسو گر پڑے
ہنس کے بولے ہم ہیں واقف راز سے
دردِ دل اشکوں نے ظاہر کر دیا
بھید گھر کا کھل گیا غماز سے
اے آہ تو اثر نہ دکھا مضطرب ہیں وہ
اے دل نہ تو تڑپ کہ انہیں اضطراب ہے
تنگ آکے یہ ہم کہنے لگے بیقدری سے
اچھا نہیں اب کوئی ہنر بے ہنری سے

نعت در صنعت غیر منقوط

ملک و ملک و حور کا سردار محمدؐ
والله دو عالم کا مددگار محمدؐ
ممدوح ہوا مہر و مہ و لوح و سما کا
الله کا وہ محرم اسرار محمدؐ
معصوم وہ محمود وہ طاہر وہ مطہر
عالم کا مدد اور مددگار محمدؐ
والله مرا ہو گا مددگار علمدار
وہ داورِ رسل عام مددگار محمدؐ

مسدس

مرغوب کیوں عروس سخن کی ادا ہے آج
قرطاس بحر نور میں ڈوبا ہوا ہے آج
اونچا فلک سے بھی کہیں ذہن رسا ہے آج
مطلع بھی اپنا مطلع شمس الضحیٰ ہے آج

حرفوں میں میرے نور ہے مہر منیر کا
سدرہ کے سر پہ غل ہے قلم کے صریر کا

اے شاہد سخن مجھے جلوہ گری دکھا
اے اسپ خامہ چال اب اپنی نئی دکھا
حسن و جمال حور ادائے پری دکھا
لی باگ میں نے ہاتھ میں چابکتری دکھا

اے شمع ذہن نور دکھا کوہ طور کا
یہ کاغذ سپید مرقع ہو نور کا

اے گلشن طبیعت انور شگفتہ ہو
نخل سخن میں آج گل تر شگفتہ ہو
ہاں جلد غنچۂ دل مضطر شگفتہ ہو
سطح سخن چمن کے برابر شگفتہ ہو

سن سن قلم برنگ نسیم سحر چلے
بوئے گلاب ساتھ ادھر اور ادھر چلے

عبرت

عبرت:۔ نواب حسین علی خاں لکھنوی بڑے مرزا خلف نواب محمد علی خاں ابن نواب شجاع الدولہ بہادر۔ صاحب دیوان و شاگرد غلام ہمدانی مصحفی بہت زبردست شاعر تھے۔ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فن سخن پر قدرت حاصل تھی۔ زبان بھی سلیس پائی تھی زیادہ حال ان کا نہ مل سکا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اجڑا پڑا ہے آج سراسر دیار دل
تکیے میں دفن میں ہوں وہ ہی کوئے یار میں
گر دکدورت آئینہ رو کی مٹی نہ ٹلے

کس زلف نے کیا ہے الٰہی شکار دل
میرا الگ مزار جدا ہے مزار دل
ہر چند آب گریہ سے دھویا غبار دل

عبرت

عبرت:۔ منشی دولت رام دہلوی رائے ہیرا لال برادر زادۂ راجہ کنول نین مرحوم ساکن کوچہ بلاقی بیگم متصدی پیشہ تھے۔ اوائل میں شیخ ابراہیم ذوق سے تلمذ تھا۔ پھر

مولانا ظہیر سے صلاح لینے لگے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں ستر برس کی عمر پاکر قضا کی۔ صاحب دیوان تھے۔ مگر کچھ ذاتی استغنا اور کچھ اولاد کی غفلت سے کلام برباد ہو گیا۔ نمونہ کلام درج ہے

سخت جانی تو نے شرمندہ کیا قاتل سے ہمیں
وقت کشتن پھر گیا منہ یار کی تلوار کا

عامل ہزار سورۂ جن مجھ پہ دم کریں
پر اس پری کی زلف کا سایہ نہ جائیگا

تمہاری بات کا جب ہم کو اعتبار نہ ہو
تمہیں بتاؤ کہ دل کیونکہ بیقرار نہ ہو

تم کو چاہا جو صنم ہم نے برائی کیا کی
الفت انسان کو ہو جاتی ہے انسان کیساتھ

پہلے تو غصہ ہوئے غیر کے بہکانے سے
بارے کچھ سوچکے سمجھے مرے سمجھانے سے

کونسا ہے وہ پری رو کہ جسے تم عبرت
دیکے دل ایسے بنے پھرتے ہو دیوانے سے

عبرت:۔ احمد دین خاں خلف رستم ہند قطب الدین خاں نبیرہ نواب عظمت اللہ خاں مراد آبادی۔ جوان صاحب مروت تھے۔ طبیعت اچھی پائی تھی۔ قوت مشق کی بدولت زبان صاف ہو گئی تھی بہت پر گو تھے۔ ایک ضخیم دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

فقط دل ہی نہ دلبر کا مکاں ہے
جہاں دیکھو وہ ہرجائی وہاں ہے

نہ مجھکو آہ کی طاقت نہ ان کو مہربانی ہے
کٹے ہیں اس طرح دن یہ بھی کوئی زندگانی ہے

تسلی کس طرح سے ہجر میں ہو اس جفا کش سے
نہ نامہ ہے نہ قاصد ہے نہ پیغام زبانی ہے

بلا ہی فتنہ ہی آفت ہی یا یہ تیرا قامت ہے
کہ جس کے ہاتھ سے سرو گلستاں پر قیامت ہے

خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی آزردہ خاطر کو
شب ہجراں جسے کہتے ہیں سو روز قیامت ہے

خستہ جاں اشک فشاں خاک بسر آتا ہے
نامہ بر شہر سے دلبر کے مگر آتا ہے

عبرت:۔ منشی محمد عبد الرسول صدیقی تلمیذ جناب میر حشمت علی صاحب حشمت بہت صاف اور پاکیزہ کلام ہوتا ہے۔ مشتاق معلوم ہوتے ہیں۔ دو شعر بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں:۔

عبرت

عبرت

زلف کا منہ پر نقاب دیکھئے کب تک رہے	ابر میں یہ ماہتاب دیکھئے کب تک رہے
ہجر میں اک شوخ کے نزع کے عالم میں ہوں	جان پہ میری عذاب دیکھئے کب تک رہے

عبرتی

عبرتی:۔ سید خورشید عالم صاحب خلف الصدق سید مقصود عالم رضوی ساکن قصبہ پہانی ضلع ہردوئی۔ مشتاق شاعر تھے۔ تخمیس میں کمال حاصل تھا۔ بہت سی غزلوں پر اعلےٰ اعلےٰ مصرعہ لگا کر اپنی استادی کا ثبوت دیا ہے۔ حضرت مقصود کی ایک غزل پر جو مصرعے لگائے تھے۔ اس کے کچھ بند درج ذیل ہیں ۔

کہے دیتے ہیں ہم صاف صاف اجی تم سے	جواب عمر کو دے جو لگائے جی تم سے
کریگا کیا مہ کنعاں برابری تم سے	ملائے خاک بھلا آنکھ آدمی تم سے

خفیف حور ہے تم سے خجل پری تم سے

بنے ہیں وہ لگے لگانے سے مفت میں نالاں	فراق میں ہوئے راہی شکیب و ہوش و تواں
مصیبتوں کا کہاں تک بیاں کرے یہ زباں	یہ کیا ستم ہے زمانہ بنا ہے دشمن جاں۔

غضب میں جان پڑی کی جو دوستی ہم سے

جو بانکپن کا کبھی ذکر ہو اکڑتے ہو	وہ کر گذرتے ہو جس بات پر کہ اڑتے ہو
طلب جو بوسہ لب ہو تو صاف لڑتے ہو	ہنسی کی بات پہ تم اس قدر بگڑتے ہو

تو جاؤ آج سے موقوف ہے ہنسی تم سے

عادم

عدم:۔ سید عبدالحمید صاحب خلف منشی حیدر علی شاہ بن صوبیدار مہتاب شاہ آپ کے آباؤ اجداد میں سے بیشتر فوجی ملازمت میں منسلک رہے ہیں۔ عدم صاحب ۱۹۰۹ء میں تلونڈی موسےٰ خاں نامی موضع میں پیدا ہوئے جو گوجرانوالہ سے قریب چار کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ تعلیم اپنے وطن اور لاہور میں پائی۔ اکثر امتحانات میں سرکاری وظیفہ بھی ملا۔ ۱۹۲۸ء میں ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازم ہوئے آجکل بطور آڈیٹر کام کر رہے ہیں اور راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

دورانِ قیام لاہور میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ پہلی غزل ۱۹۲۵ء میں فرمائی اور ۱۹۲۷ء سے اکثر مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ آپ کو علم موسیقی سے بھی دلی تعلق ہے۔ اور شاید اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ آپ کے کلام میں نہایت دلکش ترنّم ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری صرف غزل گوئی تک محدود نہیں ہے۔ دیگر اصنافِ نظم میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ گو مشق کو بہت عرصہ نہیں ہوا۔ مگر کلام کا انداز نہایت دلکش ہے۔ تخئیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ محاکات کا لطف بھی آپ کے کلام میں موجود ہے۔ دُور از کار تشبیہ و استعارات سے کلام پاک ہے۔ تلمذ کسی سے نہیں ہے، مذاقِ سلیم خود ہی رہنما ہے۔ ملک کے اکثر ممتاز رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اگر مشق جاری رہی تو وہ دن دُور نہیں کہ آپ کا شمار بھی نامی اساتذۂ فن میں ہوگا۔ کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین ہے۔

جفا کا لطف باندازۂ وفا نہ ملا — ترے جہاں میں تو مرنے کا بھی مزا نہ ملا

نہ دل سے محو ہوئی آرزو نہ بر آئی — ستم ظریفی فطرت کا مدّعا نہ ملا

جنوں سوار تھا سر پہ پاؤں توڑ آئے — کچھ اپنی منزلِ موہوم کا پتہ نہ ملا

جنابِ شیخ یہ کیا ماجرا ہوا آخر — سنا ہے کہ آپ کو کعبہ میں بھی خدا نہ ملا

ہائے کیا بیداد پر بیداد کر لیتا ہوں میں — شامِ غربت میں وطن کو یاد کر لیتا ہوں میں

ضبط مشکل ہے خلافِ ضبط ننگِ عشق ہے — دل ہی دل میں بیٹھ کر فریاد کر لیتا ہوں میں۔

چاندنی راتیں محبت اور جوانی ہائے ہائے — تھام کر دل ان دنوں کو یاد کر لیتا ہوں میں

اب کہاں پینے کا پہلا سا وہ لطف اے ہمنشیں — ہاں ذرا لطفِ ستم ایجاد کر لیتا ہوں میں

بندہ ہیں تجھ کو خبر کیا ہے حقیقت کیا مجاز — دیکھ کر ان کو خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

گو تری محفل سے او بیداد گر جاتا ہوں میں — دیکھ کیا خستہ جگر آشفتہ سر جاتا ہوں میں۔

شوقِ بے پایاں کی کوشش کا کوئی حاصل بھی — اے فریبِ آرزو آخر کدھر جاتا ہوں میں۔

زندگی کی راہ پُر آفات ہے لیکن عدم
حسرت بھری ہے رونق ناپائیدار میں
فرصت کہاں کہ ہوش میں آنا نصیب ہو
محرومیوں میں بھی مری تکمیل شوق دیکھ
تڑپا دیا ہے عہد فراغت کی یاد نے
مقصود انتظار ہے کیا کچھ خبر نہیں۔
انکی ہر ایک بات پہ آتا ہے اب یقیں
چلتے ہو خضر سوئے عدم یا کہ حشر تک
کیا دیکھتے ہو منہ مرا احوال پوچھ کر
دلجوئی خوب کرتے ہیں واماندگی میں دوست
آخر فریب وعدہ کی کچھ انتہا بھی ہے۔
کچھ کہہ رہی ہے رات کی خاموش چاندنی
جستجو وہم سے تعبیر ہوئی جاتی ہے
مٹتی جاتی ہیں جوانی کی اُمنگیں جوں جوں
طلسم اعتبار خوبی تدبیر قائم ہے

ہر کٹھن منزل سے وحشت میں گذر جاتا ہوں میں
میرے لئے بہار کا غم ہے بہار میں۔
کھویا گیا ہوں کشمکش روزگار میں
معدوم ہو گیا ہوں تری رہ گذار میں
کچھ ڈھونڈھتا ہوں گردش لیل و نہار میں
بیٹھا ہوں کتنا محو ترے انتظار میں
وہ بس گئے ہیں سادگی اعتبار میں۔
بیٹھے رہو گے غمکدۂ روزگار میں
کیا مجھ سے کوئی سجدۂ شکرانہ چاہیئے
کہتے ہیں مجھ سے ہمت مردانہ چاہیئے
یہ مانتا ہوں میں کہ تقاضا نہ چاہیئے
کچھ احترام شیشہ و پیمانہ چاہیئے۔
ہائے تدبیر بھی تقدیر ہوئی جاتی ہے
زندگی موت کی تصویر ہوئی جاتی ہے
ابھی ہم اپنی بربادی کو قسمت تو نہیں کہتے

جذبات محبت

روح میں کیوں سما گئے ہو تم
میری ہستی پہ چھا گئے ہو تم
دل کو مجنون کر دیا تم نے
ہوش کا خون کر دیا تم نے
دل ہی مندر تم اسکی مورت ہو
ہائے تم کتنے خوبصورت ہو
دُور رہتے ہو ماجرا کیا ہے۔
جور بیجا سے مدعا کیا ہے
شب کو یہ خدمت محال کہاں
رات کو ضبط کی مجال کہاں

رات کی حشر خیز خاموشی — خامشی کی عمیق سرگوشی
دل سراپا خیال ہوتا ہے — اور تمہارا جمال ہوتا ہے
روح محو نیاز ہوتی ہے — آنکھ وقفِ نماز ہوتی ہے
کاش ایسے میں تم کبھی آؤ — آکے اِک بار دیکھ ہی جاؤ
لیکن ایسے مِرے نصیب کہاں — تم کہاں اور میں غریب کہاں۔

دریا

اپنے دامن میں لئے پُرجوش ہیجانوں کا شور — تند موجوں کا تلاطم مست طوفانوں کا شور
ساحلوں سے عالمِ وحشت میں ٹکراتا ہوا — پتھروں کو پائے استغنا سے ٹھکراتا ہوا
جنگلوں میں آندھیوں سے گفتگو کرتا ہوا — بادلوں کے قہقہے کی جستجو کرتا ہوا
چلچلاتی دھوپ کے ناز و ادا سہتا ہوا — تلملا کر مضطرب انداز میں بہتا ہوا
چاندنی راتوں کے جلووں پر فدا ہوتا ہوا — شمع رو تاروں کی محفل میں فنا ہوتا ہوا
صبح کے پُرنور جلووں کی ضیا سے فیضیاب — شام کے خمخانۂ رنگیں کا سرمست و خراب
سبزہ زاروں کی حسیں زلفوں کو سلجھاتا ہوا — بے خودی کے کیف میں ہنستا ہوا گاتا ہوا
اپنی رگ رگ میں چھپائے زندگی کی کائنات — کامیابی سے کئے جاتا ہے طے راہِ حیات
شورشِ ہستی سے مِل سکتا نہیں کیفِ جمود — اضطرابِ زیست کا پیکر ہے دریا کا وجود

قطعات

رواں ہے شوق کا بجرہ سنہری جوئباروں میں — بہا جاتا ہوں نورانی امنگوں کے خماروں میں
فضائے زندگی پر حُسن کا سیلاب حاوی ہے — گھرا ہوں ماہ طلعت آرزوؤں کی بہاروں میں

دیگر

ہمہ تن پائے شکستہ ہمہ تن یاس ہوں میں — کس قدر روح شکن وحشت کی تنہائی ہے
چاندنی رات ہے ویرانہ ہے اور یادِ وطن — واہ کیا غمکدۂ دل میں بہار آئی ہے

عدیل

عدیل - خواجہ وحید الدین خاں۔ تفصیلی حالات دریافت نہ ہو سکے۔ کلام ذیل نذر احباب ہے۔

خدا کے سامنے پرسش کیوقت رو رو کر
نہ روئیں نالۂ بلبل کو سن کے کیوں اے دل

گناہ دھوئینگے اس چشم اشکبار سے ہم
پھنکے ہوئے ہیں بہت عشق گلعذار سے ہم

عدیل

عدیل - سید محمد عسکری کنتوروی جناب حبیب کنتوروی کے برادر خورد ہیں اور انھیں سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ ہیئت ہندسہ ریاضی وغیرہ حیدر آباد کے مدرسہ تعلیم المعلمین میں پڑھا۔ اس وقت سرکار نظام میں پولیس انسپکٹر ہیں بہت طبیعت دار شاعر ہیں مضمون اچھے پیدا کرتے ہیں۔ زبان کی صفائی کی طرف توجہ کم مگر خلاف محاورہ شعر نہیں کہتے۔ فراہم شدہ کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

ہو رہا کس طرح کیونکر چین پائے عندلیب
ہے ازل سے موج گل زنجیر پائے عندلیب

کیا انقلاب دہر کا ڈر اہل وضع کو
بدلا کسی ہوا سے نہ گل کی قبا کا رنگ

چہرہ اُداس حال پریشان دل نڈھال
بگڑا ہوا ہے آج ترے مبتلا کا رنگ

آئی اگر ہنسی بھی تو آنسو ٹپک پڑے
مدت سے ہے یہی دل درد آشنا کا رنگ

دن رات منتظر ہوں قیامت کا اس لئے
شاید ہو اُس میں بھی کوئی تیری ادا کا رنگ

گر کام لیں کبھی دل صبر آزما سے ہم
تیری جفا کو صاف بدل دیں وفا سے ہم

دیر و حرم کا پردۂ اسرار ایک ہے
عشق صنم میں پھر نہیں سکتے خدا سے ہم

یہ خاکساریاں یہ وفا یادگار ہے
آنکھوں کو مل رہے ہیں ترے نقش پا سے ہم

نہیں ہیں جوہر اصلی نمایاں تیغ قاتل میں
ہماری سخت جانی نقش ہے فولاد کے دل میں

کیا جانے اور کیا ہو پھر قتل گاہ میں
ہم تو شہید ہو گئے پہلی نگاہ میں

امید مغفرت نے کیا دل کو مطمئن
رحمت تری شریک ہے میرے گناہ میں

غش آیا جس سے طور پہ موسیٰ کو اے عدیل
سرگذشت اپنی بیاں کی ہے مگر ڈرتا ہوں

جلوہ ہے اُس جمال کا میری نگاہ میں
کل نہ یہ بھی کہیں مجنوں کا فسانہ ہو جائے

کیمیا ہوتی ہے اربابِ خرد کی صحبت
کام لو خلق و مروّت سے اگر دنیا میں

چار دن بیٹھے تو نادان بھی دانا ہو جائے
دوست بن جائے عدو غیر یگانہ ہو جائے

عراقی۔ ولی دکنی کے معاصرین میں سے تھے۔ نام نہ معلوم ہو سکا۔ ایک شعر عراقی کا یہ ہے:۔

جس کے نیَن جاری نہیں سو دل سرا ویران ہے
معمور ہو کیونکر بسے جس گاؤں بیچ پانی نہیں

عرش:۔ ضمیر الدین احمد صاحب شاگرد جناب تسلیم لکھنوی۔

جی ہی تو ہے اپنا جسے چاہا اُسے چاہا
دل ہی تو ہے ظالم جدھر آیا اُدھر آیا

خوب برہم کیا ہے کام مرا
بے خودی اب تو لے سلام مرا
پختگی میں بھی اپنی خامی تھی
عشق تھا اک خیال خام مرا
عرش کیونکر نہ قدر قیس کروں
عاشقی میں ہے وہ امام مرا

صورت تصویر ہم ذوق بیاں رکھتے نہیں
منہ تو رکھتے ہیں مگر منہ میں زباں رکھتے نہیں

وہ چمن اپنا نہیں جس میں کہ ہو خوف خزاں
جس کو بجلی پھونک دے وہ آشیاں رکھتے نہیں

عرش:۔ منشی محمد احتشام حسین دہلوی تلمیذ جناب جلال لکھنوی شگفتہ طبع فصیح البیان تھے۔ روزمرہ بہت صاف ہے۔ مضمون آفرینی کلام میں موجود ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

مجھ سے بل تیرے وہ اے گیسوؤں والے نہ گئے
پیار سے ہاتھ گلے میں کبھی ڈالے نہ گئے

زندگی بھر ترے کوچے میں رہے مر کے گئے
ہم وہ آدم ہیں کہ جنت سے نکالے نہ گئے

وہ ہیں دید کے مشتاق تھے کتنے ان کے
جاتے جاتے بھی تو قبروں کی دعا لے نہ گئے

مر گئے جب تو یہ دیکھا کہ جنازے اُٹھے
اُٹھ کے کوچے سے ترے چاہنے والے نہ گئے

عرشی:۔ جناب امتیاز علی خاں صاحب ولد ڈاکٹر ممتاز علی خاں ۱۹۰۴ء میں بمقام

پیدا ہوئے۔ ابتداءً عربی و فارسی کی ضروری تعلیم حاصل کی۔ بعد کو انگریزی پڑھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں شعر و شاعری سے شوق تھا۔ چند غزلیں اور نظمیں لکھی تھیں جو کلام موصول ہوا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے۔

تمکینِ عز و ناز سے اُٹھتی نہیں نگاہ
پہلی سی اب وہ لذتِ دردِ جگر کہاں
تھا مشغلہ کبھی دلِ ایذا پسند کا
اب چاشنیِ کاوشِ زخمِ جگر کہاں
معلوم ہیں بتوں کی تغافل شعاریاں
اب انتظارِ وعدۂ شام و سحر کہاں
مانا کہ جذبِ دل ہے ذریعہ وصال کا
لیکن مجھے دماغِ نیاز اثر کہاں

اللہ رے نزاکتِ حسن و جمالِ دوست
اب روز و شب تلاشِ درِ چارہ گر کہاں

شوریدگی عشق کا ذمہ لئے ہوئے
آ۔ ساتھ اپنے حسن کی دنیا لئے ہوئے
صہبائے بیخودی سے تہی جامِ زلیست ہے
آ۔ نرگسِ سیاہ کا مینا لئے ہوئے
ہونٹوں سے کوئی برقِ تبسم گرا کہ دل
مشتاق ہے متاعِ تمنا لئے ہوئے
تیری دلنشیں آنکھیں کاش دل میں رکھ لیتا
آہ انکھیں بہت کچھ دخل کاوشِ نظر میں ہے

عرشی: میر احمد حسین خلف مولوی اولاد حسن برادر کلاں امیر الامرا والاجاہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم شوہر شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ بھوپال۔ ۳۰ برس کی عمر میں حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جب بمقام بڑودہ ملک گجرات پہنچے یکایک عارضۂ اسہال میں انتقال فرمایا۔ سنِ رحلت ۱۲۷۶ھ ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے اور حضرت غالب سے مشورہ سخن کرتے۔ کلام فصیح و بلیغ ہے فضلا اور اہل اللہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ کلام جو کچھ دستیاب ہو سکا۔ اس کا انتخاب نذر ناظرین ہے

مغلوب ہیں سب اہلِ زباں میرے سخن سے
ہوں زلہ ربا غالب اعجاز رقم کا
اتنی ہی آرزو ہے ہمیں تجھ سے اے فلک
یہ انگلی اک نہیں بجھی ہووے جو ہاں نہ ہو
شعلہ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے
یوں تو پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

عرشی

عرشی - منشی سید محمد عبد الشکور صاحب ساکن ضلع پٹنہ شاگرد جناب شوق نیموی
کلام میں سوز اور لذت ہے۔ مضمون خوب پیدا کرتے ہیں۔ اور انداز بیان سے شعر کو
اور زیادہ لطیف بناتے ہیں۔ افسوس ہے کہ زیادہ کلام نہ مل سکا۔ تین شعر بطور نمونہ درج
ذیل ہیں۔

کچھ اور رنگ ہے قاتل کا ہمیرے ذبح کے بعد	کہ ایک ہاتھ جگر پر ہے ایک خنجر پر
جو مے کو کہتے ہیں واعظ حرام اے عرشی	قیامت آئے تو پوچھیں ہم ان سے کوثر پر
زاہدا ابھی کدورت دل نہیں صاف ہو	تھوڑی سی مے جو مانگ کے پی لے کلال سے

عروج - منشی عبد الکریم صاحب بریلوی تلمیذ حضرت داغ۔ طبیعت میں آمد زیادہ
ہے۔ شعر میں سلاست اور پاکیزگی ہوتی ہے۔ زبان بھی صاف اور شستہ ہے چند
اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

سختیاں جھیلے کہاں تک دل ہی کچھ پتھر نہیں	موت ہی آجائے یارب وہ اگر آتے نہیں
دل میں آجاتے ہیں اور آنکھوں میں پھر تے ہیں	بے تکلف مجھ سے ہیں پر شکل دکھلاتے نہیں
دل کو بہلاؤ ذرا اٹھو ہنسو بولو عروج	رنج و غم میں آدمیت سے گزر جاتے نہیں

عروج - مولانا عبد الحق کانپوری۔ شاگرد حضرت تجلی مرحوم ثانی۔ آپ عرصہ تک
مشن سکول کانپور میں پرشین ٹیچر رہے۔ حضرت ناسخ مغفور کے رنگ کلام کو بہت پسند
کرتے ہیں۔ اور خود بھی اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ شاعری کا بہت شوق ہے۔ اکثر
اپنے مکان پر بھی مشاعرہ کرتے ہیں۔ اپنے استاد سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ چنانچہ
ایک مقطع میں فرماتے ہیں۔ ؎

اپنے سخن میں فیض تجلی کا ہے عروج	حاصل فروغ خدمت استاد سے ہوا

آپ انداز قدیم کے دلدادہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نوادر کی مثالیں آپ کے
یہاں بکثرت موجود ہیں۔ آپ کی چند غزلیں ایک مختصر رسالہ کی صورت میں چھپ چکی ہیں

جس کا نام عشق کی چھیڑ چھاڑ رکھا ہے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

یہ منظر بھی رہیگا یادگار عالم فانی
لحد پر پھول رو رو کر چڑھائے شمع تربت نے

عقیدت کی کرشمہ سازیاں تھیں طور پر موسےٰ
پہنچ جاتے آستاں پہ بھی صبر سے کام لیجئے

گڑے جاتے ہیں ان رسوائیوں سے ہم تو مرقد میں
پھونکدے روح اک نئی قالب مست حال میں

اپنی نگاہ ناز تو ڈال نہ قلب غیر پر

آیا خیال اس بت کافر کا صبحدم
مانگی دعائے مرگ بہت کچھ شب فراق

اندھیرا چھا گیا جب حضرت موسیٰ کی آنکھوں میں

اہل نظر سے چھپ کے تو جائیگا حشر میں کہاں

ممکن ہے نام کے لئے باقی نشاں رہے

گو ہم کو بیخودی میں تھی افتادگی نصیب

کٹتے ہیں گر کے اشک ندامت یہ حشر میں

زنجیر تو اسیروں نے پہنی ہے شوق سے

دو گز زمیں کیواسطے رگڑی تھیں ایڑیاں

نظر بھر کر کسی کو دیکھ لینا اور مر جانا
وگرنہ اک ہنسی ہوتی کسی بیکس کا مر جانا

جسے تم جلوہ سمجھے تھے تمہارا نور ایماں تھا
کوچہ یار میں عروج کیجئے ہائے ہائے کیوں

گزرنے والے تربت پر تمہارا نام لیتے ہیں
گیسوئے مشک عنبریں عمر تری دراز ہو

اہل نظر کو چاہئیے صاحب امتیاز ہو

یارب غضب ہوا کہ نماز سحر گئی
آتی نہیں ہے ہجر میں کیا موت مر گئی

پکارا طور پر جلوہ کہ دیکھی روشنی میری
حسن ازل تو کس لئے آج نقاب پوش ہے

آہ رسا سے دب کے اگر آسماں رہے
تھامے ہوئے تجھے تو دل ناتواں رہے

وہ آرہی ہے رحمت غفار دیکھئے
ہوتی ہے اب یہ کس کو سزا اور دیکھئے

اک لاش ہے پڑی پس دیوار دیکھئے

عریاں ۔ میاں غلام محمد غوث سوائی خلف شاہ عالم خاں سوائی۔ جناب عریاں مدراس کے باشندے اور تجارت پیشہ تھے۔ نواب رؤف احمد خاں پرتو سے تلمذ تھا ۱۳۰۵ھ میں ان کا ایک مختصر سا دیوان مسمیٰ تیغ عریاں شائع ہوا تھا۔ اسکے چند سال بعد انتقال ہو گیا۔ کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ طبیعت موزوں پائی تھی۔ یہ بھی پایا جاتا ہے

عریاں

کہ ناسخ کے تتبع کی کوشش میں رہتے تھے۔ کلام بے نمک ہے۔ پھر بھی اب سے نصف صدی قبل مدراس میں رہ کر جو کچھ کہہ گئے غنیمت ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ہوا ہے جب سے سودا مجھ کو اس زلف پریشاں کا
مرے دست جنوں سے چاک ہے دامن بیاباں کا

تپ دوری لیلے نے بڑھائی سوزش مجنوں
بنے گا حال پتلا موم سے بھی سنگ طفلاں کا

ہے اثر کس کے خیال چہرہ پر نور کا
آہ آتشبار میں عالم ہے برق طور کا

قیامت میں خدا کے آگے لے کے دل
کسی کا ہاتھ ہے دامن کسی کا

کہنے لگے سب چاند نے کیا کھیت کیا ہے
آیا مہ تاباں جو سر شام ہمارا

قلقل مینا سے آتی ہے صدا گھنگرو کی آج
رقص ساقی بزم میں کرتا ہے جو طاؤس کا

پھر بہار آئی ہے پھر لطف چمن تازہ ہے
دل میں پھر جوش جنوں سلسلہ جنباں ہوگا

تھم تھم کے نہ کرتا ہو مرا ذکر وہ عریاں
رہ رہ کے جو ہوتا ہے مجھے درد جگر آج

لب رنگین جاناں کی ہوئے تاثیر رونے میں
تصدق ہوتے ہیں لعل یمن ہر قطرہ خوں پر

سر اٹھانا ظالموں کا ہے سیہ بختی کی شکل
وقت گل ہونے کے ہوتا ہے بہت روشن چراغ

گلرخان گلشن ہستی پہ آجاتا ہے دل
کب تلک سمجھائیں عریاں ایسے دیوانے کو ہم

صدمۂ ہجراں سہا جاتا نہیں
موت کا پیغام بھی آتا نہیں

یا رب یوں زمرۂ اغیار میں
جس طرح گل ہو ہجوم خار میں

ہیں کہ میرے دل پہ داغ کئی
اے گل تر خاک تھے گلزار میں

چڑھ گیا دیکھتے ہی نشۂ صہبا مجھ کو
مست کرتی ہے تری نرگس شہلا مجھ کو

زندگی کا ہے مزہ یار ہو جب یار کے پاس
بے ترے ایک سے جینا ہو کہ مرنا مجھ کو

کعبہ سے سروکار نہ مطلب ہے حرم سے
ہم اس بت بے پیر کے ہیں چاہنے والے

مرا بزم میں سن کے افسانۂ غم
پریشان ہوئے قصہ خواں کیسے کیسے

عزیز

عزیز قاضی عزیز الدین صاحب شاگرد و خلف قاضی ممتاز حسین صاحب ساکن

پہلی پھبت کلام میں سوا صفائی کے اور کوئی بات نہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

اب تو آنکھوں میں مری پھرتا ہی دن بھر کوئے یار
مرکے میں مل جاؤں زندوں میں اگر آجائے موت

ایک دن وہ تھے کہ میں پھرتا تھا کوئے یار میں
موت تو یہ ہے کہ جیتا ہوں فراق یار میں

عزیز

عزیز۔ نواب عبدالعزیز خاں خلف نواب محمد سعادت یار خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں بہادر والی روہیلکھنڈ عدالت دیوانی فرخ آباد میں وکالت کرتے تھے۔ عبدالملک ممتاز کے شاگرد تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ طبیعت دار اور ذی استعداد تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲۷۵ھ میں تذکرہ سخن شعرا کی تالیف کے وقت حیات تھے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

نظارہ جمال سے سرشار ہو گیا
مجھ کو شراب شربتِ دیدار ہو گیا

کرتے تھے دعا ہم ترے ملنے کی خدا سے
کعبہ میں صنم نام ترا وردِ زباں تھا

دیکھ جا اپنے مریضِ ہجر کو ہنگامِ نزع
عمر بھر کی ہے تلافی اک نگاہِ ناز میں

نملا خانہ دنیا میں تو آرام عزیز
آؤ اس گھر سے چلیں اور کوئی گھر دیکھیں

غضب ہے تو کہ تو نے اک ادا میں
جگہ کر لی دل ویر آشنا میں

عجب شیریں ہے آب تیغ قاتل
حلاوت یہ کہاں آبِ بقا میں

بیتا وکے جو دامِ محبت میں ہے اسیر
بلبل کو اب پسند قفس ہے چمن نہیں

روز و شب شورش و کاہش میں بسر کرتے ہیں
رشک داغوں سے مرے شمس و قمر کرتے ہیں

ادب سے خون رکا ہے گلوئے بسمل میں
کہ پڑ نہ جائے کہیں داغ تیغ قاتل میں

نیرنگ قیامت سے نہ ہو گی مجھے حسرت
میں ایسے تماشے تو بہت دیکھ چکا ہوں

رات فرقت کی بسر ہوتی نہیں
یا الٰہی کیوں سحر ہوتی نہیں

رات دن کعبہ ابرو ئے صنم دیکھتے ہیں
ہم تو بتخانے میں بھی سیر حرم دیکھتے ہیں

لئے پھرتی ہے اڑائے ہوئے صحرا صحرا
کیا ہوا ہے کہ بھری ہے سر سودائی میں

وہ ہدف مجھکو کرے یہ شوق میں تاثیر ہو
آہ حسرت کی جگہ سینہ میں ان کا تیر ہو

عزیز اپنے حریم دل کے ہم تو گرد پھرتے ہیں
رہے کعبہ مبارک شیخ کو کاشی برہمن کو

دیکھا جو عزیز اپنے دل صاف میں ہم نے
آیا وہ نظر جام جہاں بیں میں نہ جسم کو

سوا تیرے نہ کوئی یاد آئے آرزو یہ ہے
ستم وہ کر کہ ظالم بھول جاؤں جور گردوں کو

آمد یار سے خوش ہے دل نا تجربہ کار
نہیں واقف کہ قیامت دم رخصت ہوگی

دشت جنوں میں پاؤں ادب سے رکھے اے عزیز
پامال ہو نہ جائیں کہیں خار راہ کے

ہے میری آبلہ پائی سے دشت رشک چمن
نہیں گلوں میں وہ رنگت جو نوک خار میں ہے

فراق میں تو بجا پیچ و تاب ہوتا ہے
وصال یار میں کیوں اضطراب ہوتا ہے

یا خدا دل میں غم یار کی مہمانی ہے
شرم رکھ لے کہ بہت بے سروسامانی ہے

تم جو آجاؤ دلربائی پر
کون دل کو سنبھال سکتا ہے

عزیز

عزیز۔ منشی سید عبدالعزیز ناگپوری وکیل بھوپال۔ موزوں طبع اور پاکیزہ خیال شاعر ہیں۔ یہ چند اشعار نذر ناظرین ہیں۔

تری صورت پہ شیدا ہیں ہزاروں
ادا کر شکر صورت آفریں کا

شوخی کا جوانی میں یہ اصرار ہے ان سے
کھل کھیل کہ اب لطف نہیں شرم و حیا میں

کیونکر نہ مسخر دل عشاق ہوں ظالم
جادو ہے بلا کا تری ایک ایک ادا میں

نہیں کونین میں اس کا ٹھکانا
گرائیں وہ جسے اپنی نظر سے

عزیز

عزیز۔ اعزالدین عثمانی بدایونی۔ قدرت اللہ شوق اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ جوان سعادتمند اور ابھی طالب علم ہیں۔ آپ کی طبیعت موزوں ہے۔ اور تاریخ نکالنے میں مہارت کامل ہے۔ یہ ان کا کلام ہے۔

قطعہ

مجمع ہوتے ہی دے کے آئینہ
منہ لگا دیکھنے وہ کافر کیش

میں نے اُس دم کیا یہ اُس سے سوال	میں بھی دیدار پاؤں کچھ کم و بیش
کہنے لگا سنی نہیں یہ مثل	اولاً خویش بعدہٗ درویش

عزیز

عزیز۔ مولوی محمد عبدالعزیز دہلوی مہین پور مولانا امام بخش صہبائی۔ علمی استعداد معقول تھی۔ فن سخن میں اپنے پدر عالی قدر کے شاگرد تھے۔ ایام غدر میں ظفریاب لشکر کے ہاتھوں بے گناہ شہید ہوئے۔ طبیعت کا رنگ نرالا تھا۔ بہت پُرلطف اور دل میں اُتر جانے والے شعر کہتے تھے۔ خیالات میں باریکی ہے۔ زبان صاف ہے۔ بہم رسیدہ کلام کا انتخاب پیش احباب ہے۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا	جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
ہم عاشقوں کا بارگہ سے جھکے ہے سر	اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
نہیں ہے رحم و مروت جو تجھ میں خیر نہ ہو	ذرا خدا ہی کا کچھ تیرے دل میں ڈر ہوتا
جب معنی وحدت ہوئے ظاہر تو یہ جانا	یہ شیخ و برہمن میں جو جھگڑا تھا یہ نہیں تھا
کٹ کٹ کے خون آتا ہے آنکھوں سے بار بار	خنجر رکھا ہے پہلو میں میرے بجائے دل
بیقراری کا کیا سبب ہے عزیز	کہیں دل تو نہیں لگا بیٹھے

عزیز

عزیز۔ مرزا عزیز الدین گورگانی مرحوم از اولاد شاہ عالم ثانی۔ حضرت احسان مغفور سے تلمذ تھا۔ اچھے شاعر تھے۔ کلام میں ندرت ہے۔ اشعار ذیل میں ان کی فکر کا نمونہ ہیں۔

میں یہ حیران ہوں عزیز و آہ یہ کیا ہو گیا	بیٹھے بیٹھے عشق کا آزار کیسا ہو گیا
تو جو خنجر کو ادھر قاتل اٹھا کر رہ گیا	میں ادھر حسرت سے اپنا سر جھکا کر رہ گیا
کہوں ہمدم کیا کہ اس دل کے ہاتھوں	نہ تھا دیکھنا سو وہ لاچار دیکھا

عزیز

عزیز۔ عبدالعزیز رائٹر رہیلنج آفس شہر کلکتہ ولد منشی کرامت اللہ شاگرد النخ۔ کلکتہ میں تعلیم و تربیت پائی وہیں زیادہ قیام رہا۔ کلام میں مضمون آفرینی کو زیادہ دخل تھا۔ لطف زبان کو کم پسند کرتے تھے۔ پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ اوائل عمر میں صاحب دیوان

ہو گئے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

اُس شوخ پر جفا پہ کسی کا جو آئے دل
صدمہ ہزار لاکھ جفائیں اُٹھائے دل

ذرہ افشاں یہ نہیں ہیں زلفِ عنبر فام میں
تارے چھٹکے ہیں مقرر یہ سوادِ شام میں

کرتے ہیں یوں مریضِ محبت کا وہ علاج
دیتے ہیں زہر گھول کے مجھ کو دوا کے ساتھ

خواب میں ہمکنار دلبر تھا
مجھ کو ہے یہ جگا دیا کس نے

تعجب سب کو ہے اس فکر میں سارا زمانہ ہے
مہِ نو ابر میں ہے یا کہ اُن زلفوں میں شانہ ہے

آج سر خنجرِ بُراں سے جدا ہوتا ہے
مجھ پہ قاتل کا جو احساں تھا ادا ہوتا ہے

عزیز۔ پنڈت شام ناتھ صاحب خلف اکبر رائے صاحب پنڈت منوہر ناتھ صاحب زتشی دہلوی اکونٹنٹ محکمہ پبلک ورکس پنجاب۔ پنڈت صاحب موصوف فاضل اجل عالم اکمل پنڈت رام کشن صاحب بسمل مرحوم کے جو پرانی دہلی کالج میں ماسٹر تھے۔ نواسے تھے۔ علوم رسمیہ سے بخوبی ماہر تھے۔ بچپن سے فنِ سخن کا ذوق اور شعر گوئی کا شوق تھا۔ خلق و مروت و شرافت و زندہ دلی میں فرد تھے۔ افسوس کہ عالم شباب میں بعمر ۲۳ سال انتقال کیا۔ کلام میں سادگی تھی تصنع سے بہت دور تھے۔ روزمرہ زیادہ لکھتے تھے۔ یہ کلام ہے۔

دلبر تو ہم نے مانا ادھر سے نکل گیا
پہلو سے دل بتاؤ کدھر سے نکل گیا

غنچۂ دل مرا کھلاتا جا
شکل بہر خدا دکھاتا جا

عزم رخصت اگر مصمم ہے
مجھکو راہ عدم بتاتا جا

ہائے تجھ بن نہیں ہے کل پڑتی
جار یہ جھگڑا اگر چکاتا جا

بیکلی ہے عزیز کو پیارے
اس کی تدبیر کچھ بتاتا جا

آنکھ گو مست ہے بدمستوں کی
نیک باطن میں تو ہویدا رہے دل

گئی افسوس جوانی تنہی برباد عزیز
کچھ نہ سمجھے کہ یہ افتادہ مصیبت کیا ہے

عزیز۔ مرزا یوسف علی خاں المخاطب بہ سراج الشعرا سلطان الذاکرین اصلی وطن بنارس

تھا۔ مگر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرزا غالب کے عزیز و تلمیذ تھے۔ مرثیہ گوئی کا بڑا شوق تھا۔ انیس اور دبیر کے مرثیوں میں اکثر جگہ جا و بیجا غلطیاں نکالی تھیں۔ عرصہ دراز تک حضرت غالب کی خدمت میں رہے انہیں کے توسط سے قلعہ میں رسائی ہوئی۔ احترام الدولہ حاذق الزمان حکیم احسن اللہ خاں صاحب ثابت جنگ نے حضرت بہادر شاہ سے بہ نذر مرثیہ و قصیدہ خلعت چارپارچہ معہ گوشوارہ و خطاب سراج الشعرا سلطان الذاکرین دلوایا تھا۔ یہاں ان کے متعلق ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قصۂ شہزادہ ممتاز کو فارسی سے زبان سلیس اردو میں سید ظہیر الدین حسین صاحب ظہیر دہلوی نے بفرمائش حکیم صاحب موصوف ترجمہ کیا تھا۔ جس کے صلہ میں شاہ دہلی نے خطاب و خلعت عنایت فرمایا تھا۔ اتفاق سے وہ قصہ حکیم صاحب سے بندائل عطار چھاپنے کے لئے لے آئے اور مرزا صاحب کے حوالہ کیا کہ روزمرہ درست کر دیں ۳۵ روپیہ اجرت کے ٹھہرے۔ حضرت نے قصہ مذکور کو گھر لیجا کر جا و بیجا خوب اصلاح کی جب اپنے زعم میں عیوب و نقائص سے پاک کر چکے لالہ صاحب کو دے آئے۔ ان سے لیکر جناب ظہیر نے بھی ملاحظہ کیا۔ اور ایک کاغذ پر جو جو غلطیاں سمجھکر مرزا صاحب نے اصلاح دی تھی اس کو اور اپنے ترجمے کو بطور محضر لکھ کر فصحا و بلغائے دہلی کو دکھایا۔ از راہ اتفاق سب نے میر صاحب کے محاورات کو درست و صحیح قرار دیا۔ اب میر صاحب کا ارادہ ہوا کہ بذریعہ اخبار و خطوط اہل لکھنؤ سے اس کی تصدیق کرائیں۔ مرزا عزیز نے جو سنا فوراً ان کے پاس آئے اور منت کہا کہ میں غریب آدمی ہوں۔ جو کچھ ہوا از راہ ضرورت ہوا۔ آپ معاف فرمائیں۔ میر صاحب نے مروت کی رو سے درگذر کی اور وہ محضر چاک کر ڈالا قصہ مختصر ان کے مزاج میں کسی قدر مراق تھا۔ بڑے پُرگو تھے۔ آخر عمر میں بتلاش روزگار بھوپال گئے وہیں ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کے شاگردوں میں سیف الحق ادیب مرحوم وہ شاگرد تھے۔ کہ جن کو فخر استاد کہا جائے تو بجا ہے۔ غزلخوانی کا ڈھنگ بہت اچھا تھا

کلام میں رنگینی تھی شعر میں بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام بہت ہی کم مل سکا۔ جو کچھ دستیاب ہوا نذر ناظرین ہے۔

بد طالعی سے نیک نہ ہوگا مآل کار
بگڑی میں کوئی کام بنایا نہ جائے گا

کہتی ہیں ہم سے جائیگی معشوق کی صفت
گر تم کو بیگناہ ستایا نہ جائے گا

نقش وفا اگرچہ خداداد کیوں نہ ہو
لیکن دل صنم میں جمایا نہ جائے گا

کیا کہوں کوچہ قاتل میں کیا کیا جا کر
ہمنشیں خاک میں ملنا تھا مجھے مل آیا

باغ میں سنکر غزلخوانی مری
بلبل شیدا ہے دیوانی مری

ہوگئے شوق کوسے یار میں خاک
یہ نہ دیکھا ہوا کدھر کی ہے

عزیز۔ جناب محمد یوسف حسین صاحب حنفی شاگرد جناب داغ دہلوی شگفتہ طبع اور پاکیزہ بیان شاعر ہیں۔ اپنے استاد کے پیتو پر چلتے ہیں طبیعت میں آمد کے باعث رنگینی ہے۔ استعارہ اور تشبیہات کی خاردار جھاڑیوں سے حتی الامکان اپنا دامن بچاتے ہیں شعر صاف کہتے ہیں۔ اور صفائی کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو کچھ کلام ان کا مل سکا پیش احباب ہے۔

آج پھر وصل کی شب ذکر عدو کا نکلا
پھر وہی قصہ چھڑا پھر وہی جھگڑا نکلا

مل گئے خاک میں ہم خاک بھی برباد ہوئی
لیجئے اب تو غبار آپ کے دل کا نکلا

تو تو کہتا تھا کہ دل میں نے چرایا ہی نہیں
ارے او شعبدہ گر دیکھ یہ اب کیا نکلا

سختیاں ہجر کی کھینچیں تو مجھے قدر ہوئی
ملک الموت مرا چاہنے والا نکلا

جگر کے ساتھ نہ اڑجائے دل بھی تیروں سے
ذرا خدا کے لئے دیکھ بھال کر دیکھو

مری وفا کا مرے شوق کا تمنا کا
یقین نہ آئے تو تم امتحان کر دیکھو

برا نہ مانو تو اک بات ہم کہیں تم سے
بروں کے ساتھ کوئی دن بھلائی کر دیکھو

جب چلا چھوڑ کر مجھے بسمل۔
ہنس دئے زخم منہ پہ قاتل کے

عزیز

عزیز:۔ منشی مہاراج سنگھ مرحوم دہلوی شاگرد شاہ نصیر دہلوی قوم کایستھ۔ آپ نے اپنے استاد مرحوم کا پراگندہ کلام بڑی محنت سے جمع کرکے کلیات قریب ۱۰۰ اجزو کے مرتب کیا تھا۔ ایام غدر میں قضا کی خود صاحب دیوان تھے۔ اپنے زمانہ کے اعتبار سے اچھے شاعر تھے۔ دیوان ان کا اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ جو دو چار شعر مختلف بیاضوں سے ہاتھ لگے درج ذیل ہیں:۔

ہوا نہ صاف وہ آئینہ رو کبھی ہم سے	سدا ہماری طرف سے اُسے غبار رہا
جام مے گلرنگ سے واقف نہیں ساقی	غنچہ کی طرح پیتے ہیں خون جگر اپنا
لیکے نقد دل کبھی جو ایک بوسہ بھی نہ دے	اے عزیز اُس مفت بر سے کس طرح سودا بنے
ضعف سے ہر رگ تن جس کی ہو تار بستر	کیونکہ وہ بستر بیماری سے اُٹھے بیٹھے

عزیز

عزیز:۔ جناب حافظ عبدالعلی صاحب ولد شیخ محمد جان صاحب۔ آپ کے آبا و اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ آپ ۱۸۸۱ء میں بمقام محلہ یحییٰ گنج شہر لکھنؤ پیدا ہوئے جب آپکی عمر نو برس کی تھی آپ اپنے والدین کے ساتھ کانپور میں قیام پذیر ہوئے۔ سب سے پہلے آپ نے حافظ ناصر خاں صاحب سے کلام مجید حفظ کیا۔ اُس کے بعد فارسی عبدالحق صاحب سے فن تجوید حاصل کر کے جناب حکیم محمود الحق صاحب سے فارسی پڑھتے رہے۔ اس وقت جناب عزیز مسجد محمد تقی میں امام ہیں۔ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۸۹۷ء میں آپ نے حضرت اطہر کانپوری سے تلمذ اختیار کیا۔ جناب قضا و قدر نے استاد کا سایہ سر سے اُٹھا لیا تو کچھ عرصے آپ نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ مگر احباب کے کہنے سننے سے پھر شعر کہنے لگے۔ اس زمانہ میں حضرت حکیم ناطق لکھنؤی کانپور تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک مشاعرہ میں شرکت ہوئی۔ آپ نے جناب ناطق کا کلام سنا اور باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ اس وقت سے آپ اپنا بہت وقت جناب ناطق کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔ آپ کی زبان شستہ ہے اور تخئیل پاکیزہ مولانا ناطق کے شاگردوں میں آپ کا درجہ ممتاز ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

چاہیئے حفظِ مراتب کو نہ رسوا کرنا
ورنہ دشوار نہ تھا قطرہ کو دریا کرنا

ہمتِ جوشِ جنوں کا یہ تقاضا ہے عزیز
خاک میں مل کے ہر اک ذرّے کو صحرا کرنا

جلوہ رنگیں میں اسکے سب کی نظریں غرق ہیں
دیکھنے والا ہے کون اب مجھ گریباں چاک کا

لے چل آبادی سے اب اے عشق ویرانے کی سمت
دیکھ لوں رُخ دُوسرا دنیائے وحشت ناک کا

امتحانِ ضبط اگر دنیا نہ ہوتا اے عزیز
روک دیتا دور ابھی میں گردشِ افلاک کا

بڑھتا آتا ہوں تصور جس قدر میں چشمِ قاتل کا
ہوا جاتا ہے گہرا زخم اتنا ہی میرے دل کا

ضعف سے نالہ مرے سینے میں رک کر رہ گیا
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے گویا دل میں نشتر رہ گیا

مفہوم تم سمجھ نہ سکے ایک لفظ کا
کیا مدعائے دل کوئی قدرت کا راز تھا

نہ الجھو دامنِ صیاد سے تم اے کانٹو
چمن میں اتنی ہی دن میرا آب و دانہ تھا

امتیاز رند و زاہد بادۂ غم میں نہیں
سب کو پینا ہی پڑے جب دور میں جام آگیا

قطرہ قطرہ جوش میں جامِ شراب
ذرہ ذرہ میکدہ کا آفتاب

عشق کا جو نقطہ ہے وہ ناپسند
حسن کا جو نقطہ ہے وہ انتخاب

لیکے آیا ہوں حیاتِ بے سکوں
میری ہستی کیا ہے شرحِ اضطراب

ہر نفس ہے روح فرسا اے عزیز
زندگی کا موت کیا دیگی جواب

تو بھی تو دیکھ ذرا جذبِ نگہ کی تاثیر
دل تو میں دیکھ رہا ہوں ترے پیکاں کے قریب

ہم نفس ایک نہ اک ہم کو بھی مل جانا ہے
شمع رکھ لی ہے جلا کر دلِ سوزاں کے قریب

گو اس کا شکوہ کرنے آیا ہے دم لبوں پہ
لیکن زبان میری خاموش ہے دہن میں

ہم کو تقسیمِ غمِ عشق کی منظور نہیں
اپنے صدمات کا تنہا ہی اثر لیتے ہیں

عہدِ فلاک میں جان غنیمت قفس کو تو
اب اس کو بھول جا کہ مرا آشیاں نہیں

صیاد کی نگاہ میں اللہ ری کشش
پھر میں پلٹ کے جا نہ سکا آشیانے میں

میرا سکوت کیا ہے شرحِ غم نہاں ہے
دل کی کدورتوں نے دھندلا کیا ہے اس کو
ہر گوشۂ فضا میں تنکے پہونچ رہے ہیں۔

کہنے کو لفظ ہے اک سمجھو تو داستاں ہے
انسان کی ورنہ ہستی آئینہ جہاں ہے
آزاد میرے بدلے اب میرا آشیاں ہے

پُر اثر حادثے زمانے کے
جلتے ہیں راستے زمانے کے
دیکھ لو مجھ کو دیکھنا ہوں اگر
رونا آتا ہے رو نہیں سکتے
اس نے بھی پھیر لی نگاہ عزیزؔ

واقعے ہیں مرے فسانے کے
رہنما ہیں اُس آستانے کے
انقلابات اس زمانے کے
یہ نتیجے ہیں دل لگانے کے
اب تو قائل ہوئے زمانے کے

سامنے اُن کے نہ ذکر عشق آنا چاہئے
کوئی دیکھے تو تجلی اس کی ہر محفل میں ہے
جز غم کے مسرت کا یہاں کام نہیں ہے
لگا کے حسن سے لو روح تن میں آئی ہے
ذرا جی بھر کے تجھ کو دیکھ لوں اے صبح کے تارے
آگئی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
آرہا ہے کوئی شاید لے سوادِ شامِ غم
میری مرگ و زیست کیسی کشمکش میں پڑ گئی

یہ مرض اپنے معالج سے چھپانا چاہئے
روشنی ہر آنکھ میں ہے نور ہر اک دل میں ہے
یہ دل ہے مرا انجمن عام نہیں ہے
یہ شمع جلنے کو اس انجمن میں آئی ہے
کہ اک تو ہی مرے ڈوبے ہوئے دل کی نشانی ہے
بس بس لے کہ یہیں تک سرحد تاثیر ہے
دیکھتا ہوں میں کہ اب تارے ضیا دینے لگے
یہ دعا کا وقت تھا اور تم دوا دینے لگے

عزیزؔ۔ شاہ عزیز اللہ۔ عہد قدیم کے سخن سنج تھے۔ جن کے حالات پردۂ راز میں ہیں۔ تذکرہ چمنستان شعرا سے یہ دو شعر نقل کئے جاتے ہیں :۔

ڈرتا نہیں ہوں نوک کٹاری کے زخم سے
کان نمک ہوا ہوں ترا حسن سبز دیکھ

بانکی نگاہ دیکھ تری ہل گیا ہوں میں۔
لو فی برہ کی جب سے لگی گل گیا ہوں میں

عزیزؔ۔ محمد عزیز الحق ہاشمی ساکن محلہ کمھرار عظیم آباد خلف مولوی شیخ اکرام الحق مرحوم

عمر تخمیناً ۵۵ یا ۵۶ سال ہوگی۔ استعداد علمی معقول ہے۔ آپ ایک عالی خاندان رئیس ہیں۔ شعر و سخن سے بہت دلچسپی ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی دخل ہے۔ مولانا شاد عظیم آبادی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

عجب کیا صبح کو شکوہ کرے نرگس جو سوسن سے
نہ نکلنے پائیں آنکھیں رات بھر بلبل کے شیون سے

تنِ خاکی کو میری روح نے آخر گرا چھوڑا
خدا کا شکر ہے یہ بوجھ اترا میری گردن سے

ہیں آنکھیں کوچۂ جاناں کی خوگر کب بہلتی ہیں
بہار ارغواں و لالہ و نسرین و سوسن سے

مرا مشرب ہے رندانہ مرا ایمان خالص ہے
ملا کرتا ہوں یکساں بے خلش شیخ و برہمن سے

نہ چھوڑا اپنا پیچھا بعد مردن وحشتِ دل نے
ہماری خاک بھی لپٹی رہی صحرا کے دامن سے

عدو مرنے پہ بھی دل کے دکھانے سے نہ باز آیا
بہت رویا عزیزؔ اک دن جو گزرا اسکے مدفن سے

عزیزؔ۔ جناب مرزا محمد ہادی لکھنوی۔ ابن مولانا مرزا محمد علی مؤلف نجوم السما۔ ابن مرزا صادق علی۔ پانچ چھ پشت تک ان کے بزرگ کشمیر میں سکونت پذیر تھے۔ وہاں سے ہندوستان آئے۔ اور لکھنؤ کو اپنا مستقر قرار دیا۔ کہتے ہیں۔ کہ حضرت عزیزؔ کا سلسلۂ نسب سادات کرام سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان علمی مذاق سے بہرہ ور تھا۔ آپ کے اساتذہ کی ذیل میں مولانا سید محمد صاحب۔ علامہ مفتی محمد عباس صاحب شوستری اور مولانا سید حامد حسین جیسے بزرگوں کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی حکیم محمد مہدی صاحب لکھنؤ کے بہترین طبیبوں میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت عزیزؔ کی ولادت ۵ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء ہوئی۔ اور ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کو انتقال ہوا۔

بچپن ہی میں والد کا سایہ عزیزؔ مرحوم کے سر سے اٹھ گیا اور تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ ماجدہ کے ذمہ آپڑا۔ اس بزرگ خاتون کی تربیت و پرداخت اور جناب عزیزؔ کی ذہانت اور فطانت ان سب نے مل ملاکر عزیزؔ کو فرد کامل بنادیا۔ شاعری

کا جوہر جو قدرت سے ودیعت ہوا تھا۔ ان کو کمال پر لے اُڑا۔ زمانہ اہلِ کمال کا دوست نہیں بنتا۔ عزیز مرحوم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ابتدا میں لکھنؤ کے ممتاز و مخیر رئیس مرزا بہادر عباس علی خاں مرحوم نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ اور معتمد و حاشیہ نشین بھی جب تک مرزا بہادر زندہ رہے۔ عزیز مرحوم دنیا کی فکروں سے بے نیاز ہو کر اپنے ذوق کی تکمیل میں مصروف رہے۔ اس زمانہ کو عزیز کی شاعری کے شباب کا عہد کہنا چاہیئے۔ مرزا بہادر کے بعد عزیز مرحوم کو اسباب معیشت بہم پہنچانے کی فکر ہوئی اور امین آباد ہائی سکول میں فارسی کی مدرسی کرنی پڑی۔ تیرہ چودہ برس تک یہ سلسلہ رہا۔ ابھی سکول ہی میں تھے۔ کہ صحت جسمانی نے جواب دے دیا۔ اور مختلف شکایتوں نے آگھیرا آخر اس ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ بہت مدت نہیں گزری کہ مہاراجہ محمود آباد یعنی راجہ سر علی محمد خاں صاحب مرحوم نے جوہر شناسی سے کام لے کر عزیز مرحوم کو اپنے ولیعہد خان بہادر راجہ امیر احمد خاں صاحب کا نگراں مقرر کر دیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کو کتب خانے کی خدمت سپرد ہو گئی۔ جس پر وہ اخیر دم تک مامور رہے

راقم السطور کے مشاہدے کے مطابق عزیز مرحوم نے نہایت سلجھی ہوئی اور خاموش طبیعت پائی تھی۔ ان میں خودداری کمال درجہ کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تمکین کی جھلکی ان کے کردار میں ضرور تھی راقم کے مہربان حکیم آشفتہ صاحب لکھتے ہیں "چونکہ شعرا فطرتاً ذکی الحس اور نازک مزاج ہوتے ہیں۔ اسلئے ایک حد تک ان میں نازک مزاجی ضرور تھی۔ جو خودداری کے ساتھ ملکر کبھی غرور اور تکبر کا دھوکا دیتی تھی" مرحوم کے مزاج کی یہ تشخیص حکیم صاحب موصوف نے درست کی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہوگی اس ہنگامہ آرائی کی جس کا ہدف بعض حضرات نے عزیز مرحوم کو بنایا۔

عزیز مرحوم کا پایہ اردو شاعری اور ادب میں اعلےٰ تھا۔ ادب کی اشاعت اور مذاقِ عامہ کی اصلاح میں آپ ہمیشہ ساعی رہے۔ لکھنؤ میں شعرا کی ایک نئی اور

نوجوان جماعت آپ ہی کے دم سے قائم ہوئی۔ جو اب عنفوانِ شباب کی معصوم شوخیوں کے چکر سے نکل کر متانت کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔ جناب عزیز مرحوم رسالہ معیار کے بانیوں میں تھے۔ جس نے اپنے وقت میں خوب نام پایا۔ آپ کی نثر کے نمونے بھی کہیں کہیں اسی میں ملتے ہیں۔ ادبی یا تخیلی نظمیں آپ نے بہت کم کہیں۔ زیادہ تر نظمیں اعتقادی یا منقبت کی نوعیت رکھتی ہیں۔ ایسی نظموں کا ایک مجموعہ طبع ہو چکا ہے اس کے سوا غزلیات کا ایک مجموعہ گلکدہ کے نام سے ۱۹۱۸ء میں مطبع نول کشور کا چھپا ہوا شائع ہو چکا ہے۔ عزیز مرحوم مکرمی جناب صفی کے ارشد تلامذہ تھے۔ خود عزیز کے شاگرد اس وقت اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسے بابو جگت موہن لال رواں مرحوم۔ مرزا جعفر علی خاں اثر۔ جناب شبیر حسن خاں جوش۔ حکیم سید علی صاحب آشفتہ۔ طاہر مرحوم۔ ان حضرات کے علاوہ اور بہت سے خوشگو اصحاب ہیں جو بجائے خود ایک ادارہ ادب کا حکم رکھتے ہیں۔ شعر الہند کے اس اقتباس کے ساتھ اس تذکرہ کو ختم کیا جاتا ہے۔" بالآخر لکھنؤ بھی اس رنگ سے متاثر ہوا۔ اور وہاں کے شعرا میں چند لوگوں نے اس رنگ میں سخن گستری شروع کی۔ چنانچہ عزیز لکھنوی جو اس گروہ کے پیشرو ہیں کہتے ہیں۔

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس رنگ میں عزیز
کچھ لوگ اور شہر میں ہیں اک ہمیں نہیں

لیکن ان لوگوں میں عام طور پر عزیز لکھنوی سب سے زیادہ مشہور ہیں اور ان کا کلام اوّل سے آخر تک دلّی کے رنگ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔"

راقم الحروف کو اس رائے سے اتفاق ہے۔ اختلاف صرف پیشرو ہی کے بارے میں ہے۔ جس کا ذکر حضرت ثاقب کے حال میں آچکا ہے۔ اب جناب عزیز کے کلام فصاحت نظام سے استفادہ کیجئے۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

یوہیں گھٹ گھٹ کے مٹ گیا آخر
عقدۂ دل کسی سے وا نہ ہوا

عشق ہے اک طلسم راز بقا
مٹ گیا دل مگر فنا نہ ہوا

ہجوم شوق کا بس قصۂ مختصر یہ ہے
کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

آگے خدا کو علم ہے کیا جانے کیا ہوا
بس انکے رخ سے یاد ہے اٹھنا نقاب کا

لکھا ہے خط میں عذرِ ستم اُس نے اے عزیزؔ
اب کیا جواب دے کوئی اس کے جواب کا

ہے محبت کی نظر میں کیا مزا خود دیکھ لو
چار آنکھیں جب ہوئیں تم کو حجاب آ ہی گیا

حقارت سے نہ دیکھو ساکنانِ خاک کی بستی
کہ اک دنیا ہے ہر ذرہ ان اجزائے پریشاں کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیران ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زندان ہونا

الحذر گور غریباں کی ڈراونی راتیں
اور وہ اُن کے گھنے بال پریشان ہونا

ہوگا اک وقت میں یہ واقعہ تاریخی
یاد رکھنا مرے کاشانہ کا ویران ہونا

وہ محویت رہی طاری رہا کچھ ایسے عالم میں
نہ شامِ غم کو پہچانا نہ اندازِ سحر جانا

یہ مختصر سی ہے میری سوانح عمری
ہمیشہ وقف ستمہائے روزگار رہا

ہے فنا آموز ہر اک خط تری تحریر کا
رنگ اُڑتا کہہ رہا ہے پیکرِ تصویر کا

دل ہوئے جاتے ہیں ٹکڑے دیکھنے والوں کے بھی
کم نہیں شمشیر سے زخم آپ کی تصویر کا

شمع بجھکر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

دیکھ لی دنیا چلو شہرِ خموشاں اے عزیزؔ
قابلِ دید اک یہی دلچسپ منظر رہ گیا

میرا قصہ ہے جدا اس کا ہے افسانہ جدا
گو کہ ہے پاس مگر ہے دلِ دیوانہ جدا

ربط دیرینہ سے باقی ہے تعلق پھر بھی
لاکھ کعبے سے بنائے کوئی بتخانہ جدا

کیا فائدہ ہے عرض ہنر سے عزیزؔ اب
جب امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

عزیزؔ اب کونسا وقت آ گیا کیا ہونے والا ہے
کہ وہ خود پوچھتے ہیں حال آ کر دم بدم میرا

مریضِ ہجر کو تم زہر دینا یا دوا دینا
مگر بالیں سے دم بھر چارہ سازو تم کو ہٹا دینا

رک جائے بات بات پہ جس ناتواں کی سانس
ایسے مریضِ غم کا بھلا اعتبار کیا

پر اسکون موت ترا اضطراب زیست
تجکو قرار آ گئے دلِ بیقرار کیا

پیدا وہ بات کر کہ تجھے روئیں دوسرے
رونا خود اپنے حال پہ یہ زار زار کیا

یہ کھٹکے لگائی ہے کسی شوخ نے ٹھوکر
دیکھوں تو کوئی قبر سے کیونکر نہ اُٹھے گا

آبلہ پہلے پڑا پھر زخم اُس کے بعد داغ
مختصر یہ ہے یونہیں سب دل ہمارا جل گیا

اپنی حد سے سوزِ دل اب بڑھ گیا
آخری درجہ تھا پارہ چڑھ گیا

عزیز قابلِ عبرت یہ ناتوانی ہے
اب اپنا حال بھی ہم سے بیان نہیں ہوتا

افشائے رازِ عشق سے کیا فائدہ ملا
میں خود تمہاری بزم میں صورتِ سوال تھا

وہ خود اسیرِ حلقۂ دامِ نمود تھا
کیا دلفریب نقشِ طلسمِ وجود تھا

آہوں نے مری زلفِ شکن در شکن بنی
آرائشِ جمال کا سرمایہ دود تھا

ابرِ آزاد زمانہ کو مقید نہ کرو
کون اشعار میں پابندِ قوافی ہوگا

دلمیں کیوں پائی جگہ اور لب تک آیا کس لئے
آہ وہ نالہ کہ جو تاثیر سے بیگانہ تھا

تھی جس کے دم سے کیفیتِ لذتِ نشاط
مدت ہوئی عزیز کہ وہ دل ہی کھو گیا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں
مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا

شرحِ اس راز کی پوچھے کوئی میرے دل سے
چار ہوتی ہیں محبت میں نگاہیں کیونکر

ہُو کا عالم اور بھیانک رات اور وہ بیکسی
جل گیا دل عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر

پتھرا کے رہ نہ جائیں یہ آنکھیں مری کہیں
روتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

زندہ رہنے کی ہمیں راہ بتا جاتے ہیں
جاتے جاتے وہ کوئی بات بنا جاتے ہیں

کوئی مریضِ غم کا دم واپسیں نہیں
اک جان ہے سو وہ کہیں ہے اور کہیں نہیں

تا چند ضبط آہ کہ رکنے لگا ہے جی
یا آج آسمان نہیں یا ہمیں نہیں

کہتے ہیں ریختہ کو جو اس طرز پر عزیزؔ
دم الٹ جائے گا عزیزؔ عزیز یہ

ہر داغ دل ہے گویا تاریخ میرے تن میں
دل کھنچ گئے سبھو نکے لبیک کہہ کے دوڑے

تعمیل حکم احباب اب ہے عزیزؔ ورنہ
ہے اک فریب ہمت و ناکامی خیال

جنون شوق کا یہ مختصر سا قصہ ہے
عزیزؔ قابل عبرت ہے بیکسی اس کی

یہ مانا کہ آزردہ تم سے ہمیں تھے

تم تھے اور ہم تھے دور ساغر تھا
لاکھ دنیا نے کھائے ہیں چکر

داغ دل شام جوانی میں مزا دیتے ہیں
حقیقت میں جو سیر عالم ایجاد کرتے ہیں
ہمارے ضبط میں پنہاں ہے نظم عالم ہستی
نہ پوچھ اے عشق پر پایہ حقیقت انکی ہستی کی
جب کوئی ظلم وہ ایجاد کیا کرتے ہیں
یہ تیری آرزو میں بڑھی وسعت نظر
واہمہ خلاق ہے جو دیکھتا ہوں خواب ہے
وقت وہ آیا کہ دنیا بھر میں ہے اک انقلاب
نہ بنیں گذریں دماغ و دل میں وہ قوت نہیں
فرصت زیست کم ہے کام بہت

کچھ لوگ اور شہر میں رہیں اک ہمیں نہیں
رہ نہ خاموش کچھ تو کہہ باتیں۔

جلوے ہیں رفتگاں کے پیدا اسی چمن میں
آواز تھی یہ کس کی ناقوس برہمن میں
نیرنگیِ فلک سے کیا رنگ ہو سخن میں
مشکل جو کام ہے وہی دشوار بھی نہیں
اب امتیاز رقیب اور راز داں میں نہیں
کہ جسکا کوئی ٹھکانا کہیں جہاں میں نہیں
مگر آؤ اب ہم تمہیں کو منا لیں

ہائے وہ وقت بھولتا ہی نہیں
اپنے مرکز سے میں ہٹا ہی نہیں

ہے بہار اور ہی ان چھٹکے ہوئے تاروں میں
وہ ہر ذرہ میں اک دنیا نئی آباد کرتے ہیں
نہ ہو نکلو نفس اس کا تو ہم فریاد کرتے ہیں
جو اپنے ساتھ اس دنیا کو بھی آزاد کرتے ہیں
عمر رفتہ تجھے ہم یاد کیا کرتے ہیں
دنیا ہے سب مری نگہ انتظار میں
اللہ اللہ میں کہاں اور آپکی محفل کہاں
اے دل آشوب گستر صبر کے قابل کہاں
اب عزیزؔ اشعار میرے درخور محفل کہاں
کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

یاد کرتے ہیں اگر اہلِ وطن یاد کریں
دامِ وحشت میں کوئی یوں بھی گرفتار نہ ہو

قصد کہنے کا ہے کچھ منہ سے نکلتا ہے کچھ اور
ہو گئے ضرب المثل سب رازِ دل آخر عزیزؔ

آئینۂ مجاز حقیقت نما ہے جب
کس واسطے میں ہوں درِ کعبہ پہ جبہ سا

عزیزؔ اب تک ہوا ظاہر نہ یہ رازِ اہلِ دنیا پر
ہوں گے بدنام تو ہو لینے دو

ہمتِ عشق یہ کہتی ہے عزیزؔ
نہیں افکارِ دنیا ہی سے فرصت

وہ بادۂ شبانہ کی مستی وہ دورِ جام
وارفتگانِ حسن پہ کیا جانے کیا بنے

رو رہا ہوں اِسی تصور میں
ناصح تری نصیحت بیجا بجا سہی

رشک کے قابل ہے اُس وحشی کی حالت اے عزیزؔ
کس سے لیں داد جا کے اہلِ وفا

تھا تغیر مری حالت میں کچھ اس طرح عزیزؔ
مرے مرتے ہی گویا اس زمانہ کا ورق الٹا

واعظ بتان دیر سے نفرت نہ کیجیے
یاد آ ہی جاتا ہے کبھی ناصح کا قول بھی

سامنے آئینہ تھا ہستی تھی

ایک آوارۂ غربت کو خبر کیوں کر ہو
دم الجھتا ہے گریبان میں اگر تار نہ ہو

مجھ سا دل باختہ کوئی دمِ دیدار نہ ہو
لاکھ کوشش کی کہ میرا رازداں کوئی نہ ہو

ظاہر میں پھر بتوں کی محبت ہی کیوں نہ ہو
یہ سچ ہے تو آشنائے محبت ہی کیوں نہ ہو

وہی چاروں طرف جب جلوہ گر ہو پھر نہاں کیوں ہو
ہم کو جی کھول کے رو لینے دو

اب جو ہونی ہے وہ ہو لینے دو
عزیزؔ اس شاعری میں نام کیا ہو

اب تک مزے ہیں یاد شبِ ماہتاب کے
اُٹھ جائیں گر نگاہ سے پردے حجاب کے

دی تھی یہ جس کو زندگی کیسی
کیونکر دکھاؤں تجھ کو کلیجہ نکال کے

چاک وہ خود ہاتھ سے جس کا گریباں کر چکے
جب زمانے میں منصفی نہ رہی

آج بیداد سے وہ ہاتھ اٹھا کے اٹھے
نہ ہیں وہ اہلِ محفل اور نہ وہ رونق ہی محفل کی

کج بحثی مجاز و حقیقت نہ کیجیے
سب کیجیے جہاں میں محبت نہ کیجیے

اُن پہ اک شان خود پرستی تھی

وہم سے عقل محبت نے ترقی پائی / اپنی پرچھائیں میں پاتا ہوں شباہت تیری

ہے حقیقت پہ تو نیکی اس قدر گہری نظر / یاد ہے کعبہ کا ابتک سنگ بنیاد ہی مجھے

برق سے خورشید سے گلہائے زنگارنگ سے / مختلف شکلیں لیے صورت اُسنے دکھلا دی مجھے

منظور ہے جو سیر سپید و سیاہ کی / گردش کو دیکھ دیدۂ عبرت نگاہ کی

اسقدر کیوں تڑپ رہے ہو عزیز / کیا کلیجے میں درد ہوتا ہے

کنارہ کیجئے گا صحبت زندان کالج سے / غضب ہی ڈھائینگے ای شیخ یہ پڑھے ہیں انگریزی

عزیز اب منطق پارینہ کو دھراؤ گے کبتک / علوم مغربی حاصل کرو پیدا ہو کچھ تیزی

سوادِ شہر خموشاں کا دیکھئے منظر / سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے

ہم گذشتہ صحبتوں کو یاد کرتے جائینگے / آنیوالے دور بھی یونہی گذرتے جائینگے

حسن ہو جس رنگ میں محتاج آرائش نہیں / وہ بگڑتے جائینگے جتنا سنورتے جائینگے

دلِ پُر درد سے جو آہ پر تاثیر نکلی ہے / غم پنہاں کی لیکر ساتھ اک تصویر نکلی ہے

اک روز جستجو تھی کسی اور کی ہمیں / یا آج ہے وہ دن کہ خود اپنی تلاش ہے

گرد اڑی ہے صبح کو جو رفت و روب دیر سے / کعبہ جاتے وقت وہ پتھر پہ ملتے جائینگے

خامۂ قدرت نے دلکا نام یہ کہکر لکھا / ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائینگے

زندگی ہے تو دکھا دینگے فروغ اردو / ہم بھی اس بزم میں اک شمع جلا ہی دینگے

سرِ منبر جنہیں واعظ نے کہا لا مذہب / نظر آتے ہیں وہی مست مئے ذات مجھے

یہ مانا کہ فرصت بہت تم کو کم ہے / ٹھہر جاؤ دم بھر ابھی دم میں دم ہے

ہے سر تا قدم سادہ لوحی کا نقشہ / غنیمت زمانے میں ناصح کا دم ہے

فراغت ملے بتکدہ سے تو جاؤں / بہت دن سے قصد طواف حرم ہے

عشق کے جذبات انہیں کچھ کچھ مزا دینے لگے / اب تو وہ بھی مجکو مرنے کی دعا دینے لگے

مانا کہ کسی سے نہ کرونگا میں کوئی بات / چھپتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر بھی

ابھی تہ تک حقیقت کی نظر پہنچی نہیں زاہد
شوخی و اضطراب کے دیکھو تعلقات
سوچنے نہ یہ بتوں سے محبت ہے اے عزیزؔ
وہ نظر شوخ و فتنہ زا ہی سہی
یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستان یہ ویرانی
کسیکو اور کیا سمجھا سکوں گا مدعا دل کا
ابھی سمجھے ہیں ویران طبقۂ گورِ غریباں کو
ہوا ہے قصد پھر معیار کی شیرازہ بندی کا
پھانس ہو تو نکال دیں احباب
آج کل نیاز ان کا ہاتھ ہے
زاہد بتا نکالے گئے کعبے سے یہ کیوں
اِک جزوِ مستقل ہے دلِ بے قرار کا
عشق بیتاب نہ رویا تھا ازل میں جبتک
کیا جہانسوز ترے حسن کا نظارا ہے
طولِ شبِ فراق کی کچھ انتہا نہ پوچھ
حسرت پہ اہلِ ذوق کے رونا ہے اے عزیزؔ
خدا خلاف اگر ہے تو کچھ نہیں پروا
ہوئے ہیں قوم کے احرار داخلِ زنداں
موسمِ گل ہے چمن ہے اور بھری برسات ہے
ذرہ ذرہ ہے چمن کا آئینہ دارِ بہار
سبزہ لہریں لے رہا ہے نکہتِ گل بیقرار

نظر پڑتا وہیں کعبہ کی اک بتخانہ آتا ہے
جو کچھ ہے میرے دلمیں تمہاری نظر میں ہے
رکھنی تھی ایک آہ اثر میں بھری ہوئی
کیوں مرے حالِ زار پر نہ ہوئی
تمہیں اے سونیوالو کس طرح آرام آتا ہے
سمجھتا ہوں خود اپنے دلکی باتوں کو میں مشکل
یہیں ہر چوکھٹے ہیں اک نئی تصویر دیکھیں گے
عزیز اہلِ قلم کی قوتِ تحریر دیکھیں گے
خلشِ دل کو کیا کرے کوئی
دل اُڑا دینا بھی کوئی بات ہے
کمبخت اِن بتوں میں تو شانِ خدا بھی ہے
پیکان اب حضور کا پیکاں نہیں رہا
خون میں جوش نہ تھا دل میں کچھ احساس نہ تھا
آفتاب ایک دہکتا ہوا انگارا ہے
اتنا جیئے کہ زیست سے بیزار ہو گئے
زنداں میں جاکے داخلِ احرار ہو گئے
یہ دیکھنا ہے کہ سرکار تو خلاف نہیں
خطائے اہلِ محبت مگر معاف نہیں
تختۂ سنبل کے نیچے اک اندھیری رات ہے
ہو رہی ہے مست خوشبو سے ہوائے مرغزار
ہر طرف ہے جلوہ گر حدِ نظر تک لالہ زار

تتمہ ض

ضامن[1] - کپتان سید ضامن علی صاحب صدر شعبۂ اُردوٗ الہ آباد یونیورسٹی - آپ کا سلسلۂ نسب ساداتِ گُردیز سے مِلتا ہی - اِس خاندان کے اکثر بزرگ عربی و فارسی کے اچھے عالم گزرے ہیں - آپ کے دادا سیّد نور علی شاہانِ اودھ کے زمانے میں ناظمِ سلطنت کے عہدے پر مامور تھے - جو عہدہ آج کل کے کمشنر کے برابر تھا یہ ہندی کے اچھے شاعر تھے - ضامن صاحب کی وِلادت ۱۸۹۴ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں ہوئی - آپ کی تعلیم لکھنؤ میں شروع ہوئی -

مولانا سیّد جوّاد اور مولانا شیخ فِدا حسین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ـــــ انگریزی تعلیم کے سلسلے میں باہر جانا پڑا - چنانچہ الہ آباد سے ایم - اے کی ڈگری حاصل کی - اگرچہ آپ ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد ہو گئے تھے - مگر علم و ادب کے جبلّی ذوق نے کرسچین کالج الہ آباد میں فارسی کی پروفیسری کی کرسی پر لا بٹھایا - چھ سال کے بعد الہ آباد یونیورسٹی نے اِن کی علمی خدمات سے اِستفادہ کیا - جہاں آپ ۱۹۲۴ء میں نئے قائم ہوئے شعبۂ اُردوٗ کے صدر بنائے گئے -

شعر و شاعری کا چسکا ابتدائی عُمر سے تھا - میر علی عباد صاحب نیساں سے مشورۂ سخن کرتے رہے اُستاد کی شفقت اور طبیعت کے خُدا داد جوہر نے کلام میں پختگی اور دلکشی پیدا کر دی - جناب نیساںؔ کے اِنتقال کے بعد آپ نے ناسخؔ کے رنگ کو چھوڑ کر صفائی کا رستہ اختیار کیا - چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

حضرتِ نیساںؔ کے دم تک لُطف تھا اس رنگ کا
اب کہو ضامنؔ غزل اُس رنگ میں جو عام ہی

آپ مختلف اصنافِ شعر میں کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں - ضامن صاحب کی

[1] بہ سلسلۂ صفحہ ۳۴۶ بعد میں یہ مسالہ وصول ہوا - اِس لیے تتمہ کے طور پر یہاں درج کیا جاتا ہی -

طبیعت میں جدت۔ زبان میں گھلاوٹ اور بیان میں اثر بہ درجۂ غایت ہے نظموں کے اگر دلاویز موضوع تلاش کرنے میں انھیں کامیابی ہوتی ہے تو غزل میں بھی برجستہ اور بلند مضامین اُن کے لیے پیش پا افتادہ چیز ہیں۔ نئے طرز کے اچھے کہنے والوں میں آپ کا شمار ہے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کی نظم شیوا بیانی کے ساتھ اخلاقی اور اصلاحی پہلو لیے ہوتی ہے۔ قصیدوں میں تخیل کی پرواز اور معنویت کا زور ایک خاص رفعت پیدا کر دیتا ہے۔ گریز کی وہ بانکی طرز ہاتھ آئی ہے کہ قاآنی یاد آجاتا ہے۔ رومان آپ کے ہاں نہایت ستھرا اور دلکش ہے۔ درد اور اثر سے کلام مالا مال ہے۔ افسوس ہے کہ آپ اپنے کلام کی اشاعت کی طرف سے بہت بے پروا ہیں۔ کاش یہ بے توجہی جلد دور ہو۔ اب چند غزلوں سے جو دستیاب ہوئیں انتخاب ملاحظہ ہو۔

وہی خبر تیری جانتا ہے جسے کچھ اپنی خبر نہیں ہے
تمھیں تو کہنے کے واسطے تو کہاں نہیں ہے کدھر نہیں ہے

یقین کیونکر تمھیں دلائیں دکھانے کی شے ہو تو دکھائیں
کہ ایک چلتا ہوا ہے جادو نظر تمھاری نظر نہیں ہے

فراق کی شب ہو یا قیامت کچھ ایسا ممکن نہیں تفاوت
کسی کی ہے صبح شب نہیں ہے کسی کی شب ہے سحر نہیں ہے

ہے عقل ناواقف حقیقت اسیر ہے شوق بے خودی کا
میں راہ عرفاں میں اُس جگہ ہوں جہاں کوئی راہبر نہیں ہے

وفا کے بندوں پہ ہے یہ روشن نیاز کی حد نہیں معین
جو تیرے نقش قدم سے اُٹھے وہ سر حقیقت میں سر نہیں ہے

پڑی ہے نالہ کشی کی عادت نہیں تو اس دائم میں ضامن
اثر شریک فغاں نہیں ہے فغاں کو ذوق نظر نہیں ہے

کر کے پہلے محو نقش عالم آرائی مجھے
خود بنایا اک تماشا پھر تماشائی مجھے

ہو کے محرم شہادت بن گیا ہوں ننگ عشق
گاڑے دیتی ہے زمیں میں شرم و رسوائی مجھے

اسیروں سے کہے کیوں حال خوش باش چمن کوئی
کلیجہ منہ کو آتا ہے نہ لے نام چمن کوئی

ہجوم یاس وحرماں میں نشاں دل کا نہیں ملتا
نہ ہوگی بے چراغ ایسی جہاں میں انجمن کوئی

بیاں کیونکر کریں لطفِ جراحت تیغ و زخمِ تن
دہانِ بے زباں کوئی زبانِ بے دہن کوئی

مزاجِ عشق سے شوریدگی جاتی رہی شاید
سرِ وادیِ الفت پھر نہ آیا کوہ کن کوئی

نمایاں یوں نہ ہر تصویر ہوتی بزمِ امکاں میں
پسِ پردہ سہی لیکن ہے شمعِ انجمن کوئی

جمالِ حق وہ کیا دیکھیں گے جو خود کورِ باطن ہیں
مری آنکھوں سے دیکھے شوخیِ رنگِ چمن کوئی

ہمیں ضامن جو ہستی و عدم دونوں میں رہنا ہے
بتاؤ تو سہی کس کو کہے اپنا وطن کوئی

صیاد خونِ دل مرا شوقِ وطن میں ہے
سنتا ہوں کچھ بہار ابھی تک چمن میں ہے

یاس و ہراس سے بھی نہ بہلا دلِ حزیں
خلوت میں تھا جو حال وہی انجمن میں ہے

دیر و حرم ہی میں نہیں اے دل ضیائے حسن
پرتو فگن وہ شوخ ہر اک انجمن میں ہے

عبرت اثر ہے رونقِ گلزارِ دہر بھی
جو پھول کل تھا آج کہاں وہ چمن میں ہے

اگر ٹکرائے گی کشتی کبھی ہم غم نصیبوں کی
صدائے نالہ و شیون لبِ ساحل سے نکلیگی

مداوا درد کا بالمثل ہوتا ہے محبت میں
خلش قلبِ حزیں کی ناوکِ قاتل سے نکلیگی

فغاں مظلوم کی برمائیگی سینہ زمانے کا
اُتر جائیگی دل میں بات وہ جو دل سے نکلیگی

نمودِ حسن سمجھی ہے ابھی تو مرگِ پروانہ
سحر کو شمع ہو کر دم بخود محفل سے نکلیگی

ازل ہی سے لکھا تھا عاشقِ محزوں کی قسمت میں
کہ موت آئیگی آسانی سے جاں مشکل سے نکلیگی

غمِ فرقت رہیگا ساتھ جب تک سانس چلتی ہے
کسی کی یاد ضامن اب نہ میرے دل سے نکلیگی

جب کہ اُسی کا دخل ہو گردشِ روزگار میں
رات یہ کیوں گھٹے بڑھے وصل و فراقِ یار میں

شیشۂ قلبِ شیخ میں تھی جو حقیقت نہاں
بن گئی صورتِ مجاز ساغرِ بادہ خوار میں

ہو کے ہر اک جگہ عیاں کیسے نہ لن ترانیاں
ایسا نہ ہو کہ فرق آئے آپ کے اعتبار میں

معنیٔ جبر و اختیار عشق میں یہ ہوئے ہیں حل — دل کو ہے اختیار سب دل نہیں اختیار میں
دیکھ کے دل کی قوتیں منتظمِ ازل نے بھی — بھر دیا کوٹ کوٹ کر سحر نگاہِ یار میں

سینہ وہ کیا جو داغدار نہیں — آنکھ وہ کیا جو اشکبار نہیں
چار دن کی بھی یہ بہار نہیں — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
کتنی دلکش ہے منزلِ ہستی — مگر افسوس پائیدار نہیں
جھوٹ بھی تم کہو تو سچ ٹھیرے — میرے سچ کا بھی اعتبار نہیں
ہاتھ دل پر وہ رکھ کے کہتے ہیں — ضامن اب بھی تجھے قرار نہیں

سجدے کرتا ہوں سزاوار سمجھ کر تجھ کو — خواہشِ خلد نہیں آرزوئے حور نہیں
ہوش کہتا ہے کہ ہے منزلِ عرفاں ابھی دور — بے خودی کا ہے اشارہ کہ نہیں دور نہیں
طالبِ دید کا دم کھنچ کے لبوں پر آیا — اب بھی آجاؤ کہ آنکھیں ابھی بے نور نہیں
دیکھو جرأت کہ یہ انسان ضعیف البنیان — ہو کے مجبور سمجھتا ہے کہ مجبور نہیں
جان جائے کہ رہے کچھ نہیں پروا ضامن — خارِ غم دل سے نکل جائے یہ منظور نہیں

ضمیمہ ع

عرش:۔ سید محمد عسکری عرف میر کلو۔ خلف میر تقی میر۔ عمر بھر نہ کسی رئیس کی درباری کی نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہا۔ فقر و فاقہ میں بسر کر دی۔ باپ کی طرح نازک مزاج تھے۔ حضرت عشرت لکھنوی اپنے تذکرہ آب بقا میں لکھتے ہیں۔ کہ ناسخیوں نے عرش سے مخالفت کی اور ان کو ناسخ کا شاگرد مشہور کیا تو عرش نے ناسخ کے نام سرقے کھول دیئے اور اپنے شاگرد میر نواب علی عرف منجھو صاحب معروف بہ سپہر الدولہ ولد میر اکرام علی کے نام سے یہ اعتراض مشہور کئے جو آب حیات میں درج ہیں۔ ان کے چند مخصوص شاگرد تھے۔ انسب میر ابو طالب۔ انسخ میر نواب علی۔ انجم مرزا بندہ رضا۔ تپش شیخ فدا علی۔ فلک میر سجاد حسین قمر شیخ سرفراز علی نشاد شیخ محمد جان۔ غدر کے بعد تباہی آئی۔ گھر لٹ گیا مفتی گنج میں اٹھ گئے۔ اور میاں الماس کے امام باڑے میں قیام کیا۔ ایک روز کلام سن کر میر لکڑ باز بانکے نے سر برہنہ ہو کر کہا کہ الٰہی عرش کو میر کا مرتبہ عطا کر۔ آپ کہنے لگے یہ کیا کہتے ہو۔ عسرت تو مجھے میر سے زیادہ ملی۔ رتبہ شاعری میں میر سے کم نہیں۔ ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا۔ اور رکاب گنج لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ قاعدہ کی پابندی اور زبان کی صحت کا خیال مزاج پر بہت حاوی تھا۔ باپ سے زیادہ بیٹے نے شاہ بقیق سخن کو فیض پہنچایا۔ عرش کا دیوان نول کشور پریس سے شائع ہوا تھا۔ مگر اب کمیاب ہے۔ یہ چند شعر تذکرہ آب بقا سے بطور نمونہ کلام نقل کئے جاتے ہیں۔

ہوں وہ روشن دل کہ مرنے پر بھی میرا غم نہیں،
بزم عالم میں چراغ کشتہ کا ماتم نہیں،

سرو قد غیرت صد غنچہ دہن پتھر کے
بتکدے میں نظر آتے ہیں چمن پتھر کے

آسیا کہتی ہے ہر صبح بہ آواز بلند
رزق سے بھرتے ہے رزاق دہن پتھر کے

بھول اب غشۂ پیری سے نہیں اٹھتا عرش
تولتے تھے کبھی ان ہاتھوں سے من پتھر کے

عشرت:۔ خواجہ عبد الرؤف لکھنوی۔ ارشد تلامذہ شیخ محمد جان شاد پیر و میر نشتر لکھنوی نے جو آپ کے خاندانی حالات تذکرہ آب بقا میں ضمیمہ کے طور پر درج کئے۔ ان سے پایا جاتا ہے۔ کہ

آپ کے والدِ ماجد کا نام خواجہ عبدالشکور تھا عشرت صاحب کے سکڑ دادا کا نام بھی عبدالشکور تھا جن کو خان بہادر کا خطاب تھا کیونکہ والئے بلخ کے خلف اصغر تھے۔ یہ صاحب بھائیوں کی نا اتفاقی سے دل برداشتہ ہو کر ۱۱۸۰ھ ہجری میں وطن کو خیر باد کہہ کر چل کھڑے ہوئے دہلی پہنچے۔ اس وقت دہلی تباہ ہو چکی تھی وہاں سے فیض آباد آئے۔ نواب شجاع الدولہ نے بہت عزت کی اور الہ آباد کا قلعہ دار کر دیا خان بہادر معہ اہل و عیال وہیں رہنے لگے ۱۱۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور الہ آباد کے قلعہ ہی میں شہ نشین کے وسط میں مدفون ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد علی خاں قلعہ دار رہے۔ سعادت علی خاں کے عہد میں جب الہ آباد انگریزوں کو دے دیا گیا۔ تو محمد علی خاں کو لکھنؤ بلا لیا گیا۔ سعادت علی خاں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ اور یہ لکھنؤ کے محلہ احاطہ خانساماں میں رہنے لگے جہاں خواجہ عشرت صاحب اس وقت تک سکونت پذیر ہیں۔ اودھ میں آ کر محمد علی خاں نے اپنے لڑکوں کی شادی اہلِ کشامرہ میں کی اور نواب ظہیر الدولہ وزیرِ اودھ سے قرابت کا سلسلہ قائم کیا۔ عشرت صاحب کے پر نانا عبداللہ خاں لاہور کے سفیر تھے۔ خواجہ صاحب کے والد عبدالشکور خاں آخری شاہ اودھ کے عہد میں نواب گنج ضلع گونڈہ کے تھانہ دار تھے۔ انتزاعِ سلطنت اور غدر نے یہ سلسلہ بھی بگاڑ دیا۔ عشرت صاحب ۱۸۷۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم مولوی امید علی قدوائی سے شروع ہو کر مولوی فریاد حسین مرادآبادی کے پاس ختم ہوئی جو فارسی میں درجہ نادرہ تک پہنچی۔ عربی میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کی۔

ظہور بخش کی کوٹھی واقع لکھنؤ میں یورپین لوگوں کی تعلیم اردو کے لئے ایک درسگاہ قائم ہوئی۔ مسٹر جانسن اس کے پرنسپل اور خواجہ عشرت ان کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے جنگ جرمن تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ بعد میں آپ نجی طور پر ان انگریزوں کو پڑھانے لگے جو پرافیشنسی کے امتحان میں جانا چاہتے۔

خواجہ صاحب راقم السطور کے مہربانوں میں ہیں۔ انہوں نے غیر معمولی ہمہ گیر طبیعت پائی ہے۔ آپ کا کلام عام پسند اور دلچسپ ہوتا ہے۔ نظم کہیں یا غزل فصاحت اور محاورے

کے گلزار کھلا دیتے ہیں۔ شاعری اور عروض پر آپ نے جو کچھ لکھا وہ محقق طوسی کو غیر ضروری بنا دیتا ہے۔ لکھنؤ کے شاہی عہد کے حالات اس تفصیل اور مصورانہ صداقت سے لکھتے کہ پڑھنے والوں کو گمان ہوتا ہے۔ کہ وہ شاہی دربار یا حرم سرا میں موجود ہے۔ آپ کثیر التصانیف اور کثیر التلامذہ ہیں۔ شاعری کے مختلف شعبوں پر چار کتابیں ہیں۔ لغات اردو کا مکمل سٹ۔ مضمون نویسی۔ اصلاح زبان اردو۔ زبان دانی۔ ہجو لی۔ ترجمان پارس۔ جان اردو۔ تذکرہ آب بقا وغیرہ آپ کی وہ تصانیف ہیں جن سے بے شمار شائقین مستفید ہوتے ہیں۔ کوئی رسالہ ایسا ہوگا جو آپ کے رشحۂ قلم سے سرسبز نہ ہوا ہو۔ ان مضامین کو فراہم کیا جائے تو طلسم ہوش ربا کے جواب میں ایک طلسم ہوش افزا بن جائے۔ اب نمونہ کلام ملاحظہ ہو :- (افسوس کہ اس اثنا میں انکا انتقال ہوگیا)

جہاں میں ڈھونڈنے والے کو کیا نہیں ملتا — مگر ہمیں دل بے مدعا نہیں ملتا

بشر کو عاقبت کار کا خیال رہے — بغیر نیک عمل کے خدا نہیں ملتا

ہوا ہے سرد زمانے سے دل یہ اے عشرت — خوشی میں غم میں کسی میں مزا نہیں ملتا

جب ازل میں حسن اپنا آشکارا کر دیا — آگ سینے میں لگا دی عشق پیدا کر دیا

اس نے جب چاہا کہ دیکھے اپنی صنعت کی بہار — خاک کا پتلا بنا کر اس کو گویا کر دیا

سنیں وہ یا نہ سنیں اختیار ہے ان کو — ہمیں حقیقت دل عرض ہے سنا دینا

کفر کا نام نہ اندیشۂ اسلام آیا — سب کو بھولا وہ جسے یاد ترا نام آیا

ہر شہر اور دیار میں مشہور ہو گیا — مجھ سے تو میرا نام بہت دور ہو گیا

الفت جتا کے یار کو مغرور کر دیا — اب تو مزاج اور بھی اُن کا بدل گیا

ہجوم بے خودی عشق نے کرامت کی — فراق میں بھی کسی سے مجھے وصال رہا

اب اس کے رحم پہ موقوف ہے نجات اپنی — تمام عمر گنہوں کا انفعال رہا

مغربی تہذیب پھیلانے لگی اپنا اثر — ہم بھی اب کہنے لگے گڈ مارننگ مائی ڈیئر

ہمیں تو فخر ہے اپنی زباں کے جوہر پہ — وہ اور ہوں گے جو احسانِ غیر لیں سر پہ

ہر ایک بات کا ہے لطف اپنی اردو میں
سر میں سودائے محبت دل میں شوق دید ہے
برہمن بُت سے جو پاتا ہے مراد میں اپنی
جیسے ہوں پابند متروکات کی زنجیر میں
رنگ ناسخ ہو نہ طرزِ مومن و غالب پسند
وہ عندلیب ہوں چمن روزگار میں
عدالت میں تو اب جاتے ہوئے اشراف ڈرتے ہیں
امام اپنی جماعت کا بنا جب پیر میخانہ
بیان کوثر و تسنیم زاہد نے کیا ایسا
پھر کر نہیں آتا عدم آباد سے کوئی،
ہمارا جذب انہیں کھینچ لائیگا گھر سے
جگر میں زخم کوئی پڑ گیا نیا شاید
انتہا ہو گئی عشرت کی بداعمالی کی،
آپ بھی جلتے ہیں غیروں کو جلانے والے
محفل آباد رہے خیر ہو خُم کی ساقی
قطع کر رشتۂ تسبیح اگر دانا ہے
دیکھ لو چل کے ذرا سیر وہاں بھی عشرت
علم سے خالی ہیں تو ہندی صنایع سیکھتے
قدر دانی کا سبق دنیا میں گو مسدود ہے
بیوفا تیری نظر کا رنگ بھی محفل میں ہے
بھرتے ہیں ہر گُل میں ہر اک برگ شجر یاں
صنمکدہ جو کبھی تھا وہ اب ہے بیت اللہ

یہ گڑ وہ ہے کہ تفوق ہے جس کو شکر پہ
روزِ اوّل سے یہی اک مدعا لائے ہیں ہم
یاد کیا کیا ترے الطاف و کرم آتے ہیں
لطف اردو معلےٰ ہے مری تحریر میں
ہے شکر ریزی مری بالکل زبانِ میر میں
جس کی زباں نہ بند کبھی ہو ہزار میں
سر دربار عملے والے سب جیبیں کرتے ہیں
صدائے قلقل مینا ہوئی تکبیر میخانہ
مری آنکھوں میں عشرت پھر گئی تصویر میخانہ
کچھ خبر خیر تک نہیں ملتی ہے اُدھر کی،
یہ کب اُمید تھی پھوٹے ہوتے مقدر سے
لہو ٹپکتا ہے ہر وقت دیدۂ تر سے،
کہ فرشتوں کو بھی لکھتے میں حجاب آتا ہے
صاف روشن یہ ہوا شمع کے جل جانے سے
ایک دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے
کشتِ امید ہری ہو گی نہ اس دانے سے
دو قدم خانۂ اللہ ہے بُت خانے سے
سیکھیوں کی شکل پر کچھ تو بحالی دیکھتے
لیکن اردو کی ترقی آج تک موجود ہے
اک چھری سینے میں ہے تو ایک چھپی دل میں ہے
جلوہ تیری نیرنگیٔ قدرت کا عیاں ہے
وہاں تو روز نیا انتظام ہوتا ہے